دکن کے بہمنی سلاطین

ہارون خاں شیروانی

مترجم

رحم علی الہاشمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

Deccan Ke Bahmani Salateen

By : Haroon Khan Sherwani

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1978

دوسرا اڈیشن : 1982

تیسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت : -/88

سلسلۂ مطبوعات : 286

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : ایس۔ نرائن اینڈ سنز، نئی دہلی۔

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

ابواب | صفحات

1 - جغرافیائی حالات 13

انسان اور اس کا ماحول - برصغیر ہند کثرت میں وحدت - لاوا سے بنی ہوئی سطح مرتفع مشرق کی طرف ڈھلان گوداوری اور کرشنا کے نشیبی علاقے - مغربی بندرگاہیں - جنوبی ہندوستان - آب و ہوا - بہمنی دکن -

2 - حالات ماقبل 22

محمد بن تغلق - تغلق کے اہتمام میں دکن کی حکومت اور حیثیت - دولت آباد (سلطنت کا دوسرا مستقر) - دکن کے صوبوں کی علیحدگی - نئی سلطنت کا ظہور - ابوالفتح ناصرالدین اسماعیل شاہ -

تشریحات 37

3 - خانوادہ شاہی کا قیام ——— علاء الدین حسن بہمن شاہ (۳ اگست ۱۳۴۷ء سے ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء) 46

نئے بادشاہ کا خاندانی سلسلہ - نئی حکومت کی مخالف جماعتیں - نئے وزیر اور حکام - بادشاہ کے حوصلے ملک میں تسلط - قیر خاں کی بغاوت - بادشاہ کی زندگی کے آخری دن - بہمنی سلطنت کی وسعت - ولی عہد سلطنت کی شادی - شاہی دسترخوان - علاء الدین کی وفات - علاء الدین کا مقبرہ -

تشریحات 61

4 - سلطنت کی تنظیم ——— محمد اول (۱۱ فروری ۱۳۵۸ء سے ۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء) 67

(الف) کلچرل حالات

نیا بادشاہ - حکومت کی ساخت - فوج - تعمیرات - سکہ - خفیہ اطلاعات کا محکمہ -

ابواب | صفحات

(ب) سیاسی حالات

محمد کی تخت نشینی۔ ملحقہ ریاستیں۔ تلنگانہ سے جنگ۔ وجے نگر سے جنگ۔ بہرام خاں کی بغاوت۔

سلطان کی زندگی کے آخری ایام۔ سلطان کا کردار

تشریحات 94

5 - تغیرات کا دور (۲۱ اپریل سے ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء)

(الف) کلچرل حالات

ورثہ۔ بیرونی حالات۔

(ب) سیاسی حالات

(۱) علاء الدین مجاہد (۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء سے ۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء)

ذاتی خصوصیات۔ وجے نگر۔

(۲) داؤد اول (۱۶ اپریل سے ۲۱ مئی ۱۳۷۸ء)

(۳) محمد دوم (۲۱ مئی ۱۳۷۸ء سے ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء)

حکومت کی نوعیت۔ جانشینی کا مسئلہ۔

(۴) غیاث الدین تہمتن (۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء سے ۱۴ جون ۱۳۹۷ء)

(۵) شمس الدین داؤد دوم (۱۴ جون ۱۳۹۷ء سے ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء)

پانچوں حکومتوں پر سرسری تبصرہ۔

تشریحات 108

6 - بہمنی تمدن کا امتزاج —— تاج الدین فیروز (۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء سے ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء) 116

(الف) کلچرل حالات

آبادی کے عناصر۔ بادشاہ کی علمیت۔ کلچرل اثرات۔ تعمیرات۔ گلبرگہ کے ولی اللہ۔

(ب) سیاسی حالات

وجے نگر۔ کھیرلا۔ تلنگانہ۔ تیمور۔ وجے نگر سے پھر آویزش۔ حضرت گیسو دراز، خان خاناں اور سلطان۔ فیروز کی حکومت کا خاتمہ۔

تشریحات 134

صفحات | ابواب

حصہ دوم

7- نیا ماحول ——— شہاب الدین احمد اوّل (۲۰ر ستمبر ۱۴۲۲ء سے ۱۷ر اپریل ۱۴۳۶ء) 142

(الف) کلچرل حالات

دار السلطنت کی تبدیلی۔ تعمیرات۔ پرانے آنے اور نئے آنے والے۔ تمدن کا امتزاج۔

(ب) سیاسی حالات

مصالحانہ پالیسی۔ وجے نگر اور تلنگانہ۔ ماہور کی مہمات۔ مالوہ۔ شہزادہ علاء الدین کی شادی۔ کونکن اور گجرات۔ مالوہ کی دوسری مہم۔ تلنگانہ سے پھر جنگ۔ سلطنت کی تقسیم۔ حکومت کی اہمیت۔

تشریحات ... 164

8- پارٹی بازی اور بڑھ گئی ——— علاء الدین احمد دوم (۱۷ر اپریل ۱۴۳۶ء سے ۶ر مئی ۱۴۵۸ء) 173

(الف) کلچرل حالات

پرانے آنے والے اور نئے آنے والے۔ تعمیرات۔ عام کلچر۔ صلح و جنگ کے فنون۔

(ب) سیاسی حالات

وجے نگر۔ خاندیش۔ وجے نگر سے پھر جنگ۔ چاکن کا معاملہ۔ تلنگانہ اور مالوہ۔ بادشاہ کا کردار۔

تشریحات ... 190

9- مزید شکر رنجیاں ——— علاء الدین ہمایوں شاہ (۷ر مئی ۱۴۵۸ء سے ۴ر ستمبر ۱۴۶۱ء) ... 198

ہمایوں کی تخت نشینی۔ سکندر کی بغاوت۔ تلنگانہ اور اڑیسہ۔ حسن خاں کی بغاوت۔ ہمایوں کا کردار۔

تشریحات ... 208

10 مجلسِ ولایت کی حکومت ——— نظام الدین سوم (۴ر ستمبر ۱۴۶۱ء سے ۳۰ر جولائی ۱۴۶۳ء) 213

مجلسِ ولایت۔ داخلی قیام امن۔ کلچرل حالات۔ اڑیسہ۔ مالوہ اور گجرات۔

تشریحات ... 221

11- محمود گاواں کا عہد ——— شمس الدین محمد سوم (۳۰ر جولائی ۱۴۶۳ء سے ۲۶ر مارچ ۱۴۸۲ء) 225

(الف) مجلس ولایت (۱۴۶۳ء سے ۱۴۶۶ء)

ابواب | صفحات

خواجہ جہان ترک کا قتل۔ مجلس ...یت کی کامیابی۔

(ب) محمود گاواں کا عروج (۱۴۶۶ء سے ۱۴۷۳ء) 227

محمود گاواں بہ حیثیت وزیر اعظم۔ محمود گاواں کی پالیسی۔ کلچرل حالات۔ مالوہ۔ اڑیسہ۔ مغربی مہمات۔ پہلا دور۔ دوسرا دور۔ محمود گاواں کے خلاف سازشیں۔ گوا کی تسخیر۔ تیسرا دور۔ چوتھا دور۔ مادر ملکہ کی وفات۔

(ج) محمود گاواں کا زوال و سقوط 245

(۱) انتظامی اصلاحات۔ کلچرل روابط۔

(۲) سیاسی حالات۔ تلنگانہ اور اڑیسہ۔ خاندیش۔ کونڈاوڈو اور وجے نگر۔ محمود گاواں کے خلاف سازش۔ خواجہ کا خاتمہ۔

(د) سلطان کی زندگی کے آخری دن 254

وزیر کے قتل کے بعد سلطان کا طرز عمل۔ محمود گاواں کے بعد سلطنت کو کیوں زوال ہوا؟ محمد کی حکومت کے آخری دن۔ محمد کے انتقال کے بعد سلطنت کی حالت۔

تشریحات 261

12۔ سلطنت کی حالت نزع —— شہاب الدین محمود (۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء سے ۷ دسمبر ۱۵۱۸ء) 275

(الف) سیاسی حالات

حکومت کی خصوصیات۔ جانشینی۔ بیدر میں ہنگامہ۔ ملک حسن نظام الملک کا خاتمہ۔ پرانے آنے والوں کی سازش۔ قاسم برید کی حیثیت۔ ملک احمد نظام الملک کی فتوحات۔ قاسم برید بہ حیثیت وزیر اعظم۔ بہادر گیلانی کی بغاوت۔ خود مختاری کی مزید کوششیں۔ ولی عہد کی تنگی۔ قطب الملک۔ مشرقی ساحل اور وجے نگر۔ قاسم برید کا خاتمہ۔ تین اور امرا کا خاتمہ۔ سلطان کا انتقال

(ب) کلچرل حالات 293

پرتگالیوں کی آمد۔ گورنروں کی آزادی۔ فوجی اصلاحات۔ شیعہ مذہب۔ فنون اور تعمیرات۔

تشریحات 302

13 آخری منزل (۷ دسمبر ۱۵۱۸ء سے ۱۵۳۸ء) 312

ظاہری اسباب۔ احمد چہارم (۷ دسمبر ۱۵۱۸ء سے ۱۵ دسمبر ۱۵۲۰ء)۔ علاء الدین شاہ (۱۵ دسمبر

ابواب | صفحات

سنہ ۱۵۲۰ء سے ۵ مارچ سنہ ۱۵۲۳ء) ولی اللہ (۵ مارچ سنہ ۱۵۲۳ء سے سنہ ۱۵۲۶ء) کلیم اللہ (سنہ ۱۵۲۶ء
سے سنہ ۱۵۲۸ء)۔

تشریحات 319

14 لسانی رجحانات 323

فارسی۔ مراٹھی۔ دکھنی۔ کنڑی۔ تلنگی

تشریحات 331

15۔ اسناد۔ تاریخ فیروز شاہی 333

فتوح السلاطین، ریاض الانشا، ضوء الامع، ظفرالولیہ، برہان مآثر تذکرۃ الملوک،
طبقات اکبر شاہی، ہفت اقلیم، گلشن ابراہیم۔

ضمیمہ (الف) 342

ضمیمہ (ب) 351

پیش لفظ

بہمنی تاریخ قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کا نہایت اہم حصّہ ہے جو متحدہ دکھن کے عہد کا ہمعصر بھی ہے۔ بہمنیوں کے پہلے کا قرونِ وسطیٰ کا دکھن صرف نصف صدی تک رہا جب کہ اس ملک پر سلاطین دہلی کی متزلزل حکومت تھی اور بہمنیوں کے سقوط کے وقت سے لے کر آصف جاہی حکومت کے قیام تک کا زمانہ بالکل انتشار کا زمانہ تھا۔

بجز میجر کنگ کی "ہسٹری آف دی بہمنی ڈائی نسٹی" (جو سید علی طباطبائی کی "برہان مآثر" کا ملخص ترجمہ ہے) اور فرشتہ کے دو انگریزی ترجموں کے بہمنی حکومت کی دو صدیوں کی مفصّل تاریخ اب تک انگریزی زبان میں نہیں شائع ہوئی۔ راقم سطور یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ اُس کی کتاب "محمود گاواں' دی گریٹ بہمنی وزیر" یقیناً اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش تھی جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ میں انڈین ہسٹری کانگریس اور آل انڈیا اورینٹل کانگریس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۱ء کے صدر صاحبان کا ممنون ہوں جنھوں نے اپنے خطبہ ہائے صدارت میں اس پر ہمت افزا تبصرے کیے۔

جیسا کہ معلوم ہوگا یہ کتاب قرونِ وسطیٰ کے دکھن کے ابتدائی حصّہ کی کلچرل اور نیز پولیٹکل تاریخ پر مشتمل ہے اور ہر باب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک میں عموماً اس عہد کے کلچرل حالات کا ذکر ہے اور دوسرے میں پولیٹکل حالات کا۔ تاریخ کے معاملے میں خاص طور پر توجہ دی گئی ہے اور پوری پوری صحت حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ راقم سطور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے

کہ بہمنیوں کا اہم ترین مقصد آبادی کے مختلف فرقوں میں ربط پیدا کرنا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ یہ مقصد اور اس کا لوگوں کے فنون اور تعمیر اور زندگی پر ملا جلا ردِ عمل اس کتاب میں ممکنہ واقعیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں محمود گاواں کے متعلق کتاب کا مسودہ موصول ہونے پر مرحومہ شریمتی سروجنی نایڈو نے حسب ذیل الفاظ میں شکریہ ادا کیا:

"آپ نے یہ واضح ترین اور دلکش تاریخی تصویر پیش کر کے جیسی اب تک میری نظر سے کوئی اور نہیں گذری اپنی بے پایاں اور دقیق تحقیقی کوششوں کو بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے قرونِ وسطیٰ کے میلون مناظر کے مقابلے میں آپ کا ہیرو آپ کے الفاظ کی روشنی میں غیر معمولی جاذبیت اور زندہ جاوید شکل میں ممتاز نظر آتا ہے ......"

مُصنّف کو فخر ہے کہ یہ اعتراف ایک عظیم المرتبت خاتون شاید ہندوستان کی تخلیق کی ذہنی خواتین میں سب سے زیادہ باعظمت خاتون کی طرف سے موصول ہوا جس کی حیثیت زمانہ حال کے انگریزی ادب میں خاص امتیاز کی حامل ہے۔ اس کے اظہار کی جرأت اس لیے ہوئی کہ محمود گاواں کا عہد بہمنی تاریخ کا صرف ایک حصہ ہے اگرچہ درخشاں ترین حصہ اور پوری تاریخ موقر ناظرین کی دلچسپی کے لیے اب پیش کی جا رہی ہے ....

کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ہر باب کے آخر میں کافی مفصل تشریحات درج کی گئی ہیں کتاب کا مبحث بالکل اچھوتا ہے اور اگرچہ بعض تشریحات محض توضیحی ہیں لیکن اور تشریحات کی ضرورت ایسے مقامات پر ہوئی جہاں ہماری مورخین کی روایات میں اختلاف ہے یا جو سکوں کی شہادت سے متفق نہیں ہوتیں۔ ان تشریحات کو متن کے بعد رکھنے کا یہ مقصد ہے کہ عام ناظرین پر ان کا بوجھ نہ پڑے اور تحقیقی کام کرنے والوں کو مزید تحقیق کے لیے کافی مواد مل جائے۔

ہارون خاں شیروانی

حیدرآباد دکن
۳۰ مارچ ۱۹۵۳ء

پہلا باب

جغرافیائی حالات

انسان اور اُس کا ماحول

یہ نظریہ ثبوت کا محتاج نہیں ہے کہ انسانی تجربات کی رفتار کا جغرافیہ سے قریبی تعلق ہے لیکن بعض نہایت ہی ممتاز مورخین اور سیاسی محققین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے ور آج ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سطح ارض کی ہیئت کا جو خود متعدد عوامل کی تابع رہی ہے لوگوں کے عادات و اطوار اور ذہنیت پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون کی روایت کی کہ آب و ہوا کا کتنا زبردست اثر انسان کی زاد بوم پر ہوتا ہے اٹھارہویں صدی میں بیرن ڈی مانٹیگو نے تقلید کی اور مفکرین نے اپنے خیالات ایک خیالی "اوسط" انسان کو پیش نظر رکھ کر ظاہر کرنے کے بجائے جس کا کبھی وجود نہ تھا ایک گوشت پوست کے زندہ انسان کو پیش نظر رکھ کر ظاہر کرنا شروع کر دیا جو اپنی فطری حیثیت سے اپنے ماحول کی پیداوار ہے جس کا شاید سب سے اہم اور پائیدار پہلو جغرافیائی ہے

جیسا کہ سب کو معلوم ہے جغرافیہ کا مطلب صرف زمین کی تشریح ہے لیکن زمین کی شکلیں درمیانی اور نیز بیرونی سطح بجائے خود متعدد فطری مظاہر کا نتیجہ ہیں جو ان شکلوں کو دن بدن غیر محسوس طور پر بدلتے رہتے ہیں اگرچہ اس تغیر کے نمایاں ہونے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال لگ جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بعض خود بخود ہونے والے تغیرات ہماری آنکھوں کے سامنے ہی ہوتے رہتے ہیں جیسے دریاؤں کے دھارے کا رُخ بدلنا اور ہوا اور سمندر کے عمل سے ساحل کے خطوط کا گھٹنا

لیکن زمین کی ساخت کے اور بھی تغیرات ہیں جو اتنے پائیدار ہوتے ہیں کہ تاریخ ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور جن سے زمین کی شکل بدل گئی ہے اور خاص خاص علاقوں کے باشندوں کے عادات و اطوار کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کا بننا اور لاوا سے بنی ہوئی سطح ارض کی ساخت، دریاؤں کے بہاو کا رُخ اور ان کی وادیوں اور نشیبی زمینوں کی فراخی، سمندر سے قرب، بلندی، ڈھلان اور چوڑائی اور ان کے نتیجہ میں اُن کا نشیب و فراز، ان تمام باتوں کا باشندوں کے کردار پر اور نیز ان کی اجتماعی زندگی کے تجربات پر قطعی اور نمایاں اثر ہوتا ہے اور یہی دراصل تاریخ ہے۔

برصغیر ہند

یہاں پر اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان کے برصغیر کا حال اور تاریخ پر اس کے اثر کا تفصیل سے ذکر کیا جائے لیکن بعض جغرافیائی مظاہر کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس سے خود دکھن کی حیثیت واضح ہو جائے۔ غالباً یوریشیائی براعظم کی سب سے نمایاں خصوصیت ہندوستان ہے جو ایک وسیع خطہ ارض کے درمیان سے جنوب کی طرف خوبصورتی سے لٹکا ہوا ہے اور مشرقی اور مغربی سواحل کے درمیان تقریباً ۲۰۰۰ میل کا فاصلہ ہے جو آہستہ آہستہ اور فنکاری کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری جنوبی حصہ مل کر راس کماری بن جاتا ہے جہاں بحرِ عرب خلیج بنگال کے دہانے سے مل جاتا ہے جو بحرِ ہند کا شمالی سرا ہے۔ اگرچہ چالیس کروڑ کی آبادی کا براعظم ۲۵ درجہ جنوب میں سمندر سے گھرا ہوا ہے مگر اس عرض البلد کے شمال میں دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلہ کوہ ہمالیہ کی سرحد ہے جو مغرب کی طرف دریائے سندھ کی گھاٹی اور مشرق کی طرف دریائے برہم پُتر کی گھاٹی کے درمیان ۱۵۰۰ میل تک پھیلا ہوا ہے جس کی چوڑائی ۱۵۰ سے ۲۰۰ میل تک ہے۔ شمال کی طرف سے آنے والوں کے لیے ایک مؤثر روک ہونے کے علاوہ یہ ہندوستان کی سرزمین کی سردی سے بھی حفاظت کرتا ہے ورنہ یہاں کم از کم اتنی ہی سخت سردی ہوتی جتنی چین کے جنوبی صوبوں میں ہوتی ہے۔

• یہ پہاڑی سلسلہ تقریباً ۹۵ درجہ مشرق سے تیزی کے ساتھ جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور برہما کا یوما س بن جاتا ہے جو شمالی سلسلہ کوہ ہمالیہ کے برابر بلند نہیں ہے تاہم اسے بارانی ہواؤں سے مدد ملتی ہے جس سے گھنے جنگل کی پیداوار ہوتی ہے اور ان دو قدرتی مظاہر نے مشرق اور شمال مشرق

کی طرف سے حملہ آوروں کو کامیابی سے روکے رکھا ہے۔ دریائے سندھ کی گھاٹی کے مغرب کی طرف پہاڑی درّوں کی ساخت بہ نسبت مشرق کے مختلف ہے اس لیے بجائے ٹھوس ہونے کے یہ شمال مشرق اور جنوب مغرب کی طرف پھیل جاتا ہے جس کے سرے پر عظیم پامیر کی سطح مرتفع ہے اور پھیلتے میں اس کی بلندی گھٹ جاتی ہے۔ کہیں کہیں یہ بلندی اتنی کم ہو گئی ہے کہ خیبر اور بولن جیسے درّے بن گئے ہیں لیکن یہ درّے بھی کافی بلند ہیں جیسے خیبر سطح سمندر سے ۲۵۰۰ فٹ اور بولن ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے۔

کثرت میں وحدت

اس برصغیر کے بسنے والوں کی نسلوں، زبانوں، مذہبوں اور سماجی اطوار کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے مگر اس میں شک نہیں کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے ملک میں اس کی قدرتی سرحدوں یعنی شمال مغرب میں کوہ سلیمان، شمال میں ہمالیہ، شمال مشرق میں آسامی اور برہمی پہاڑی سلسلوں اور باقی سمتوں میں سمندر کی وجہ سے کسی حد تک ملک میں یگانگت ہے لیکن ملک کی عظیم وسعت کے پیش نظر یہ لازمی ہے کہ آب و ہوا میں اختلاف ہو۔ شمال میں ایک وسیع سطح زمین ہے جو شمال مغربی پہاڑی سلسلے سے شمال مشرق میں آسامی اور برہمی پہاڑی سلسلے تک پھیلی ہوئی ہے جو لمبائی میں دو ہزار میل اور چوڑائی میں کہیں کہیں ۱۰۰۰ میل ہے۔ یہ سطح زمین کہیں کہیں ذرا فرق کے ساتھ بندھیاچل کے دامن تک چلی گئی ہے جو تقریباً بالکل وسط میں ہے۔ بندھیاچل نہ بہت زیادہ بلند ہے اور نہ بالکل نیچا مسلسل بلکہ سارا خطہ ریگستانی ہے اور درمیانی علاقے بھی ایسے ہیں جو بڑی فوجوں کے گذرنے کے ...... قابل نہیں ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمال کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کو مشرق کی طرف سے بنگال، اڑیسہ یا شمالی سرکار کے راستے سے چکر کاٹنا پڑتا ہے یا مغرب میں گجرات اور خاندیش کی طرف سے۔

لاوا سے بنی ہوئی سطح مرتفع

ہندوستان کے اصل جزیرہ نمائی خطہ میں پہنچ کر ہمیں ایک متساوی الاضلاع مثلث ملتا ہے جو الٹا رکھ دیا گیا ہے جس کی اساس بندھیاچل اور خط سرطان کے متوازی ہے اور سرا راس کماری ہے لیکن خود اسے بھی ایک وحدت نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ مالوا میں پہاڑوں کی ڈھال

مغرب کی طرف ہے اور اس کے دونوں بڑے دریا نربدا اور تاپتی مختلف تنگ پہاڑی گھاٹیوں سے گذر کر بحر عرب میں گرتے ہیں اور خاص دکھن کے دریا چوڑی سطح نشیبی سرزمین سے ہو کر مشرق کی طرف بہتے ہیں۔ اصلی جغرافیائی دکھن کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اجنتا کے پہاڑی سلسلہ سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں قدیم محفوظ چٹان سطح مرتفع کے وسط میں نیلگری اور پال گھاٹ درّے تک گئی ہے۔ یہ سطح مرتفع جس کے کچھ حصہ پر ایک وسیع نیم دائرہ کی شکل میں قدیم زمانے سے لاوا کا بہاؤ پھیلا ہوا ہے۔ یہ دس دن کے چاند سا نظر آتا ہے اور اس کا ایک سرا ناگپور اور دوسرا گوا ہے۔ یہ بیس لاکھ مربع میل کے رقبہ میں ہے اور جغرافیائی نقطۂ نظر سے خاص کر قابل توجہ ہے۔ لاکھوں برس کی مدت میں لاوا پگھل کر سیاہ روئی کی کاشت کی مٹی میں تبدیل ہو گیا ہے جس میں نمی کسی اور زمین کے مقابلے میں زیادہ دیر تک قائم رہتی ہے اس لیے بہت زرخیز اور نفع بخش ہے۔ اس زرخیز زمین کی موجودگی کئی تاریخی مظاہر کا باعث ہوئی اور مالوا کے حکمرانوں اور دکھن کی سطح مرتفع کے حکمرانوں کے درمیان برار کے متعلق جو کشمکش رہی ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ برار اس لاوا سے بنی ہوئی نیم دایرہ کی زمین کے تقریباً وسط میں ہے اور اس لیے شمالی ہمسایوں کی حریص نگاہیں ہمیشہ اس کی طرف رہی ہیں۔ بہمنی دَور میں کشمکش کا مرکز ماہور رہا ہے جو برار کے بائیں متصل ہے اور کھیرلا جو اس علاقہ کے اندر ہے اور مالوا اور دکھن کے حکمرانوں کے درمیان بار بار یہ کشمکش واقع ہوئی ہے۔ محمد سوم کے زمانے میں گجرات نے جو مالوا کے خلاف مدد کی تھی اُس کی اہمیت کی بنیاد یہی لاوا کی مٹی سے بنا ہوا برار ہے اس لیے کہ گجرات کے سلطان محمود بیگڑہ نے بجا طور پر یہ خیال کیا کہ اگر دکھن کے بجائے برار مالوا کے پاس چلا گیا تو وہ اتنا طاقتور ہو جائے گا کہ اپنے مغربی ہمسایہ پر غالب آجائے۔

یہ لاوا سے بنی ہوئی سطح مرتفع یکایک مغربی گھاٹ پر ختم ہو جاتی ہے اور ...۲ فٹ نشیب میں چلی جاتی ہے اس طرح مرہٹہ ملک دیش کے لیے قدرتی دفاعی روک بن جاتی ہے جہاں سے یہ قوم پہلے لاوا کی سرزمین پر ناگپور سے گوا تک پھیل گئی اور پھر شمال میں دہلی تک اور مشرق میں بنگال تک اور جنوب میں تنجور تک۔ کونکن اور دلیش کا قدرتی قلعہ نما علاقہ جس کی فصیل مشرق میں پہاڑی سلسلہ اور مغرب میں بحر عرب کی خندق ہے ایک طاقتور قوم کا گہوارہ تھا جس نے دابول اور چاول کے بندرگاہوں کے تنگ مقبوضات کے باوجود بہمنیوں کے مقابلے میں اپنی آزادی قائم رکھی۔ بہمنی مقبوضات کے ان تنگ راستوں کی موجودگی کا ثبوت اس امر واقعہ سے ملتا ہے کہ لاوا کی اس سرزمین کے سب سے آخری جنوبی سرے گوا کو دو بارہ محمود گاواں کو فتح کرنا پڑا اور قبل از یں کہ وہ "ہندوستان کی اس قابل رشک

بندرگاہ" تک پہنچے اُسے درمیان کے کئی قلعوں جیسے مچال اور سنگ میشور کو تسخیر کرنا پڑا جو قدرتی بلندی پر تھے۔ اور ناقابل گذر جنگل سے گھرے ہوئے جسے پار کرنے میں اس بہادر وزیر کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی صورت شمال میں پیش آئی' اس لیے کہ یہی چاکن اور سمندر کے درمیان دہ گھنا جنگل تھا جہاں بدنصیب حسن کو پھسلا کر لے جایا گیا اور وہاں مرہٹہ سردار راجہ شرکے نے اسے قتل کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بحر دابول اور چال کی نکاس کے اور بعد کو گوا پر قبضہ کے بہمنی اقتدار ساحلی علاقہ پر بالکل موثر نہ تھا ورنہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ بحری قزاق مغرب کو جانے والے بہمنی جہازوں کو لوٹتے رہتے جس کی وجہ سے محمود گاواں کو مہاراشٹر پر فوج کشی کرنا پڑی۔

مشرق کی طرف ڈھلان

یہ لاوا سے بنی ہوئی سطح مرتفع مغرب کی طرف تو تقریب ....۳ فٹ نیچے اُتر جاتی ہے مگر مشرق کی طرف اس کی ڈھلان بتدریج ہوتی ہے اور مشرقی میدان کی سطح کے برابر ہونے تک تقریباً تین سو میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ گھاٹ سے آگے بڑھ کر سطح مرتفع تقریباً سطح ہے لیکن مشرق میں ۵، درجہ پر تقریباً ۵۰ میل چوڑی اُبھری ہوئی سطح ہے اور اُس اُبھری سطح کی جنوبی ڈھلان پر خلد آباد ہے جس کے دامن میں ایلورہ کے غار بنے ہیں اور وسط میں دولت آباد اور جنوبی سرے پر اورنگ آباد ہے۔ اورنگ آباد سے مشرق کی طرف ڈھلان اتنا بتدریج ہے کہ محسوس بھی بمشکل ہوتا ہے لیکن اس کے جنوبی کنارے پر ایک اُبھری ہوئی سطح سمندر کی سطح سے تقریباً ۲۰۰۰ - ۲۵۰۰ فٹ بلند ہے اور گھاٹ سے احمد نگر ہوتی ہوئی گولکنڈہ، حیدر آباد، سکندر آباد کے تین ملے ہوئے شہروں تک جاتی ہے جو اس کی آخری مشرقی سرحد ہے۔ اُبھری سطح کے درمیانی پھیلاو میں بیدر واقع ہے جو خود بھی بلند سطح پر ہے اور جنوب کی طرف تقریباً ایک ہزار فٹ کا نشیب ہے اور اسی کی وجہ سے بیدر کی آب و ہوا اتنی خوشگوار اور صحت بخش ہے کہ احمد اول کو اُبھری سطح کی دوسری جانب کے تپتے ہوئے شہر گلبرگہ کی جگہ اسے دارالسلطنت قرار دینے کی ترغیب ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ محمد اول کے ذہن میں ۳، درجہ مشرق تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلہ کے آخری مشرقی مقام گولکنڈہ کی جنگی نقطۂ نظر سے اہمیت رہی ہوگی جب اس نے اُسے بہمنی سلطنت کی سرحدی چوکی قرار دیا اور کچھ دن بعد بہمنی تلنگانہ کے میدان پر ٹوٹ پڑے اور دکھن کے اس حصّہ کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

گوداوری اور کرشنا کے نشیبی علاقے

یہ سطح مرتفع ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ دکھن کے دو اہم ترین دریاؤں گوداوری اور کرشنا کے نشیبی علاقوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ ان دو دریاؤں کی نوعیت میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ کرشنا اور اس کی شاخ تنگ بھدرا سمندر کے قریب کرنول جیسے پتھریلے علاقوں سے گذرنے کی وجہ سے جہاز رانی کے قابل نہیں ہیں لیکن شمالی دریا گوداوری اور اس کی شاخیں برن ہیتا اور واردھا سطح علاقہ سے ہو کر زرخیز زمین پر گذرتی ہیں اور راستہ میں سنگرینی کی کوئلہ کی کانیں ہیں۔ لیکن اس زرخیز خطہ کے علاوہ تلنگانہ میں مرہٹہ ملک کی زرخیزی کے مقابلہ میں کوئی خوبی نہیں ہے اس لیے کہ اگرچہ مہاراشٹر کی سیاہ روئی کی کاشت کی مٹی پانی کو کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے روکے رکھتی ہے تلنگانہ کی زمین ریگستانی ہے اور بہت جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر اور نیز اس علاقہ کی عموماً ناہموار سطح کی وجہ سے پانی کو گہرائی میں ذخیرہ کرنے کے لیے بڑے اور چھوٹے بندھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تلنگانہ کی مصنوعی جھیلیں اور حیدرآباد کے گرد تالاب اور آبی ذخیرے شروع میں اسی مقصد سے تعمیر کیے گئے تھے۔ مشرق کی نشیبی سرزمین پر پہنچنے کے بعد بہمنیوں کے لیے سیلابی میدانوں اور گوداوری اور کرشنا کے نئے بنے ہوئے دہانوں پر قابض ہو جانا بالکل آسان تھا باوجودیکہ جنوب سے وجے نگر کا اور شمال سے گج پتی اقتدار کا دوہرا دباؤ پڑتا رہا۔ اور کونڈاپلی کی مہمیز کو مستقر بنا کر محمود شاہ لشکری بآسانی شمال کی طرف اڑیسہ تک اور جنوب کی طرف کانچی تک بڑھتا چلا گیا جو کہ بہمنی سلطنت کا آخری جنوبی ساحل تھا جہاں اب تک بہمنیوں کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔

مغربی بندرگاہیں

اگرچہ مشرقی ساحل کا علاقہ بہت لمبا تھا جس پر بیش تر بہمنیوں کا قبضہ رہا مگر اس علاقے میں جو بندرگاہیں ان کے قبضے میں تھیں اُن پر وہ قانع نہ تھے اس لیے کہ اس علاقے کے بندرگاہ گوداوری اور کرشنا سے آئی ہوئی تہ نشین ریت سے بنے تھے اور ہمیشہ ریتیلے رہتے تھے حتیٰ کہ آج بھی مچھلی پٹم اور کاکناڈا کی بندرگاہوں میں جہاز میلوں کے فاصلے پر روک دیے جاتے ہیں۔ ۱۴ درجہ شمال کے پورب میں غیر ریتیلی بندرگاہ صرف اسحٰق پٹن ہے مگر یہ بھی (مزید جنوب کی طرف مدراس کی بندرگاہ کی طرح) بالکل مصنوعی ہے اور آج کل کے زمانے میں مفید ثابت نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ بہمنیوں نے مشرقی ساحل پر کسی بندرگاہ کو

ترقی دینے کا خیال نہ کیا بلکہ جیسا اوپر کہا گیا ہے، انھوں نے مغربی ساحل کے بندرگاہوں پر قبضہ حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ چاول اور دابول شروع ہی سے اُن کے قبضے میں تھے لیکن ان بندرگاہوں کے اور گوا کے درمیان گھنا جنگل حایل ہونے کی وجہ سے جس میں دشمن قبایل آباد تھے اور جنھیں وجے نگر سے مدد ملتی تھی بہمنیوں کا گوا پر قبضہ غیر مستقل رہا۔ اس میں شک نہیں کہ وجے نگر کی شمالی سرحد مشرقی ساحل پر مسلسل دباؤ ڈال کر بہمنی تنگ بھدرا کی پوری لمبائی پر کرشنا کے دہانے تک قابض ہو گئے تھے۔ کرشنا کے اوپری حصہ اور دوآبہ کے آنند پور شہر پر قابض ہونے کی وجہ سے تنگ بھدرا کے بالائی حصہ کے بنائے ہوئے نندی کنا مادرّے سے گذر کر دہ گوا کے ساحلی علاقہ تک پہنچ سکتے تھے مگر اس کی کبھی کوشش نہیں کی گئی اس لیے کہ اس صورت میں جنوبی مرہٹہ ملک کے دشمن قبایل شمال سے بآسانی عقبی حملہ کر سکتے تھے۔ محمود گاواں نے اسے سمجھ لیا اور اس نے اس آسان راستہ کو چھوڑ کر جنوب کی طرف سے چاول سے براہ کولھاپور پر حملہ کیا۔ اس نے یہ بھی بخوبی اندازہ کر لیا کہ محال، سنگ میشور اور مغربی گھاٹ کے دوسرے قلعے سب کے سب گھنے جنگل سے گھرے ہوئے تھے جو گوا کی دفاع کا واحد مضبوط گڑھ تھے اور ایک مرتبہ وہ کامیابی کے ساتھ اس مہم کو سر کر سکا تو گوا پر بہمنی بحری بیڑا مسلط کر کے وہ بنا کسی آدمی کے نقصان کے اور بغیر ایک گولی چلائے اس عظیم بندرگاہ میں داخل ہو جائے گا۔

جنوبی ہندوستان

جزیرہ نما جنوبی حصہ پر بہمنی اقتدار کبھی موثر نہیں رہا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دکھن کی سطح مرتفع میں اور اس حصہ میں جسے "جنوبی ہند" کہتے ہیں قدرتی ساخت میں بڑا فرق تھا۔ گوا ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں لاوا سے بنا ہوا شمالی سرزمین کا حصہ مغربی گھاٹ کے جنوبی پتھریلے حصہ سے ملتا ہے اور مغربی گھاٹ پر کبھی بہمنی پوری طرح قابض نہیں رہے بلکہ یہ حصہ ہمیشہ جنوبی ہمسایہ کے زیر اقتدار رہا۔ مغربی گھاٹ کا پتھریلا حصہ مشرق کی طرف بڑھتا چلا گیا ہے اور میسور کی سطح مرتفع بن جاتا ہے اور تنگ بھدرا سے ٹھیک اس مقام پر ملتا ہے جہاں آج ہمپی کے کھنڈر وجے نگر کی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ "جبہ دکھن کی سطح مرتفع ترچناپلی تک پورے کرناٹک کا مرکز تھی مگر جغرافیائی نقطۂ نظر سے مشرقی ساحل کا جنوبی چار سو میل کا علاقہ شمالی ساحلی علاقہ سے جو ۱۶ درجہ شمال سے ۸۰ درجہ مشرق کے تقریباً متوازی جنوب کی طرف چلا گیا ہے بالکل مختلف ہے۔ تقریباً ۱۶ درجہ شمال اور ۸۰ درجہ مشرق کے جنوب کا ساحلی علاقہ ہوا کی دو مختلف قسموں یعنی شمال مشرقی تجارتی ہواؤں اور جنوب مغربی

بارانی ہواؤں سے متاثر ہوتا ہے اور بجز کاویری کے دہانہ کے جو شمال کے گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کی طرح آگے کو نکلا ہوا نہیں ہے اور جو کبھی خلیج کی شکل میں رہا ہوگا اس علاقے میں نہ کوئی قابل ذکر بندرگاہیں ہیں اور نہ دریاؤں کے دہانے۔ خود مدراس مصنوعی بندرگاہ ہے اور پورے سال بھی بے خطر نہیں رہتا۔ جزیرہ نما تیزی کے ساتھ اور تقریباً یک لخت تنگ ہوتا جاتا ہے جس کی وجہ سے بارش کی اور زمین میں نمی کی افراط رہتی ہے لیکن اس کے باوجود بعید جنوب کی زمین قدرتی کھاد والے لاوا سے بنے ہوئے دکھن کے مقابلہ میں بہت کم تر ہے۔

آب و ہوا

جہاں تک سطح کی بلندی اور آب و ہوا کا تعلق ہے سرسری طور پر ۱۶ درجہ شمال کو خاص دکھن کی شمال مشرقی سرحد قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس خطہ کے جنوب میں بارش کم ہوتی ہے اور مغرب میں روئی کی کاشت کی کالی مٹی والے خطہ کے علاوہ زمین بہت ناقص ہے۔ جنوب کا حصہ بالکل منطقہ حارہ کے اندر ہے اور اگر زمین کی سطح بلند نہ ہوتی تو یہاں کی گرمی قریب قریب ناقابل برداشت ہوتی سال میں تقریباً ۳۰ انچ بارش کے اوسط اور مشرقی ساحل کے قریب کی زمین ریتیلی اور بارانی ہونے کی وجہ سے تلنگانہ کے کاشت کاروں کی حالت کچھ بہت بہتر نہیں ہے اور سارے علاقے میں بکثرت چھوٹے اور بڑے بندھ ہیں جو خشک سالی کے اندیشہ سے جو اکثر ہوتی ہے پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ علاوہ بریں جنوبی حصہ میں جنوب مغربی بارانی ہواؤں کی وجہ سے سمندر کے قریب کی زمین کاشتکار کو کچھ زیادہ نفع دے جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حوصلہ مند بہمنی حکمرانوں نے ساحل کی زرخیز زمین کی طرف رخ کیا اور شاید اسی وجہ سے کرشن دیورائے نے گج پتیوں کو ان کے وطن کی طرف دھکیل دیا۔

بہمنی دکھن

خلاصہ یہ کہ بہمنی دکھن بر اعظم کے وسط کے قدرتی جغرافیائی حدود کے اندر تھا۔ شمال کی طرف اس کی سرحد بندھیاچل تھی جس میں سارا برار اور کچھ حصہ موجودہ مدھیہ پردیش کا بندھیاچل کے سرے تک شامل تھا۔ جنوب کی طرف اس کی سرحد تنگ بھدرا سے کرشنا تک ادلتی بدلتی رہتی تھی جس کا انحصار اس پر تھا کہ حکومت لوجے نگر کے مقابلے کی کتنی طاقت ہے اور حکومت کا موثر اقتدار

کرشنا کے دہانے سے آگے نہ تھا۔ سلطنت کی مشرقی سرحد پہلے گولکنڈہ تک مقرر ہوئی تھی اُس پہاڑی سلسلہ کے قریب جو مغربی گھاٹ کو تلنگانہ سے ملاتا ہے لیکن اس سرحد تک پہنچ کر بہمنیوں کے لیے یہ آسان ہو گیا کہ میدان کو پار کر کے راجہ سندری تک ساحلی علاقہ کو فتح کر لیں اور پھر بلا کسی مزاحمت کے مشرقی ساحل کو اوپر سے نیچے تک چھان ڈالیں۔ مغربی سرحد دراصل مغربی گھاٹ تھی جس کے دوسری طرف مرہٹوں کے غنیم قبایل آباد تھے اور نکاس چال اور دابول کی طرف تھی جو سلطنت کے خاص بندرگاہ بن گئے۔ گوا کئی بار فتح کیا گیا اور جاتا رہا۔ یہاں تک کہ محمود گاواں چال اور دابول کی طرف سے بڑھتا ہوا اور جنگل کاٹتا ہوا اور راستہ کی بلندیوں کو تسخیر کرتا ہوا فتح مند ہوا۔ کوکن پر قبضہ تقریباً سلطنت کے خاتمہ تک رہا اور یہ دراصل سلطنت کا زبردست قلعہ بن گیا اور اس کے جاتے ہی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے اور کئی سلطنتیں بن گئیں یعنی شمال میں احمد نگر، مہاراشٹر اور بیجاپور تقریباً بھیما سے کرشنا اور تنگ بھدرا تک، برار تقریباً گوداوری کے خطہ تک اور گولکنڈہ بشمول تلنگانہ اور کرشنا گوداوری دوآبہ اور جو کچھ سب سے بچ رہا تھا وہ مختصر المدت سلطنت بیدر میں رہا۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بیجاپور جس کا مرکز کرشنا گوداوری دوآبہ میں تھا اور احمد نگر گوداوری اور بھیما دریاؤں کے درمیان اور سیاہ روئی کی کاشت کی سرزمین کے ذخیرہ کے ساتھ اور گولکنڈہ اپنی مشرقی ساحل کی بارانی زمین اور بارش کی فراوانی کے ساتھ یہ سب تو پھلتے پھولتے رہے مگر بیدر جو کبھی بہمنی سلطنت کا مستقر تھا گھٹتے گھٹتے جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے تیزی سے انحطاط کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگرچہ آب و ہوا کی صحت مندی میں کوئی اور جگہ اس کے مقابلے کی نہ تھی مگر اس شہر کے پاس دکھن کا کوئی زرخیز حصہ سہارے کے لیے نہیں تھا۔ اور امیر برید کا یہ کہنا محض طنز نہ تھا جب اُس نے اپنے آقا بادشاہ سے عرض کیا کہ سارے زرخیز علاقے گورنروں نے لے لیے اور اب اعلیٰ حضرت کو پیش کرنے کے لیے اُس کے پاس کوئی خطہ ملک باقی نہیں رہا ہے

دوسرا باب

حالات ماقبل

محمد بن تغلق

چودھویں صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کے برصغیر کا پورا حصہ ایک حکومت کے ماتحت آگیا یعنی دہلی کے سلطان محمد بن تغلق کے ماتحت۔ ۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی کے ماتحت مسلمانوں نے سب سے پہلے سرزمین دکھن میں قدم جمایا تھا لیکن اس کی فتح مستقل نہ تھی اور دکھن کو اس کے ہم قبیلہ بدنام قطب الدین مبارک شاہ کو دوبارہ فتح کرنا پڑا لیکن محمد بن تغلق سے پیشتر اس سطح مرتفع اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں کو زیر کر کے قبضہ جمانے اور دہلی کی فوجوں کا جنوب کے دور دراز حصوں پر مستقل حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہ قبضہ کچھ تو برق رفتار حملوں سے اور کچھ ملک کی منظم فتوحات سے ہوا لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا دکھن زیادہ دن محمد تغلق کے ماتحت نہیں رہا بلکہ جیسے ہی اسے منظم ہونے کا موقعہ ملا یہ پوری سلطنت سے الگ ہوگیا۔

تاہم جب تک محمد بن تغلق کا اقتدار قائم رہا اور اس کی حکومت رہی ۔ اس کے اثرات سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں جیسے دولت آباد کا پہاڑ ترشا ہوا قلعہ، بیدر کا گنبد اور بودھن اور دوسرے مقامات کے کتبات اور حیدر آباد اور ملحقہ علاقوں کی ریاست وغیرہ میں رسم الخط جس میں سرکاری زبان فارسی لکھی جاتی تھی بہمنی سلطنت کے بیدر کے دور تک قائم رہا۔ فن تعمیر میں ہندو فنکار بڑی مشکل سے

تغلق کے عہد کے نیم مدور گنبد اور ڈھلوان دیواروں کی سادگی کا منقش دایرے پر بلند گنبد کی شکل میں منتقل کر پایا جس میں جا بجا دیکھنے والے کی توجہ مرکوز کرنے کے لیے جالیاں اور کھڑکیاں بنائی گئیں۔

مزید براں بہمنیوں کا سارا نظام حکومت حتیٰ کہ بہت سے عہدوں کے نام تک بیش تر سلاطین دہلی کے مقررہ نمونے پر قائم رہے۔ دراصل بہمنیوں کے متعنن محمد اول نے محض نظام حکومت کی ازسرنو اصلاح کی جو آزادی کی جنگ کے دوران میں بگڑ گیا تھا اور اصولی طور پر ہمیں اس میں اُس وقت تک کوئی نمایاں فرق نہیں نظر آتا جب تک کہ پندرھویں صدی کے آخری حصہ میں محمود گاواں نے وزارت نہیں سنبھالی[۲۲]

تغلق کے اہتمام میں دکھن کی حکومت اور حیثیت

مناسب ہوگا کہ ہم اپنے مبحث کی ابتدا میں تغلق کی سلطنت کے نظام اور اس نظام میں دکھن کی حیثیت کی تشریح کر دیں۔ محمد بن تغلق کی حکومت کے ابتدائی دَور میں بادشاہ کو پورے ملک پر جنوب میں مدورا تک اور اُس کے بھی آگے پورا اقتدار حاصل تھا۔ اس عہد میں سارا ملک تیئیس صوبوں میں منقسم تھا۔ جس میں جاج نگر (اڑیسہ)، مرہٹ (مہاراشٹر)، تلنگ (تلنگانہ)، بیدر، کمپلی (جو بعد میں بڑھ کر وجے نگر بن گیا)، دوار سمدر جس میں بعد کو مالوا شامل ہوگیا، اس کے جنوبی صوبے تھے[۲۳]۔ ساری سلطنت کی مرکزیت سلطان کے ہاتھ میں تھی جس نے ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) کے بعد کچھ دنوں کے لیے سلطنت کے دو مستقر مقرر کیے، ایک دہلی میں اور دوسرا دیوگیر معروف بہ دولت آباد میں[۲۴]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حکومت کے ابتدائی دَور میں سلطان کو ان صوبوں کے نظم و نسق میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ ضیا برنی نے اپنی تاریخ کا ایک پورا باب اس بحث پر وقف کیا ہے اور کہا ہے کہ جیسے ہی کوئی نیا علاقہ سلطنت میں شامل ہوتا ویسے ہی حکومت کے افسروں کا پورا عملہ مقرر ہو جاتا تھا اور دور دراز کے علاقوں پر بھی تسلط ہو جاتا تھا اور دہلی کے محل ہزار ستون کے دفتر میں محاصل اور دوسرے مواجب جمع ہوتے تھے[۲۵]۔ صوبے یا اقالیم کئی دیہی اضلاع یا شق میں اور شہری اضلاع یا مداین یا شہر میں منقسم تھے۔ دیہی اضلاع پھر مزید ہزاری یا صدی میں منقسم تھے، اول الذکر ایک ہزار گاؤں اور آخر الذکر سو گاؤں پر مشتمل ہوتے تھے۔ صوبے کا بڑا حاکم والی کہلاتا تھا اور شق شقداروں، عاملوں اور ناظموں کے ماتحت تھے۔ صدی جو سب سے چھوٹا انتظامی وحدت تھا اور شاید آج کل کے تعلقہ یا تحصیل کے برابر تھا، امیران صدہ کے ماتحت تھا، جن کے ماتحت متصرف، کارکن، بلاہار، چودھری، پٹواری وغیرہ جیسے چھوٹے دیہی حکام تھے[۲۶]۔

صوبہ جات کی حکومتوں کا نظام مرکزی حکومت کے ماتحت اس طرح قائم تھا۔ اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔ اوّل یہ کہ جن مقامی ہندو رئیسوں یعنی رائے، رانگان یا مقدمون نے خراج دینا منظور کیا وہ اپنے اپنے علاقوں میں پورے اختیارات کے ساتھ بحال رکھے گئے[8] اور خود گورنروں کو اپنے علاقے میں بڑی حد تک آزادی حاصل تھی جس کی وجہ مرکز سے طویل فاصلہ اور موثر اقتدار کی دشواری تھی۔ ان گورنروں کے اپنے دیوان یا وزیر ہوتے تھے اور خود اپنی عدالتیں اور فوجیں گورنروں کے ماتحت حکام کا بہت بڑا عملہ ہوتا تھا اور اگرچہ اعلیٰ عہدوں پر تقرر سلطان کی منظوری سے ہوتا تھا لیکن صوبہ کے دوسرے حکام بلا مرکز کی منظوری کے مقرر ہوتے تھے۔ علاوہ بریں خود گورنر کے صوبہ جاتی امرا اور ملی حکام ہوتے تھے۔ بعض صوبے نیلام بھی کیے جاتے تھے[8] اور دوسرے صوبوں کی کل مالگذاری جمع کر کے اور صوبہ کا خرچ وضع کر کے مرکز کو بھیج دی جاتی تھی[9]

معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ کے گورنروں کو بڑے اختیارات تھے۔ امیران صدہ جنھوں نے دکھن کی آزادی حاصل کرنے میں خاص کردار ادا کیا اُن کی حیثیت غیر معمولی تھی۔ یہ حکام بیشتر اونچے خاندان کے تھے اور اونچے طبقہ، متوسط طبقہ کے اور اپنی صدی یا سو گاؤں کے لوگوں سے جن پر ان کی حکومت تھی براہ راست تعلق رکھتے تھے[10] یہ محض مالگذاری وصول کرنے والے نہ تھے بلکہ فوجی کمان دار بھی تھے۔ جو مقامی فوجی دستہ کے پورے ذمہ دار تھے اور اگرچہ داحی اور شقدار ایک طرح عام نظروں سے پوشیدہ تھے۔ اس لیے یہی امیر ہر طرح عملی حیثیت سے حکومت کے نمائندے تھے جن سے عام لوگ واقف تھے۔ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ انھیں اپنی حکومت کا غرور تھا اور جب محمد بن تغلق نے بغاوت کی سزا میں جس کے یہ براہ راست ذمہ دار نہ تھے اور جس سے بالآخر سلطنت میں پھوٹ پڑی، انھیں دبانے کی پالیسی پر عمل شروع کیا تو یہ بھپر گئے۔

دولت آباد (سلطنت کا دوسرا مستقر)

ان بغاوتوں کے کئی سبب تھے لیکن یہاں میں وہی اسباب بیان کروں گا جن سے دکھن کو براہ راست آزادی حاصل ہوئی۔ دکھن کی سب سے پہلی بغاوت جس کا حال نہیں ملتا ہے سلطان کے ماموں زاد بھائی بہاء الدین گرشاسپ کی تھی جو ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں واقع ہوئی۔ گرشاسپ کو ساگر میں ایک جاگیر ملی ہوئی تھی[11] اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے شروع ہی سے مرکزی حکومت کے احکام کو اور سلطان کے اقتدار کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا[12]۔ اس نے مقامی امرا اور سرداروں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے

موافق کر کے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان نے گجرات کی فوج کے ساتھ خواجہ جہاں ملک احمد ایاز اور مجید الدین ابو رضا کو روانہ کیا۔ جنھوں نے دیوگیر میں ایک سخت لڑائی کے بعد شکست دے کر اُسے اُس کی جاگیر کی طرف بھگا دیا جہاں سے وہ کمپلی کے رائے کمپلا دیو کے پاس چلا گیا جو ایک خود مختار رئیس تھا اور تنگ بھدرا کے کنارے اُس کی ریاست تھی[13] اس دوران میں خود سلطان دیوگیر آگیا اور بغاوت فرو کرنے کے لیے خواجہ جہان کو روانہ کیا لیکن گُرشاسپ نے خواجہ جہان کو دو مرتبہ شکست دے دی اور جب تک خواجہ جہان کی مدد کے لیے مزید فوج نہیں آئی وہ گرشاسپ کو زیر نہ کر سکا۔ بالآخر خواجہ جہان کمپلی رائے کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا اور شاید اُس کے قلعہ کو مسمار کر دیا لیکن گرشاسپ دکھن کی طرف اور آگے ویر بلل کے دارالسلطنت دوارتی پتر چلا گیا اور ویر بلل نے سلطان کی فوج کی آمد کی خبر سن کر گرشاسپ کے ساتھ دغا کی اور اُسے گرفتار کر کے سلطان کے پاس بھیج دیا۔ اور اسی کے ساتھ سلطان کے اقتدار اعلیٰ کو سرِتسلیم کر لیا[14]

گُرشاسپ کی بغاوت اور اُس کی ابتدائی کامیابی نے سلطان کو یہ احساس دلا دیا کہ سلطنت کا مستقر ایسی جگہ ہونا چاہیے جو دہلی کے مقابلہ میں زیادہ مرکزی ہو۔ اس نے دہلی میں اپنے قریبی مشیروں اور ارکانِ عمل سے مشورہ کیا[15] اور کچھ مباحثہ کے بعد جس میں اُجین کا بھی ذکر ہوا، سلطان نے بالآخر دیوگیر کو سلطنت کے دوسرے مستقر کے طور پر منتخب کیا اور دہلی کے ممتاز خاندانوں کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔ دیوگیر کا نام پہلے قبۃ الاسلام رکھا گیا اور پھر دولت آباد کر دیا گیا[16]۔ اور یہاں ایک عظیم سلطنت کے مستقر کے شایانِ شان تمام سہولتیں اور آسائشیں مہیا کر دی گئیں۔ چونکہ سلطان کی اس پر خاص توجہ تھی اس لیے اس کی دولت میں دن دُونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور کچھ حیرت کی بات نہیں کہ دولت آباد کے ہندو بہت زیادہ دولت مند ہو گئے اس لیے کہ دہلی کے ہندو اپنے آبائی وطن ہی میں رہے[17]۔ اپنے عروج کے زمانے میں شہر تین بڑے حصوں میں منقسم تھا یعنی دولت آباد خاص جس میں چھاؤنی اور شاہی محلات تھے اور اصل شہر کٹکا اور دیوگیر جسے کبھی دھراگیر اور دھراگیر ابھی کہا جاتا تھا اور جس میں قلعہ تھا[18]۔

اس انتظام کا بظاہر یہ مقصد تھا کہ بادشاہ وقتاً فوقتاً جنوبی مستقر میں جاتا رہے اور معتبر اُمراء حکام کی بڑی تعداد وہیں موجود رہے تاکہ وسیع تغلق سلطنت میں دکھن کے قلب میں ہی ایک ایسا عملہ رہے جس پر سلطنت بھروسہ کر سکے[19] دہلی سلطنت کے دو مستقروں میں سے ایک مستقر کی حیثیت سے اب بھی قائم رہا، جہاں ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی تھی اور سلطنت کی شمال مغربی سرحد کے اس پار سے جو مسلسل نقل وطن کر کے آنے والوں کی کثیر تعداد آتی رہتی تھی، وہ وہیں آتی رہے اس لیے کہ ان کے دولت آباد

آنے کی توقع نہ تھی۔ سلطان کو اس کا مطلق احساس نہ ہوا کہ وہی امرا جنھیں وہ ہندوستان کے روایاتی دارالسلطنت سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ایک شہر میں منتقل کر رہا تھا ملک اور سلطنت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیں گے اور دکھن میں ایک آزاد حکومت قائم کر دیں گے جو ساڑھے تین سو سال تک باقی رہے گی۔

دکھن کے صوبوں کی علیحدگی

۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں جب کہ تغلق سلطنت کا دوسرا مستقر دولت آباد میں قائم ہوا اُس وقت سے ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) تک یعنی دکھن کی خودمختاری کا اعلان ہونے تک اس مدت کو دو نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں (۱۳۲۷ء سے ۱۳۴۱ء تک) جنوبی ہند میں پورے طور پر امن رہا اور "جو لوگ دنیا کے شور و شغب اور افکار سے اُکتا گئے، انھوں نے دولت آباد کی محفوظ دیواروں میں جائے پناہ حاصل کر لی" اس لیے کہ تغلق سلطنت کے اس مستقر سے زیادہ کہیں اور اتنا امن و آسایش نہ تھی۔[1] ایک وسیع سلطنت کے دوسرے مستقر کی حیثیت سے دولت آباد بظاہر بہت کامیاب رہا اور وہاں ایک کثیر وفادار آبادی کو قائم کرنے کی پالیسی بارآور ہو رہی تھی۔

سلطان برابر دولت آباد سے دہلی اور دہلی سے دولت آباد آتا جاتا رہا لیکن ۷۲۸ھ (۱۳۲۸ء) سے سلطان مغربی صوبوں یعنی دہلی اور دوآبہ میں بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے دو سال تک شمالی مستقر میں رہا۔ اس کی عدم موجودگی میں نہ صرف دکھن ہی پُر امن رہا بلکہ شمالی بغاوتیں بھی بلا وقت فرو کر دی گئیں اور یکم محرم ۷۳۴ھ (۱۲ ستمبر ۱۳۳۳ء) کو جب ابن بطوطہ سلطنت کا دورہ کر کے یہاں آیا تو بظاہر سلطنت میں بڑی فارغ البالی تھی لیکن یہ محض طوفان سے پہلے کا سکون تھا اور جب طوفان آگیا تو محمد بن تغلق کی ساری سلطنت درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

صورت یہ ہوئی کہ جب سُلطان تلنگانہ سے دولت آباد کے راستے میں تھا تو یہ افواہ اُڑی کہ سُلطان بیمار ہو کر فوت ہو گیا جس سے کمال الدین گرگ کے لڑکے ہوشنگ کو بغاوت کی جرأت ہوئی۔ سُلطان کی افواج نے اُس کا تعاقب کیا اور اس نے راجہ "باربرا" کے علاقہ میں پناہ لی جس کی ریاست دولت آباد اور تھانہ کے درمیان واقع تھی۔ سلطان کو دولت آباد میں جب بیماری سے صحت ہوئی تو اُس نے ہوشنگ کا اس کی جائے پناہ میں تعاقب کیا مگر راجہ نے اپنے مہمان کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور یہ طے ہوا کہ سلطان واپس چلا جائے اور ہوشنگ خود کو تغلق خاں کے حوالے کر دے جو اس وقت دولت آباد

میں نائب السلطنت کے عہدہ پر مقرر ہوا تھا۔ ہوشنگ کو بالآخر معافی مل گئی۔[22]

تغلق خاں کے تقرر کے ساتھ ہی شہاب سلطانی نصرت خاں کو بیدر میں تلنگانہ کی حکومت پر ایک لاکھ ٹنکر کے خراج پر مامور کیا گیا۔[23] ان انتظامات کو مکمل کر کے سلطان دہلی روانہ ہو گیا اس لیے کہ شمال سے کئی ہنگاموں کی خبریں آئی تھیں جن میں اہم ترین امیر گل چندر[24] کی مدد سے امیر ہلاکو کا اعلان آزادی تھا۔ شمال کے راستہ میں بیڑ کے مقام پر سلطان کا ایک دانت نکالا گیا جسے یادگار کے طور پر ایک بڑے گنبد کے اندر دفن کر دیا گیا۔ سلطان جولائی ۱۳۳۶ء میں دہلی پہنچا۔[25]

سلطان نے دکھن میں سلطنت کا مستقر قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی۔ یہ اس کا خاتمہ تھا اور اب اس نے یہ طے کیا کہ معبر کی بغاوت کی کامیابی اور نیز جنوب میں متواتر بغاوتوں کا سبب انھیں اُمرا کی معنویانہ روش تھی جنھیں اس نے دولت آباد بھیجا تھا اور جب سلطان شمال سے روانہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ جن لوگوں کو جنوب میں نقل وطن کرنے کی ہدایت کی گئی تھی وہ پھر شمال میں منتقل ہو جائیں۔

لاہور کی بغاوت کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان کو پھر معبر کے گورنر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جنوب کی طرف جانا پڑا۔ اس بغاوت کا بانی پنجاب کے کیتھل کا سید احسن تھا۔ وہ سلطان کے خزانچی سید ابراہیم کا والد تھا اور معبر یا کارومنڈل کے علاقے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ فرشتہ نے اس بغاوت کی تاریخ ۷۴۲ھ (۱۳۴۱ء) بتاتی ہے لیکن اب قطعی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ یہ واقعہ سات برس پہلے یعنی ۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء) کا ہے۔ معبر کا دارالسلطنت مدورا تھا اور یہ سلطنت کا سب سے آخری جنوبی صوبہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید احسن نے دولت آباد کے بعض ان اُمرا کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جنھیں دہلی سے جنوب میں منتقل ہونے پر مجبور کیا گیا تھا اور جب سلطان نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے فوج بھیجی تو یہ فوج بھی باغیوں سے مل گئی۔ سلطان نے اپنے خزانچی سید ابراہیم اور اس کے دوسرے عزیزوں کو گرفتار کر لیا اور ۹ جمادی الاول ۷۴۲ھ (۲۱ اکتوبر ۱۳۴۱ء) کو دولت آباد کے راستے سے معبر کی طرف روانہ ہو گیا۔[26] سلطان جب دہلی سے روانہ ہوا تو وہاں قحط سالی تھی اور شاید اسی وجہ سے اس نے اپنے ساتھ کافی رقم نہیں لی جتنی اس مہم کے لیے ضروری تھی اور اسے جنوبی مستقر میں پہنچ کر مہاراشٹر کے صوبہ پر بھاری محصول لگانا پڑا۔ سلطان ورنگل ہو کر معبر جانا چاہتا تھا مگر وہاں وبا پھیلی ہوئی تھی اور خود سلطان بھی بیمار ہو گیا اور مجبوراً دولت آباد واپس آیا اور اپنی جگہ نائب وزیر ملک مقبول کو وہاں مقرر کر دیا۔[27]

مدورا کی بغاوت کے بعد ہی ورنگل بھی آزاد ہو گیا اور تقریباً اسی زمانے میں وجے نگر کی سلطنت

کے قیام کا پہلا قدم اٹھایا گیا۔ گرشاسپ کی بغاوت نے کمپلی کا بھی خاتمہ کردیا تھا اور اس کا علاقہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا لیکن نائب وزیر مقبول کو مقامی ہندو امرا کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے ایک یعنی کرشن نایک یا کنیا نایک نے دہلی کی سلطنت کے زوال کی علامت دیکھ لی اور ملک مقبول کو ورنگل سے مار بھگایا۔[25] پھر اُس نے ایک نمایندہ بلل دیو کے پاس بھیجا جو اس وقت ہمپی میں تھا اور ہمپی نے ہندوراج کے مستقر کی حیثیت سے کمپلی کی جگہ لے لی تھی[26] اس سلسلہ میں جن رئیسوں نے شاہی افواج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا یعنی کرشن نایک یا کنیا نایک اور بلل دیو اور سب سے بڑھ کر ہری ہر جس نے وجے نگر کی جنوبی سلطنت کے بانی اور اس کے پہلے حکمران کی حیثیت سے ناموری حاصل کی اُن میں ایک نمایاں شخصیت کو ملحوظ رکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ہری ہر دراصل ابتدا میں تغلق کی حامی جماعت سے تعلق رکھتا تھا اس لیے کہ اُسے سلطان نے ۱۳۲۷ء اور ۱۳۴۲ء کے درمیان پردا پچھنا سمدر پتی کے خطاب کے ساتھ بلاری اور کرشنا تنگ بھدرا دوآبہ کے ایک حصّہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور اس کی حکومت میں ساحل سمندر بھی شامل تھا لیکن اس وقت وہ بجائے پورے اعزاز کے صرف ہری اپا ودیا کے کمتر اعزاز پر قانع تھا اور یقینی طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ "دہلی کی بالادستی کو تسلیم کرتا تھا"۔ اب ان تینوں رئیسوں کی متحدہ افواج دوار سمدر کے صوبہ اور مشرقی دکھن کے صوبہ کارومنڈل کو تقریباً بعید جنوب تک فتح کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور تغلق کی ماتحتی کا جوا اتار پھینکا جس سے سیاسی اقتدار کا ایک نیا نظام ظہور میں آیا اور سلطان کے قبضہ میں مہاندی کے جنوب میں صرف تھوڑا سا علاقہ باقی رہ گیا جس کا مرکز دولت آباد تھا۔

خاص دکھن کی باری اس کے بعد آئی اگرچہ آزاد حکومت قائم کرنے کی پہلی کوشش ناکام ہوئی۔ ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں جب شہاب سلطانی نصرت خاں گورنر بیدر نے ایک لاکھ ٹنکہ کا مقررہ خراج سلطان کے خزانہ میں نہیں داخل کیا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تو دولت آباد کے نائب سلطنت قتلغ خاں نے اُسے شکست دے دی اور گرفتار کرکے دہلی روانہ کر دیا۔[29] دکھن کی دوسری شورش ۷۴۰ھ (۱۳۴۰ء) میں علی شاہ کی بغاوت تھی[30] علی شاہ نتھو[31] سلطان علاء الدین خلجی کے نائب عارض الممالک ملک ہزبر الدین ظفر خاں کا بھتیجا تھا۔ اُسے نائب سلطنت [illegible] نے محاصل کی وصولی کے لیے گلبرگہ بھیجا تھا مگر اس نے احکام کی تعمیل کے بجائے دہر در میں علاء الدین ملک شاہ کے لقب[33] سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ اس کے تین بھائی حسن گنگو، احمد اور محمد بھی مل گئے[34]۔ انھوں نے ایک ہندو بادشاہی افسر مسمی بھیرون کو قتل کر دیا[35]۔ جو سلطان کے معتمد علیہ افسروں میں تھا

اور آگے بڑھ کر ساگر اور بیدر کے قلعوں پر قبضہ کر لیا لیکن اس کے بعد پانسہ پلٹ گیا۔ قتلغ خاں نے ملک شاہ کو دھرور میں شکست دے کر بیدر سے مار بھگایا اور اسے گرفتار کر کے سلطان کے مستقر سورگ دواری بھیج دیا۔ سلطان نے اس کے آبائی وطن غزنی میں جلاوطن کر دیا۔[۳۴]

اس طرح تغلق خاں کو ان پچھلی دو بغاوتوں کو فرو کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی یعنی نصرت خاں کی اور علی شاہ کی۔ لیکن دکھن کی حصول آزادی کی کوشش اور ساری سلطنت میں جو آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے اُس سے سلطان کو یقین ہو گیا کہ حکومت کے نظام میں کوئی بنیادی خرابی ہے اور یہ کہ پرانے امرا جنھیں اس نے دہلی سے سلطنت کے دور دراز حصے میں امن قائم رکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہی دراصل خاص مجرم تھے۔ یہی امرا دکھن کے تمام فسادات کے ذمہ دار تھے اور مدورا کی علیحدگی اور نصرت خاں اور علی شاہ کی بغاوتیں اس کی شہادت تھیں۔ خود سلطان کی دکھن میں موجودگی معبر کی بغاوت کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور کمپیل کے سید احسن کو دور دراز مدورا میں ایک وفادار خاندان کی پناہ مل گئی اور ورنگل اور کرناٹک بھی سلطنت سے الگ ہو گئے۔ ان تمام باتوں پر غور کر کے سلطان نے ایک ترکیب نکالی جو اپنے وقت سے بہت پہلے تھی اور اس کے علامتی سکہ کے اجرا اور دوسری اصلاحات کی طرح ہندوستان کے لیے قبل از وقت تھی۔ اس نے قدیم امرا کی جگہ کمتر درجہ کے نئے امرا کو مقرر کیا جو خود سلطان کے ساختہ و پرداختہ تھے اور بالکل اُس کے قابو میں تھے۔[۳۵] لیکن سلطان کو قدیم امرا کے اثرات کا اندازہ نہیں ہوا جو اتنی مدت سے حکومت کے نظام میں بحیثیت محصّل خراج اور فوجی کمان دار کے امیرانِ صدہ کی حیثیت سے اپنے اپنے ہزاری اور صدی حلقوں میں تقریباً آزاد رہے تھے، خصوصاً گجرات اور دکھن کے دُور دراز صوبوں میں۔ ان اُمرا نے اپنی جان اور اپنی عزت کے تحفّظ سے فکرمند ہو کر کامیاب انقلاب برپا کیا اور ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں ایک آزاد حکومت دکھن میں قائم کر لی۔

نئی سلطنت کا ظہور

اس انقلاب کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ ۷۴۵ھ (۱۳۴۴ء) کے قریب سلطان کو اطلاع ملی کہ دکھن کے نائب السلطنت تغلق خاں کا ماتحت عملہ بہت غبن کر رہا ہے جس سے اس صوبہ کی آمدنی کروڑوں اور لاکھوں سے گھٹ کر ہزاروں تک رہ گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دارالسلطنت میں ایک پارٹی بن گئی تھی جو سلطان کے سابق استاد سے حسد کرتی تھی جسے دکھن کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا تھا اور محض اپنی قابلیت اور بہترین نظم و نسق کی بنا پر سلطنت میں دوسرے درجہ کی شخصیت کا اعزاز حاصل کر لیا تھا

اس پارٹی نے سلطان پر اپنا اثر قائم کیا اور اُسے اس پر آمادہ کیا کہ اس پُرانے آدمی کو دکھن سے واپس بُلا لیا جائے لیکن چونکہ یہ بچپن میں سلطان کا استاد رہ چکا تھا اس لیے ادب کے لحاظ سے سلطان نے اُس کی طلبی کے لیے ایک خاص پیام بر بدر حاج کو بھیجا اور یہ کہلا بھیجا کہ خلیفہ بغداد نے جو خلعت سلطان کو بھیجی ہے اُسے دیکھنے کے لیے وہ دہلی آجائے۔ بدر حاج یکم شعبان ۷۴۵ھ (۸ دسمبر ۱۳۴۴ء) کو دہلی سے روانہ ہو کر تقریباً وسط رمضان میں دولت آباد پہنچا۔[۳۹] دکھن کے لوگ قتلغ خاں کی بڑی عزت کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اس "نیک دل" خان کی روانگی پر وہاں کے لوگ چیخ چیخ کر رو دئیے، حتیٰ کہ دیواروں سے بھی یہ صدا آئی کہ "دکھن میں جتنی خوبی تھی وہ سب رخصت ہو گئی"۔[۴۰] چونکہ نئے نائب السلطنت کو دولت آباد پہنچنے میں کئی ہفتے لگتے اس لیے سلطان نے حکم دیا کہ قتلغ خاں کا بھائی مولانا نظام الدین (عالم الملک) گجرات سے جا کر عارضی طور پر نائب السلطنت کا عہدہ سنبھال لے۔ اس اثنا میں سلطان نے دکھن کو چار شق میں تقسیم کیا اور انھیں علی الترتیب ملک سر دعوت دار، ملک مخلص الملک، یوسف بغرہ اور عزیز الدین خمار کے سپرد کیا۔ سر بریلطانی عماد الملک کو ایک ہندو دھرا کی نیابت کے ساتھ دکھن کا نائب سلطنت مقرر کیا۔ یہ تمام حکام نیچے کے درجے سے بڑھے تھے اور شاید سب نو مسلم تھے اور دو ایک دھرا کی طرح ہندو۔[۴۱] ممکن ہے کہ جیسا برنی نے لکھا ہے: یہ "نو دولتے" رہے ہوں لیکن انتظامی امور میں کافی تجربہ کار تھے۔ مثلاً عزیز الدین امروہہ میں حاکم رہ چکا تھا اور ان "نو دولتوں" میں سے کئی ایک مقامات پر سرکاری عہدوں پر مامور رہ چکا تھا۔[۴۲]

بہر حال جو صورت بھی ہو یہ حکام ان حکام سے زیادہ غیر ذمہ دار تھے جن کی جگہ یہ رکھے گئے تھے۔

اس غیر ذمہ داری کا پہلا ثبوت گجرات سے آیا جو آخر ۷۴۵ھ (۱۳۴۷ء) سے عزیز خمار کی سپردگی میں تھا۔ سلطان نے قطعی حکم دیا تھا کہ جن امیران صدہ نے سلطنت سے بغاوت کی سازش میں شرکت کی تھی انھیں معاف نہ کیا جائے۔ عزیز جسے برنی "حرامی"[۴۳] کہتا ہے جب اپنے علاقہ کے مستقر دھار میں پہنچا[۴۴] تو اس نے اناسی مقامی اُمرا کو طلب کیا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ جنوب میں جتنی بغاوتیں ہوئیں وہ سب دیو گیر کے اُمرا کی وجہ سے ہوئیں اور بظاہر لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ان سب کو قتل کرا دیا لیکن اس کا نتیجہ اس کارروائی کرنے والے کی توقع کے خلاف ہوا اور گجرات، دولت آباد اور ملحقہ علاقوں کے تمام اُمرا کو اس نظام حکومت سے شدید نفرت اور عناد ہو گیا جس کے ماتحت دوسروں کے قصوروں کی بنا پر بے قصور [illegible] جائے۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد جب ۷۴۶ھ (۱۳۴۴ء)[۴۵] میں [illegible] مقبل جو احمد [illegible] کا غلام [illegible]

بحیثیت گورنر گجرات کے دابھوئی پر یا تو گجرات میں چار امرا یعنی مبارک جور، قاضی جلال، جلال بن لالہ اور جبّو افغان کی قیادت میں [۴۴] بغاوت ہوگئی اور ملک مقبل کو نہروالہ پر پسپا ہونا پڑا۔ باغیوں کو اتنی کامیابی ہوئی کہ انھوں نے کمبایت کی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا اور عزیز خمار کو بڑودہ میں قتل کردیا۔ سلطان کو مجبوراً بذات خود گجرات کا رخ کرنا پڑا۔ لیکن اس کی روانگی سے پیشتر تغلق خاں نے جو دربار میں حاضر تھا یہ رائے ظاہر کی کہ ذرا ذرا سے ہنگاموں کو فرو کرنے کے لیے دور دراز مقامات پر اعلیٰ حضرت کا بذاتِ خود جانا خلاف شان ہے اور یہ التجا کی کہ بجائے اس کے خود تغلق خاں کو شہاب سلطانی اور علی شاہ کے ساتھ جو دونوں پھر شاہی نوازشات سے سرفراز ہوگئے تھے اس مہم پر بھیجا جائے[۴۵] لیکن سلطان نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور دہلی میں ملک فیروز (جو بعد کو فیروز شاہ کے لقب سے دہلی کے تخت پر بیٹھا)، خواجہ جہان احمد ایاز اور ملک کبیر کی ایک مجلس ولایت قائم کرکے ۲۵ یا ۲۶ رمضان ۷۴۵ھ (۳۱ جنوری ۱۳۴۵ء) کو دہلی سے روانہ ہوگیا جہاں پھر اُسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا[۴۶]۔

کوہ آبو پہنچ کر سلطان نے باغیوں کے خلاف جو دابھوئی اور بڑودہ میں قلعہ بند تھے ایک فوج روانہ کی۔ باغیوں کو شکست ہوئی اور وہ دیوگیر کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہوئے۔ سلطان کوہ آبو سے آگے بڑھا اور شروع ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں بھڑوچ پہنچ کر ملک مقبول کو دہلی کی ایک فوج کے ساتھ باغیوں کے تعاقب پر روانہ کیا جنھیں نربدا پر شکست ہوئی۔ بیشتر امرا نے یا تو گجرات میں سلیر اور منیر کے ہندو مقدم مہادیو کے یہاں پناہ لی یا دولت آباد بھاگ گئے اور بھڑوچ کے قرب و جوار کے امرا جن کی غداری ثابت ہوگئی تھی انھیں ملک مقبول نے پکڑ کر قتل کردیا[۴۷]۔ اب سلطان نے گجراتیوں پر سختی کی۔ اور مالگزاری جو بہت دنوں سے باقی تھی وصول کرنا شروع کیا۔ اُس نے اپنے دو سب سے زیادہ معتمدین[۴۸] درباریوں زین بندہ مجد الملک اور رکن تھانیسری[۴۹] کے لڑکے کو بطور تفتیش کنندہ کے دولت آباد روانہ کیا تاکہ یہ معلوم کریں کہ گجرات کی بغاوت میں کون امرا ملوث تھے۔ یہ دونوں حکام اپنی سنگ دلی کے لیے اتنے بدنام تھے کہ ان کی آمد پر دولت آباد میں سخت ہنگامہ برپا ہوا اور سلطان کو ان کی جگہ امیر خسرو کے لڑکے ملک احمد لاجین[۵۰] اور ملک احمد سرجمدار کو بھیجنا پڑا جو قلتاش کے لقب سے مشہور تھا۔ انھیں ہدایت کی گئی کہ سلطان کے احکام عالم الملک کو پہنچادیں جو اب تک دکھن کے نائب السلطنت کے عہدے پر کام کر رہا تھا کہ ۱۵۰۰ منتخب سواروں کا انتظام کرکے ان کے ساتھ دولت آباد کے امرا کو بھڑوچ بھیجے۔ نائب السلطنت نے سلطان کے احکام کی تعمیل کی کوشش کی اور رائچور، مدگل، گلبرگہ، بیجاپور، لجوتی، برار اور دوسرے مقامات سے امیران صدہ کو دولت آباد میں طلب کیا کہ فوج کے ساتھ گجرات جائیں۔ امرا کو محسوس ہوگیا کہ سلطان کا کیا ارادہ

ہے اور قصداً بہت سست رفتاری کی حتیٰ کہ عالم الملک نے اُمرا کا انتظار کیے بغیر پندرہ سو کا رسالہ روانہ کر دیا۔ عالم الملک نے بڑی کوشش سے ناصر الدین تغلچی، حسام الدین، اسماعیل مُخ، حسن گنگو اور نور الدین جیسے ممتاز امرا کو دولت آباد میں جمع کیا۔[52]

یہ قافلہ بھڑوچ کی طرف روانہ ہوا لیکن صرف پانچ فرسخ کا راستہ طے کیا تھا کہ رات ہو گئی اور یہ گجج اور دونوں شہروں کے درمیان[53] مانک دون درہ پر ٹھہر گئے اور رات کی تاریکی میں انھوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ اگر وہ بھڑوچ گئے تو سلطان یقیناً انھیں قتل کر دے گا۔ چنانچہ دوسرے دن انھوں نے ملک احمد لاچین اور قلتاش کو قتل کر دیا اور واپس ہو کر اسی دن شام کو دولت آباد پہنچ گئے جس وقت یہ پہنچے اس وقت عالم الملک سو رہا تھا اور یہ خبر سن کر سخت پریشان ہوا مگر وہ بے بس تھا اور باغی پہلے غلہ کے ذخیرہ پر اور پھر دھارا گیر کے خزانے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور بالآخر تین دن کی مسلسل جنگ کے بعد شاہی محل اور قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔[54] اب انھوں نے تاریخ کا ایک نیا سنگ میل قائم کر دیا کہ اپنی جماعت سے اسماعیل مُخ کو دکھن کے پہلے خود مختار سلطان کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔[55]

ابوالفتح ناصر الدین اسماعیل شاہ

جمادی الاول ۷۴۶ھ (ستمبر ۱۳۴۶ء) لغایت ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ (۲ ستمبر ۱۳۴۷ء)۔[56]

دکھنی اُمرا نے سلطان کے خلاف مہم میں قیادت کے لیے ایک بادشاہ کو منتخب کر کے بڑی دور اندیشی کی۔ وہ ان بغاوتوں کے انجام سے واقف تھے جو واضح اعلان آزادی کے بغیر آسانی سے دبا دی گئیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہی بغاوت کامیاب ہو سکتی ہے جس کا ایک عام طور پر متفقہ منتخب کیا ہوا امیر ہو۔ اسماعیل مُخ کا انتخاب کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا۔ وہ دکھن کا ایک سربرآوردہ امیر تھا جس کے انتظام میں ۲۰۰۰ گاؤں تھے اور چونکہ اس کا بڑا بھائی ملک یل افغان[57] سلطان محمد بن تغلق کے "ممتاز ترین اُمرا" میں تھا اور اس وقت مالوا میں افواج سلطانی کا سپہ سالار تھا اس لیے بوقت ضرورت اس طرف سے مدد ملنے کا پورا یقین تھا۔[58]

کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہی کا تاج اسماعیل کو پیش کیا گیا تو پہلے اس نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ "حسن گنگو کو تخت پر بٹھانا چاہیے اس لیے کہ علاوہ اُس کی وسیع جاگیر کے وہ بہمن کے خاندان سے ہے" مگر اس خیال سے کہ گنگو کو کہیں اور کام کی ضرورت ہوگی اور ممکن ہے کہ دشمن سے فوراً ہی مقابلہ کرنا پڑے اس لیے اسماعیل ہی کو بادشاہ بنایا گیا۔[59] بہر نوع اسماعیل تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اُس نے نور الدین کو خواجہ جہاں کا خطاب دیا اور حسن گنگو کو ظفر خاں اور امیر الامرا کا۔[60]

نئی سلطنت نہ صرف دکھن کے اُمرا کا مرکز بن گئی بلکہ گجرات کے بڑودہ اور دابھوئی کے اُمرا کی اور نئے بادشاہ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ مہاراشٹر میں جاگیروں اور اقطاع کو نئے حکام میں تقسیم کر دیا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا گجرات کے بعض اُمرا نے سلیر اور منیر کے مقدم مان دیو کے علاقے میں پناہ لی تھی۔ نئے بادشاہ نے حکومت سنبھالتے ہی یہ تدبیر کی کہ یہ امرا کہیں سلطان کے ہاتھ نہ لگ جائیں اور مان دیو کو مجبور کیا کہ وہ انھیں دولت آباد بھیج دے۔ اُس نے اس جماعت کے لیڈر قاضی جلال کو قدر خاں کا خطاب دیا اور دربار میں اُسے ممتاز عہدہ پر مقرر کر دیا۔[۹۵]

ناصر الدین کے تخت نشین ہونے کے ایک یا دو ماہ بعد خواجہ جہاں نور الدین کو گلبرگہ جانا پڑا جہاں ایک مقامی رئیس مسمی کندھرا نے کئی مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا جن میں درویش شیخ زماں عز الدین بھی شامل تھے۔[۹۶] خواجہ جہاں نے گلبرگہ میں کندھرا کا محاصرہ کیا اور اس کی فوجوں کو شکست دے دی۔ لیکن کندھرا بڑا چالاک تھا اور اس نے جلال دوہانی کو جو شاید سلطان محمد تغلق کی طرف سے کلیانی کا حاکم تھا۔ یہ خط لکھا کہ وہ فریقین کے دشمن کے ہاتھوں میں عملاً قید کی حالت میں ہے اور اس سے مدد مانگی۔ جب دولت آباد میں فوجی سالاروں نے یہ خبر سُنی تو انھوں نے بھی خواجہ جہاں کی مدد کے لیے حسین ستیا کو گلبرگہ بھیج دیا۔ حسین نے جلال دوہانی کو شکست دے دی اور اسے میدان جنگ میں قتل کر دیا لیکن اس سے قضیہ ختم نہیں ہوا اس لیے کہ کندھرا اس وقت غیر مفتوحہ گلبرگہ میں قید تھا اور سلطان کی فوجوں کا کلیانی اور نیز ساگر پر قبضہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں ظفر خاں نے خواب دیکھا کہ اُسے اپنے رفیقوں کی مدد کے لیے گلبرگہ جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ تیزی کے ساتھ پہلے ساگر گیا اور وہاں سلطان کی فوجوں کو شکست دے کر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔[۹۷] اس بازو کے حملہ کی تکمیل کر کے وہ گلبرگہ کی طرف بڑھا جس کا تقریباً چار ماہ سے محاصرہ تھا اور وہاں محاصرین سے مل گیا۔[۹۸]

اس اثنا میں اس اندیشہ سے کہ سلطان کی فوجیں خود دولت آباد پر حملہ نہ کر دیں اسماعیل شاہ نے شہاب جلال کو گلبرگہ کی انقلابی فوجوں کے نام یہ پیام دے کر بھیجا کہ فوج کا ایک حصہ فوراً مستقر کو بھیج دیا جائے۔[۹۹] اس پر محاصرہ کرنے والی فوجوں میں دو رائیں ہو گئیں۔ ایک کا خیال تھا کہ بادشاہ کے حکم کی تکمیل کی جائے اور دوسری جماعت جس میں خود ظفر خاں بھی تھا یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اور طرف توجہ کر کے خود کو کمزور کیا جائے۔ شام کو ظفر خاں نے فوجی کمان داروں کے سامنے ایک پُرجوش تقریر کی۔ اور اتحاد کے مقصد پر زور دیا۔ اور کہا کہ دولت آباد کی حکومت خود اپنی حفاظت کی خاطر انھیں دشمنوں کے ہاتھ میں دے دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ سب کو عزم مصمم پر قائم ہو جانا چاہیے۔ اس پر فوج نے دولت آباد کے احکام کی تعمیل نہیں کی جب تک کہ انھوں نے گلبرگہ پر قبضہ کر کے کندھرا کو مار نہ بھگایا۔[۱۰۰] ظفر خاں اپنا مقصد پورا کر کے فاتحانہ دولت آباد واپس آیا۔

دکھن کی خودمختاری بغاوت کو فرو کرنے میں شاہی افواج کی متواتر ناکامی اور دولت آباد حکومت کے روز افزوں تقویت نے سلطان محمد تغلق کو سخت فکرمند کر دیا اور کہا جاتا ہے کہ ایک رات کو وہ انتہائی پریشانی میں سربسجود ہو کر اللہ تعالےٰ سے دعا کرنے لگا کہ اگر اُسے دولت آباد کے باغیوں پر فتح حاصل ہو جائے تو وہ اپنے لوگوں کے قتل کے رجحان سے تایب ہو جائے گا۔ تازہ ترین خبروں کی بنیاد پر سلطان نے بذات خود میدان جنگ میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ عماد الملک سرتیز اور ملک یل افغان اس کے ساتھ ہوئے شاید یہی وقت تھا جب اسماعیل شاہ نے گلبرگہ پیام بھیج کر یہ حکم دیا کہ دکھنی فوج کا ایک حصّہ دولت آباد بھیج دیا جائے۔ دولت آباد پہنچ کر سلطان نے فوراً اسماعیل شاہ پر حملہ کر دیا جس کے پاس افغانوں، مغلوں، راجپوتوں اور دکھنیوں کی ۳۰۰۰۰ ہزار سپاہ تھی اور جسے ظفر خاں کی ماتحتی میں گلبرگہ سے فوج آجانے کی وجہ سے اور تقویت ہو گئی تھی۔ محمد بن تغلق نے جنگ کے لیے اپنی فوج کی صف بندی کی۔ قلب کی کمانداری تاتار خاں کو دی گئی، میمنہ کی قیادت سلطان نے بذات خود کی اور میسرہ پر ملک مقبول کو مامور کیا۔ سلطان کے مقابلہ میں ظفر خاں، حسام الدین، نصرت خاں اور صفدر خاں تھے اور قلب کی کمان خود اسماعیل شاہ کے ہاتھ میں تھی جس کے ساتھ اس کا لڑکا خضر خاں، خان جہان نورالدین خاں، خاتم خاں، اسکندر خاں اور حشمت خاں تھے اور میمنہ کی کمان گجراتی امرا قدر خاں اور مبارک خاں کے ہاتھ میں تھی۔ جنگ میں دکھنی فوج کی فتح میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی کہ اسماعیل شاہ کی قلب کی کمان میں خان جہان نورالدین ایک تیر سے گھایل ہو کر فوت ہو گیا اور دکھنی شاہی حفاظتی دستہ جس میں ۶۰۰۰ سوار تھے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اسماعیل کا سلطان کی فوج کے قلب پر بھرپور حملہ اور میسرہ کی طرف سے ظفر خاں کے حملہ سے بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور جب ظفر خاں نے سلطان کے خزانے پر جی توڑ حملہ کیا تو اُسے بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا اور بڑی مشکل سے وہ اپنی فوج کے کچھ حصّہ کو بچا سکا۔ ان کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ سلطان کے ہاتھیوں نے دکھن کی فوج کو کچل ڈالا اور اسماعیل شاہ کے ہزاروں طرفدار میدان جنگ میں کام آئے ؁۵۱

سلطان کی فوج کی قوت دیکھ کر اور یہ اچھی طرح محسوس کر کے آیندہ کسی جنگ میں جم کر لڑنے میں کامیابی حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے دکھن کے لیڈروں نے ایک نئی تدبیر جنگ اختیار کی۔ قتل عام ختم ہونے پر انھوں نے رات کی تاریکی میں جمع ہو کر باہم مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ اسماعیل شاہ جب تک ممکن ہو سکے دولت آباد پر قبضہ رکھے اور باقی امرا اپنی اپنی جاگیروں پر چلے جائیں اور سلطان کی فوجوں سے اُن کی حفاظت کریں۔ سلطان کوئی فیصلہ کن ضرب نہ لگا سکے گا اور کوئی قطعی کامیابی حاصل کرنے میں اُس کی

دوسری طرف کی مصروفیتیں حایل ہوں گی۔ پچھلی شکست کے بعد اسماعیل کو اپنی جگہ پر قائم رہنا مشکل معلوم ہوا اور وہ دھراگھیر کے قلعے میں چلا گیا[۵۵] جہاں رسد کا سامان جمع تھا اور طویل محاصرہ کی تیاری کرلی۔

دوسرے دن سلطان نے دولت آباد پر قبضہ کرلیا جو بالکل غیر محفوظ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب اس نے خیال کیا کہ پچھلے چند برسوں میں جو کچھ کھویا گیا تھا وہ سب واپس مل گیا اور اللہ تعالے سے بھڑوچ میں اس نے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرنے کے لیے اُس نے تمام سیاسی قیدیوں کی آزادی کا اعلان کردیا۔ دولت آباد پر قبضہ کرکے وہ اتنا خوش ہوا کہ وہاں اقامت اختیار کرکے اُس نے دہلی میں مجلس ولایت کو اطلاع دینے کے لیے ایک خاص وفد بھیجا اور مجلس نے جواب میں مورخ برنی کو پیام تہنیت کے ساتھ دولت آباد بھیجا[۵۹]۔ لیکن یہ تہنیتی نامہ و پیام نامبارک ثابت ہوا اس لیے کہ دولت آباد میں قیام کے دو ہی ماہ بعد[۶۰] سلطان کو تغی کی بغاوت فرو کرنے کے لیے گجرات روانہ ہونا پڑا۔ اس نے دھراگھیرہ کا محاصرہ خداوندزادہ ملک جوہر اور شیخ برہان الدین بلارامی کو سپرد کرکے سرتیز کو ظفر خاں کے کلبرگہ اور دوسرے مقامات پر مقابلہ کرنے کی ہدایت کی[۶۱]۔

اسماعیل شاہ بلا کسی راہ فرار کے دھراگھیرہ میں مقید تھا اور اس کے ماتحت کی ساری فوج بے درد ملک جوہر کے ہاتھوں تقریباً قید کی حالت میں تھی۔ ملک جوہر نے جنگ کے قیدیوں کو قتل کرنا اور دولت آباد کے باشندوں پر بے طرح ظلم کرنا شروع کیا[۶۲]۔ سابقہ انتظام کے مطابق ظفر خاں گلبرگہ سے براہ راست اپنی جاگیر میراج کو چلا گیا[۶۳] اور وہاں سے ارکہ جاکر اگلی جنگ کی تیاری کے لیے تین ماہ مقیم رہا اور دعا کرتا رہا کہ "اللہ تعالے لوگوں کو تغلق کے ظلم سے نجات دے"۔ ارکہ سے وہ ساگر گیا جہاں کمان دار اسکندر خاں اور بارنی کے دوسرے سردار اُس سے مل گئے[۶۴]۔ وہ ساگر ہی میں تھے جب انھوں نے سُنا کہ عماد الملک سرتیز نے گلبرگہ پر قبضہ کرلیا۔ ظفر خاں نے مجلس جنگ منعقد کی اور طے کیا کہ جوہر کو شکست دینے کے لیے فوراً دولت آباد پر چڑھائی کی جائے اور پھر سرتیز جہاں بھی ملے اس کا صفایا کیا جائے۔ جب سرتیز نے سُنا کہ ظفر خاں نے دولت آباد کا رُخ کیا ہے اور وہاں وہ تیزی سے پہنچنا چاہتا ہے تو وہ گلبرگہ سے دولت آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔ ظفر خاں نے بلا کسی دقت کے گوداوری کو عبور کیا لیکن دولت آباد میں اُسے غنیم کے ہراول دستے سے مقابلہ کرنا پڑا جسے شکست دے کر وہ بیڑ کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کرلیا[۶۵]۔ بیڑ سے وہ گوداوری کی طرف واپس آیا اور مہو کے غلہ کے ذخیرے پر قبضہ کرلیا۔ یہاں اس نے سُنا کہ سرتیز سندتان میں ہے جس پر ظفر خاں نے فوراً اپنا راستہ بدل دیا اور سندتان کی طرف بڑھا جہاں اسے سرتیز ایک بھاری فوج کے ساتھ ملا ظفر خاں کی فوج میں تلنگانہ کے رائے کا بھیجا ہوا پندرہ سو سپاہ کا رسالہ مل گیا اور اس نے چند ابتدائی جھڑپوں کے

بعد دہلی کی فوج پر حملہ کیا اور اسے پورے طور پر شکست دے دی۔[55] سر تیز جو ایک تیر سے زخمی ہو گیا تھا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُسے ایک سپاہی نے پہچان کر پکڑ لیا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ اب ساری فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ "باختر کے اونٹ، تاتار کے گھوڑے، باندیاں اور حبشی غلام ہزاروں کی تعداد میں اور منوں سونا چاندی، سیکڑوں خیمے" اور بے شمار مال غنیمت ظفر خاں کے ہاتھ لگا۔[56] اب سارا میدان دکھن کی فوج کے پیروں تلے تھا۔ ظفر خاں کا اسماعیل شاہ نے دولت آباد سے تقریباً دس میل نظام پور کے مقام پر "شایاں شان" تزک و احتشام سے استقبال کیا۔[57] اسماعیل کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ظفر خاں نے اپنی ماہرانہ جنگی چالوں سے بڑی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور ظفر خاں کی واپسی کے دو ہفتہ بعد اُس نے امرا کو جمع کیا[58] اور اُن سے کہا کہ در اصل اُس نے حکومت ظفر خاں کی امانت کے طور پر اس وقت تک اپنے ہاتھ میں رکھی اور تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا اور خود اپنی زندگی بھر کے لیے صرف شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔[59] اب چونکہ دکھن کا تخت سلطنت خالی تھا اس لیے فوج اور عوام الناس نے بالاتفاق ظفر خاں کو سکندر ثانی علاء الدین حسن بہمن شاہ الولی[60] کے لقب سے بالاتفاق بادشاہ منتخب کر لیا۔ نئے بادشاہ نے اس موقعہ پر مبارک ساعت صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد بدخشانی سے نہیں بلکہ ہندو منجمین کے حساب سے قبول کی اور جمعہ ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ / ۳ اگست ۱۳۴۷ء[61] کو دولت آباد کی مسجد قطب الدین مبارکؒ خلجی میں اپنے پیر شیخ سراج الدین جنیدی کے ہاتھوں تاج شاہی زیب سر کیا۔

تشریحات

۱ - دیوگیر بعد کا دولت آباد ضلع اورنگ آباد ریاست مہاراشٹر میں ایک پہاڑی قلعہ، ۱۹ر۵۷ درجہ شمال، ۱۳ درجہ مشرق - بودھن ریاست حیدرآباد کے ضلع نظام آباد میں ایک قلعہ، ۱۸ر۵۳ شمال، ۷۷ر۱۲ مشرق - قندہار ریاست حیدرآباد کے ضلع ناندیڑ میں ایک قلعہ، ۱۸ر۵۳ شمال، ۷۷ر۱۲ مشرق - ان دو مقامات کے کتبات کے متعلق دیکھو ایپی گرافیا انڈو مسلیمیکا ۲۰ - ۱۹۱۹ء صفحات ۱۵ و ۲۰ -

۲ - انتظام حکومت کے متعلق دیکھو قریشی کی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیت آف دہلی، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، نیز ذیل میں محمد اوّل اور محمد دوم کے حالات کے باب -

۳ - برنی صفحہ ۴۶۸ -

۴ - اس سوال پر کہ آیا دارالسلطنت پورے طور پر دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا گیا تھا یا دولت آباد صرف سلطنت کا دوسرا مستقر تھا، ڈاکٹر مہدی حسین نے اپنی کتاب دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق مطبوعہ لنڈن ۱۹۳۸ء کے صفحات ۱۰۸ و مابعد میں مفصل بحث کی ہے - اُن کی رائے بظاہر بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ دہلی اور دور دراز کے صوبہ جات دکھن میں جو طویل فاصلہ تھا اُس کے پیشِ نظر صرف مسلم آبادی کے عمائد کو دہلی سے منتقل کیا گیا تھا - نیز دیکھو جی براون کا مضمون سم فیوچرز آف دی کریکٹر اینڈ پالیسی آف محمد بن تغلق، جرنل آف یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی بابتہ جون ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۲ -

۵ - برنی صفحہ ۴۶۸ - قصر ہزار ستون اس لیے کہ دیوان عام میں بہت سے ستون تھے -

۶ - برنی صفحہ ۵۰۱ - ابن بطوطہ، ٹراویلز ان ایشیا اینڈ افریقہ، مترجمہ گبسی مطبوعہ لنڈن ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۱۲ - محمد بن تغلق کے ماتحت نظام حکومت کی پوری تفصیل مہدی حسین نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۴ میں دی ہے جسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے - تغلق کے ماتحت صوبہ جات کی مکمل فہرست کے لیے دیکھو العمری کی مسالک الابصار ترجمہ آٹو سپنسر، مسلم یونیورسٹی جرنل مارچ ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۲ - اصل مسودہ پیرس کے بیبلیو تھیک نیشنل کے نمبر ۵۸۶۹ پر ہے -

۷ - برنی صفحہ ۴۶۹ -

۸ - اسی طرح بیدر شہاب سلطانی نصرت خاں کو سپرد کیا گیا تھا - برنی صفحہ ۴۸۰ -

۹ - اس کی تشریح اور مزید تفصیلات کے لیے دیکھو مہدی حسین کی کتاب صفحات ۲۱۱ و مابعد -

۱۰ - صدی کا مفہوم تقریباً سو ہے جس کے لیے دیکھو اسٹب کی انگلش کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری جلد اوّل صفحات ۱۰۴ و مابعد - ہزاری اور صدی اور ان کے امرا کے بارے میں دیکھو برنی صفحہ ۴۹۵، اور ابن بطوطہ، رحلہ مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۷ھ جلد دوم صفحہ ۵۷ - صدیوں کے مختلف حالات کے لیے دیکھو ایشوری پرشاد کی ہسٹری آف قرونا ٹرکس مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۶ء صفحات ۲۰۹ - ۲۰۸، نوٹ ۵۸ - لیکن مجھے اس کی کوئی سند نہیں مل سکی کہ جیب فاضل مصنف نے لکھا ہے کہ امیر صدہ کے ماتحت سو آدمی ہوتے تھے -

۱۱ - یہ تاریخ بدایونی کی منتخب التواریخ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء صفحہ ۲۲۶ میں ہے - فرشتہ نے گلشن ابراہیمی مطبوعہ لکھنو کے اوّل ایڈیشن کے صفحہ ۱۲۵ پر بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ اس نے دکھن میں علم بغاوت بلند کیا - دیکھو بیگ کی ہسٹری آف دی تغلق ڈائی نسٹی آف دہلی، جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۵۸ -

ساگر کرناٹک ریاست کے ضلع گلبرگہ میں، ۲۷ ر ۱۶ شمال، ۴۸ ر ۷۶ مشرق -

۱۲ - ابن بطوطہ، رحلہ صفحہ ۳۰ -

۱۳ - کمپلی ریاست اندھرا پردیش کے ضلع بلاری میں، ۲۵ ر ۱۵ شمال، ۳۶ ر ۷۶ مشرق - ڈاکٹر ونکٹ رمن نیا کی کتاب کمپلی اینڈ وجے نگر مطبوعہ مدراس ۱۹۲۹ء میں کمپلی کی تاریخ پر بہت اچھا مقالہ ہے - بہادر خاں سے مطلب بہاء الدین گرشاسپ ہے -

۱۴ - ویر بلل سوم ۱۲۹۲ء - ۱۳۴۲ء - ونکٹ رمن نیا کی کتاب وجے نگر، اوریجن آف سٹی اینڈ ایمپایر مطبوعہ مدراس ۱۹۳۳ء، پہلا باب -

۱۵ - ارباب دول کی تشریح کے متعلق دیکھو مہدی حسین کتاب صفحہ ۲۱۹ -

۱۶ - دیوگیر کا نام پہلے دولت آباد نہیں بلکہ قبۃ الاسلام رکھا گیا اور دار الضرب کا یہی نام سکوں پر درج ہے - دیکھو جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۲ء صفحہ ۳۴۰ - نیز مسالک الابصار مذکور صفحہ ۱۸ -

۱۷ - ابن بطوطہ صفحہ ۲۲۷ - اس مسئلہ پر مفصل بحث کے لیے دیکھو مہدی حسین کی کتاب صفحات ۱۱۲ و مابعد -

۱۸ - ابن بطوطہ نے صفحہ ۲۲۷ پر شہر کے تین حصے بتائے ہیں یعنی دولت آباد، دیوگیر اور کٹک - کٹک کا نام عصامی نے بھی صفحہ ۵۹۷ پر دیا ہے - دھراگیرہ کے بارے میں دیکھو برہان صفحہ ۱۴ - ظفر الوالیہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۹ میں صاف لکھا ہے کہ دھراگیر پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا - بدایونی نے صفحہ ۲۳۵ میں لکھا ہے کہ دھراگیرہ دولت آباد کے قلعے کے مرکزی

حصہ کا نام تھا لیکن منتخب التواریخ جلد اوّل صفحہ ۲۳۵ میں اسے دھرانگر کہا گیا ہے

۱۹ - بلاقی، مطلوب الطالبین، مخطوط انڈیا آفس نمبر ۶۵۳ جس کی مہدی حسین نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۱۳ و ۱۱۴ پر نقل کی ہے جہاں یہ لکھا ہے کہ صرف ممتاز اور صحت مند لوگوں کو نقل وطن کا حکم دیا گیا تھا۔ مسالک الابصار جو دارالسلطنت کے منتقل ہونے کے دس سال کے اندر لکھی گئی تھی اس میں دہلی کے اجاڑ ہونے کا مطلق ذکر نہیں ہے۔

۲۰ - عصامی، فتوح السلاطین مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۴۴۳۔ عصامی اس زمانہ کا ہمعصر تھا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اور وہ بحیثیت مجموعی زیادہ قابل اعتماد ہے البتہ شاید محمد بن تغلق کے کردار کے متعلق جس سے اُسے دلی تعصب تھا۔ نیز دیکھو ابن بطوطہ صفحہ ۲۲۷۔ اور مہدی حسن صفحات ۱۱۳ و مابعد۔ عصامی کے مستند ہونے پر اوشا نے جرنل آف اورینٹل ریسرچ مدراس ۳۷-۱۹۳۶ء مقدمہ صفحہ ۲ میں بحث کی ہے۔ میں نے دکھن کی سلطنت کے قیام کے سلسلہ میں عصامی سے استفادہ کیا ہے۔ عصامی کے بارے میں دیکھو ایتھے، فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری نمبر ۸۹۵۔ یہ شاید وہی خواجہ عبدالملک عصامی ہے جس کا اسپرنگر کی وضاحتی فہرست کے صفحہ ۱۰ پر ذکر ہے۔

۲۱ - رحلہ جلد دوم صفحہ ۱۔

۲۲ - رحلہ جلد دوم صفحہ ۶۲۔

۲۳ - برنی صفحہ ۴۸۱۔ مہدی حسن کے صفحہ ۱۰۷ میں ہے کہ "تین سال کے اندر ایک کروڑ"۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ بیدر ریاست کرناٹک میں اسی نام کے ضلع کا مستقر، ۱۷°۵۶′ شمال، ۷۷°۳۲′ مشرق۔

۲۴ - رحلہ جلد دوم صفحہ ۱۹۔ رحلہ کا "قلمبند" عصامی کا گل چند ہے۔ صفحہ ۴۵۱۔

۲۵ - جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۶۲۔ بیڑ ریاست مہاراشٹر میں اسی نام کے ضلع کا مستقر، ۱۸°۵۹′ شمال، ۷۵°۴۶′ مشرق۔

۲۶ - جیسا کہ ہیگ نے جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۲ء کے صفحہ ۳۲۴ پر بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ بدایونی نے صفحہ ۲۳۱ میں یقیناً برنی کی تقلید کی ہے اور مدورا کی سلطنت کے بانی کیتھل کے سید احسن کو دکھن کے پہلے بہمنی بادشاہ سے خلط ملط کر دیا ہے۔ فرشتہ نے بغاوت کی تاریخ میں اور نیز دوسری تاریخوں میں غلطی کی ہے۔ مہدی حسین نے صفحہ ۱۰۵ پر سکوں کی جو تشریح کی ہے اُس سے تاریخ کا تعین ہو جاتا ہے۔ برنی نے صاف لکھا ہے کہ جس وقت معبر کی بغاوت ہوئی اُس وقت سلطان ڈلمؤ اور قنوج کی سرحد پر تھا جس سے ۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء) کا تعین ہوتا ہے۔ پروفیسر گِب نے ابن بطوطہ کا جو ملخص ترجمہ کیا ہے اُس میں تاریخ کا عجیب خلط ملط ہے اور بلا سال کے تعین کے نہم جمادی الثانی کی تاریخ دی گئی ہے اور یہ بدایونی اور فرشتہ کے دیے ہوئے سال یعنی ۷۴۲ھ سے ملا دی گئی ہے اور اس کے مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۳۴۱ء کو سلطان کی جنوب کی طرف روانگی بتائی گئی ہے۔ دراصل معبر کی بغاوت ۹ جمادی الثانی ۷۳۴ھ

(۳ نومبر ۱۳۴۷ء) کو نہیں بلکہ ۷۳۵ھ (۱۳۳۵ء) میں واقع ہوئی جب کہ سید احسن نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے کہ مشہور سنہ دکھن کی فتح سے شروع ہوا تو یہ ممکن ہے کہ مشہور سنہ کو قمری ہجری سنہ سے خلط ملط کر دیا گیا ہو جس سے دس سال کا فرق پیدا ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے۔

مدورا کی سلطنت ۱۳۳۵ء سے ۱۳۷۱ء تک رہی اور پھر وجے نگر میں شامل ہوگئی۔ دیکھو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۱۵۰۔ کارومنڈل ساحل کو معبر کا نام مسلمانوں نے دیا ہے۔

۲۷۔ برنی صفحہ ۴۸۱۔ ملک قبول یا ملک مقبول کی پیدائش اندھرا کی ہے۔ دیکھو شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، ایسٹ اینڈ ڈاوسن جلد سوم صفحہ ۳۶۷۔

۲۸۔ وجے نگر (ہمپی) ریاست اندھرا پردیش کے ضلع بلاری میں، ۲۰ر۱۵ شمال، ۲۸ر۷۶ مشرق۔ فرشتہ صفحہ ۱۳۸، برنی صفحہ ۴۸۴۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ کنیا نایک ورنگل کا آخری کاکتی حکمران پرتاب رودر کا لڑکا تھا۔ "مگر اس کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ہے۔" ونکٹ رمن نیا کی کتاب وجے نگر، اوریجن آف سٹی اینڈ ایمپائر۔ اس کا بیان ہے کہ تلنگانہ میں دو صوبے تھے ایک ملک مقبول کے ماتحت جس کا مستقر ورنگل تھا اور دوسرا نصرت خاں کے ماتحت جس کا مستقر بیدر تھا۔ کرشنا نایک اور کنیا نایک کی مماثلت کے متعلق دیکھو کتاب مذکور ضمیمہ ج صفحہ ۱۱۔ برنی کے نایک اور طبقات کے پایک (صفحہ ۴۰۱) کے تعین میں کوئی وقت نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ فارسی رسم الخط "پ" اور "ن" میں فرق صرف نقطوں کا ہے اور ان کے اوپر یا نیچے ہونے کا اور ہمیں یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ نقطوں کے متعلق سب کاتب محتاط نہ تھے۔ ان نایکوں کی تاریخ کے متعلق دیکھو راما راو کا مضمون فاونڈیشن آف دی ریڈی کنگڈم (روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ الہ آباد ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۴۹)۔

۲۹۔ بلل سوم اور ہمپی کے تعلق کے متعلق دیکھو سری کان تیا کی کتاب فاونڈرس آف وجے نگر مطبوعہ بنگلور ۱۹۳۸ء صفحہ ۷۰ و مابعد۔ ڈاکٹر اینگر کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا جلد دوم کے صفحہ ۴۸۹ میں لکھتے ہیں کہ گرشاسپ کی بغاوت کی ناکامی نے کمپلی کے خاتمہ اور ہمپی کی قلعہ بندی کی نشاندہی کی چنانچہ یہ یقیناً ۱۳۳۶ء میں واقع ہوا ہوگا۔ ایشوری پرشاد نے ہسٹری آف قرونا ترکس کے صفحہ ۱۹۱ میں لکھا ہے کہ یہ بلل سوم نہیں ہو سکتا بلکہ بلل چہارم ہوگا جس کا یہاں ذکر ہے اس لیے کہ بلل سوم کا ۱۳۴۲ء میں انتقال ہو چکا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مورخ نے حکومتوں کی تاریخ میں فرشتہ کی نقل کی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس میں تقریباً دس سال کا فرق ہے۔ دیکھو تشریح نمبر ۲۶ مذکورہ بالا۔ متن میں اقتباسات ایشوری پرشاد کے صفحات ۱۹۲ و ۱۹۹ سے ہیں۔ وجے نگر کی بنیاد پر مختلف نظریات کی بحث صفحات ۱۸۷ و مابعد میں ہے۔ ہری ہر کے حالات کے لیے دیکھو ونکٹ رمن نیا کی کتاب اوریجن صفحہ ۱۲۹۔

۳۰ - فرشتہ صفحہ ۱۲۸، برنی صفحہ ۴۸۸ لیکن نصرت خاں کو اپنے سکے ڈھالنے کا وقت مل گیا۔

۳۱ - جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۳۶۲ پر یہی تاریخیں ہیں۔ بدایونی نے صفحہ ۲۳۳ پر جو ۷۳۶ھ (۱۳۳۶ء) کی تاریخ دی ہے اور بغاوت کرنے والے کا نام علی شیر لکھا ہے یہ غلط ہے۔ حالانکہ وہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ سلطان اس وقت تک سورگ دواری میں تھا حالانکہ وہ وہاں سے ۷۴۰ھ (۱۳۴۰ء) میں روانہ ہو چکا تھا۔ قبل ازیں کہ ہیگ نے تاریخوں کی تصحیح پر کام شروع کیا ابن بطوطہ کی رحلہ کے اردو مترجم محمد حسین نے ان واقعات کی تاریخوں پر مفصل بحث کی تھی۔ دیکھو محمد حسین کی عجایب الاسفار مطبوعہ دہلی ۱۸۹۸ء صفحات ۱۸۶ و مابعد۔ اس واقعہ کا ذکر رحلہ جلد سوم کے صفحہ ۶۷ پر اور برنی کے صفحہ ۴۸۸ پر ہے۔ یہ بات کہ علی شاہ حسن گنگو کا بھائی اور ہزبرالدین کا بھتیجا تھا فرشتہ نے صفحہ ۱۳۰ میں لکھی ہے۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اس اختلاف کی وجہ یہ ہو کہ دکھن میں شمسی ہجری سنہ جلد ہی رائج ہو گیا ہو۔ دیکھو نیچے بارہواں باب، تشریح نمبر ۹۲۔

۳۲ - ننھو کا عرف عصامی کے صفحہ ۴۶۳ میں ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ حسن کے خاندانی نام گنگو کا بالکل ہم قافیہ ہے۔ علی شاہ کا مسی سکہ حسب ذیل تھا:

اوپر کا رخ : علاء الدنیاء الدین

نیچے کا رخ : علی شاہ سلطان

دیکھو راجرس ضمیمہ تھامس کی کتاب کرانیکلس آف پٹھان کنگس آف دہلی۔

۳۳ - یہ عصامی کے صفحہ ۴۶۳ میں ہے لیکن سکوں پر اس کا لقب علی شاہ ہے۔

گلبرگہ : ریاست کرناٹک میں اسی نام کے صوبہ کا مستقر ۱۷ر۲۱ شمال، ۷۶ر۵۱ مشرق۔

۳۴ - عصامی - یہ دلچسپ بات ہے کہ علی شاہ نے اپنی بادشاہی کا اعلان دھرور میں علاء الدین کے لقب سے کیا۔ یہی لقب بعد کو اس کے بھائی نے اختیار کیا جو پہلا بہمنی حکمران تھا۔ یہ دراصل ان کے چچا کے آقا علاء الدین خلجی کے لقب پر تھا۔ اسی طرح ظفر خاں کا لقب جو حسن گنگو نے بادشاہ ہونے کے قبل اختیار کیا تھا وہ اس کے چچا ہزبرالدین ظفر خاں کے لقب کی نقل تھا۔ عصامی نے صفحہ ۴۶۴ میں سارے قبیلہ کو ظفر خانی خلجی ترشاد کہا ہے۔

دھرور، ریاست کرناٹک کے ضلع حیدرآباد میں، ۱۷ر۱۸ شمال، ۷۷ر۴۳ مشرق۔

۳۵ - عصامی صفحہ ۴۶۴۔

۳۶ - برنی صفحہ ۴۸۹۔ سورگ دواری کا شہر گنگا کے کنارے قدیم شہر کھور کی جگہ کے قریب تعمیر ہوا تھا۔ ۲۷ر۳۲ شمال، ۷۹ر۵۵ مشرق۔ یہ غالباً ریاست اترپردیش کے موجودہ شہر فرخ آباد کے قریب ہوگا۔

۳۷- اس مصلحت کا مقابلہ ہم نپولین کے نئی امراکی جماعت بنانے سے کر سکتے ہیں۔ نپولین کے بیش تر جنرل، سفیر اور وزیر نچلے طبقہ کے تھے جو محض اپنی قابلیت کی بنا پر ترقی کر کے کاونٹ، ڈیوک، شہزادے حتیٰ کہ حکمران تک بن گئے۔ اسلامی ممالک کی تاریخ میں یہ بالکل نئی بات نہیں ہے جس میں بکثرت مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ غلام جیسے ادنیٰ ترین درجہ سے ترقی کر کے کامیاب سالار افواج، مدبر اور حکمران بن گئے۔

۳۸- برنی صفحہ ۵۰۱۔

۳۹- بدر چاچ کا نظام تاریخ اس کی دولت آباد سے روانگی کے متعلق، قصاید بدر چاچ، لکھنو ایڈیشن، صفحہ ۴۰۔

۴۰- عصامی صفحہ ۴۸۰۔

۴۱- برنی صفحہ ۵۰۰۔ برنی کا بیان ہے کہ ایک وزارت ایک سابقہ مالی مسمی پیرا کو تفویض کی گئی تھی۔

۴۲- مہدی حسین صفحہ ۱۷۷۔ امروہہ ریاست اتر پردیش کے ضلع مراد آباد میں، ۵۴ ر ۲۷ شمال، ۲۸ ر ۷۸ مشرق۔

۴۳- برنی صفحہ ۵۰۲۔

۴۴- دھار جواب ریاست مدھیہ پردیش میں ہے، ۳۶ ر ۲۲ شمال، ۱۹ ر ۷۵ مشرق۔

۴۵- مذکورہ نظام تاریخ، جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۳۶۴ پر۔

۴۶- یہ نام عصامی کے صفحہ ۴۸۱ میں ہیں۔

۴۷- عصامی صفحہ ۴۸۲۔ بڑودہ اب ریاست مہاراشٹر میں ہے، ۱۸ ر ۲۲ شمال، ۱۵ ر ۷۳ مشرق کھمبایت اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۱۹ ر ۲۲ شمال، ۳۸ ر ۷۲ مشرق۔

۴۸- برنی صفحہ ۵۰۸۔

۴۹- سلطان کی جس وقت دہلی سے روانگی ہوئی اس وقت رمضان کے مہینے میں چار یا پانچ دن باقی تھے۔ اس نے عید دہلی سے آٹھ میل کے فاصلہ پر سلطان پور میں کی۔ برنی صفحہ ۵۰۹۔ سلطان پور ہی میں اس نے سلطنت کی لغاوتوں اور شورشوں پر برنی سے طویل گفتگو کی۔ عید کا دن یکم شوال ۵ فروری ۱۳۴۵ء کو تھا۔ غالباً سلطان دہلی سے یکم یا ۳۱ جنوری کو روانہ ہوا اور سلطان پور میں ۴ فروری ۱۳۴۵ء کو۔ دیکھو جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۵۶۔

۵۰- برنی صفحہ ۵۱۲۔ یہ تاریخ ۷۴۵ھ نہیں ہے جو منتخب التواریخ جلد اول کے صفحہ ۲۳۵ پر دی گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں سلیر اور منیر کے جائے وقوع کو نہ معلوم کر سکا۔ دابھوئی اب ریاست مہاراشٹر میں ہے، ۹۸ ر ۲۲ شمال، ۲۸ ر ۷۳ مشرق۔ بھڑوچ ریاست مہاراشٹر میں ایک ضلع کا مستقر، ۴۲ ر ۲۱ شمال، ۵۹ ر ۷۲ مشرق۔

۵۱۔ برنی صفحہ ۵۱۳۔ کہ شریران زمانہ را پیشوا بودند۔ زین الدین ملقب بہ مجدالدین جیسا کہ فرشتہ صفحہ ۱۴۱ میں ہے۔

۵۲۔ رائچور ریاست آندھرا پردیش میں ایک ضلع کا مستقر۔ ۱۲ر۱۶ شمال، ۳۵ر۷۷ مشرق۔ مدگل ریاست آندھرا پردیش کے ضلع رائچور میں۔ ۱ر۱۶ شمال، ۲ر۷۵ مشرق۔ گنجوتی، ہمپی کے کھنڈرات سے چند میل کے فاصلہ پر ریاست آندھرا پردیش میں۔ ۳۰ر۱۵ شمال، ۳۶ر۷۶ مشرق۔ بیجاپور، اب ریاست مہاراشٹر میں ایک ضلع کا مستقر ہے۔ ۱۶ر۴۹ شمال، ۳ر۷۵ مشرق۔ رائے باغ اب ریاست مہاراشٹر میں۔ ۳۰ر۱۶ شمال، ۵۲ر۷۴ مشرق۔

۵۳۔ مانک دون (فرشتہ) یا مانک گنج (بدایونی صفحہ ۲۳۵)۔ درہ گنج اور دون شہروں کے درمیان (عصامی صفحہ ۴۹۳) دولت آباد سے پانچ فرسنگ کے فاصلہ پر ہے لیکن برنی (صفحہ ۵۱۴) کا بیان ہے کہ دولت آباد کے مغرب میں ایک منزل یا تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ نیز دیکھو ہاشمی کے اُردو ترجمہ فرشتہ کا ذیلی نوٹ، سلسلہ مطبوعات عثمانیہ یونیورسٹی جلد سوم صفحہ ۱ جہاں اتنا ہی کہنے پر قانع ہے کہ وہ اغلباً دولت آباد کے قریب ہوگا۔

۵۴۔ عصامی صفحہ ۴۹۵۔

۵۵۔ برنی صفحہ ۵۱۴۔ سکوں کی عبارت یہ ہے:

اوپر کی طرف: ناصر الدین والدنیا۔

نیچے کی طرف: ابوالفتح اسماعیل شاہ۔

دیکھو اسپیٹ کی کتاب کوائنز آف دی بہمنی کنگس (فرسٹ کلچر ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۹۲)۔ راجر کا مقالہ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۵ء حصہ اوّل صفحات ۵۲ و ۵۳۔ پلیٹ ۴ صفحہ ۳۶۔ طامس کی کتاب پٹھان کنگس آف دہلی۔ راجر کا ضمیمہ ۹۳۔ راجر کی کتاب کنگس آف معبر صفحہ ۳۶۔

۵۶۔ اسماعیل کی تخت نشینی کا مہینہ کہیں نہیں مل سکا لیکن اس کا حساب اس طرح لگایا گیا ہے:

(۱) اسماعیل کی تخت نشینی کے ایک یا دو ماہ بعد نور الدین خواجہ جہاں گلبرگہ جاتا ہے (عصامی صفحہ ۵۰۲)

(۲) ظفر خاں کے دہلی کی فوج کو شکست دیتے ہوئے تین یا چار ماہ گذر جاتے ہیں۔

(۳) محمد بن تغلق اپنی فتح کے بعد دو ماہ دیوگیر میں قیام کرتا ہے۔ (عصامی صفحہ ۵۱۱)

(۴) ظفر خاں کا ارکہ میں تین ماہ قیام (عصامی صفحہ ۵۱۵)۔ میزان تقریباً گیارہ ماہ۔

۵۷۔ برنی صفحہ ۵۱۴۔ فرشتہ (صفحہ ۲۷۵) نے اس کا نام ملک گل لکھا ہے۔ برنی (صفحہ ۴۸۰) نے بڑے بھائی کا نام ملک اختیار الدین یل افغان لکھا ہے اور چھوٹے بھائی کا نام ملک مخ افغان اور لکھا ہے کہ انھیں ۱۳۲۱ء

میں علاء الدین خلجی نے ورنگل بھیجا تھا۔ یل یعنی پہلوان۔ مخ بمعنی آگ یا پتھر۔ منتخب التواریخ (صفحہ ۲۳۶) میں چھوٹے بھائی کا نام اسمعیل فتح لکھا ہے اور نیز فرشتہ نے (۲۷۵)۔ مگر یاد رہے کہ ان دونوں میں کوئی بھی معاصر نہ تھا اور ممکن ہے کہ کاتب نے یہ سمجھ کر کہ نقطے چھٹ گئے ہیں اپنی طرف سے مخ پر تین نقطے لگا کر غلطی سے فتح کر دیا ہو۔ ظفر الوالیہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۹ میں اسے اسمعیل الافغان لکھا ہے۔

۵۸۔ جیسا کہ بعد کو معلوم ہوگا یہ پیشگوئی پوری نہیں ہوئی اور ملک یل واقعی سلطان کی فوجوں کے ساتھ بغاوت کو فرو کرنے آیا۔ ممکن ہے کہ اسی واقعہ سے اسماعیل کی مقبولیت پر حرف آیا ہو اور وہ تخت سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہوا ہو۔

۵۹۔ یہ عصامی کا بیان ہے۔ صفحات ۴۹۶ و ۴۹۷۔

۶۰۔ ایضاً صفحہ ۴۹۷۔ فرشتہ صفحہ ۲۷۵۔

۶۱۔ عصامی صفحہ ۴۰۸۔

۶۲۔ ایضاً۔ کلیانی چالوکیہ حکمرانوں کا سابقہ دار السلطنت۔ ریاست کرناٹک کے ضلع بیدر میں۔ ۴۲ء۷ا شمال، ۸۲ء۷۷ مشرق۔

۶۳۔ ایضاً صفحہ ۵۰۲۔

۶۴۔ ایضاً فرشتہ صفحہ ۲۷۵۔

۶۵۔ عصامی صفحات ۵۰۳ و ۵۰۴۔

۶۶۔ فرشتہ صفحہ ۲۷۵۔

۶۷۔ پوری تفصیل عصامی کے صفحات ۵۰۵ لغایت ۵۰۹ میں ہے۔

۶۸۔ بدایونی صفحہ ۲۳۵۔

۶۹۔ برنی صفحہ ۵۱۶۔

۷۰۔ عصامی صفحہ ۵۱۱۔

۷۱۔ برنی صفحہ ۵۱۶۔

۷۲۔ عصامی صفحہ ۵۱۲۔

۷۳۔ ایضاً صفحہ ۵۱۳۔

۷۴۔ ایضاً صفحہ ۵۱۴۔ میرج اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۴۹ء۱۶ شمال، ۴۲ء۷۴ مشرق۔

۷۵۔ ایضاً صفحہ ۵۱۵۔ الکہ کا جائے وقوع مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

۷۶ - ایضاً صفحات ۵۱۷ و ۵۱۸ -

۷۷ - ایضاً صفحہ ۵۱۸ - تلنگانہ سے مدد، فرشتہ صفحہ ۲۷۶ - دیکھو ونکٹ رمن نیائی اور ینگن صفحہ ۱۱۷ - منڈتان غالباً موجودہ سنہ کھیر ہے جو ریاست مہاراشٹر کے ضلع بیٹر میں ہے -

۷۸ - عصامی صفحہ ۵۲۱ -

۷۹ - ایضاً

۸۰ - فرشتہ صفحہ ۲۷۶ - بدایونی صفحہ ۲۳۶ -

۸۱ - عصامی صفحہ ۵۲۳، منتخب جلد اوّل صفحہ ۲۳۶ میں ہے کہ ظفر خاں نے اسماعیل کو تخت سے اتار دیا اور خود تخت نشین ہو گیا -

۸۲ - برنی صفحہ ۵۱۴ میں "البہمنی" کا اضافہ ہے مگر نسخوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، دیکھو اگلا باب تشریح نمبر ۱۲ -

۸۳ - فرشتہ صفحہ ۲۷۰ - برنی صفحہ ۵۱۴ میں مختلف بیان ہے - وہ کہتا ہے کہ تخت نشینی جمعہ ۱۸ شعبان ۷۴۸ھ (۳ نومبر ۱۳۴۷ء) کو ہوئی لیکن معاصر عصامی کی شہادت کے مقابلہ میں یہ قطعی غلطی ہے اور عصامی اس مبارک موقع پر خود موجود تھا اور وہ صاف صاف فرشتہ کی تائید کرتا ہے -

شیخ سراج الدین جنیدی ۶۷۰ھ (۱۲۷۱ء) میں بمقام پشاور پیدا ہوئے تھے اور محمد بن تغلق کے ہمراہ دکھن آئے کہا جاتا ہے کہ وہ پرتاب اودر کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے ۱۲ شعبان ۷۳۲ھ (۲۱ مئی ۱۳۳۲ء) سے انھوں نے بیجاپور میں اقامت اختیار کی اور پھر وہاں سے موضع کرچی چلے گئے - وہ علاء الدین حسن کے پیر تھے۔ در تذکرۃ الملوک میں دونوں کے تعلقات کے متعلق کئی واقعات بیان کیے گئے ہیں - وہ محمد اوّل کے عہد سے پیشتر گلبرگہ منتقل نہیں ہوئے اور ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں ۱۱۱ سال کی طویل عمر پاکر گلبرگہ میں وفات پائی - انھوں نے محمد اوّل اور اس کے جانشین کو تخت نشینی کے وقت تیغ سلطنت پہنائی - جب محمد شاہ کا انتقال ہوا تو شیخ نے تھوڑا سا موٹا کپڑا اور ایک کرتا منگوایا اور بہت دنوں تک سلاطین بہمنی کے تخت نشینی کے وقت کا یہی لباس رہا - شیخ کا مزار جو اب روضۂ شیخ کہلاتا ہے اس وقت بھی گلبرگہ کی ایک ممتاز یادگار ہے - دیکھو محمد سلطان کی ارمغان سلطانی مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۰۳ء - تذکرۃ الملوک فولیو ۶ (الف) - ظہیر الدین احمد کی احمد شاہ ولی بہمنی باب اوّل - روضہ اور اس کے منارے اور بلند دروازہ جو سب بیجاپور کے یوسف عادل شاہ کے بنوائے ہوئے ہیں ان کی تفصیل کے لیے دیکھو آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ ۴۰-۱۹۳۷ء صفحہ ۲ - دیکھو روداد انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۳۸ -

تیسرا باب

خانوادہ شاہی کا قیام

علاء الدین حسن بہمن شاہ

(۳ اگست ۱۳۴۷ء سے ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء)

نئے بادشاہ کا خاندانی سلسلہ

ناصر الدین اسماعیل کا یہ بیان کہ وہ حکومت کو ... تک علاء الدین کی امانت کے طور پر سنبھالے ہوئے تھا خواہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ علاء الدین کو اس کی تخت نشینی سے چند ماہ پیشتر جو مسلسل فتوحات حاصل ہوئی تھیں اُن سے اسماعیل کی صورت حال بہت متزلزل اور دشوار ہوگئی تھی اور نام نہاد "انتخاب" محض نام کا ... ہوگا۔ علاء الدین نے اپنی قوت بازو سے جو حق پیدا کر لیا تھا اُس پر اس سلسلہ نسب سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا جو ماہرین انساب نے نئے بہمن اور قدیم بہمن و اسفندیار کے مابین قائم کیا۔ اب ہمیں نئے حکمران کے خاندان اور گذشتہ حالات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ فرشتہ نے جو یہ قصہ لکھا ہے کہ حسن دہلی کے ایک برہمن مسمی گنگو کا ملازم تھا اور اسے ایک برتن سونے کے سکوں سے بھرا

ہوا ملا جسے وہ اپنے آقا کے پاس لے گیا جو حسن کی ایمانداری سے اتنا خوش ہوا کہ اسے شاہی دربار میں لے گیا۔ جہاں ولی عہد سلطنت بھی حسن کی ایمانداری اور دیانت سے بہت خوش ہوا۔ یہ قصہ ابھی حال تک بلا کسی شبہہ کے بالکل صحیح سمجھا جاتا رہا۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ گنگو بہمنی کا لقب جس نے گنگو برہمن سے جو وعدہ کیا تھا اس کے ایفا کے لیے اختیار کیا[2]۔ اس سارے واقعہ پر سب سے پہلے میجر ہیگ نے شبہہ کا اظہار کیا۔ جب اس نے برہان ماثر کا ملخص ترجمہ انڈین اینٹی کوئری میں شائع کیا[3]۔ برہان جو فرشتہ کی تصنیف سے چند سال پیشتر لکھی گئی تھی[4] اس میں گنگو کا مطلق ذکر نہیں ہے اور نہ اس نے "گنگو بہمنی" کے لقب ہی کا ذکر کیا ہے[5] اور اگرچہ فرشتہ نے ایک جگہ اس سارے قصہ کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے مگر دوسری جگہ وہ حسن کے خاندان کے متعلق بہت سے مختلف قصوں کی وجہ سے الجھن میں پڑ جاتا ہے اور "اپنی حقیر رائے" میں گنگو کے قصہ کو ترجیح دیتا ہے[6]۔

ہم نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ حسن ملک ہزبر الدین ملقب بہ ظفر خاں علائی کا بھیجا تھا جو ۶۹۷ھ (۱۲۹۸ء) میں ماورائے جیحوں کے خانہ بدوش ترکی قبایل کے جرگہ کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا تھا جب کہ حسن کی عمر صرف چھ سال کی تھی[7]۔ ہمارے بعض مورخین نے اُسے "کیکویہ" کہا ہے جس سے بعض حال کے مورخین نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیں۔ بعض نے کہا کہ یہ کیکاوس کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو حسن کا والد خیال کیا جاتا ہے[8] اور دوسرے مورخین نے یہ خیال کیا کہ یہ گنگو یا کنکو ہے اور دوسرا حرف جس پر کسی لاپروا کاتب نے نقطہ نہیں لگایا بعد کو کیکو پڑھا گیا اور "یہ" کا اضافہ کر دیا گیا[9]۔ دراصل "کاکویہ" میں کوئی الجھن کی بات نہیں ہے اس لیے کہ رشتہ کاکویوں کے شاہی خاندان سے مل جاتا ہے جس نے کئی سال تک اصفہان اور ہمدان میں حکومت کی اور جن کی نسل غزنی اور غور کے مضافات میں آکر آباد ہوگئی۔ کچھ اس بنا پر کہ ان کی ریاست غزنی کے سلطان محمود اعظم کی حفاظت میں آگئی تھی[10] اس سررشتہ کی موجودگی میں درباری ماہرین انساب حسن کا سلسلۂ نسب ایران کے عظیم ترین شاہی خاندانوں بہمن و اسفندیار سے ملانے اور اُن سے اوپر بہرام گور تک لے جانے میں بالکل حق بجانب تھے[11]۔ دراصل نئے بادشاہ نے جو لقب اختیار کیا وہ "بہمنی" نہ تھا بلکہ "بہمن" تھا[12] اور علاء الدین محض علی شاہ کے لقب کی نقل اور خاندان کے سرپرست علاء الدین کے نام کو زندہ کرنا تھا اور ظفر خاں کا لقب جو حسن نے اختیار کیا اور اپنے جانشین کو منتقل کیا وہ ہزبر الدین کے لقب کا احیا تھا۔

نئی حکومت کی مخالف جماعتیں

جیسا کہ ہر انقلاب میں ہوتا ہے، جو سلطنت علاء الدین نے فتح کر کے حاصل کی تھی وہ پھولوں کی سیج نہ تھی[13] دراصل نئے بادشاہ کے قبضہ میں جو کچھ آیا تھا وہ اس کی جاگیر مبارک آباد مراج اور رائچور کے آس پاس کا علاقہ اور بعض دوسرے شہر تھے[14] اور دکن کا بیشتر حصہ تغلق پارٹی کے تنخواہ دار یا بلا تنخواہ ہمدردوں سے بھرا ہوا تھا جنھوں نے اب اپنی زندگی کا بہترین موقع دیکھا کہ اپنے لیے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ نیز مشرقی اور مغربی دکھن میں ہندو رئیس تھے جنھوں نے اپنے لیے بہترین مصلحت یہ سمجھی کہ شورش پسندوں سے مل جائیں اور بہمنیوں کے زوال کے بعد آزادی حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ علاء الدین کے پہلو میں شمس الدین معروف بہ مخ کا کانٹا تھا اس لیے کہ اسماعیل شاہی اعزاز کا مزہ چکھ چکا تھا اور اس نے تخت ایک ایسے شخص کے لیے چھوڑا تھا جو رتبہ میں اس سے بہت کم تھا اور یہ لازمی بات تھی کہ کسی نہ کسی وقت کوئی ایسی جماعت ابھر آئے جو اسماعیل کو پھر تخت نشین کرنے کی کوشش کرے۔ علاء الدین کا یہ بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے ان سب جماعتوں کا مقابلہ کیا، کبھی بزور قوت اور کبھی ترغیب و تحریص یا سیاسی چال سے اور اپنی سلطنت کو مستحکم کر کے اپنے پیچھے ایک مطمئن اور مضبوط مرکز کی سلطنت چھوڑی۔[15]

نئے وزیر اور حکام

نئے بادشاہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہزادہ محمد خاں کو ظفر خاں کا خطاب دے دیا۔ جس سے اس کے فیاض اور بہادر چچا کی یاد پھر تازہ ہوگئی اور جو خود اس کے اپنے حق میں بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔ شاہزادہ کی نسبت ایک ممتاز امیر ملک سیف الدین غوری کی لڑکی سے کردی گئی جو اب وکیل مطلق یا وزیر اعظم ہوگیا۔[16] سابق بادشاہ شمس الدین اسماعیل مخ کو امیر الامرا بنایا گیا — بہاء الدین کو سکندر خاں کا خطاب دے کر باربک یا بادشاہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ دیا گیا، حسامی دوال کو نائب وزیر بنایا گیا اور رفیع الدین کو فتح الملک کا خطاب دے کر حاجب خاص یا مہتمم امور خانہ داری کا عہدہ دیا گیا اور فرشتہ کا بیان ہے کہ برہمن گنگو کو صدر محاسب کا عہدہ دیا گیا۔[17]

بادشاہ کے حوصلے

دلچسپ بات یہ ہے کہ علاء الدین ہندوستان کے محض ایک حصّہ کی بادشاہی پر قانع نہ تھا بلکہ شاہان تغلق کی جانشینی کرنا چاہتا تھا اور سارے برصغیر ہندوستان کو ایک حکومت کے ماتحت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پہلے تنگ بھدرا کو عبور کرکے رامیشور اور معبر یا ساحل کارومنڈل تک فتح کرے اور پھر گجرات، مالوہ اور گوالیار کو تسخیر کرے اور بالآخر خود دہلی پر قبضہ کرے لیکن اس کے دوراندیش اور وفادار وزیر ملک سیف الدین غوری نے ان حوصلہ مندیوں کی مخالفت کی اور کہا کہ بعید جنوب جنگل سے بھرا ہوا ہے اور مہم کی کامیابی کے لیے ناموزوں ہے۔ اس نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق دونوں بالآخر جنوب کو زیر کرنے میں ناکام رہے تھے[۵] اور اس وقت طلب مہم سے بمشکل اپنی فوجوں کا دسواں حصّہ بچا کر لا سکے تھے اس لیے ملک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ پہلے وہ دکھن کی سطح مرتفع کی شورش کو رفع کرے اور پھر مالوا اور گجرات پر چڑھائی کرے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے فوجی کمان داروں کو حکم دیا کہ وہ دکھن کے اُن مختلف حصّوں کی طرف بڑھیں جو اب تک ایسے لوگوں کے قبضہ میں ہیں جو بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اُس نے حسین گرشاسپ کو کوٹ گیر اور قندھار بھیجا، رضی الدین قطب الملک کو جنوب مغرب کی طرف اور ملک مقبول کو جسے قیر خاں کا خطاب ملا تھا کلیانی بھیجا اور سکندر خاں کو تلنگانہ کی طرف روانہ کیا اور میراج کی فوج کو عین الدین خواجہ جہاں کی ماتحتی میں گلبرگہ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا[۶]

ملک میں تسلّط

پہلی مہم گلبرگہ کی جانب گرشاسپ کے ذمہ تھی۔ کوٹ گیر کے راستے میں اُس نے سنا کہ تغلق کے قندھار کی قلعہ بند فوج نے اپنی اطاعت شعاری ترک کردی ہے اور نئے بادشاہ کے نام سے جنگل پر قبضہ کرلیا ہے اور تغلق کا نمایندہ ہندو اکراج بھاگ کر بودھن چلا گیا ہے۔ چنانچہ گرشاسپ نے قندھار کا رُخ کیا اور اپنے آقا کی طرف سے قلعہ کی فوج سے حلف وفاداری لیا۔ اس کے بعد وہ کوٹ گیر گیا اور قلعہ کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا لیکن اپنی فوج کو لوٹ مار کی اجازت دینے کی بجائے اس نے تمام آبادی کو اپنی اپنی املاک پر بدستور قابض رہنے کی سرطرح سے ضمانت دی[۷] اس مہم کے کامیاب انجام کی خبر جب

بادشاہ کو پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور دولت آباد میں نقارے بجانے کا حکم دیا۔[20]

قطب الملک جو جنوب مغرب کی طرف بھیجا گیا تھا اُس نے مارم، مہندری اور اکل کوٹ کو زیر کیا اور اکل کوٹ کا نام بدل کر سید آباد رکھا۔ پورے علاقہ پر قابو حاصل کرنے کے بعد اُس نے حکم دیا کہ جو شخص بذات خود حلف وفاداری لینے حاضر ہوگا اس کے سب قصور معاف کر دیے جائیں گے۔[21] مہم کے دوران میں اس نے جن چیزوں پر قبضہ کیا تھا وہ سب ان کے اصلی مالکوں کو واپس کر دیں اور مقامی ہندو زمینداروں کی پوری حفاظت کی ذمہ داری لی اور فوج کو سختی سے حکم دیا کہ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ جیسا کہ ہمارے مستند مورخ نے کہا ہے "کچھ تو بزور قوت زیر کیے گئے اور کچھ قوت زر سے"۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ قطب الملک کے ماتحت فوج زیادہ نہ تھی مگر سارا علاقہ جس کی تسخیر کے لیے فوج بھیجی گئی تھی، دولت آباد کی حکومت کے ماتحت آگیا۔[22]

قیر خاں کلیانی کے مضبوط قلعہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر وہ بلا محاصرہ کے قابو میں نہ آیا۔ محاصرہ پانچ ماہ تک جاری رہا[23] جس کے آخر میں تغلق کی قلعہ بند فوج نے امن و حفاظت کی درخواست کی اور ہتھیار ڈال دیے۔ بہمنی کماندار نے انھیں پورے طور پر معاف کر دیا کہ کلیانی کلیان یا دارالامن قرار دیا جائے اور ہر شخص کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی۔ بادشاہ نے جب اس زبردست کامیابی کی خبر سُنی تو دارالسلطنت میں ایک ہفتہ تک جشن منانے کا حکم دیا اور کلیانی کا نام بدل کر فتح آباد رکھ دیا۔[24]

سکندر خاں کو بیدر بھیجا گیا تھا جہاں اُس نے سارے علاقہ کو اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کر دیا اور بیدر میں اپنی فوج کو جنگ کے لیے تیار کیا اور مالکھیر پر چڑھائی کی جو ہندو زمینداروں کے قبضہ میں تھا۔ اور جنھوں نے شاہی افواج کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک قابو میں نہ آئے جب تک سکندر نے اپنی فوج کو ایک ایک چپہ زمین کے لیے دست بدست لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ بالآخر مزاحمت کرنے والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اطاعت قبول کر لی جس پر انھیں اپنے گھروں میں پوری حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی۔[25] مالکھیر سے سکندر نے تلنگانہ میں کرشن نایک یا کنیا نایک کو پیام بھیجا[26] اور علاءالدین کے تخت نشین ہونے کی اطلاع دی اور اسے دوستانہ تعلقات کی دعوت دی جس پر ایک معاہدہ ہو گیا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ سکندر کو تلنگانہ مدعو کیا جائے اور بادشاہ کو چند ہاتھی نذر کیے جائیں۔ نایک نے فوراً سکندر کو اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی اور لغیر فوج کو ساتھ لیے شاہی کماندار کے استقبال کے لیے چند میل آگے بڑھ آیا۔ ہندو رئیس اور مسلمان جنرل میں گہری دوستی ہو گئی اور سکندر کئی دن تک نایک کے دارالسلطنت میں مقیم رہا۔ جب سکندر نے نایک سے رخصت چاہی تو

نایک نے عاجزانہ سلام بادشاہ کو بھیجا اور دکھن کے نئے حکمران کو قیمتی تحائف اور چند ہاتھی بھیجے۔[۲۷]

گلبرگہ جو کئی مرتبہ ہاتھ آیا اور نکلا تھا اب وہاں پھر لوچار یڈی کی قیادت میں جو تغلق کا وفادار تھا، بغاوت بھڑک اٹھی۔ بادشاہ نے اعظم ہمایوں خواجہ جہاں جیسی بڑی شخصیت کو فوراً مبارک آباد میراج سے گلبرگہ کی طرف روانہ کیا جس کے ساتھ قطب الملک بھی مل گیا جس نے بہت بڑی کامیابی سے اکل کوٹ اور مہندری کو زیر کیا تھا۔ شاہی فوج کو گلبرگہ کا پھر محاصرہ کرنا پڑا اور بڑی دشواری سے قطب الملک کی قیادت میں منجنیق سے حملہ کرنے اور قلعہ میں پانی بالکل بند کردینے کے بعد فتح کیا جا سکا۔ وزیر نے اب محل عدالت میں قیام کیا اور سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کیا۔ جن لوگوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ ان پر سختی کی اور جنھوں نے معقولیت کا اظہار کیا تھا انھیں انعام تقسیم کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں گلبرگہ کا سارا علاقہ زیر کر لیا گیا۔[۲۸]

۷۵۲ھ (۱۳۵۲ء) کے قریب خبر آئی کہ ساگر میں بغاوت ہوگئی ہے جہاں محمد بن عالم، علی لاچین اور فخرالدین مہروار نے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ خواجہ جہان نے محمد بن عالم کو پیام بھیج کر ساگر کے قلعہ کی کنجی طلب کی اور یہ دھمکی دی کہ اگر انکار کیا تو "جواہرات یا پتھر کچھ اس کے ہاتھ نہ لگے گا"۔ جواب میں محمد نے علی بیگ نتھو کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ اسے شاہی کارندوں نے بہت ستایا تھا جس سے مجبور ہو کر اس نے بغاوت کی اور اب اگر ساگر اس کے پاس رہنے دیا جائے تو وہ اطاعت قبول کرے گا۔ وزیر نے فوراً نتھو کو گرفتار کرلیا اور دولت آباد بادشاہ کو عرضی بھیج کر یہ استدعا کی کہ اُسے باغیوں پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ وہ خود ساگر پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے اور خواجہ جہان کو حکم دیا کہ وہ چینتور کو عبور کرکے وہاں اس کا انتظار کرے۔ اس دوران میں اس نے فوجی دستے روانہ کردیے کہ ساگر کے گرد و پیش میں لوٹ مار کریں۔[۲۹]

بادشاہ کو دارالسلطنت سے باہر جانے میں تامل تھا۔ دراصل وہ سارے ملک میں بغاوتوں سے خوفزدہ ہوگیا تھا اور یہ ڈر تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں کہیں خود دارالسلطنت کے اندر بغاوت نہ ہوجائے۔ اس لیے وہ دو ماہ تک رُکا رہا اور جب تک حضرت اویس قرنی نے خواب میں اُسے یہ بشارت نہیں دی کہ اگر اس نے محمد بن تغلق کے خلاف جنگ کی تو وہ کامیاب ہوگا اس وقت تک وہ روانہ نہ ہوا اور جب وہ گلبرگہ پہنچا تو اس نے خبر سُنی کہ محمد بن تغلق کا دریائے سندھ کے کنارے انتقال ہوگیا۔ گلبرگہ میں خواجہ جہان بادشاہ سے ملا اور ان تمام مہموں کا حال بیان کیا جو پچھلے سات مہینوں میں اس جوار میں اُسے پیش آئی تھیں۔ بادشاہ نے گلبرگہ میں دو یا تین دن قیام کیا اور پھر بڑی تیز رفتاری

سے ساگر کی طرف روانہ ہوگیا اور تین دن میں وہاں پہنچ گیا[۳۰]۔ محمد بن عالم نے جب بادشاہ کی آمد کی خبر سُنی تو فوراً ہتھیار ڈال دیے اور معافی کا خواستگار ہوا اور باوجود اس کی انتہائی قابل اعتراض حرکات کے بادشاہ نے اس کی جان بخشی کی۔

ساگر میں شاہی خیمہ اُس بڑے حوض کے کنارے لگایا گیا جو حوض شاہ کہلاتا تھا۔ یہ کچھ دنوں سے بے مرمت پڑا تھا اس لیے اس کی مرمت کرائی گئی۔ بادشاہ نے شیخ عین الدین بیجاپوری[۳۱] جیسے بزرگوں کو مدعو کیا اور انھیں بہت سے قیمتی تحائف دیے۔ وہ کافی دن وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ اس علاقہ کی تمام شورش اور بدامنی کا خاتمہ ہوگیا اور "ہر چھوٹا بڑا محفوظ ہوگیا"[۳۲]۔ ساگر سے وہ کھیم بھاوی گیا۔ جہاں ایک ہندو مسمی کھیرا مقدم تھا[۳۳]۔ بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر مقدم نے اپنے ایلچی اس کی پیشوائی کے لیے اور اطاعت شعاری کا اظہار کرنے کے لیے بھیجے اور دو سال کا خراج ادا کیا اور بادشاہ کے پہنچنے پر حاضر ہوکر سلامی دی اور دربار میں اس کا اعزاز کیا گیا۔ کھیم بھاری سے علاء الدین نے مدھول پر چڑھائی کی۔ یہ ایک رئیس مسمی نراین کا مستقر تھا جو بہمنی اقتدار علی کی مخالفت کرنے میں پیش پیش تھا۔ چنانچہ علاء الدین دوسرے دن مالکوٹ پہنچا جہاں اُسے ارکہ کے مقطع دار یعنی جاگیردار قاضی سیف کا پیامبر ملا جو اب تک تغلق کے حامیوں میں تھا۔ پیام میں قاضی سیف نے کہا کہ اس نے بادشاہ دہلی کے ظلم کو خوب سمجھ لیا اور اب وہ علاء الدین کا ساتھ دے گا۔ چنانچہ اس نے استدعا کی کہ اُسے خود حاضر ہوکر اطاعت شعاری کا اظہار کرنے اور بادشاہ سلامت کی قدم بوسی کی اجازت دی جائے۔ اجازت پاکر جب وہ شاہی خیمہ میں پہنچا تو اسے بہت بیش قیمت خلعت دی گئی اور بادشاہ نے کہا کہ اس کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ظالم بادشاہ کی اطاعت ترک کرکے منصف بادشاہ کی اطاعت کرنا اصل وفاداری ہے۔

اب مدھول کا راستہ صاف تھا۔ علاء الدین نے کرشنا ندی کو عبور کیا اور شورہ پشت نراین کے علاقہ کو تاراج کر دیا۔ نراین بادشاہ کی آمد سے سخت پریشان ہوا اور ایک ایلچی شاہی خیمہ میں بھیج کر استدعا کی کہ لڑائی بند کی جائے اور ایک نمائندہ اُس کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ بادشاہ کی اطاعت شعاری کا اقرار کرے۔ اس پر بادشاہ نے قاضی بہاء الدین کو نراین کے پاس یہ پیام دے کر بھیجا کہ اب بھی اُسے موقعہ ہے کہ ہتھیار ڈال دے ورنہ اس کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نراین کے دوستوں نے اُسے لڑائی جاری رکھنے کی صلاح دی اس خوف سے کہ بادشاہ اپنی رحم دلی کے باوجود شاید نراین جیسے پرانے پاپی کو معاف نہ کرے۔ چنانچہ نراین جام کھنڈی میں قلعہ بند ہوگیا اور اپنے کماندار گوپال کو مدھول کی مدافعت پر اور دوسرے فوجی افسروں کو تردل اور باگل کوٹ کی حفاظت پر تعینات کیا[۳۴]۔ چنانچہ شاہی فوج

نے جام کھنڈی کا محاصرہ کیا۔ رات گئے قلعہ کی فوج نے چھاپہ مارنے کی کوشش کی جس میں سخت دست بدست لڑائی ہوئی اور بادشاہ نے خود مبارک خاں، سیف خاں، ملک احمد اور دوسرے کمان داروں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا اور بالآخر غنیم پسپا ہو کر قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اب شاہی فوج نے ہزاروں منجنیقوں سے قلعہ کی دیوار توڑنا شروع کیا۔ اور تین چوتھائی رات گذرنے سے پہلے قلعہ کی دیوار میں ایک شگاف ہو گیا جس سے فوج معہ بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہو گئی۔ یہ فتح محض شاہی فوج نے نہیں حاصل کی تھی بلکہ بعض ہندو رئیسوں نے بھی مدد کی تھی جن میں سب سے ممتاز میواڑ کے شاہی خاندان کے سجان سنگھ کا لڑکا دلیپ سنگھ تھا جس نے پہلے بھی تغلق کی فوجوں کے خلاف دکھن کی جدو جہد آزادی میں مدد دی تھی۔ بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور ۲۵ رمضان سنہ ۸۲۴ھ (۴ نومبر سنہ ۱۴۲۲ء) کو اُسے دولت آباد کے صوبہ میں دس گاؤں کی جاگیر دی اور سردار خاصہ خیل کا معزز خطاب عطا کیا۔[35]

اس دوران میں ولیعہد سلطنت ظفر خاں[36] مبارک آباد میراج سے آگیا اور بادشاہ نے شاہانہ شان و شکوہ کے ساتھ اس کی پذیرائی کی۔ اب فوج نے کھتر کو عبور کیا اور مدھول پہنچ گئی جہاں بظاہر نراین نے بھاگ کر پناہ لی تھی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا جس میں بڑی دقت پیش آئی اور محاصرہ پورے چار ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر نراین اتنا مجبور ہوا کہ اس نے بادشاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور ہتھیار ڈالنے اور حلف وفاداری لینے پر آمادگی ظاہر کی اور دس سال کا خراج بھی بھیجا۔ اس موقعہ پر علاء الدین کے کردار کا پورے طور پر مظاہرہ ہو گیا کہ باوجود اس کے کہ نراین کو زیر کرنے میں اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی مگر اس نے اس طرح اسے معاف کر دیا جیسے اس سے کوئی قصور نہ ہوا ہو اور اُسے اس کی ساری ریاست بطور شاہی جاگیر کے دے دی۔[37]

پچھلے چند ماہ کی متواتر مہموں کا بادشاہ کی صحت پر بُرا اثر پڑا تھا اور ساگر ہی کی مہم کے وقت اُس کی عمر ۶۰ سال کی ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ کچھ دن آرام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مدھول سے وہ میراج گیا اور وہاں چند ماہ قیام کر کے ہیتن چلا گیا اور دو ماہ وہاں گذارے اور پھر ساگر واپس آیا جہاں جاگیرداروں اور جوار کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا اور سلامی دی۔ فوج کا انتظام درست کرنے کے بعد اُس نے چنار کو عبور کیا اور مالکھیر اور سیرم سے ہو کر گذرا جہاں اس نے مقامی رئیسوں سے خراج وصول کیا اور پھر شکار پر چلا گیا اور پورے سال بھر دار السلطنت سے باہر رہنے کے بعد گلبرگہ پہنچ گیا۔[38]

قیر خاں کی بغاوت

بادشاہ کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی آرام نہ ملا۔ جیساکہ اوپر کہا گیا ہے۔ اب تک تو وہ ان لوگوں کے خلاف جنگ کرتا رہا جو تغلق کے طرفدار تھے اور اس امید میں کہ اب حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے، وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اُس نے میدان جنگ میں اپنی مسلسل کامیابی اور باغیوں کو شکست دینے کے بعد اُن سے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اپنی اعلیٰ صلاحیت ثابت کر دی تھی لیکن اب اُسے ایک اور سنگین شورش سے سابقہ پڑا اور وہ اس کے معتمد علیہ جنرل اور مشیر فاتح کلیانی کی بغاوت تھی۔

قیر خاں کو ایک شخص مسمی کالے محمد نے بادشاہ کے اقتدار کی مزاحمت کے لیے بھڑکایا اور یہ خیال کر کے کہ بادشاہ اس قدر مصروف ہے کہ وہ کسی کامیاب مہم کی تیاری نہ کر سکے گا۔ اس خبر کو سن کر بادشاہ بذاتِ خود کلیانی پہنچا اور وہاں سکندر خاں کو طلب کیا جس پر اب بادشاہ بہت مہربان تھا اور تلنگانہ کو پرامن طور پر زیر کرنے کی بنا پر اُسے فرزند کا خطاب عطا کیا تھا۔ سکندر کے آنے پر بادشاہ نے اُسے سُرخ چھتری عطا کی اور یہ اعزاز ابھی تک کسی امیر کو نہیں حاصل ہوا تھا۔ بادشاہ نے سکندر کو حکم دیا کہ وہ قیر خاں کو زیر کر کے شاہی دربار میں حاضر کرے۔ سکندر خاں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ جب تک وہ نافرمان باغی کو زیر نہ کر لے گا بادشاہ کو اپنی صورت نہ دکھائے گا۔ سکندر کلیانی سے بیدر گیا اور وہاں سے کوہیر جہاں قیر خاں موجود تھا اور اپنی کامیابی پر اُسے اتنا یقین تھا کہ سکندر کی چڑھائی کی خبر سن کر وہ کوہیر سے بیدر پہنچا اور میدان جنگ میں سکندر کا مقابلہ کیا مگر اس کی فوج کو سخت شکست ہوئی اور فخر شعبان اسے گرفتار کر کے اور ہاتھ پَیر باندھ کر سکندر کے پاس لایا۔ جب اس کی خبر بادشاہ کو پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور نقارہ بجانے کا حکم دیا اور خود سکندر کو مبارکباد دینے کو ہیر روانہ ہو گیا۔ سکندر اپنے سابقہ رفیق کو لے کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا اور ساتھ ہی درخواست کی کہ اگر وہ فوراً اطاعت نہ قبول کرے تو اُسے سزا دی جائے لیکن قیر خاں کی ناشائستہ حرکت کی بنا پر بادشاہ نے سخت گیری کی۔ اب تک اس نے تغلق کے تمام طرفداروں کو خواہ ہندو ہوں یا مسلمان معاف کر دیا تھا اور انھیں جاگیریں اور دیگر مراعات دے کر راضی کر لیا تھا مگر اب معاملہ خود اس کے ایک سالار کی اس کے خلاف بغاوت کرنے کا تھا اور ملک کا نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے سخت کارروائی کی ضرورت تھی چنانچہ اس وجہ سے اس نے باوجود سکندر کی سفارش کے قیر خاں کا سر اپنے سامنے قلم کرا دیا۔ اس اثنا میں کالے محمد بھاگ کر کوہیر میں قلعہ بند ہو گیا اور بادشاہ نے فوراً بڑھ کر قلعہ کو تسخیر کر لیا۔[13]

اب بادشاہ گلبرگہ واپس آیا اور اس کا نام بدل کر احسن آباد رکھا اور اسے دکھن کی سلطنت کا مستقر قرار دیا[۱۴۹]۔ اس شہر کی قلعہ اور بعض دوسری مذہبی عمارات کی تعمیر سے پہلے ہی آرائش ہو چکی تھی[۱۵۰]۔

بادشاہ کی زندگی کے آخری دن

بادشاہ کی زندگی کے آخری ایام اس کی شمال، جنوب اور مغرب کی مہمات میں صرف ہوئے۔ گوا پر پانچ یا چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد قبضہ ہو سکا اور یہ قبضہ غیر مستقل ثابت ہوا اس لیے کہ اگلی صدی کے آخر میں اسے محمود گاواں کو پھر سے فتح کرنا پڑا۔ سلطان نے واپسی میں دابول کی تسخیر کی (جو اب بہمنی سلطنت کا خاص بندرگاہ ہوگیا) اور کلہار اور کولھاپور کو فتح کیا۔ یہ مہم غالباً اس خراج کو وصول کرنے کے لیے کی گئی جو وجے نگر کے ذمہ باقی تھا لیکن وجے نگر نے روپیہ پیسہ دے کر اپنی نوزائیدہ سلطنت کو بچا لیا[۱۵۱]۔

شمال میں سلطان مانڈو تک گیا جو عنقریب سلاطین مالوا کے ماتحت ہندوستان کا ایک ثقافتی مرکز بننے والا تھا اور وہاں کے لوگوں سے خراج وصول کیا[۱۵۲]۔

مشرق میں وہ تلنگانہ پر ٹوٹ پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھتا چلا گیا اور بھکلی راجہ اردا سے بھڑ گیا جو دور مشرق کی طرف نیلور کی ایک ریاست کا حکمران تھا۔ شاید اس نے ورنگل پر قبضہ کر لیا مگر دریائے کرشنا پر دھرنی کوٹہ میں کونڈا ویڈو کے اناووٹا کے ایک افسر کاتیا ویما کے ہاتھوں شکست کھائی اور پھر بھکتی راجہ نے اُسے پیڈا کنڈا میں شکست دے دی۔ اب اُسے پیچھے ہٹنا پڑا اور صرف تلنگانہ کے مغربی حصے پر بھونگیر تک قابض رہنے پر قانع ہونا پڑا[۱۵۳]۔

بہمنی سلطنت کی وسعت

علاء الدین کے انتقال کے وقت اس کے براہ راست قبضہ میں جو مملکت تھی وہ شمال میں مانڈو سے لے کر مغرب میں دابول اور گوا تک پھیلی ہوئی تھی اور کرشنا کے کنارے کے رائے اور ورنگل کے رائے اُسے خراج دیتے تھے۔ اُس نے اپنی سلطنت کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا: (۱) احسن آباد گلبرگہ معہ رائچور اور مدگل کے، وزیر سیف الدین غوری کی سپردگی میں تھا (۲) دولت آباد معہ بیڑ، جنیر اور چال کے بادشاہ کے بھتیجے محمد بن علی شاہ کے پاس (۳) برار اور ماہولی صفدر رجال سیستانی کے ماتحت اور (۴) اندور، کولاس اور بہمنی تلنگانہ کا الگ صوبہ بنا کر ملک سیف الدین غوری کے لڑکے اعظم ہمایوں

کو سپرد کیا گیا[۱۲۴]

علاء الدین کی حکومت کے حالات سے نئے دکن کے حکمران کے کردار کا اظہار ہوتا ہے۔ اُس کی تمام مہموں میں سے کسی ایک میں بھی خواہ وہ تغلق کے طرفداروں کے خلاف ہوں یا ہندو راجاؤں اور مقدموں کے خلاف ظلم کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا اور بیشتر ایسا ہوا کہ جنگ کے خاتمہ پر خود بادشاہ یا اس کے نمایندہ نے مفتوحہ ریاست پھر اُسی کو واپس کر دی جو اب تک دشمن رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ورنگل کے رائے جیسے طاقتور حکمران نے بلا کسی کشت و خون کے بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ قبول کر لیا اور نئی سلطنت کے معزز دوست اور حلیف سمجھے جانے لگے۔ جیسا کہ عصامی نے کہا ہے علاء الدین میں اچھے بادشاہوں کی تینوں صفات تھیں یعنی وہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد کرتا تھا، غریبوں پر مہربانی کرتا تھا اور احکام خداوندی کی پیروی کی پوری کوشش کرتا تھا[۱۲۵]

خود اس کے ماتحت جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت یا سازش کی ان سے جو سلوک اُس نے کیا وہ الگ بات ہے۔ اُن پر وہ بڑی سختی کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پہلے کے ہمسر اور رفیق سخت ضابطہ کے ماتحت رہے۔ چنانچہ اس نے سکندر کی سفارش کے باوجود کہ قیر خاں کی جان بخشی کی جائے اُس نے دوسروں کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے اس کا سر قلم کرا دیا۔ یہی حال اس کے پیشرو شمس الدین سابق سلطان ناصر الدین اسماعیل کا ہوا جس پر بادشاہ کے خلاف سازش میں شرکت کا الزام تھا — بادشاہی سے دست بردار ہونے کے بعد سے اسماعیل امیر الامرا اور سلطنت کا ممتاز امیر تھا۔ اُسے شاہی دربار میں بادشاہ کے بائیں جانب جگہ ملتی تھی اور جب وہ دربار میں داخل ہوتا تو ادب کے طور پر بادشاہ چند قدم آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتا لیکن جب ملک سیف الدین غوری وزیر اعظم مقرر ہوا تو اُسے اسماعیل پر فوقیت دی گئی اس لیے کہ جیسا بادشاہ نے کہا پُرانے بادشاہوں کا دستور تھا کہ وزیر اعظم کو امیر الامرا پر فوقیت دیتے تھے۔ اس پر اسماعیل خاموش تو ہو گیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اور لوگوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کرنے پر بھڑکایا۔ بادشاہ کو صورت حال کا پتہ چل گیا اور اس نے اسماعیل کو بھرے دربار میں طلب کیا اور کئی ممتاز امرا کو جمع کیا اور اسماعیل سے پوچھا کہ کیا وہ بادشاہ کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اسماعیل نے قسم کھا کر کہا کہ وہ بالکل بے قصور ہے اور الزام سراسر جھوٹا ہے اس پر بادشاہ نے حاضرین سے خطاب کیا اور وعدہ کیا کہ جو شخص سچ سچ کہہ دے گا اُسے قطعی معافی دی جائے گی۔ چنانچہ کئی امرا نے شہادت دی کہ اُن کے علم و یقین میں الزام بالکل صحیح ہے جس پر بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے تلوار کا وار کر کے اسماعیل کو قتل کر دیا[۱۲۶] دکن کے بھرے دربار میں یہ پہلی سزائے موت

تھی اور خواہ یہ کتنی ہی حق بجانب ہو اس میں شک نہیں کہ دوسرے بہمنی بادشاہوں کے لیے جو محتاط نہ تھے ایک مثال قائم ہو گئی کہ اپنے بعض بہترین وزیروں اور لوگوں کو اس طرح ختم کر دیں۔

ولی عہد سلطنت کی شادی

بادشاہ کے تزک و احتشام کے اہتمام کا اندازہ ان شاندار ضیافتوں سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے لڑکے اور وارث ظفر خاں کی جو بعد کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ملک سیف الدین غوری کی لڑکی سے جو بعد کو شاہ بیگم ملقب ہوئی شادی کے موقعہ پر کیں۔ یہ شادی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس سے ان سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے جو اس وقت رائج تھے۔ ولی عہد سلطنت کی شادی ۲۴ ربیع الثانی ۷۵۲ھ (۲۰ جون ۱۳۵۱ء) کو ہوئی لیکن اس مبارک تقریب میں ضیافتوں اور جشن مسرت کا سلسلہ پورے سال بھر ۲۳ ربیع الثانی ۷۵۳ھ (۸ جون ۱۳۵۳ء) تک قائم رہا جب کہ بادشاہ نے ہزاروں تھان زربفت، مخمل اور ریشم کے اور ایک ہزار عرب اور عراقی گھوڑے اور بارہ مرصع تلواریں اپنے امرا میں تقسیم کیں اور خاص و عام کو غلہ تقسیم کیا گیا اور دار السلطنت کے غربا اور محتاجوں کو پکا ہوا کھانا کھلایا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکھن میں ہندو اور مسلمان پہلے ہی ایک دوسرے کے گہرے دوست ہو گئے تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ شاہی ضیافت میں تلنگانہ، شکر کھیڑا اور مدگل کے رائے بھی مدعو تھے۔ اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ علاء الدین کی جوانی کا زمانہ ملتان میں گذرا تھا اور شاید اس کی شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ جب ولی عہد کی شادی کی تقریبات شروع ہوئیں تو علاء الدین کی ملکہ ملکہ جہان نے اپنی بہن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو اب تک ملتان ہی میں تھی بادشاہ نے فوراً انتظام کیا کہ اسے گلبرگہ بلایا جائے۔ جب یہ خاتون سات ماہ میں گلبرگہ پہنچی تو ملکہ دکن جن سے سارے انتظامات پوشیدہ رکھے گئے تھے حیرت زدہ ہو گئیں اور بہت خوش ہوئیں[۴۹]

شاہی دسترخوان

ان تقریبات کے موقع پر شاہی مہمانوں کو جو کھانا دیا گیا اس کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حسن اتفاق سے ہمیں ان کھانوں کی فہرست مل گئی جو دوسرے موقعوں پر شاہی دسترخوان پر ہوتے تھے۔ جب علاء الدین علی بیگ نتھو اور محمد بن عالم کی بغاوت فرو کرتے ہوئے راستہ میں گلبرگہ پہنچا تو وزیر خواجہ جہاں نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور اپنے آقا بادشاہ کی ضیافت کے لیے شاندار پُرتکلف کھانا تیار کیا۔

ٹھیک آٹھ پہر دن گذرنے پر قرنا بجا کہ کھانا تیار ہے۔ شجر ریشمی کپڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اور روٹیاں برابر تقسیم کر دی گئیں۔ اس کے بعد مختلف قسم کے بھنے ہوئے کھانے اور گرما گرم سالن کا شوربہ، ترکاریاں، خام اجمود، سلاد اور شکار کے چھوٹے بڑے جانوروں کے گوشت، یخنی اور مختلف قسم کے سالن رکھے گئے۔ کھانے کے آخر میں خشک و تر مٹھائیاں اور حلوے لگائے گئے۔ یہ ضیافت صرف شاہی مہمان اور امرا کے لیے نہ تھی بلکہ گلبرگہ کے خاص و عام باشندے بلا تفریق بلائے گئے تھے۔ کھانا ختم ہونے پر پان تقسیم کئے گئے اور امرا اور فوجی سالار بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے گئے[50]

علاء الدین کی وفات

بادشاہ یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ (۱۱ فروری ۱۳۵۸ء) کو ۵۱ سال کی عمر میں ضعیفی اور تکان سے فوت ہو گیا۔ وہ بالکل خود ساختہ انسان تھا اور ایک سیاسی خلا کے دور میں جب کہ چھوٹے چھوٹے حکمران اور قسمت آزما ہر طرف ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے اپنی محنت، سوجھ بوجھ اور نظم و ضبط کے احساس کے ساتھ ایک نئی سلطنت قائم کر کے مستحکم کر لی جو ہزاروں مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی جب کسی نے اُس سے پوچھا کہ اس کی اس شان دار کامیابی کا راز کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہر ایک کے ساتھ خواہ دوست ہو یا دشمن مہربانی کا سلوک اور غریبوں اور محتاجوں کو فیض پہنچانا[51]۔ جیسا کہ عصامی نے کہا ہے اُس کے کردار کی دو خصوصیات انصاف اور فیض رسانی تھیں[52] اُسے شکار کا بہت شوق تھا لیکن شکار کھیلتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص اس کے پاس عرضی لے کر آتا تو وہ اس کی سماعت کرتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ جیسی خود اس کی محنت کش زندگی تھی ویسی ہی اُس کے امرا کی بھی ہو جائے اور وہ اکثر کہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ شکار کو اس لیے جاتا تھا کہ اُس کے امرا بھی تکلیف اٹھانے کے عادی ہو جائیں[53]
وہ مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے حکم دیا کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت کے عوض جزیہ نہ لیا جائے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ غلہ اور ہر قسم کے مویشی و پیداوار اس کی سلطنت میں بلا محصول کے آیا کریں[54]۔ بظاہر اُسے دکھن کے آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ۲۵ شوال ۷۵۳ھ (۱۴ فروری ۱۳۵۲ء) کو وہ ایلورہ کے غاروں کو دیکھنے گیا اور اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو لے گیا جو کتبوں کو پڑھ سکیں اور دیواروں پر منقش تصاویر کے مفہوم کو بتا سکیں[55]۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں ہی کے لیے فیض رساں نہ تھا بلکہ ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں اُس نے مکہ معظمہ میں ایک رباط بھی بنوائی[56]
چنانچہ اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ عصامی کی یہ دعا اللہ تعالےٰ

نے قبول کرلی کہ "میں خالق کائنات اللہ تعالیٰ سے جس کی قدرت سے زمین و آسمان اور کون و مکاں قائم ہیں یہ دعا کرتا ہوں کہ تیرا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہو جائے اور رہتی دنیا تک باقی رہے۔"

بستر مرگ پر اُس نے اپنے تینوں لڑکوں محمد، محمود اور داؤد کو بلایا اور نصیحت کی کہ جو سلطنت اس نے قائم کی ہے اگر وہ اُسے باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں ایک جان دو قالب ہو کر رہنا چاہیے اور دو چھوٹے لڑکوں کو ہدایت کی کہ وہ ولی عہد سلطنت محمد کی اطاعت کریں۔ اس کے بعد اُس نے انھیں روپیہ اور استعمال کی چیزیں دیں اور حکم دیا کہ گلبرگہ کی جامع مسجد میں جا کر ان چیزوں کو حاجت مندوں میں تقسیم کردیں۔ جب تینوں لڑکوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ انھوں نے حکم کی تعمیل کردی ہے تو اُس نے الحمدللہ کہا اور ختم ہو گیا۔[5]

علاء الدین کا مقبرہ

بہمن شاہ کو ایک مقبرہ میں دفن کیا گیا جو قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے جہاں اُس کے پیر شیخ سراج الدین جنیدی کے مزار کے دو بڑے مینار دور سے نظر آتے ہیں۔ مقبرہ کے اندر تین قبریں ہیں جن میں سے ایک یقیناً پانچویں حکمران محمد دوم کی ہے اور دوسری دو چار فٹ بلند ایک چبوترے پر ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی مرحوم نے جو یہ قیاس کیا ہے کہ پہلے بہمنی حکمران کی قبر چار فٹ بلند چبوترے پر ہے[6] وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاس کی چھوٹی قبر میں دفن ہے۔ بہمن شاہ نے نیچے کے درجہ سے ترقی کی اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے سادگی کی زندگی بسر کی لیکن اُس کا جانشین محمد اوّل سخت مزاج تھا اور اُسے اپنے منصب اور وقار کا بڑا لحاظ تھا۔ اس لیے یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ پہلے بہمنی حکمران نے ایک بلند چبوترے پر بڑی قبر میں دفن ہونا پسند کیا ہو جس کا بیرونی قطر ۴ء۴ فٹ ۶ اِنچ مربع ہو اور دوسرا حکمران جو سب حکمرانوں میں درشت مزاج تھا وہ چھوٹی سی قبر پر قانع ہو گیا ہو جس کا قطر صرف ۲۶ فٹ مربع ہے۔ ان دو قبروں کے طرز تعمیر ہی سے واضح ہوتا ہے کہ سطحی قبر پہلے بہمنی حکمران کی ہے اس لیے کہ وہ تغلق طرز کی ہے جس کی دیواریں بنیاد کی طرف بہت موٹی یعنی آٹھ فٹ کی ہیں اور گنبد کے اوپر ٹوٹے ہوئے کلس کے نشانات تغلق طرز کے ہیں اور اندرونی حصہ بالکل سادہ ہے۔ یہ تمام باتیں بالکل واضح ہیں۔ برعکس اس کے چبوترے کی ساخت زیادہ خوشنما ہے اور اس لیے شاید بعد کی ہے۔ کیوں کہ اس میں دیوار ول

کی موٹائی معمولی ہے اور اندر کا نچلا حصہ مربع ہے جو اونچا ہو کر ہشت پہل ہو گیا ہے اور چاروں کونوں پر اندرونی محرابوں پر ٹھہرا ہوا ہے۔ مزید برآں اندرونی حصہ کی آرائش میناکاری کی اینٹوں سے کی گئی ہے جن پر یکے بعد دیگرے دایرے اور الماس کے نقش ہیں، شاید سلطنت اور دولت کے اظہار کے لیے۔ تابوت کی شکل بھی زیادہ خوبصورت اور فنکارانہ ہے۔ ان قابل لحاظ امور کے ماسوا یہ امر واقعہ ہے کہ نچلی قبر شیخ سراج کے مقبرہ کے ٹھیک جنوب میں ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ مرید نے اپنی قبر کا خاکہ ایسا بنایا ہو کہ وہ اس کے پیر کے مزار کے بالکل سیدھ میں ہو اور مرید کا چہرہ پیر کے چہرہ کے آمنے سامنے ہو۔

ان تمام مشاہدات اور نیز مقامی روایات کی بنا پر ہم اس قرین قیاس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ علاءالدین بہمن شاہ نچلی قبر میں دفن ہے اور اس کا نامور لڑکا بلند تر قبر میں۔

تشریحات

۱۔ عصامی۔ فتوح السلاطین، سطر ۱۰۲۸۔ صرف یہی ایک معاصر تاریخ ہے جو دکھن میں لکھی گئی۔
رے خیال میں انتخاب قطعاً جمہوری طریقہ پر نہیں ہوا جیساکہ صدیقی نے آرگنائزیشن آف دی بہمنی گورنمنٹ
ے مقالہ میں لکھا ہے جو اورئنٹل کانفرنس منعقدہ میسور ۱۹۳۵ء میں پڑھا گیا اور روئیداد کے صفحہ ۴۷۶ میں ہے۔

۲۔ فرشتہ جلد اول صفحات ۲۷۳ و ۲۷۴۔

۳۔ کنگ۔ ہسٹری آف دی بہمنی ڈائی نسٹی۔

۴۔ فرشتہ کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں بہمنیوں کا حال ہے سنہ ۱۰۱۹ھ اور سنہ ۱۰۱۵ھ میں لکھا گیا (فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۸) حالانکہ برہان مآثر ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۲ء) میں مکمل ہو گئی تھی۔

۵۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۸، اور طبقات اکبر شاہی کا بیان ہے کہ گنگو بہمنی کا لقب بادشاہ کی کوٹھی پر کندہ تھا مگر اس کی تصدیق میں کوئی اور شہادت نہیں ہے۔

۶۔ ایسے قصوں میں سے ایک کا ذکر برہان میں ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا نے نوجوان حسن کے لیے دشاہی کی پیشگوئی کی تھی اور مولانا رفیع الدین خیرازی نے اپنی کتاب تذکرۃ الملوک کے فولیو ۶ (الف) میں جو ۸۷۶ھ (۱۴۷۱ء) میں بمقام بیجاپور لکھی گئی تھی کئی واقعات میراج میں حسن کی شیخ سراج جنیدی کی خدمت کے بیان کیے گئے ہیں جنھوں نے پیشگوئی کی تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن تخت نشین ہوگا۔

۷۔ حسن ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ء) میں پیدا ہوا تھا۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۲۸۱ میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ میں ۶۷ سال کی عمر میں ہوا۔ عبدالجبار نے اپنی کتاب محبوب الوطن میں عین الدین بیجاپوری کی کتاب ملحقات طبقات ناصری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حسن کی پیدائش ۶۹۱ھ میں ہوئی۔

۸۔ کاکویہ امین احمد رازی کی کتاب ہفت اقلیم مخطوطہ آصفیہ شعبہ تاریخ نمبر ۲۲۴۱ میں ہے۔ نیز دیکھو ریو کی فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم جلد اول صفحہ ۳۳۵ بی۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون جلد چہارم

صفحہ ۵۰۱ میں اس کتاب کی تکمیل کی تاریخ سنہ ۱۰۱۱ھ (سنہ ۱۶۰۲ء) بتائی ہے۔ کاکویہ کی اس تشریح کے متعلق دیکھو جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۶۳۔ محمد علی برہان پوری کی کتاب مرأۃ الصفا مخطوطہ آصفیہ شعبہ تاریخ نمبر ۴۰۱ میں ہے کہ علاء الدین کیکادس امین محمد علی کا لڑکا تھا۔

۹۔ یہ مسٹر کھرے اور مسٹر اوٹورکار کی تشریح ہے۔ دیکھو روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس کلکتہ سنہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۰۴۔

۱۰۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم صفحہ ۶۶۷۔

۱۱۔ برہان مآثر جلد دوم۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۱۔

۱۲۔ عصامی، صفحہ ۵۲۲۔ اسی سکہ (ٹنکہ) پر جو حیدر آباد میوزیم میں ہے حسب ذیل عبارت ہے:

اوپر کی طرف: السلطان الاعظم علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ۔

نیچے کی طرف: سکندر ثانی یمین الخلافت ناصر امیر المومنین۔ ضرب بحضرۃ احسن آباد۔

نیز دیکھو اسلامک کلچر حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۸۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۲۔ گلبرگہ کی ایک مسجد کا کتبہ "سلطان علاء الدنیا والدین ابو المظفر بہمن شاہ السلطان" فرشتہ کے بیان پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھو شیروانی کا مقالہ 'گنگو بہمنی' جرنل آف انڈین ہسٹری' اپریل سنہ ۱۹۴۱ء صفحہ ۹۵۔ نیز دیکھو عبد اللہ چغتائی کا مضمون بانی سلطنت بہمنیہ' برہان' دہلی' اپریل سنہ ۱۹۴۱ء۔

۱۳۔ بلگام ریاست کرناٹک میں اسی نام کے ضلع کا مستقر ۱۵ر۵۱ شمال' ۳۲ر۷۴ مشرق۔ بکیری ریاست کرناٹک کے ضلع بلگام میں رائے باغ سے تیس میل جنوب۔

۱۴۔ عصامی، صفحہ ۵۲۶۔

۱۵۔ فرشتہ صفحہ ۲۷۷۔ اس کا ذکر برہان یا عصامی نے نہیں کیا ہے۔

۱۶۔ ان سارے حکام کے نام بجز پراسرار گنگو برہمن کے عصامی کے صفحات ۵۲۳ لغایت ۵۲۷ میں درج ہیں۔ نیز دیکھو برہان مآثر صفحہ ۱۶۔ گنگو کا نام صرف فرشتہ کے صفحہ ۲۷۸ میں ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ سلطنت کی تنظیم اگلے بادشاہ کے وقت سے پہلے تک مکمل نہیں ہوئی تھی۔

۱۷۔ فرشتہ صفحہ ۲۷۹۔ عبد الجبار (صفحات ۱۰۸ و ۱۹۳) نے ملا داؤد بیدری کی کتاب تحفۃ السلاطین کا ذکر کیا ہے جس سے فرشتہ نے بہت استفادہ کیا ہے اور بہت سے اقتباسات دیے ہیں مگر مجھے یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔

۱۸۔ عصامی صفحات ۵۲۸ و مابعد۔ برہان مآثر صفحہ ۱۶۔ واضح ہو کہ حسین کو گرشاسپ کا خطاب سنہ ۷۴۳ھ

(۱۳۲۶ء) میں بہاء الدین گرشاسپ کی محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کی یاد دہانی کے لیے دیا گیا تھا ملک سیف الدین غوری کے بارے میں دیکھو صدیقی کا مقالہ روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ کلکتہ صفحہ ۷۰۱۔ کوہیر جسے برہان مآثر میں غلطی سے کوتیر کہا گیا ہے۔ ریاست اندھرا پردیش کے ضلع بیدر میں ہے۔ ۳۶ر۱۷ شمال، ۵۸ر۷۶ مشرق۔ کونگیر ریاست اندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد میں منجیرا سے تقریباً چار میل مشرق میں ہے۔ ۲۵ر۱۸ شمال، ۵۳ر۷۷ مشرق

۱۹۔ عصامی صفحہ ۵۳۱۔ برہان صفحہ ۱۶۔ بودھن ریاست اندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد میں ایک تعلقہ کا مستقر ہے۔ ۴۰ر۱۸ شمال، ۵۳ر۷۷ مشرق۔ مارم ریاست مہاراشٹر کے ضلع عثمان آباد میں دریائے بینی تھورا پر ہے۔ ۴۷ر۱۷ شمال، ۲۹ر۷۶ مشرق۔

۲۰۔ عصامی صفحہ ۵۳۲۔ برہان صفحہ ۱۷۔ سید آباد اکل کوٹ پہلے اس نام کی ایک ریاست کا مستقر تھا اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۳۱ر۱۷ شمال، ۱۵ر۷۶ مشرق۔ مہندری شاید موجودہ درگی ہے جو اب مہاراشٹر میں ہے۔ ۲۷ر۱۷ شمال، ۱۷ر۷۶ مشرق۔

۲۱۔ عصامی صفحہ ۵۳۲۔

۲۲۔ عصامی صفحہ ۵۳۳۔ برہان صفحہ ۱۷ میں ۵۰ دن ہے۔

۲۳۔ عصامی صفحہ ۵۳۳۔ دیکھو رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۳۲۹ء فصلی صفحات ۵۲ اور ۵۳ جس میں کہا گیا ہے کہ فتح آباد شاید دھرور کا اعزازی نام ہے لیکن دراصل دھرور کا یہ نام شاہجہان کی حکومت سے پہلے نہ تھا۔ فتح آباد مدتوں تک پراسرار رہا اور اگرچہ اس نام کے کئی مقامات ہیں مگر سب مشتبہ ہیں۔ یہ مقام جو دارالضرب ہونے کی اہمیت کا تھا اس کے جائے وقوع کے تعین میں، جو دقت تھی وہ سب سے پہلے شیروانی نے اپنی کتاب محمود گاواں کے صفحہ ۵۸ میں حل کی جہاں قطعی طور پر کہا گیا ہے کہ دولت آباد کو فتح آباد کا نام دیا گیا تھا اس لیے کہ برہان کے صفحہ ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ نام کی یہ تبدیلی کلیانی کے مستحکم قلعہ کی تسخیر کی یادگار میں ہوئی۔ فتح آباد کے دارالضرب کے صرف آٹھ سکے ملے ہیں۔ دو حیدر آباد میوزیم میں ہیں، دو پرنس آف ویلز میوزیم بمبئی میں اور چار برٹش میوزیم میں ہیں اور یہ سب محمد اوّل کی حکومت کے ہیں۔

۲۴۔ عصامی صفحہ ۵۳۴۔

۲۵۔ "تلنگانہ کا کابا" عصامی صفحہ ۵۳۵۔ برہان صفحہ ۱۸۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۸ میں اُسے ورنگل کا راجہ کہا گیا ہے۔ وہ دراصل کپایا نایک ورنگل کا خود مختار حکمران تھا۔ دیکھو رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۳۳۴ء فصلی جس میں اُس مسی تختی کی گرانٹ کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا ذکر جرنل آف بہار اینڈ اوڑیسہ ریسرچ سوسائٹی

جلد ۲ کے صفحات ۹۲۸ – ۹۲۹ میں ہے۔

۲۶۔ عصامی صفحات ۵۳۷ – ۵۳۵ – برہان صفحہ ۱۷ – فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۸۔

۲۷۔ عصامی صفحہ ۵۴۲ – برہان صفحہ ۱۸۔

۲۸۔ اس واقعہ کی تاریخ کا تعین ہم ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) کر سکتے ہیں کہ بادشاہ جب ساگر جاتے ہوئے گلبرگہ پہنچا تو اُس نے محمد بن تغلق کے انتقال کی خبر سنی جو اسی سال دریائے سندھ کے کنارے ۲۱؍محرم ۷۵۲ھ (۲۱؍مارچ ۱۳۵۱ء) کو واقع ہوئی تھی۔ اس واقعہ نے ان لوگوں کی کمر توڑ دی ہوگی جو اب تک بہمنی اقتدار کے مخالف تھے۔

۲۹۔ ساگر گلبرگہ سے تقریباً ۷۰ میل اسی نام کے ضلع شاہپور تعلقہ میں۔ ۳۷؍۱۶ شمال، ۴۸؍۷۶ مشرق۔

۳۰۔ شیخ عین الدین بیجاپوری دکھن کے ایک ممتاز بزرگ اور کثیر التصانیف ملحقات طبقات ناصری کے مصنف ہیں۔ پیدائش دہلی ۷۰۶ھ (۱۳۰۶ء)۔ وفات بیجاپور ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ء)۔ ان کے مزار کی تعمیر محمود گاواں نے کی۔ عبدالجبار، تذکرہ اولیائے دکھن جلد اوّل صفحہ ۵۳۔

۳۱۔ عصامی صفحہ ۵۵۱۔ اس ساری مہم کا حال صفحات ۵۴۳ لغایت ۵۵۰ میں ہے۔ نیز برہان مآثر صفحات ۱۹ لغایت ۲۱۔

۳۲۔ یہ عصامی کا بیان ہے صفحہ ۵۵۲۔ کھیم بھاری ریاست کرناٹک کے ضلع گلبرگہ میں۔ ۳۷؍۱۶ شمال، ۲۲؍۷۶ مشرق۔ مدھول اب مہاراشٹر میں ہے۔ ۲۰؍۱۶ شمال، ۱۹؍۷۵ مشرق۔

۳۳۔ یہ عصامی کا بیان ہے صفحہ ۵۵۴۔ برہان صفحہ ۲۲ میں معین الدین ہے۔

۳۴۔ جام کھنڈی، اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۳۰؍۱۶ شمال، ۲۲؍۷۵ مشرق۔ باگل کوٹ ریاست مہاراشٹر کے ضلع بیجاپور۔ ۱۱؍۱۶ شمال، ۴۴؍۷۵ مشرق۔

۳۵۔ اپٹے کی مدھول سنستھان چیا گھوڑپاڑے چرنچیا اتیہاس۔ مطبوعہ پونہ ۱۹۳۴ء فرمان نمبر ۱۔

۳۶۔ یہ قدر خاں نہیں ہے جیسا کہ برہان کے صفحہ ۲۴ میں ہے۔

۳۷۔ اس ساری مہم کی تفصیل عصامی کے صفحات ۵۵۰ لغایت ۵۶۱ میں اور برہان کے صفحات ۲۱ لغایت ۲۴ میں ہے۔

۳۸۔ عصامی صفحات ۵۶۳ – ۵۶۱ – برہان صفحہ ۲۵۔ سال کا شمار اس کے مختلف مقامات کے قیام سے کیا گیا ہے۔ مالکھیر ضلع گلبرگہ میں۔ ۱۲؍۱۷ شمال، ۰۹؍۷۷ مشرق۔ سیرم کرناٹک کے ضلع گلبرگہ میں۔ ۱۱؍۱۷ شمال، ۱۸؍۷۷ مشرق۔

۳۹۔ قیر خاں کی بغاوت۔ عصامی صفحات ۵۶۷ – ۵۶۳ – برہان صفحات ۲۷ – ۲۵۔

۴۰۔ یہ برہان مآثر کا بیان ہے۔ یہ واقعہ ۹ ربیع الاول ۷۵۱ھ (۱۴ مئی ۱۳۵۰ء) کے بعد کا ہوگا جب کہ عصامی نے اپنی تصنیف کی تکمیل کی۔ دیکھو مہدی حسین کا مقدمہ (صفحات ۲۰ و ۲۱)۔ عصامی نے دارالسلطنت کے دولت آباد سے گلبرگہ منتقل ہونے کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔

۴۱۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۲۸۰ میں لکھا ہے کہ گلبرگہ کی عظیم مسجد علاءالدین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ دکھن کی فن تعمیر کا شاندار نمونہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ نیز دیکھو اس مبحث پر یزدانی کا مضمون جنوری ۱۹۲۵ء کے اسلامک کلچر میں۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ مسجد کی تعمیر شروع میں علاءالدین نے کی ہو اور بعد کو اس کے جانشین نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہو۔

۴۲۔ وجے نگر کے خراج کا ذکر اور تفصیل سے آگے آئے گا۔ دیکھو انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ الہ آباد کی روئیداد کے صفحہ ۴۲۶ میں گرتی ونکٹ راؤ کا مضمون بہمنی وجے نگر کے تعلقات پر۔ گوا جو پہلے پورنگیر ہندوستان کا مستقر تھا۔ ۲۰-۱۵ شمال، ۵۷-۷۲ مشرق۔

۴۳۔ برہان صفحہ ۲۷۔ مانڈو یا مانڈو گڑھ جس کا نام شادی آباد بھی ہے اب مدھیہ پردیش میں ہے۔ ایک زمانہ میں مالوا کا دارالسلطنت رہا ہے۔ ۲۲-۲۱ شمال، ۲۶-۵۷ مشرق۔

۴۴۔ دیکھو ایپی گریفیا انڈیکا جنوری ۱۹۲۱ء میں ونکٹ رام نیا کا مقالہ راجہ مندری کی تختیاں تیلگو چوڑا اناد یوا پر صفحات ۱۰۸ مابعد خصوصاً صفحہ ۲۵۔ معلوم ہوتا ہے کہ ونکٹ رام نیا کو "وابروخانو" نام کے مفہوم میں اشتباہ ہے جو ان تختیوں پر درج ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ شاید علاءالدین کا کوئی افسر ملازم ہوگا لیکن دابروخالو کو خود علاءالدین بہمن شاہ سے تشخص کرنے میں مطلق کوئی دشواری نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ تخت نشین ہونے سے پہلے اس کا لقب ظفر خاں تھا۔ دیکھو اس کے پیشتر دوسرا باب۔ برہان صفحہ ۲۷۔ بھونگیر اب ریاست اندھرا پردیش کے ضلع نلگنڈہ میں اسی نام کے تعلقہ کا مستقر ہے۔ ۱۷-۳۱ شمال، ۵۳-۷۸ مشرق۔ دھرنی کوٹہ ضلع کرشنا ریاست اندھرا پردیش میں دریائے کرشنا امراوتی کے مضافات میں۔ ۳۵-۱۶ شمال، ۲۶-۸۰ مشرق۔ پیڈاکونڈا اندھرا پردیش کے ضلع مشرقی گوداوری کے تعلقہ بھدراچلم میں۔ نیلور اندھرا پردیش کے ایک ضلع کا مستقر۔ ۲۷-۱۴ شمال، ۸۰-۱ مشرق۔

۴۵۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۸۰۔ بھونگیر اس وقت تک سلطنت بہمنی کا آخری سرا تھا اس لیے کہ اس قلعہ کے آگے کمپیا نایک یا کرشنا نایک کی ریاست تھی جس سے علاءالدین کے خوشگوار تعلقات تھے۔ جونیر جو بعد کو سلطنت احمد نگر کا مستقر ہوا۔ اب ضلع پونہ میں ہے۔ ۱۲-۱۹ شمال، ۲۵-۷۴ مشرق۔ چاول ریاست مہاراشٹر کے ضلع کولابہ میں۔ ۳۳-۱۸ شمال، ۴۰-۷۳ مشرق۔ ماہور ریاست اندھرا پردیش میں برار کی سرحد پر

ضلع عادل آباد میں ہے۔ ۵۰ر۱۹ اشمال، ۶ر۸۰ ۷مشرق۔ اندور جواب نظام آباد کہلاتا ہے۔ ریاست اندھرا پردیش میں ایک ضلع کا مستقر ہے۔ ۴۰ر۱۸ اشمال، ۶ر۸۰ ۷مشرق۔ کولاس، ضلع بیدر میں۔ ۲۰ر۱۸ اشمال، ۴۲ر۷۷ مشرق۔

۴۶۔ عصامی صفحہ ۵۴۶۔

۴۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۹۔ اس وقت بھی بادشاہ نے اپنی نیک مزاجی سے اسماعیل کی اولاد پر ترس کھایا اور اس کی جگہ اُس کے لڑکے کو امیر الامرا بنا دیا۔

۴۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۸۔ عبدالجبار صفحہ ۹۴ بحوالہ ملحقات۔

۴۹۔ عصامی صفحہ ۵۴۹۔

۵۰۔ بادشاہ کے انتقال کی تاریخ۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۱۔ قبر پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ اس بادشاہ کے سنہ ۷۶۰ھ کی تاریخ کے دو سکے ہیں جس کے لیے دیکھو۔ عبدالولی خاں کی کتاب بہمنی سکے صفحہ نمبر ۱۲ و ۱۳۔

۵۱۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۱۔ بحوالہ ملحقات۔

۵۲۔ عصامی صفحہ ۵۷۵۔

۵۳۔ عبدالجبار صفحہ ۱۲۱۔ بحوالہ ملحقات

۵۴۔ ایضاً صفحہ ۱۴۰۔

۵۵۔ ایضاً صفحہ ۱۴۷۔

۵۶۔ ایضاً صفحہ ۲۱۴۔

۵۷۔ بحق خداوند کون و مکاں ... کہ موجود از وشد زمین و زماں
چو نامے تو اقصائے عالم تمام ... بگیرد شود مونس خاص و عام

۵۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۱۔

۵۹۔ رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۲۶-۱۹۲۵ء صفحات ۱ و ۲۔

چوتھا باب

سلطنت کی تنظیم

محمد اوّل

(۱۱ر فروری ۱۳۵۸ء سے ۲۱ر اپریل ۱۳۷۵ء)

(الف) کلچرل حالات

نیا بادشاہ

جیسا کہ پیشتر معلوم ہوا ہوگا جس وقت ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) میں علاء الدین بہمن شاہ تخت نشین ہوا اُس وقت دکن میں دو ممتاز گروہ تھے اور وہ سب اس خلفشار کی حالت سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک تو وہ جو نئے شاہی خاندان کے ماتحت دکھن کی آزادی کا حامی تھا اور دوسرا وہ جو تغلق کے حامیوں کے ساتھ تھا اور تیسرے وہ مقامی رئیس اور مقدم جو خود اپنے حصول اقتدار کا خواب دیکھ رہے تھے۔ علاء الدین نے تمام مخالف عناصر پر قابو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور اپنے لڑکے محمد شاہ کے لیے ایسی سلطنت چھوڑی جو موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ پُرامن ہو سکتی تھی۔ علاء الدین نے تلنگانہ[۱] اور وجے[۲] نگر کے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات رکھے اور وجے نگر سے تو اتنے اچھے

تعلقات تھے کہ اُسے ولی عہد سلطنت کی شادی میں مدعو کیا گیا لیکن تلنگانہ کے رائے نے بہمنیوں سے دوستانہ تعلقات کے رجحان کی علامت کے طور پر ایک بیش قیمت عقیق بھیجا جسے محمد نے ایک مرصع ہما (طایر خوش بختی) میں جڑوا کر شاہی چتر کے اوپر نصب کیا۔[3] تاہم ملک میں اب بھی مخلوط النسل چور اور ڈاکو بھرے ہوئے تھے اور محمد نے لاقانونیت کو ختم کرنے کے لیے اپنے نوساختہ صوبوں کے گورنروں کو حکم دیا کہ جو لوگ سلطنت کی پُرامن ترقی میں مزاحم ہوں اُنھیں پوری سختی سے دبا دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے ہزاروں سر چھ ماہ کے اندر دارالسلطنت میں بھیجے گئے۔ قدرتاً اس کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ جب محمد کا انتقال ہوا تو اُس نے بالکل پُرامن اور منظم سلطنت چھوڑی۔[4]

حکومت کی ساخت

اگرچہ دکھن کی آزادی کے اعلان کا سہرا ناصرالدین اسماعیل کے سر ہے اور علاءالدین خانزادہ بہمنی کا بانی تھا لیکن محمد اوّل نے سلطنت کو منظم کیا اور اُس کے آئین کی بنا ڈالی۔ نئی حکومت کے مرکز کی بلند ترین شخصیت کی حیثیت سے محمد کو اس کا بڑا خیال تھا کہ وہ شاہانہ شکوہ وسطوت کے لباس میں ملبوس ہو اور اس کے روزانہ دربار میں وہی دبدبہ اور آداب تھے جو ایک طاقتور سلطنت کے حکمران کے شایاں شان تھے۔ جمعہ کے علاوہ ہر روز بہترین قسم کے ریشمی قالین بچھتے تھے اور عام وخاص کی پذیرائی کے لیے زربفت کے شامیانے نصب کیے جاتے تھے۔ دربار میں بادشاہ دن کا آٹھواں حصّہ (ایک پہر) گذرنے کے بعد آتا تھا اور ظہر کی اذان کے وقت تک کام کرتا تھا یعنی دوپہر سے ایک گھنٹہ بعد تک۔ اپنی حکومت کے شروع میں اُسے باپ سے جو چاندی کا تخت ترکہ میں ملا تھا اُس پر قانع رہا لیکن ۲۳ مارچ ۱۳۶۳ء کو اس کی جگہ تخت فیروزہ رکھا گیا جو اُسے تلنگانہ کے رائے نے بھیجا تھا۔[5] یہ تخت آبنوس کا بنا تھا اور تین گز لمبا اور دو گز چوڑا تھا اور اسے تخت فیروزہ اس لیے کہتے تھے کہ شروع میں اس پر فیروزہ کے رنگ کی میناکاری تھی لیکن محمد اوّل کے بعد ہر نئے سلطان نے اس میں مزید جواہرات اور خوشنمائی کا اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ پورا تخت جواہرات سے بھر گیا۔[6]

یہ تخت ایوان بار عام یا دیوان عام میں رکھا جاتا تھا۔ نئے سلطان کو ان لوگوں کے سامنے جو اُس کے والد کے رفیق رہ چکے تھے اپنے وقار کا بڑا لحاظ تھا۔ چنانچہ جب اُس کے خُسر ملک سیف الدین غوری نے اُس کا یہ رجحان دیکھا تو بادشاہ کی موجودگی میں دربار میں بیٹھنے سے معذوری ظاہر کی اور اس کے بعد کسی کو دربار میں بیٹھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سیف الدین غوری ، علاءالدین بہمن شاہ کا رفیق اور بادشاہ

کا خسر ہونے کے علاوہ نصایح الملوک کے ایک کتابچہ کا مصنف بھی تھا۔ یہ کتابچہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان مصنفوں کے طرز پر اپنے آقا بادشاہ اور اہل خاندان کے لیے نصایح کا مجموعہ تھا۔ اس کا مخاطب خود بادشاہ تھا اور اس میں اُن صفات کو بیان کیا گیا تھا جن کی ایک کامیاب حکمران کو ضرورت تھی۔ مجلس شوریٰ کا مقام اور شرائط، ہر چھوٹے بڑے عہدہ پر بہترین افراد کے تقرر کی ضرورت، افسروں کی "تلوار اور قلم" کے آدمیوں اور "علم و فن" کے آدمیوں میں تقسیم اور اعلےٰ انتظامی عہدوں جیسے وکیل (وزیر اعظم)، وزیر، دبیر (سکریٹری) اور فوجی عہدوں جیسے سرحد دار (محافظ سرحد)، قلعہ دار (قلعہ بند فوج کا کماندار)، بخشی (تنخواہ تقسیم کرنے والے)، عدالتی افسروں جیسے قاضی، مفتی (قانونِ شرع کی تشریح کرنے والے) اور پولیس کے افسروں جیسے کوتوال (کمشنر پولیس)، محتسب (اخلاق عامہ کے نگران) وغیرہ میں جو صفات ہونا چاہئیں ان کی تفصیل تھی۔

خود بادشاہ کے متعلق غوری نے لکھا تھا کہ اُسے اتنی کم عمری میں سلطنت مل جانے کو اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے اور لوگوں کی خلقی صلاحیتوں اور دشمن کی نقل و حرکت کے صحیح رحجان پر نظر رکھنا چاہیے اور ناموافق واقعات کا دل پر زیادہ اثر نہ لینا چاہیے، دوسروں سے نیکی کرنا چاہیے اور خود کو اعلےٰ اخلاق کا ہونا چاہیے اور اسی کے ساتھ اہل حاجت اور اہل علم کی مدد پر تیار رہنا چاہیے، اُسے حکومت کے مصالح کا ماہر ہونا چاہیے اور دوسری ایسی صفات کا حامل ہونا چاہیے جو اُسے معزز و موقر بنائیں۔ فوج کو وفادار رکھنے کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہو وہ اُسے کرنا چاہیے، منافقوں اور نیم وفادار لوگوں کو اپنی حمایت میں لینے کی کوشش کرنا چاہیے اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو تو ایسے طریقہ سے انھیں برطرف کرنا چاہیے کہ وہ ملک میں فساد نہ برپا کرسکیں۔ اُسے ان لوگوں سے پرہیز کرنا چاہیے جو آرام و آسایش کے عادی ہوں اور جو اپنا نفع حاصل کرنے کے لیے اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اُس نے بادشاہ کو نصیحت کی کہ اُسے ان لوگوں سے مشورہ لینا چاہیے جو اہل علم ہوں اور مشورہ دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ نیز اُس نے اعلےٰ حضرت بادشاہ کو مخاطب کرکے کہا کہ اُسے مختلف عہدوں پر ایسے ہی لوگوں کو مقرر کرنا چاہیے جو اپنے عام کردار اور صلاحیت کے لحاظ سے موزوں ہوں۔ اس لیے کہ "بداخلاق ماہر یا ایسے دیانت دار لوگ جو اُن فرائض سے ناواقف ہوں جو انھیں انجام دینا ہے، یہ دونوں سلطنت کو تباہ کردیں گے۔"

چنانچہ یہ کتابچہ مثالی بادشاہ کی صفات نیز اہم عہدوں پر تقرر کے اصول کا خلاصہ تھا۔ مصنف کو پہلے بہمنی حکمران نے وکیل سلطنت یا وزیر اعظم کے عہدہ پر مقرر کیا تھا جس پر وہ کسی حد تک اس لیے قائم رہا کہ اُس نے اپنے خویش سلطان کا احترام قائم رکھنے میں ہوشمندی سے کام لیا اور شاید اس وجہ سے بھی کہ

اُس نے اپنے کتابچہ میں دی ہوئی نصایح پر عمل کیا۔ تاہم اس کتابچہ کو زیادہ سے زیادہ ایک وزیر اعظم کے مثالی کردار کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے نہ کہ اس آئین کا جسے خود حکمران نے قبول کیا تھا[9] تاہم یہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں بہمنی سلطنت کے اعلےٰ حکام کی ضروری خصوصیات کی تشریح ہے[10]

اس میں شک نہیں کہ محمد اول نے اپنی حکومت کو اپنے وزیر اعظم کے مشورہ سے منظم کیا جو تقریباً بہمنی دور کے خاتمہ تک قائم رہا۔ جیساکہ دوسری جگہ کہا گیا ہے علاء الدین بہمن شاہ کی حکومت سلطنت مدورا سے رائچور تک اور بھونگیر سے دابول اور گوا تک وسیع ہوگئی تھی اور کرشنا ندی کے کنارے کے حکمران اور تلنگانہ کے رائے اسے خراج دیتے تھے[11] سلطنت کے ابتدائی دنوں میں سلطان کا بیشتر وقت فوجی مہموں میں صرف ہوا اور ملک کی حکومت کم و بیش فوجی قانون کے ماتحت رہی، لیکن محمد اول نے حکومت کو نیم غیر فوجی بنیاد پر قائم کیا۔ اُس نے سلطنت کو اطراف یا صوبوں میں تقسیم کیا جن کے مرکز دولت آباد، برار، بیدر اور گلبرگہ تھے اور ان کے گورنروں کو بھی علی الترتیب مسند عالی، مجلس عالی، اعظم ہمایوں اور ملک نائب کے خطابات دیے۔ گلبرگہ کا صوبہ جس میں بیجاپور شامل تھا سب صوبوں سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا اور ایسے شخص کو سپرد کیا گیا تھا جس پر بادشاہ کو سب سے زیادہ اعتماد تھا اور اس لیے اُسے ملک نائب یا وائسرائے کہا جاتا تھا[12]

فوج

فوج کو بھی اسی طرح منظم کیا گیا۔ کمانڈر ان چیف کے عہدہ کا نام اب امیرالامرا ہوگیا اور افسروں کی ایک جماعت باربرداران کے نام سے قائم کی گئی جس کا کام یہ تھا کہ بوقت ضرورت فوج بھرتی کرے ان کے علاوہ دو سو آدمی ایسے تھے جو یکہ جوانان یا سلاح داران کہلاتے تھے جو بادشاہ کے ذاتی اسلحہ کے ذمہ دار تھے۔ ان کے علاوہ چار ہزار آدمیوں کا ایک پورے طور پر مسلح دستہ شاہی باڈی گارڈ کا تھا جو خاصہ خیل کہلاتا تھا۔ سلطان کے حکم کے بموجب ہر روز پچاس سلاح دار اور ایک ہزار خاصہ خیل سپاہیوں کا بادشاہ کی حفاظت کے لیے پہرہ رہتا تھا[13]

اسی زمانہ میں جنگی سامان کی ایک نئی چیز یعنی بارود دکھن میں داخل ہوئی اور ہم ۷۶۶ھ (۱۳۶۵ء) میں ادونی کے محاصرہ میں توپ اور بندوق کا ذکر سنتے ہیں۔ یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ رومیان و فرنگیان (ترک و فرانسیسی) توپ چلاتے تھے جو صفدر خاں سیستانی کے لڑکے مقرب خاں کی ماتحتی میں تھے جیساکہ بعد کو معلوم ہوگا بہمنی اور وجے نگر دونوں کی مہموں میں فوجیں آتشیں اسلحہ استعمال کرتی تھیں اور یہ اس

وقت سے اسّی سال پہلے کی بات ہے جب کہ عبدالرزاق نے وجے نگر میں آتشیں اسلحہ کے استعمال کا ذکر کیا اور چینی سیاح ماہان نے ۱۴۰۶ء میں جب بنگال میں آتشین اسلحہ کے استعمال کا ذکر کیا اُس سے بھی چالیس سال پہلے کی بات ہے[۱۴] بارود اور آتشین اسلحہ کے انکشاف نے دفاع کے سارے تصوّر کو آنکھ جھپکنے میں بدل دیا اور بڑے بڑے قلعے، بہت موٹی دیواریں، پھاٹک کے سامنے آہنی پردے، بندوق جمانے کے سوراخ، فصیل اور توپوں کی برجیاں اور مینار اور جدید صورت حال کے مناسب دوسری ضروریات یعنی دوہری دیواریں اور بند راستے تیار ہو گئے اور ایک دیوار باہر کے گولے کے روکنے کے لیے بنائی جانے لگی۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ یہ نئی تعمیرات اسی زمانہ کے بنے ہوئے یورپ کے قلعوں کے بہت مشابہہ تھیں جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بہمنیوں کی ملازمت میں بہت سے "ترک اور فرانسیسی" تھے۔ اس طرح کا ایک قلعہ ۷۶۸ھ (۱۳۶۶ء) میں پناہ اسلام کے نام سے بدرالدین ہلال عرف ملک الشرق نے بھنگر میں تعمیر کیا تھا جو موجودہ قلعہ احمد نگر سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ ایک کتبہ جو اس وقت ایک مسجد میں لگا ہے جس کا بظاہر اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں لکھا ہے کہ اس قلعہ کو محمد اوّل کے عہد میں مقامی سرداروں کی روک کے لیے تعمیر کیا گیا[۱۵]

تعمیرات

محمد اوّل کے زمانہ کی کم از کم تین بڑی یادگاریں ایسی ہیں جو اب تک موجود ہیں۔ ایک تو گلبرگہ کے قلعہ کی جامع مسجد، دوسرے شہر گلبرگہ میں شاہ بازار مسجد اور تیسرے عثمان آباد میں حضرت شمس الدین کا مزار۔ روایت اور ساخت دونوں کے لحاظ سے شاہ بازار مسجد کو محمد اوّل کے عہد سے منسوب کیا جا سکتا ہے[۱۶]۔ اس کا پھاٹک تعمیری لحاظ سے محمد کے مقبرے سے بہت مشابہہ ہے۔ اس کا چوکور گنبد، اس کے کناروں کے گلدانوں کے نقش و نگار اور اس کی موٹی ڈھلوان "تغلق" کے طرز کی دیواریں اور خود مسجد کا احاطہ جو دونوں سمت میں باہر کو نکلا ہوا ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس تعمیر کا مقصد کسی بادشاہ کے فانی جسم کو اپنے پہلو میں لینا ہے۔ یہ عمارت ایک دوسری متبرک عمارت قلعہ گلبرگہ کے اندر کی جامع مسجد سے جو اس سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہے بہت مختلف ہے اور اس میں بیرونی ترک و ایرانی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ ترکوں اور ایرانیوں نے ہندو اثرات سے دکھن کے فنِ تعمیر کو بالکل بدل دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں تغلق کی روایات کو ترک کر کے ایک نئے طرزِ تعمیر کی بنا ڈالی جو بعد کو دکھنی طرز کہلایا۔ اس کا خاص معمار قزوین کا باشندہ شمس کا لڑکا رفیع تھا جس نے ۷۶۹ھ (۱۳۶۷ء) میں اس مسجد کی تعمیر کی[۱۷] ہندوستان کی کسی اور مسجد کے برخلاف یہ

ساری کی ساری چھت سے پٹی ہوئی ہے اور اس طرز کی مسجد کی تعمیر جو ہندوستانی آب و ہوا کے لیے بالکل موزوں ہے یقیناً یورپ کے طرز کی نقل ہوگی۔ جہاں ہسپانوی اور ترکی مسجدوں کے اندر ہزاروں نمازیوں کی گنجائش ہے اور جن میں کھلا ہوا صحن نسبتہً بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

اس مسجد کی چھت مشرق سے مغرب ۲۱۶ فٹ اور شمال سے جنوب ۱۷۶ فٹ ہے جو کئی چھجوں اور محرابوں میں منقسم ہے اور محرابیں گنبد کی شکل کی نظر آتی ہیں۔ گنبدوں میں تغلق کی پست صورت ترک کردی گئی ہے اور بلند ڈیلوں پر تعمیر ہوئے ہیں۔ یہ سب ایک ناپ کے نہیں ہیں۔ محرابوں اور پھانکوں کے گنبد دوسرے گنبدوں سے بہت بڑے ہیں اور محرابیں جو اونچے ستونوں پر قائم ہیں اور جو بعد کے بہمنیوں میں بہت مقبول ہوئیں وہ ابھی سے نمایاں ہیں۔ مسجد کے اندرونی حصہ کی ساخت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ عمارت کے تین رخ یعنی شمال، مشرق اور جنوب میں بڑی چوڑی چوڑی محرابیں ہیں جن سے ملی ہوئی شمال اور جنوب کے رخ کے محاذ میں سات غلام گردشیں ہیں۔ جو مرکزی محراب کی طرف اس طرح جاتی ہیں کہ اس وسیع احاطہ کے اندر نمازی جس جگہ بھی بیٹھا ہو وہاں سے امام کو ممبر پر خطبہ پڑھتے یا امامت کرتے ہوئے دیکھ سکے۔ اس طریقہ سے ایک اور خوشگوار صورت پیدا ہوگئی ہے کہ باوجود صحن کے بالکل مسقف ہونے کے ہر طرف سے ہوا آئے اور اس طرح ہندوستان کی گرمی کو متوازن کردے ورنہ ہندوستان میں پوری مسقف عمارت کی گرمی ناقابل برداشت ہوتی۔

سکہ

بہمنی سلطنت میں جو سکے رائج تھے وہ خاص طور پر دلچسپ ہیں اس لیے کہ ان کے بغور مطالعہ سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ ہمارے فرشتہ جیسے مورخین کے بیانات کے خلاف ہیں۔[۱] فرشتہ کا بیان ہے کہ پہلے بہمنی سلطان نے کوئی سکہ مضروب نہیں کیا اور سب سے پہلے جس نے سونے چاندی کے سکے مضروب کیے وہ محمد اول تھا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ ٹنکہ (چاندی کا سکہ جس کا وزن ایک تولہ تھا) اس کے ایک طرف کلمہ کندہ تھا اور چار خلفائے راشدہ کے نام اور دوسری طرف حکمران بادشاہ کا نام اور ڈھلنے کی تاریخ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجے نگر اور تلنگانہ کے رالیوں کی ترغیب دینے پر ہندو سناروں نے سونے اور چاندی کے جو سکے ان کے ہاتھ لگے انھیں گلا ڈالا اور ان کی جگہ ملاوٹ کے سکے جو ہندو ریاستوں میں رائج تھے یعنی ہُن اور پرتاپ چالو کردیے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ان ملاوٹ کرنے والوں اور ان کے شرکا کو سخت سزائیں دی گئیں اور بیشتر کو برخاست کرکے ان کی جگہ دہلی کے کھتریوں کو رکھا گیا تب جاکر بہمنی سکوں کا

چلن ہو سکا[۱۹]

یہ فرشتہ کا بیان ہے لیکن جب ہم سکوں کی شہادت پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ کا بیان محض سُنا سُنایا اور ناقص تھا۔ بہمنی سکے اگرچہ کمیاب ہیں مگر اب بھی دکھن کے مدفون خزانوں میں ملتے ہیں اور کئی ماہرین نے ان کا ذکر کیا ہے[۲۰] جن سے فرشتہ کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ حیدر آباد کے میوزیم میں تقریباً تمام بہمنی سلاطین بشمول علاء الدین بہمن شاہ کے سکے موجود ہیں اور ان میں سے ایک میں بھی کلمہ یا خلفائے راشدین کے نام نہیں ہیں۔ دراصل عبارت اور بیشتر الفاظ تغلق کے سکوں کی نقل میں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبل ازیں کہ خلیفہ عباسی نے محمد اول کو اپنے نام کے سکے ڈھالنے کی باضابطہ اجازت دی علاء الدین بہمن شاہ نے اپنے سکوں پر یمین الخلافت ناصر امیر المومنین کے الفاظ کندہ کرا دیے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ محمد کے سکوں میں صرف "حامی دین متین" اور "رسول اللہ" کے الفاظ ہیں اور خلفا کے نام بالکل نہیں ہیں[۲۱] اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کو اتنا طاقتور سمجھتا تھا کہ دُور و دراز مصر میں بیٹھے ہوئے نام کے خلیفہ کے نام کا سہارا لیے بغیر وہ اپنے دشمنوں سے خود نپٹ سکتا تھا۔

سونا چاندی گلانے کے قصہ کے متعلق یہ ہے کہ اگرچہ سونے کے ٹنکہ زیادہ تعداد میں نہیں ملتے ہیں اور اسی طرح ہُن سے چھوٹے سکے کمیاب ہیں تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ شروع کے ہُن بہت اچھی قسم کے ہیں اور اتنے خالص جیسے بہمنی سونا۔ اس لیے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فرشتہ نے محمد شاہ کے عہد کو کس لیے ایسا زمانہ کہا ہے جب کہ وجے نگر کے ہُن نے بہمنی سونے کے ٹنکہ کا بازار میں چلن ختم کر دیا تھا۔

خفیہ اطلاعات کا محکمہ

قبل ازیں کہ ہم محمد اول کی حکومت کی خالص سیاسی تاریخ کا ذکر کریں دو واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ ایک تو منہیان یا خفیہ اطلاعات کا محکمہ جو دکھن کی طرف سے دہلی میں مامور تھا اور جس کا کام شاید یہ تھا کہ دہلی میں جو واقعہ بھی بہمنی سلطنت کی دلچسپی کا ہو اُس کی اطلاع دے اور دوسرا ایک ہمدردانہ عنصر جو محمد اول نے ضوابط جنگ میں داخل کیا۔ دہلی میں خفیہ اطلاع کے محکمہ کے جو لوگ تعینات تھے انھوں نے یہ اطلاع دے کر اپنا فرض ادا کر دیا کہ تلنگانہ کا رائے دہلی کے سلطان فیروز سے خط و کتابت کر رہا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر سلطان فیروز دکھن پر حملہ کرے تو اُس کا پُرجوش خیر مقدم کیا جائے گا اور نہ صرف تلنگانہ کا رائے بلکہ وجے نگر کا رائے بھی اُس کا ساتھ دے گا۔[۲۲] ہمدردانہ عنصر یہ تھا کہ ۷۶۷ھ (۱۳۶۶ء) کی وجے نگر کی خون ریز جنگ کے بعد بین الاقوامی ضابطہ کے طور پر یہ طے کیا گیا کہ لڑائی میں صرف وہی لوگ مارے جائیں

جو مسلح ہوں اور جنگی قیدیوں کی جانوں کا احترام کیا جائے اور اس طرح نہ صرف محمد اوّل کے جانشینوں کے لیے بلکہ اُس کے دشمنوں کے لیے بھی ایک اچھی مثال قائم ہو گئی۔[23]

(ب) سیاسی حالات

محمد کی تخت نشینی

محمد کو اُس کے والد نے اپنی زندگی ہی میں ولی عہد سلطنت بنا دیا تھا[24] اور وہ اپنے والد کے انتقال پر بلا کسی وقت کے دکھن کا سلطان ہو گیا۔ اُس نے فوراً حکم دیا کہ دربار میں سوگ منایا جائے جو تین دن تک جاری رہا اور اس کے بعد ۳ ربیع الاول ۷۵۹ھ (۱۳ فروری ۱۳۵۸ء) کو باضابطہ درباری رسوم کے ساتھ تخت نشین ہوا۔[25] وہ ہر جمعرات کو اپنے والد کی قبر پر جاتا تھا اور اُسی نے اپنے والد کا مقبرہ بنوایا اگرچہ یہ بالکل سادہ تھا۔ یہ مقبرہ قلعہ گلبرگہ کے جنوبی پھاٹک سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور ایک ۲۶ فٹ کے چبوترہ پر ہے اور قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اگرچہ بہمنی حکومت تغلق سلطنت کے مقابلہ پر قائم ہوئی تھی مگر یہ مقبرہ اور نیز کئی دوسری یادگاریں خالص تغلق طرز کی ہیں یعنی وہی ڈھلوان دیواریں، سپاٹ گنبد اور چھت کے چاروں کونوں پر گلدان۔[26]

نئی سلطنت کے شان و شکوہ کا اندازہ اُس سفر سے کیا جا سکتا ہے جو ۷۶۱ھ (۱۳۶۰ء) میں مادرِ ملکہ نے مکہ معظمہ کا کیا۔ تقریباً ایک ہزار ہمراہیوں کے ساتھ وہ دابول کے لیے روانہ ہوئیں جو مغربی ساحل پر بہمنی سلطنت کا خاص بندرگاہ تھا اور وہاں سے ۱۰ ذیقعدہ ۷۶۱ھ (۲۴ اگست ۱۳۶۰ء) کو مخصوص بہمنی جہاز پر روانہ ہو کر ۱۶ ذیقعدہ ۷۶۱ھ (۲۸ ستمبر ۱۳۶۰ء) کو جدہ پہنچیں۔ جتنے دن وہ حجاز میں رہیں انھوں نے چار ہزار لڑکے لڑکیوں کی شادیاں کرائیں جس کا سارا خرچ اپنی جیب خاص سے دیا۔[27] یہی نہیں بلکہ انھوں نے مصر کے عباسی خلیفہ المعتضد باللہ سے خط و کتابت کی[28] اور اپنے لڑکے کے لیے خطبہ و سکہ کے اجرا کے حق کے لیے باضابطہ اجازت حاصل کی۔[29] اگرچہ نام نہاد خلیفہ کو حکومت کے بالکل اختیارات نہ تھے اور مذہبی اختیارات بھی برائے نام تھے بلکہ وہ مصر میں اپنے محل کے اندر قید تھا تاہم بحیثیت خلیفہ اسلام کے اسلامی دنیا میں اُس کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور ہندوستان کے مسلم حکمران ہمیشہ اُس کے نام سے حکومت کا حق حاصل کرنے پر خوش ہوتے تھے خصوصاً جب انھیں کسی طرف سے مزاحمت کا اندیشہ ہوتا۔[30]

معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے سلطان فیروز کے متعلق یہ اندیشہ تھا کہ وہ تلنگانہ کے راجے کی شہ پاکر دکھن پر حملہ نہ کردے اور اس اجازت نامہ سے اور نیز خلیفہ کی فیروز کو فہمائش سے کہ وہ دکھن کے مسلمانوں کا خون نہ بہائے یہ خطرہ رفع ہوگیا۔[۳۱] محمد کی ماں نے اس کی نئی حاصل شدہ حکومت کو مضبوط کرنے کی جو کارروائی کی تھی اُس سے قدرتاً اُسے بڑی خوشی ہوئی اور جب ایک سال سے اوپر دارالسلطنت سے باہر رہنے کے بعد ضعیف العمر خاتون واپس ہوئیں تو دابول اور گلبرگہ کے راستے پر کالگر تک محمد اُن کے استقبال کے لیے گیا۔ مادرِ ملکہ واپسی کے بعد چند ہی ماہ زندہ رہیں اور اس تمام مدّت میں اُنھوں نے اس کمرہ میں قیام کیا جو ان کے لیے ان کے شوہر کی قبر کے پاس بنایا گیا تھا۔ ان کا انتقال ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں ہوا اور وہ اپنے نامور شوہر کی قبر کے پہلو میں دفن کی گئیں۔[۳۲]

ملحقہ ریاستیں

محمد شاہ کی حکومت سے لے کر تقریباً بہمنی سلطنت کے خاتمہ تک دو بڑی سلطنتوں یعنی دکھن اور وجے نگر کے درمیان مسلسل کشمکش رہی۔ ان جھگڑوں کا سبب دونوں حکومتوں کی مذہبی عداوت کو قرار دینا تو بہت آسان ہے لیکن یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ حکمرانوں کا ہمیشہ یہ رجحان رہتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی خواہشات پر مذہب کی سند کا پردہ ڈال دیں اور درباری مورخ ہمیشہ بڑے جوش سے مخالف جماعت کے مقتول منکرین کی واقعی یا قیاسی تعداد کو جو لڑائی میں ماری گئی لفاظی کے ساتھ بیان کریں۔[۳۳] جنوب کے ایک فاضل مورخ نے بجا طور پر اس عناد کو سیاسی یا مذہبی عوامل سے زیادہ معاشی عوامل سے منسوب کیا ہے۔[۳۴] اُس نے اِس امر واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ جو علاقہ بہمنیوں اور وجے نگر کے درمیان مابہ النزاع رہا ہے یعنی کرشنا گوداوری کا دوآبہ وہ مغربی چلوکیاوں اور راشٹر کتاوں اور نیز یادو اور ہویسلاون کے درمیان بھی مابہ النزاع رہا ہے اور بہمنی اور وجے نگر کی سلطنتوں کے قائم ہونے سے محض ناموں کی تبدیلی سے تاریخ کا اعادہ ہے لیکن اُس کا یہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے کہ تنگ بھدرا کے جنوب کی سرزمین گلبرگہ کے گردوپیش کی زمین کے مقابلہ میں معاشی حیثیت سے زیادہ زرخیز تھی اس لیے کہ اگر وجے نگر کی دولت کے متعلق عبدالرزاق اور نیونز کی شہادت کو بالکل صحیح بھی مانا جائے تو ہمارے سامنے اس کی شہادت موجود ہے کہ گلبرگہ کا شاہی خزانہ بھی کچھ کم دولت مند نہ تھا اور طبقات طبقات ناصری کے مصنّف کا بیان ہے کہ اس میں چار سو من سونا اور سات سو من چاندی اینٹوں کی شکل میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ لاکھوں پرتابی اور ہن کے اور کروڑوں کی قیمت کے جواہرات[۳۵] بھی اس میں شامل تھے۔ اس کے خیال میں یہ امر مشتبہ ہے کہ جب دو سلطنتوں کے درمیان سیاسی دشمنی موجود ہو

تو جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے ذرا سا بھی بہانہ کافی ہے اور فاتح یقیناً مفتوح سے جتنا بھی مال غنیمت کھسوٹ سکے گا حاصل کرے گا۔ لیکن یہ کہنا کہ وجے نگر کے مقابلہ میں بہمنی سلطنت کم دولت مند تھی ذرا مبالغہ کی بات ہے[۳۶]

امن کی خلاف ورزی محمد شاہ کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ تلنگانہ اور وجے نگر کے رایوں کی طرف سے ہوئی۔ سلطان کی حکومت کے ابتدائی زمانہ ہی میں تلنگانہ کے کنیا نایک اور وجے نگر کے بکّا کی طرف سے بیک وقت ایسے پیامات موصول ہوئے جو تقریباً اعلان جنگ تھے اور جن کو قبول کرنے کی سلطان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بکّا کا پیام اس مضمون کا تھا کہ مدّت مدید سے رائچور اور مدگل کے ملحقہ علاقے کرشنا ندی تک جنوبی سلطنت کے ماتحت تھے اور اگر بہمنی اپنی حکومت قائم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں یہ علاقے حوالے کر دینا چاہیے۔ تلنگانہ کے حکمران کا مطالبہ دوسرے عنوان کا تھا۔ کولاس علاء الدین بہمن شاہ کو دے دیا گیا تھا اور اب رائے نے یہ پیغام بھیجا کہ اس کا لڑکا اُس کی مرضی کے خلاف یہ قلعہ سلطان سے چھین لینا چاہتا ہے۔ سلطان نے ان دونوں حکمرانوں کے ایلچیوں کی تپاک کے ساتھ پذیرائی کی اور وزیر اعظم سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان کے مناسب جوابات بھیج دے[۳۷]

تلنگانہ سے جنگ

جب سلطان کا جواب جو قدرتاً انکاری تھا دونوں حکمرانوں کو پہنچا تو اس کے جواب میں دونوں سلطنتوں کی فوجیں ساتھ ہو گئیں۔ تلنگانہ کے رائے نے اپنے لڑکے وِنایک دیو[۳۸] کو پیادہ اور سوار کی بہت بڑی فوج کے ساتھ کولاس کی طرف روانہ کیا اور وجے نگر نے بیس ہزار سپاہی کنیا نایک کی مدد کے لیے بھیجے۔ اُن کے خلاف سلطان نے اسماعیل مُخ کے لڑکے امیر الامرا بہادر خاں اور اعظم ہمایوں اور صفدر خاں سیستانی کو برار اور بیدر کی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ شاہی فوج کا بڑا حصّہ متحدہ فوج سے کولاس کے پاس ملا اور اُسے شکست دے کر ورنگل کے پھاٹک تک تعاقب کیا۔ کنیا نایک کو مجبوراً ایک لاکھ ہن بطور خراج کے اور پچیس سے اوپر ہاتھی بطور تاوان جنگ کے دینا پڑے[۳۹]

لیکن تلنگانہ کا منحوس قضیہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا محمد درشت مزاج آدمی تھا اور اپنے وقار کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ رائے کے ساتھ اس انتظام کے جلد ہی بعد یعنی ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں سلطان نے سنا کہ کچھ گھوڑوں کے تاجر ورنگل گئے تھے اور اگرچہ انھوں نے کہا تھا کہ چند خاص گھوڑے

بہمنی سلطان کے لیے محفوظ ہیں مگر کرشن ونایک نے وہ گھوڑے جبراً کم قیمت پر خرید لیے ۔ ممکن ہے کہ سلطان کے لیے گھوڑے محفوظ کرنے کا قصہ تاجروں نے گھڑ لیا ہو لیکن سلطان یہ سن کر جھلا گیا اور یہ خیال کیا کہ اُس کے وقار کو دھکا لگا ہے ۔ علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ ونایک کو وہ سمجھوتہ منظور نہ تھا جو اس کے والد اور سلطان کے درمیان حال ہی میں ہوا تھا اور وہ مزید قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا ۔ بہر نوع سلطان نے طے کر لیا کہ اس کی جو توہین ہوئی ہے اُس کا انتقام لے ۔ اُس وقت ونایک پالم پیٹ میں تھا اور سلطان نے اپنے چند معتبر آدمیوں کو تاجروں کے بھیس میں بھیجا کہ یہ بہانہ کریں کہ اُن کا سب سامان چوری ہو گیا ہے اور وہ بالکل مفلس ہو گئے ہیں ۔ اس ہراول جماعت کے پیچھے ہی خود سلطان بھی تلنگانہ کی طرف روانہ ہو گیا اور اس کے پہنچنے پر پالم پیٹ میں بڑی کھلبلی مچ گئی اور پالم پیٹ میں چھپے ہوئے تاجران نے اسلحہ نکال کر لڑنا شروع کر دیا ۔ ونایک گرفتار ہو گیا لیکن جب وہ سلطان کے سامنے پیش ہوا تو اتنا آپے سے باہر تھا کہ اُس نے سلطان کے لیے ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے اور نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان نے اُسے قتل کرا دیا۔[۶۲] اندھرا کی آبادی سلطان سے سخت غضبناک ہوئی اور جب سلطان بیدر ہو کر دارالسلطنت واپس جانے لگا تو چھاپہ ماروں نے درختوں اور پرانی عمارتوں کی چھتوں پر سے سخت پریشان کیا حتی کہ چار ہزار کا رسالہ جو سلطان کے ساتھ گلبرگہ سے چلا تھا اس میں سے بمشکل ڈیڑھ ہزار وہاں واپس پہنچ سکا ۔ محمد خود ایک بندوق کی گولی سے زخمی ہو گیا[۶۳] اور پالکی پر کولاس پہنچایا گیا جہاں اُسے ملک سیف الدین غوری کی بھیجی ہوئی فوج مل گئی جس نے اُسے بحفاظت مستقر تک پہنچایا ۔

دوسرے سال یعنی ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) کے شروع میں دکھن کے خفیہ ایجنٹ متعینہ دہلی نے یہ خبر بھیجی کہ تلنگانہ کے رائے نے سلطان فیروز تغلق کو پیام بھیج کر یہ استدعا کی کہ وہ "مالوا اور گجرات کے حکمرانوں" سے دکھن پر حملہ کرنے کے لیے کہے اور یہ وعدہ کیا کہ وہ خود اپنی فوجوں سے حملہ آوروں کی مدد کرے گا اور "نیز وجے نگر کی فوجوں سے[۶۴]" جس کے عوض میں اس نے ماتحتی قبول کرنے کا وعدہ کیا ۔ سلطان نے فوراً پوری قوت سے تلنگانہ پر حملہ کر دیا اور اپنے عم زاد خاں محمد کو حکم دیا کہ وہ دولت آباد کی فوجوں کو جمع کر کے "قتلق خاں کے تالاب" پر لے آئے جو دولت آباد کے بالاگھاٹ میں واقع تھا اور صفدر خاں سیستانی اور اعظم ہمایوں کو بھی دارالسلطنت طلب کر لیا گیا ۔ سلطان نے ملک کے نظم و نسق کا کام ملک سیف الدین غوری کو سپرد کیا اور کولاس پہنچ کر اعظم ہمایوں کو بیدر اور ماہور کی فوجوں کے ساتھ گولکنڈہ روانہ کیا ۔ صفدر خاں سیستانی کو اس نے برار کی فوج کے ساتھ تلنگانہ کے مستقر ورنگل بھیجا اور خود بھی وہیں پہنچ گیا ۔ اس تمام مدت میں کنیا نایک وجے نگر کے رائے کی مدد کا منتظر رہا مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کچھ جانشینی کا جھگڑا چل رہا تھا[۶۵] اور چونکہ کسی طرف

سے مدد کی امید نہ تھی اس لیے اس نے بہادر خاں سے استدعا کی کہ سلطان سے عرض کرے کہ اب تک جو کچھ اُس نے کیا وہ وجے نگر کے رائے کے دباؤ سے کیا جو اس کا ساتھ دینے والا تھا اور اب وہ خود کو سلطان کے رحم و کرم کے حوالے کرتا ہے۔ اُس نے وہ تمام شرطیں منظور کر لیں جو اس پر عاید کی گئیں اور ۱۳ کروڑ ہن، تین سو ہاتھی، دو سو گھوڑے اور گولکنڈہ کا شہر معہ متعلقات کے" سلطان کے حوالے کرنا پڑا[۱۳]۔ اب گولکنڈہ جو پہلی مرتبہ سلطنت دکھن میں شامل ہوا تھا اعظم ہمایوں کو سپرد کیا گیا۔ تاوان جنگ لے کر جو ایلچی آئے اُن کی سلطان نے بیدر میں بڑی عزت و احترام سے پذیرائی کی اور رائے کے لیے بے شمار تحفوں سے لاد دیا۔ اُس نے تلنگانہ اور بہمنی سلطنت کے درمیان سرحد "ہمیشہ کے لیے" گولکنڈہ میں قائم کر دی۔ اسی موقع پر ایلچیوں نے سلطان کو تخت فیروزہ پیش کر کے متحیر کر دیا جسے وہ ورنگل سے لکڑی کے بہت بڑے بکس میں بند کر کے لائے تھے اور جب تک وہ کھول کر اور جوڑ ملا کر پیش نہیں کیا گیا اس وقت تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ بکس میں کیا ہے۔ سلطان موسم خزاں کے نقطۂ اعتدال سے ذرا پہلے گلبرگہ پہنچا اور رجب ۱۲، مارچ ۱۳۶۳ء کو آفتاب برج ثور سے گذر کر برج حمل میں پہنچا تو پہلی مرتبہ اس تخت پر بیٹھا۔ چالیس دن تک جشن منایا گیا اور کہا جاتا ہے کہ اس دوران میں تمام قانون اور رواج کی بندشیں ختم کر دی گئیں[۱۴]۔

وجے نگر سے جنگ

ظاہر بات ہے کہ سلطان وجے نگر کے طرز عمل سے خوش نہ تھا اور اب چونکہ تلنگانہ کا قضیہ ختم ہو چکا تھا اس لیے سلطان اپنے جنوبی پڑوسی کو سبق دینا چاہتا تھا۔ غالباً سلطان نے وجے نگر کی روش معلوم کرنے اور نیز خود اپنی سیاسی فوقیت کا امتحان کرنے کے لیے ایک غیر معقول سیاسی چال چلی[۱۵] جس کی کوئی اور توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اُس نے تقریباً تین سو قوالوں کی اُجرت وجے نگر کے خزانے سے برآمد کرنے کے لیے ایک باضابطہ ہنڈی تیار کر دی۔ یہ قوال دہلی سے آئے تھے جنھوں نے دوسرے گانوں کے ساتھ امیر خسرو اور امیر حسن کی غزلیں بھی گائی تھیں۔ یہ قوال شاید شہزادہ مجاہد کی ناصر الدین اسماعیل کے لڑکے بہادر شاہ کی لڑکی سے شادی کے موقع پر آئے تھے جو اسی زمانے میں ہوئی تھی[۱۶]۔ ہنڈی فوراً وجے نگر بھیج دی گئی مگر جب اُسے لے جانے والے جنوبی سلطنت کے مستقر میں پہنچے تو بُکا نے جو اب وجے نگر کے تخت پر مضبوطی سے قائم ہو گیا تھا انھیں گدھوں پر بٹھا کر وجے نگر کی سڑکوں پر گشت کرایا۔ اس طرح سلطان کی جو توہین کی گئی اُس پر وہ سخت برافروختہ ہوا اور فوراً اسی ہزار سوار، نو لاکھ پیادہ اور تین ہزار ہاتھیوں کی فوج لے کر جنوبی سلطنت کو فتح کرنے روانہ ہو گیا اور ادونی میں اپنا مستقر بنایا۔ برار اور بیدر کی بہمنی فوجیں حال ہی میں تلنگانہ کی مہم کی

سخت مشقتیں جھیل چکی تھیں اس لیے سلطان نے انھیں آرام کرنے کا حکم دیا اور خان محمد کو دولت آباد کی فوج لے کر جانے کا حکم دیا اور خود شہزادہ مجاہد کے ساتھ پالم پیٹ کے مال غنیمت کا پانچواں حصّہ لے کر اپنے پیر شیخ سراج الدین جنیدی کے پاس گیا اور ان سے استدعا کی کہ اسے اپنی حسب مرضی سیدوں اور محتاجوں کو تقسیم کر دیں اور اُس وقت جو مہم اُسے درپیش ہے اُس میں اُس کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔ اس اثنا میں وجے نگر کے رائے نے تنگ بھدرا کو عبور کر کے مدگل پر قبضہ کر لیا جس میں مشکل سے آٹھ ہزار سپاہیوں کی قلعہ بند فوج تھی اور مرد عورت بچہ جو سامنے آیا اُسے قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھ ہزار آدمیوں میں سے صرف ایک شخص یہ دردناک قصہ سنانے کے لیے گلبرگہ پہنچ سکا۔[۴۸]

سلطان کو یہ خبر سن کر سخت صدمہ ہوا اور اُس نے اپنی جانشینی کے لیے اپنے لڑکے مجاہد کا باضابطہ اعلان کر کے اور ملک سیف الدین غوری کو ملک کے انتظام اور خزانے پر پورے اختیارات دے کر (صاحب اختیار ملک و مال) کرشنا کو عبور کیا۔ مدگل میں سلطان کے پہنچتے ہی وجے نگر کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور سلطان وہاں فاتحانہ داخل ہوا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان نے دشمن کے ستّر ہزار آدمی قتل کیے اور تحفۃ السلاطین کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے دو ہزار ہاتھی اور تین سو توپ گاڑیاں (ارابہ توپ و ضرب زن)، سات سو عرب گھوڑے اور ایک مرصّع تخت حاصل کیا اور یہ سب اُس مال غنیمت کے علاوہ تھا جو امرا کے ہاتھ آیا۔[۴۹]

سلطان نے برسات کا موسم وہیں گذارا اور پھر بھاری فوج کے ساتھ جنوب کا رُخ کیا اور تنگ بھدرا کو عبور کر کے وجے نگر کی مملکت میں داخل ہو گیا۔ اِس مہم کی اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ اس میں پہلی مرتبہ بہمنیوں نے توپیں اور آتشیں اسلحہ کا بافراط استعمال کیا۔ توپخانہ بظاہر "ترکوں اور فرانسیسیوں" کی سپردگی میں تھا اور یہ پہلا موقع ہے کہ دکھن میں یوروپیوں کے ملازم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ سارا شعبہ صفدر خاں سیستانی کے لڑکے مقرب خاں کے ماتحت تھا۔ بکانے یہ سُن کر اپنی مملکت کی تقریباً ساری فوجوں کو جمع کیا اور اپنے بھانجے کو ادونی کا قلعہ سپرد کر کے بہمنی فوج کا مقابلہ کرنے روانہ ہو گیا۔ اُس نے اپنی افواج کا کماندار بھوج مل رائے کو مقرر کیا اور فوج چالیس ہزار رسالہ اور پانچ لاکھ پیادہ پر مشتمل تھی۔ بھوج مل کو اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ اُس نے اپنے آقا سے پوچھا کہ سلطان کو زندہ لے آئے یا مُردہ اور رائے نے اُسے باضابطہ اجازت دے دی کہ اگر ضرورت ہو تو سلطان کو قتل کر دیا جائے اور اس کی لاش کو لا کر تخت شاہی کے پیروں پر ڈال دیا جائے۔ سلطان نے پندرہ ہزار رسالہ اور پچاس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ آگے بڑھ کر موجودہ تہر سیرو گپا کے قریب تنگ بھدرا کو عبور کیا اور خان محمد کو حکم دیا کہ دس ہزار سوار اور

تیس ہزار پیادہ فوج اور سارے توپ خانہ کو لے کر آگے بڑھے۔ اس وقت دونوں فوجوں کے درمیان صرف بارہ کروہ کا فاصلہ تھا۔ لڑائی ۱۴ ذیقعدہ ۷۶۷ھ (۲۰ جولائی ۱۳۶۶ء) کو موضع کوتلم کے پاس کسی جگہ شروع ہوئی۔ بہمنی فوج کے قلب کی کمان خاں محمد کے ہاتھ میں تھی، میمنہ کا کمان دار موسیٰ خاں افغان اور میسرہ کا عیسیٰ خاں افغان تھا۔ جب میمنہ اور میسرہ کے کمان دار بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر فوت ہو گئے تو یہ بازو بڑے خطرے میں پڑ گئے اور معلوم ہوتا تھا کہ بہمنی فوج کو بہت جلد سخت شکست ہو جائے گی۔ لیکن عین وقت پر محمد شاہ تین ہزار سوار لے کر پہنچ گیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں اور شدید دست بدست لڑائی ہونے لگی جب کہ خان محمد کا ہاتھی شیر شکار دشمن کی صفوں میں گھس گیا اور فوراً کمان دار بھوج مل رائے کا ڈھیر کر دیا۔ جنگ کا خاتمہ وجے نگر کی شکست پر ہوا۔[50]

ایک ہفتہ ادونی میں گذار کر اور نیچے کھچے وجے نگریوں کا صفایا کر کے سلطان نے خود وجے نگر پر چڑھائی کی۔ اب رائے نے چھاپہ مار جنگ شروع کر دی جس میں دکھنی پچھلی تلنگانہ کی مہم میں ناکام رہے تھے اور اپنے دارالسلطنت کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کر دیا۔ سلطان اتنا پریشان ہوا کہ اس نے بجائے مہم کو جاری رکھنے کے جس میں شکست لازمی تھی پیچھے ہٹنے کو ترجیح دی لیکن ہار ماننے کے نتائج کا فوج پر جو اثر ہوتا اُس سے وہ خائف تھا اس لیے اُس نے بیماری اور فوج کی قیادت سے معذوری کا بہانہ کیا۔ رائے کی فوجوں نے پسپا ہوتی ہوئی فوج کا سختی سے تعاقب کیا اور چھاپہ مار دستے کبھی کبھی ہراول کے دستوں میں گھس کر اُن کا صفایا کر دیتے تھے لیکن جب سلطان تنگ بھدرا کو عبور کر کے خود اپنی مملکت میں پہنچا تو اس نے فوج کو روک کر پوری قوت سے رائے کے خیمہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا جو اس وقت ناچ رنگ اور شراب نوشی میں مشغول تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ذرا ہی دیر میں رائے کی خیمہ گاہ اللہ اکبر کے نعروں سے گونجنے لگی اور رائے کو پسپا ہونا پڑا اور جب تک وہ اپنے دارالسلطنت نہیں پہنچ گیا اُس نے دم نہ لیا۔[51]

بکا نے اپنی سلطنت کے اُمرا کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ سب کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ جس طرح اُس کے پیش رو بہمن شاہ سے دوستانہ تعلقات تھے ویسے ہی اُس کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ موجودہ سلطان سے دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ چنانچہ وجے نگر کے ایلچی سلطان کے خیمہ میں صلح کی استدعا کے ساتھ بھیجے گئے اور یہ اپیل کی گئی کہ دو ہمسایہ سلطنتوں میں برادرانہ تعلقات ہونا چاہئیں۔ یہ سن کر سلطان ہنسا اور کہا کہ وہ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ موسیقاروں کا معاوضہ وجے نگر کے خزانے سے دیا جائے اور جس ہنڈی پر اُس نے دستخط کیے ہیں اس کی تعمیل کی جائے۔[52] اس موقعہ پر موسیقاروں نے بھی گذارش کی اور سلطان سے جان کی امان پا کر عرض کیا کہ سلطان نے جو قتل عام کیا ہے وہ اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ہے

اس لیے کہ بہت سی عورتیں اور بچے ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں جو اپنے کو اس مقدس مذہب کا پیرو کہتے ہیں اور جس کی نہ اسلام میں تعلیم ہے نہ اجازت۔ بادشاہ اس اپیل سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ آیندہ سے بہمنیوں کی طرف سے جو لڑائی کی جائے اس میں صرف واقعی لڑنے والے مارے جائیں اور اسیرانِ جنگ کو بالکل نہ ستایا جائے۔[۵۳]

بہرام خاں کی بغاوت

اس مہم کے فوراً بعد سلطان کو دولت آباد کے گورنر بہرام خاں مازندرانی کی بغاوت سے دوچار ہونا پڑا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے دولت آباد کی تقریباً ساری فوج وجے نگر کی مہم پر باہر تھی اور بہرام خاں نے "جسے علاء الدین بہمن شاہ اپنے لڑکے کی طرح سمجھتا تھا" اسے بہترین موقع سمجھ کر مرہٹہ کمبھ دیو اور برار اور بگلانہ کے دوسرے رئیسوں سے مل کر سازش کی اور مرہٹہ صوبہ کے خراج پر قبضہ کر کے سلطان کے خلاف بغاوت کردی۔ سلطان اس وقت وجے نگر میں تھا اور جب اُس نے یہ خبر سنی تو فوراً سید جلال حمود اور شاہ ملک کو دولت آباد روانہ کیا کہ باغی امیر کو باز آنے کی فہمایش کریں لیکن اس سے کچھ فایدہ نہ ہوا جب یہ دونوں ایلچی گبرگہ واپس پہنچے تو سلطان ویسے ہی واپس آیا تھا اور بغیر آرام کیے ایک ہی ہفتہ کے اندر جنوب مغرب کی طرف روانہ ہو گیا اور مسند اعلےٰ خاں محمد کو آگے روانہ کیا۔ بہرام خاں پٹن تک بڑھ کر آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو سلطان کی فوج کا کچھ حصہ باغی سے مل گیا جس کی وجہ سے خان محمد کو تیزی سے پیچھے ہٹ کر شیوگاؤں آنا پڑا۔[۵۴] بادشاہ جو اس وقت بیڑ میں تھا تیزی کے ساتھ پٹن کی طرف بڑھا۔ جب وہ وہاں سے چار کروہ کے فاصلے پر تھا تو بگلانہ کا راجہ بھاگ کھڑا ہوا اور بہرام خاں پیچھے ہٹ کر دولت آباد آگیا لیکن شاہی فوجوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا اور رات کی تاریکی میں بہرام خاں اور کمبھ دیو نکل کر سیدھے حضرت زین الدین کے پاس پہنچے جنھوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً گجرات چلے جائیں۔[۵۵]

بادشاہ سخت جزبز ہوا اس لیے کہ قبل اس کے کہ وہ انھیں پکڑ سکے یہ گجرات کی حد کے اندر پہنچ گئے تھے اور اب سلطان کو یاد آیا کہ جب اُس کی تاجپوشی کے وقت تمام بزرگ حضرات کو حلف وفاداری لینے کے لیے بلایا گیا تو شیخ زین الدین دربار میں نہیں آئے تھے۔[۵۶] اس وقت شیخ نے غور کیا تھا کہ سلطان شراب پیتا ہے اور دوسری منہیات شرعیہ کا مرتکب ہوتا ہے اس لیے شیخ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسے شخص کو بادشاہ تسلیم کریں اور مزید فہمایش کی تھی کہ ایک مسلم بادشاہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلام

کے نقشِ قدم پر چلے۔ اب سلطان نے اصرار کیا کہ شیخ کو خود حاضر ہو کر یا بذریعہ تحریر اظہارِ وفاداری کرنا چاہیے۔ یہ پیام سُن کر شیخ نے ایک عالم اور ایک سید اور ایک گنہگار کا قصہ سنایا جنھیں بُت پرستوں نے پکڑ لیا تھا اور بتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا ورنہ اُن کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔ عالم اور سید نے اُس کی پوری تعمیل کی مگر دل میں قرآن کی "آیت حمد" پڑھ لی[58]۔ لیکن گنہگار نے کہا کہ اس کے رفیق تو پاک باز لوگ ہیں لیکن خود اُس کے نامۂ اعمال میں خدا کے سامنے پیش ہونے والی کوئی چیز نہیں ہے اس لیے وہ بیجان چیزوں کو سجدہ کرنے کے بجائے اپنا سر کٹوانے کو ترجیح دے گا۔ شیخ نے فرمایا کہ اگرچہ دوسرے لوگ سید اور عالم جیسے ہیں مگر وہ خود گنہگار ہیں اس لیے وہ محمد شاہ جیسے سلطان کے سامنے حاضر ہونے کے بجائے سر ا ٹھکتنے کو ترجیح دیں گے۔ اس پر سلطان نے حکم دیا کہ وہ دولت آباد سے چلے جائیں۔ شیخ نے اپنی جانماز اپنے کندھے پر ڈالی اور شیخ برہان الدین کے مزار پر چلے گئے[58] اور قبر کے پاس بیٹھ کر کہا کہ اب کون ہے جو انھیں یہاں سے ہٹا سکے۔ اب سلطان کو محسوس ہوا کہ اُس کا مقابلہ ایک غیر معمولی کردار کے انسان سے ہے اور صدر الشریف کو مصالحانہ پیام دے کر بھیجا۔ شیخ نے جواب دیا کہ اگر سلطان کم سے کم دوسروں کے سامنے شراب نہ پیئے، ملک کے سارے شراب خانوں کو بند کر دے۔ اُس طرح عمل کرے جیسے اُس کے والد نے ساری عمر کیا اور تمام افسروں کو حکم دے دے کہ وہ اسلامی اخلاق پر عمل کریں تو سلطان "فقیر زین الدین سے بڑا دوست کسی اور کو نہ پائے گا"۔ سلطان نے ان شرائط کو مان لیا اور بالآخر دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مسندِ عالی کو مہاراشٹر سپرد کر کے سلطان گلبرگہ روانہ ہو گیا[59]۔

سلطان کی زندگی کے آخری ایام

سلطان کی زندگی کے باقی ایام امن اور فارغ البالی میں گذرے۔ بکّا اور کنیا نایک برابر خراج دیتے رہے اور سارے ملک میں امن رہا خصوصاً ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے کے بعد سے۔ سلطان نے یہ طے کر لیا کہ آیندہ سے وہ کسی مہم میں نہ جائے گا اور اپنی موجودہ سلطنت کو مستحکم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد سے وہ ہر سال اپنے ملک کے صوبہ جات کا دورہ کرنے لگا اور فرشتہ کا بیان ہے کہ اُس کی حکومت کے آخری زمانے میں ہر شخص خوشحال اور فارغ البال تھا۔

سلطان کا انتقال ۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ (۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء) کو ہوا[60]۔ وہ اپنے نامور باپ کی قبر سے تھوڑے فاصلے پر اور اپنی دارالسلطنت کے قلعے کے محل سے کچھ دور مدفون ہوا[61]۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی قبر پر قرآن کی ایک آیت[62] لکھی تھی مگر اب اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔

سلطان کا کردار

سلطان محمد خانوادہ بہمنی کا ایک عظیم حکمران تھا۔ جہاں تک انتظامی اداروں کا تعلق ہے اُس کے والد کو انھیں مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا موقع نہ ملا تھا اور یہ کام محمد کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا کہ وہ نظام حکومت کے اداروں کی تکمیل کرے۔ مشرق اور جنوب میں اُس نے اپنی مہموں سے اپنے ہمسایوں پر نئی سلطنت کی قوت کا سکّہ بٹھا دیا تھا اور صرف ایک بغاوت بہرام خاں مازندرانی کی، جو اُس کے دورِ حکومت میں ہوئی جس کو اس نے پُوری قوت سے دبا دیا تھا۔ اس کی فن جنگ کی مہارت کا اندازہ اُس کی وجے نگر کے خلاف مہم سے ہوتا ہے جس میں اُس نے نہ صرف آتشین اسلحہ کا موثر طور پر استعمال کیا بلکہ اپنی فوج سے بہت زیادہ بڑی دشمن کی فوج کو شکست دے دی۔ اپنے دربار میں وہ کسی قسم کے امتیاز کا روادار نہ تھا اور خود اُس کے خسر وزیر اعظم ملک سیف الدین غوری کو شاہی تخت کے نیچے کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن شیخ زین الدین کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں محمد اول جیسے طاقتور حکمران کو بھی برتر کردار کے آگے جھکنا پڑتا تھا اور کسی کی فہمائش پر بُری باتوں کو ترک کرنا پڑتا تھا۔ محمد بزرگوں کی نصیحت اور ہدایت کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا اور اپنی مہموں کی کامیابی کے لیے شیخ سراج الدین جنیدی کی دعاؤں پر اعتقاد رکھتا تھا[۶۳]۔ شہزادگی میں اُسے تیر اندازی اور تلوار چلانے کے شریفانہ فن سکھائے گئے تھے اور اگرچہ وہ شراب پیتا تھا مگر اس کے اخلاقی کردار کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی۔ انتقال کے وقت اُس کی تلنگانہ، وجے نگر اور اپنی ہندو اور مسلمان رعایا سے اور اپنے خدا کے ساتھ مفاہمت ہو گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں اور انتظامی افسروں اور رعایا کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا اور اُن پر توجہ کرتا تھا[۶۴]۔ وہ ہمیشہ اہل علم کی صحبت پسند کرتا تھا[۶۵] اور یہی وجہ ہے کہ شیخ المشایخ زین الدین دولت آبادی، عین الدین بیجاپوری، مولانا نظام الدین برنی، حکیم ظہیر الدین تبریزی جیسے اہل علم اُس کے دارالسلطنت میں جمع ہو گئے تھے جس سے دکھن اہل علم کا گہوارہ اور سارے ہندوستان کے لیے قابلِ رشک بن گیا تھا[۶۶]۔

تشریحات

۱۔ تلنگانہ کا رائے کنیا نایک تھا جس نے ایک مرتبہ تغلقوں کے خلاف ظفر خاں کی مدد کی تھی۔ دیکھو اوپر دوسرا باب۔ رام راؤ کے مضمون فاؤنڈیشن آف ریڈی کنگڈم (روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۴۹) کے بموجب کنیا نایک کا انتقال ۱۳۷۵ء میں یا بقول ونکٹ رام نیا کی تیلیگوانا دیوچوڑا کے مقدمہ صفحہ ۱۱ کے ۱۳۳۹ء یا اس سے کچھ پہلے۔

۲۔ ہندوستان کے فارسی مورخین ہمیشہ وجے نگر کے راجے کا نام "کشن رائے" یا "دیورائے" لکھتے ہیں اور اسے بطور نام کے نہیں بلکہ بطور لقب کے استعمال کرتے ہیں۔ ان تمام مورخین نے اپنی تصنیفات وجے نگر کے کرشن دیو رائے (۱۵۰۹ء لغایت ۱۵۲۹ء) کی شاندار حکومت کے بعد لکھیں اور شاید اُس سے اتنے موثر ہوئے کہ اس کے ذاتی نام کو اس کے تمام پیش رو حکمرانوں کا لقب سمجھا۔ وجے نگر کے حکمرانوں کے متعلق دیکھو نیچے تشریح نمبر ۳۴۔

۳۔ محمد نے اپنی حکومت کے آخری دنوں میں جو چھتری استعمال کی، اس کے اوپر غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا چڑھا تھا جو اس کی والدہ مکہ معظمہ سے لائی تھیں۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۵۔

۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۵۔

۵۔ بادشاہ اس نئے تخت پر سب سے پہلے شمسی نوروز یا ایرانی سال نو کے دن ۷۴۸ھ کے موسم خزاں کے بعد بیٹھا۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۲۔ سر وولزلی ہیگ نے جو ۱۲ مارچ ۱۳۶۵ء کی تاریخ لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ دیکھو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۳۸۱۔

۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۶۸۔

۷۔ مجھے یہ اصل کتاب دستیاب نہیں ہو سکی مگر اس کا اُردو ترجمہ عبدالجبار خاں کی کتاب تذکرۃ السلاطین دکھن مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۹ھ کے صفحہ ۵، لغایت صفحہ ۸۲ میں موجود ہے۔ مُصنّف کا بیان ہے کہ جب اس نے اس کا ترجمہ کیا تو اصل کتاب اس کے پاس موجود تھی مگر یکم ستمبر ۱۳۲۶ھ کے موسیٰ ندی کے سیلاب میں اس کا بیش قیمت مخطوطات کا سارا کتب خانہ

معہ اس کتاب کے بہ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ اسی کتابچہ کو نام بدل کر مولانا قدرت اللہ نے شاہجہان کی تاریخ میں دستور جہان کشائی کے نام سے استعمال کیا ہے لیکن اس کتاب کا بھی مجھے پتہ نہیں چلا۔ ان حالات میں قدرتاً اس کے استناد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

۸۔ عہدہ داروں کے یہ سارے نام جن کا ذکر کیا گیا وہی ہیں جو دہلی میں رائج تھے۔ دیکھو قریشی کی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیت آف دہلی، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۲ء باب ۵ و ۷۔

۹۔ دیکھو صدیقی کی کتاب مذکور ملک سیف الدین غوری جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتابچہ دراصل سلطنت کا آئین تھا۔ نیز دیکھو صدیقی کا مضمون آرگنائزیشن آف دی سنٹرل اینڈ پراونشیل گورنمنٹس آف دی دکھن انڈو بہمنیز، انڈین اورینٹل کانفرنس منعقدہ میسور ۱۹۳۵ء صفحہ ۴۶۲۔

۱۰۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ فرشتہ تنہا وہ مورخ ہے جس نے اس وزیر کا نام لکھا ہے۔ برہان مآثر، طبقات اکبری اور دیگر مورخین نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ معاصر عصامی نے بھی فتوح السلاطین مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۸ء میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ اس نے ساری تفصیلات بلاتخفیف کے بیان کی ہیں لیکن اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عصامی کی زندگی میں ملک کو عروج نہ حاصل ہوا ہوگا۔

۱۱۔ دیکھو اوپر تیسرا باب۔

۱۲۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۸۲۔ ہمیں ملک نائب کا عہدہ دہلی میں بھی ملتا ہے۔ دیکھو قریشی کی کتاب مذکور صفحہ ۱۰۰۔

۱۳۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۸۲۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ ان میں سے بعض عہدے عادل شاہی حکومت میں خود اس کے زمانہ تک قائم رہے یعنی ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) تک۔

۱۴۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۰۔ یورپینوں کا ذکر اب پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ بارود کے بارے میں دیکھو گوڈ کی کتاب یوز آف گن پاوڈر ان انڈیا (ڈینی سن راس یادگاری جلد مطبوعہ پونہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۱۱۷) وجے نگر میں آتشیں اسلحہ کے استعمال کا ذکر عبدالرزاق نے مطلع السعدین میں کیا ہے۔ ایلیٹ اینڈ ڈاوسن، ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی ہزاون ہسٹورینز (جلد چہارم صفحہ ۱۱۷)۔ دراصل توپ خانہ کے استعمال کا ذکر سب سے پہلے غرناطہ کے مسلم حکمران اسماعیل بن فرج کے ۱۳۲۵ء میں بازہ کے محاصرہ کے سلسلے میں سُنا جاتا ہے۔ ادونی، ریاست اندھرا پردیش کے ضلع بلاری میں ایک تعلقہ کا مستقر، ۱۵ر۳۸ شمال، ۷۷ر۱۷ شرق۔

۱۵۔ ایپی گرافیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۲۴ء صفحہ ۳۔ ڈاکٹر ناظم نے ٹھیک لکھا ہے کہ چونکہ محمد کا انتقال ۷۷۶ھ میں ہوا اس لیے قلعہ کی تعمیر اس کے عہد میں شروع ہوئی ہوگی اور تکمیل اس کے جانشین کے عہد میں بھنگر، مہاراشٹر کے ضلع

احمد نگر میں ایک شہر، ۱۹٫۲۰ شمال، ۷۹٫۲۱ مشرق۔

احمد نگر، ریاست مہاراشٹر میں ایک ضلع کا مستقر، دریائے سینا کے کنارے، ۱۷٫۵ شمال، ۷۴٫۵۵ مشرق۔

۱۶۔ رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۳۳۵ فصلی، صفحہ ۵۔

۱۷۔ اپی گرافیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۰۷ء، صفحہ ۱۰۲۔ رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۳۳۵ فصلی صفحات ۵۔ ۲۔ مسجد کے کتبہ میں تاریخ ۴ محرم ۷۶۹ھ (۳۱ اگست ۱۳۶۷ء) ہے۔ آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی دی ہوئی یکم ستمبر ۱۳۶۷ء نہیں ہے۔ نیز دیکھو فرگوسن کی ہسٹری آف انڈین اینڈ ایسٹرن آرکیٹیکچر مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء صفحہ ۲۶۴، جس میں مسجد کا نقشہ دیا ہوا ہے۔ پرسی براون انڈین آرکیٹیکچر، اسلامک پیریڈ کے صفحہ ۶۹ میں اس مسجد کو جنوبی ہند میں اسلامی یادگاروں کا دلچسپ ترین نمونہ کہتا ہے۔

قزوین، البرز پہاڑ کے دامن میں ایک شہر، تہران سے ۶۰ میل شمال مغرب میں۔

۱۸۔ یہ بیان بیشتر شیروانی کی کتاب محمود گاواں 'عظیم بہمنی وزیر' مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۲ء کے صفحات ۵۸-۵۲ سے لیا گیا ہے

۱۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۲۔ عبد الجبار کا بیان ہے کہ اس نے خود ایک سکہ دیکھا جس کے حاشیہ پر چاروں خلفا کے نام ہیں لیکن جس سکہ کا اُس نے حوالہ دیا ہے اُس میں ایک طرف علاء الدنیا و الدین اور دوسری طرف محمد محمود ہے۔ اس لیے یہ کسی طرح بہمنی محمد اوّل کا سکہ نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۰۔ گبس، گولڈ اینڈ سلور کوائنز آف بہمنی کنگڈم (نیومسمیٹک کرانیکل ۱۸۸۱ء)۔ کاڈرنگن، کاپر کوائنس آف دی بہمنی ڈائی نسٹی (نیومسمیٹک کرانیکل ۱۸۸۳ء)۔ محمد احمد کا مضمون ایرا اینڈ اسپارٹمنٹ کوائنز آف بہمنی کنگس (روئیداد آل انڈیا اورینٹل کانفرنس پٹنہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۳۷، و مابعد)۔ اسپیٹ کا مضمون دی کوائنز آف دی بہمنی کنگس (اسلامک کلچر، حیدر آباد دکن ۱۹۳۵ء صفحات ۳۰۷-۲۶۹)۔ عبد الولی خاں کی کتاب بہمنی کوائنس۔ اندھرا پردیش گورنمنٹ میوزیم۔

۲۱۔ محمد کے سکوں پر دار الضرب کے نام احسن آباد اور فتح آباد ہیں۔ احسن آباد تو گلبرگہ کا نام ہے جو اسے پہلے بہمنی حکمران نے دیا تھا اور فتح آباد دار الضرب کے لیے دیکھو تیسرا باب، تشریح نمبر ۲۴۔

۲۲۔ فرشتہ باب اوّل صفحہ ۲۹۰۔ فیروز تغلق سلطان دہلی، ۱۳۵۱ء لغایت ۱۳۸۸ء۔

۲۳۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۲۔

۲۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۹۔

۲۵۔ محمد کی تخت نشینی کی تاریخ فرشتہ نے یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ لکھی ہے جس سے اس کی حکومت کی

مدت ۱۰ سال، ۸ ماہ، ۵ دن ہوتی ہے جو طبقات اکبری اور برہان مآثر کی دی ہوئی مدت ۱۱ سال، ۲ ماہ، ۵ دن سے تقریباً ۶ ماہ کم ہے لیکن اس معاملے میں برہان مستند نہیں ہے اس لیے کہ اس نے صفحہ ۱۳ میں محمد کی تخت نشینی کا سال ۷۵۸ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور طبقات نے نہ تخت نشینی کی تاریخ لکھی ہے اور نہ انتقال کی' اس لیے ہم محمد کے بادشاہ ہونے کی تاریخ یکم ربیع الاول ۷۵۹ھ (۱۱ فروری ۱۳۵۸ء) قرار دے سکتے ہیں۔

۲۶- پہلے دو بہمنی حکمرانوں کے مقبروں کی بحث کے متعلق دیکھو اوپر تیسرا باب' آخری حصہ۔ نیز نیچے تشریح نمبر ۶۰۔

۲۷- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۵۔

۲۸- عبدالجبار نے جو مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۳۷ پر قائم کا نام لکھا ہے اور صحیح نہیں ہے۔ معتضد ۷۵۳ھ (۱۳۵۲ء) سے ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) تک خلیفہ رہا اور قائم ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) سے ۸۵۹ھ (۱۴۵۵ء) تک۔

۲۹- یہ دو چیزیں خاص شاہی نشان سمجھی جاتی تھیں۔ دیکھو قریشی کی مذکورہ کتاب صفحات ۷۲-۷۱۔

۳۰- اس پر قریشی نے مذکور کتاب کے صفحہ ۷۰ پر مفصل بحث کی ہے۔ مصر کی برائے نام خلافت بھی ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم اوّل کے مصر فتح کرنے پر ختم ہو گئی۔

۳۱- عبدالجبار نے طبقات ناصری صفحہ ۲۰۰ و صفحہ ۵۸۰ کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ باوجود اس سفارش کے حالات کے مقتضا اور فیروز تغلق کے ہمدردانہ مزاج نے اُسے دکھن کی مہم پر آمادہ نہ کیا۔

۳۲- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۵۔

۳۳- یہ صورت محض مشرق کی نہیں بلکہ مغرب کی بھی تھی اور سولھویں اور سترھویں صدی میں یورپ کی مذہبی لڑائیاں اس کا ثبوت ہیں۔ حکمرانوں نے پروٹسٹنٹ مصلحین کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر پوپ کے قبضہ سے زیادہ سے زیادہ اقتدار نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور جب لڑائی چھڑ گئی تو ان کے ہم مذہبوں نے ان فتوحات کے لیے جو انھوں نے خود اپنے نفع کے لیے حاصل کی تھیں مذہب کے حق میں کہہ کر خوب تعریف کی' اور مخالف فریق کے لیے شاید اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ وجے نگر کے خلاف بہمنیوں کی لڑائیوں کے سلسلے میں فرشتہ نے ہندوؤں کے لڑائی میں مارے جانے یا عمداً قتل کیے جانے والوں کی تعداد میں بڑی رنگ آمیزی کی ہے لیکن جو تعداد بتائی گئی ہے وہ اگر صحیح ہوتی تو دکھن میں ایک بھی ہندو باقی نہ رہا ہوتا اور بہر نوع جنگ کے اور قتل عام کے ان تمام مقتولین کے باوجود دکھن کی فوجوں نے کیا مسلمان اب بھی آبادی کا بہت قلیل حصہ ہیں۔ باوجودیکہ ایران اور دیگر بیرونی ملکوں سے اُن کے ہم مذہبوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اگر کوئی بات یقینی ہے تو یہ ہے کہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان فنا ہو جانے کے خطرے میں تھے خصوصاً اس بنا پر کہ ہم کوئی قابل لحاظ مسلمان کیے جانے کا واقعہ بجز بہمنی حکومت کے

آخری زمانہ کے نہیں سنتے تھے۔

۳۴۔ گرتی ونکٹ راؤ کا مضمون بہمنی و وجے نگر ریلیشنز (رونیدار انڈین ہسٹری کانگرس منعقدہ الہ آباد ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۶۴۔ انھوں نے بوثوق لکھا ہے کہ لڑائی معاشی تھی نہ کہ مذہبی۔

۳۵۔ یہ کتاب محمد اوّل کے ہم عصر زمانے کی ہے جس سے عبدالجبار نے اپنی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۳۱ پر کافی استفادہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اُس کے پاس موجود تھی اور دریائے موسیٰ کے سیلاب میں ضائع ہوگئی۔

من کا وزن۔ احمد نگر کا من ۴۰ سیر کا ہے (یعنی کہ ۲ ۱۶۳ پونڈ کا جیسا سیویل نے اے فارگاٹن ایمپائر مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۷۰ء کے ضمیمہ بی صفحہ ۴۰۲ میں لکھا ہے) اور ممکن ہے کہ فرشتہ نے بھی یہی خیال کیا ہو لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مدراس کا من ۱۲ سیر کا ہے اور بمبئی کا من ۴۲ سیر کا۔ حیدرآباد میں شکر کے لیے ۱۲ سیر کا اور دوسری چیزوں کے لیے ۴۰ سیر کا ہے۔ ہمیں یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ فرشتہ کی عادت اسی طرح ہر بات میں مبالغہ کرنے کی ہے۔

۳۶۔ گرتی ونکٹ راؤ کا مضمون مذکور صفحہ ۲۶۵۔

۳۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۳۔ وجے نگر کے حکمرانوں کے سلسلہ میں دیکھو نیچے تشریح نمبر ۴۳۔

۳۸۔ یہ گرتی ونکٹ راؤ کی کتاب مذکور کی روایت ہے (صفحہ ۲۶۴)۔ فرشتہ نے "ناگ دیو" لکھا ہے وجے نگر کے حکمران کے لیے دیکھو نیچے تشریح نمبر ۴۳۔

۳۹۔ ویلوگ، مقدمہ صفحات ۱۱ و ۱۲۔ کولاس ضلع نظام آباد اندھرا پردیش۔ ۱۸°،۲۰° شمال، ۷۷°،۴۲ مشرق۔

۴۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۲۸۵ و ۲۸۶۔ اس جگہ کا نام کئی طرح سے بتایا گیا ہے یعنی فلم پٹم، بلم پٹم، دلیم پٹم وغیرہ اور یہ یقیناً پالم پیٹ ہے جو ضلع ورنگل کے تعلقہ مولگ میں ایک قدیم شہر ہے۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۳۷۹ میں اسے ساحلی شہر ولیم پٹم سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ محمد اوّل کی فوج کبھی مشرقی ساحل تک پہنچی۔ پالم پیٹ میں اب بھی بہت سے قدیم مندر ہیں۔ دیکھو میموائرس آف دی آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا نمبر ۶، از یزدانی مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۲ء۔ لیکن اس میں یہ غلط لکھا ہے کہ پالم پیٹ ورنگل قسمت کے انتظامی مستقر ہنم کنڈہ کے شمال مشرق میں چالیس میل کے فاصلہ پر ہے اس لیے کہ مولگ تعلقہ جس میں یہ واقع ہے شمال مشرق میں ہے۔ پالم پیٹ (سروے آف انڈیا میپ ۵۶ شمال جنوب مشرق میں پالم پیٹ ہے) ہنم کنڈہ کے شمال مشرق میں تقریباً ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۱۶°،۱۸ شمال، ۱۵°،۸۰ مشرق۔ کسی زمانہ میں پالم پیٹ ریاست ورنگل کے ایک صوبہ کا مستقر تھا جیسا کہ برہان مآثر صفحہ ۱۳ میں ہے۔

۴۱- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۰- ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۱۳-

۴۲- مالوہ اور گجرات اب تک برائے نام دہلی کے ماتحت تھے اگرچہ فیروز تغلق کی کمزور حکومت نے گورنروں کو آزادی دے رکھی تھی۔ گجرات نے اپنی باضابطہ خود مختاری کا ۱۳۹۶ء تک اعلان نہیں کیا اور مالوہ نے ۱۴۰۱ء تک۔

۴۳- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۰ میں صاف لکھا ہے کہ "دیو رائے" کا انتقال تقریباً اسی زمانہ میں ہوا۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بکا نے ۱۳۷۶ء یا ۱۳۷۷ء تک حکومت کی۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وجے نگر کی حکومت کے متعلق کچھ جھگڑا ہوا اور فریقین ہری ہر کے دو بھائی کمپا اور بکا تھے اور کمپا کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سنگما دوم۔ نیلور کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپا کم از کم ۱۳۵۵ء تک حکمران رہا (ہولٹز، اپی گرافیا انڈیکا جلد دوم صفحہ ۲۱)۔ نیلور میں ایک اور کتبہ ہے جس میں ۴ مئی ۱۳۴۶ء کو سنگما کا رائے ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ بکا کی حکومت اُس کے خیال میں ۱۳۴۳ء سے شروع ہوئی۔ سیول نے (اے فارگاٹن ایمپائر مطبوعہ لنڈن ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۸) اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہری ہر کی جانشینی متنازعہ تھی اور جب بکا کو غلبہ حاصل ہو تو اُس نے دعویٰ کیا کہ وہ ہری ہر کے فوراً بعد جانشین ہوا۔

قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۳ء میں ہری ہر کے انتقال پر کمپا تخت نشین ہوا اور ۱۳۵۵ء تک حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا تخت نشین ہوا جس کا انتقال ۱۳۶۳ء کے آخر یا ۱۳۶۴ء کے شروع میں ہوا اور جبھی بکا کو تخت نشین ہونے کا موقع ملا۔ لیکن اُس نے ۱۳۴۳ء سے ۱۳۶۳ء تک کی مدّت کو غاصبانہ قبضہ قرار دیا اور اپنی جانشینی کی تاریخ ۱۳۴۳ء قرار دی۔ چنانچہ فرشتہ نے غالباً کمپا کی موت کا حوالہ دیا ہے۔ جب اس نے لکھا کہ "تقریباً اسی زمانہ میں ۷۶۴ھ (۱۳۶۳ء) وجے نگر کے رائے کا انتقال ہوا"۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۳۷۰ میں کمپا یا سنگما دوم کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر وینکٹ رام نیاّ نے اپنے مضمون مجاہد شاہ بہمنی میں (روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ حیدر آباد ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۷۲) کہا ہے کہ شاید فرشتہ کے نولکشور ایڈیشن میں ۷۶۳ھ ۷۷۴ھ کی جگہ غلط چھپ گیا ہے جس سے تلنگانہ اور دکھن کے درمیان مصالحت کا واقعہ مجاہد کے دور حکومت میں ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وجے نگر کے ایک حکمران کی موت کا معمہ حل نہیں ہوتا اس لیے کہ بکا کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۳۷۶ء اور ۴ فروری ۱۳۷۷ء کے درمیان کسی وقت ہوا۔ میرے خیال میں اس کے حل کی یہی صورت ہے کہ میرے قیاس کو صحیح مان لیا جائے۔

۴۴- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۴-

۴۵- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۸- اسے فرشتہ کی حسب معمول مبالغہ کی عادت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اگر قانون اور رواج کی ساری بندشیں ختم کر دی گئی ہوتیں تو یقیناً حکومت اور سماج کا تختہ الٹ جاتا اور یہ محمد جیسے طاقتور پابندِ ضابطہ حکمران کے عہد میں ؟ فرشتہ نے اکثر اس طرز بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔

۴۶۔ گرتی ونکٹ راؤ کتاب مذکور صفحہ ۲۶۶۔

۴۷۔ فرشتہ نے تحفۃ السلاطین کے مصنف ملا داؤد بیدری کا حوالہ دیا ہے جس نے لکھا ہے کہ وہ شادی کے موقع پر موجود تھا اور اس وقت اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی۔

۴۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۹۔ دشمن کے ہاتھوں ایسی شدید مصیبتوں کے بیان کا یہ اسلوب مورخین میں عام ہے۔

۴۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۰ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی فرشتہ کا مبالغہ ہے اس لیے کہ وجے نگر نے مدگل پر قبضہ چند ہی ہفتہ پیشتر کیا تھا اور یہ یقین نہیں آتا ہے کہ ایک مخدوش قلعہ میں اتنی بہت سی دولت اتنی قلیل مدت میں انھوں نے جمع کر لی ہو۔

۵۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۲۹۰ و ۲۹۱۔ سیویل نے اے فارگاٹن ایمپایر کے صفحہ ۴۷ میں لکھا ہے کہ بھوج مل رائے کا اصلی نام ملی ناتھ تھا اور اس کی سند رائس کے نظر ثانی کیے ہوئے ۱۳۵۵ء لغایت ۱۳۵۶ء کے بعض کتبات سے دی ہے۔ سرد گپا ریاست تامل ناڈو کے ضلع بلاری میں ایک تجارتی شہر، ۱۵ر۶۴ شمال، ۷۷ر۳۸ مشرق۔ کوتلم اس سے چند میل کے فاصلہ پر ہموار زمین پر۔ کروہ یا کوس کی ناپ ۳۰۰۰ گز یا ۵ کیلومیٹر = ۸ میل ہے۔

۵۱۔ یہ سب فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۱ میں ہے۔

۵۲۔ یہ عجیب بات ہے کہ سلطان کو جو کچھ مال غنیمت حاصل ہوا اُس کے علاوہ کوئی تاوان جنگ نہیں لیا۔ دراصل جو کچھ وہ چاہتا تھا وہ اُسے مل گیا اور اب وہ وجے نگر کو باجگذار ریاست سمجھتا تھا۔

۵۳۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۲۔

۵۴۔ فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۲۹۳ میں لکھا ہے کہ بہرام خاں نے خان محمد کے کچھ سپاہیوں کو رشوت دے دی۔ پٹن یا پیٹھن دریائے گوداوری پر۔ ایک زمانہ میں مغربی چلوکیاون کا دارالسلطنت تھا۔ اب ریاست اندھرا پردیش کے ضلع اورنگ آباد میں دریائے بند وسارا پر ایک تعلقہ کا مستقر ہے۔ ۱۹ر۵۸ شمال، ۷۵ر۴۶ مشرق۔

شیوگاؤں ریاست مہاراشٹر کے ضلع احمد نگر میں۔ ۱۹ر۱۵ شمال، ۷۵ر۵ مشرق۔

۵۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۴۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۳۹۴ میں ہے کہ اسی بغاوت کے نتیجہ میں ملک راجہ نے خاندیش کی ریاست قائم کر لی لیکن مجھے اس روایت کی سند نہیں مل سکی

۵۶ - شیخ زین الدین داؤد ایران کے شہر شیراز میں سنہ ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں پیدا ہوئے اور ۷۲۷ھ (۱۳۲۷ء) میں جب دارالسلطنت دہلی سے منتقل ہوا تو دولت آباد آگئے۔ وہ دکھن کے بزرگ ترین اور صاف گو اولیاؤں میں سے تھے۔ ناصر خاں فاروقی نے خاندیش میں زین آباد انھیں کے نام پر آباد کیا۔ ۲۵ ربیع الاول ۷۷۱ھ (۲۷ اکتوبر ۱۳۶۹ء) کو ان کا انتقال ہوا اور خلد آباد میں مدفون ہوا۔

برہان مآثر میں صفحہ ۳۲ میں اس سے مختلف ہے۔ اُس میں یہ ہے کہ جب بہرام خاں شیخ زین الدین کے پاس گیا تو انھوں نے اُسے مشورہ دیا کہ سلطان سے معافی مانگے۔ سلطان نے اُسے معاف تو کر دیا مگر حکم دیا کہ اُس کی سلطنت سے باہر چلا جائے۔

۵۷ - آیہ محمد قرآن کی سورۂ ۲۱ میں ۸۷ ویں آیت ہے اور وہ یہ ہے:

لاالہ الاانت سبحانک انی کنت من الظالمین - فاستجبنالہ ونجینٰہ من الغم وکذالک ننجی المومنین -

(تیرے سوا کوئی معبود نہیں - تیری ذات پاک ہے - بے شک میں گنہگار ہوں - پھر ہم نے اس کی دعا سن لی اور اُسے دُکھ سے نجات دی اور اسی طرح ہم نیکوں کو پناہ دیتے ہیں)۔

۵۸ - حضرت شیخ برہان الدین دکھن کے بہت بڑے بزرگ اور شیخ زین الدین کے پیر تھے۔ دہلی کے قریب ہانسی میں پیدا ہوئے اور دولت آباد میں انتقال کیا - ان کا مزار اب تک مرجع خلایق ہے۔

۵۹ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۴ -

۶۰ - برہان مآثر صفحہ ۳۱ کی روایت کے بموجب محمد نے ۱۷ یا ۱۸ سال اور ۷ ماہ حکومت کی۔ طبقات میں ۱۳ سال ہے جو یقیناً غلط ہے۔ رفیع الدین شیرازی نے تذکرۃ الملوک مخطوطہ آصفیہ نمبر ۱۰۸ فولیو ۸ (الف) میں اور امین احمد رازی نے ہفت اقلیم مخطوطہ آصفیہ شعبہ تاریخ نمبر ۱۴۲۳ فولیو ۱۱۶ (ب) میں ۱۸ سال ۷ ماہ سے اتفاق کیا ہے لیکن عبداللہ المکی نے ظفر الولیہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۹ میں اس کی حکومت کی مدّت ۱۷ سال ۷ ماہ لکھی ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس کا انتقال ۱۹ ذیقعد ۷۷۶ھ (۲۰ اپریل ۱۳۷۵ء) کو ہوا جس سے اس کی حکومت کی مدت ۱۷ سال، ۸ ماہ، ۹ دن کی ہوتی ہے جو برہان کی دی ہوئی دو تاریخوں کے بیچ میں ہے اور اسے صحیح سمجھنا چاہیے۔ رفیع الدین نے جو اس کے انتقال کی تاریخ ۷۷۳ھ لکھی ہے وہ یقیناً غلط ہے۔

۶۱ - اس کے متعلق دیکھو اوپر تیسرا باب۔

۶۲ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۵ - "اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف واپس آ اُس کی رضا سے مطمئن ہو کر"۔ قرآن سورہ ۸۹ آیۃ ۲۷ و ۲۸ -

۶۳ - مفرح القلوب بحوالہ عبدالجبار کتاب مذکور۔

۶۴۔ رفیع الدین شیرازی کتاب مذکور فولیو ۸ (الف)۔

۶۵۔ برہان صفحہ ۳۱۔

۶۶۔ عبدالجبار، کتاب مذکور صفحہ ۲۸۲۔ طبقات صفحہ ۴۰۸۔

شیخ عین الدین بیجاپوری دہلی کے قریب نوج میں سنہ ۷۰۶ھ (سنہ ۱۳۰۶ء) میں پیدا ہوئے اور دہلی سے دولت آباد آئے اور وہاں سے بیجاپور جہاں وہ سنہ ۷۶۳ھ (سنہ ۱۳۶۱ء) میں پہنچے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ملحقات طبقات ناصری بھی ہے جو افسوس ہے کہ اب نایاب ہے۔ وہ گنج العلوم کہلاتے تھے اور طویل عمر پاکر ۲۷ رجب سنہ ۷۹۵ھ (۱۰ مئی سنہ ۱۳۹۲ء) کو انتقال کیا۔ ان کا مزار بیجاپور میں محمود گاواں نے تعمیر کیا۔

پانچواں باب

تغیّرات کا دَور

(۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء سے ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء)

(الف) کلچرل حالات

ورثہ

محمد اوّل کو ایک چھوٹی سی غیر منظم حکومت ملی تھی مگر اپنے انتقال کے وقت اُس نے ایک مستحکم نظام قائم کر دیا تھا جو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ تھا اور ایک معقول ترقی یافتہ مرکزی اور صوبائی نظام حکومت قائم ہو گیا تھا۔ جن لوگوں کو سلطنت کے نظام کی مضبوطی کا علم تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس کے لیے جد و جہد کرنا سود مند ہو گا اور ہم دیکھتے ہیں کہ گلبرگہ کی سلطنت کے لیے ۲۲ سال تک مسلسل کش مکش رہی جس میں برابر قتل و خون ریزی اور عزل و نصب ہوتا رہا جس کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں ہوا جب تک ۸۰۰ھ (۱۳۹۷ء) میں فیروز تخت نشین ہوا۔ بجز محمد دوم کے جس نے بیس سال تک پُرامن حکومت کی اور جس کے عہد میں دکھن کو فروغ ہوا اور کلچر اور علوم و فنون کی ہمیشہ سے زیادہ ترقی ہوئی اُس وقت تک چار سلطانوں میں سے ایک کو بھی چند ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ اس درمیانی خلا کے خاتمہ پر فیروز کی شخصیت میں ایک نئی قوت اُبھرتی ہے لیکن وہ بھی پچیس سال تک کامیاب حکومت کرنے کے بعد معزول کر دیا جاتا ہے اور احمد اوّل

کی تخت نشینی کے بعد ہی سلطنت کی جانشینی کا ضابطہ طے ہوا اور اولادِ اکبر کی جانشینی کا اصول خانوادہ بہمنی کے خاتمہ تک جاری رہا۔

بیرونی اثرات

مجاہد کی تخت نشینی اور فیروز کی تخت نشینی کی چوتھائی صدی کی درمیانی مدّت میں کئی عوامل بہمنی یا دکھن کلچر کی تشکیل کے لیے برسرِعمل رہے۔ شروع سے تغلق سلطنت سے آزاد ہو جانے کی وجہ سے دکھن شمال سے کٹ گیا تھا اور اس وقت سے گجرات، خاندیش اور مالوا کی آزادی سے بڑے بڑے علاقے دہلی اور دکھن کے درمیان حایل ہو گئے تھے۔ ان حالات میں یہ قدرتی بات تھی کہ خلجیوں اور ابتدائی تغلقوں کے مختصر المدت تعلقات کے دوران میں جو اثرات دہلی سے دکھن میں آتے تھے وہ رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تلنگانہ اور وجے نگر نے محمد اول کے خلاف فیروز تغلق کو اُکسا کر دکھن میں دہلی کے اثر کو واپس لانے کی کوشش کی مگر یہ ناکام ہوئی۔ اِس کے بعد سے دکھن پر دہلی کے اقتدارِ اعلیٰ کی کوئی علامت نظر نہیں آتی جب تک کہ مغل ہندوستان کے شہنشاہ کی حیثیت سے منظرِ پر نہیں آئے۔

شمال کا اثر تقریباً بالکل ختم ہو جانے کے بعد دکھن کے مسلمانوں کی مختصر سی تعداد کو ملک کے باہر سے مدد لینے کی ضرورت ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ خلیج فارس کے ساحلی علاقوں اور اس کے بھی آگے شمال میں بحیرہ کیسپین کے سواحل یعنی ایران، عراق اور عرب سے شعراء، علما، بزرگان دین، فنکار، تاجر، سپاہی اور قسمت آزما لوگوں کا طاقتور انسانی عنصر متواتر ہجوم کے ساتھ نوواردوں کے طور پر دکھن میں آتا رہا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ مشرقی ثقافتی اثرات تو واضح طور پر گھٹ رہے تھے لیکن غیر ملکی اثرات بہمنی سلطنت میں براہ راست کام کر رہے تھے حالانکہ اس کی ساخت تغلق کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ یہ نووارد کچھ تو بہمنی سلاطین کی دعوت پر اور کچھ اپنی مرضی سے آکر آباد ہو گئے اور بعد کو ان کا لقب شمالی آبادکاروں نے جو خود کو پورے طور پر دکھنی سمجھتے تھے غریب الدیار یا آفاقی کر دیا۔

الف ۔ کلچرل اثرات

ایرانی، ماورائے جیحونی اور عراقی نوواردوں کی کثرت کا اندازہ فوجی اور غیر فوجی بہمنی عہدہ داروں کے القابوں سے ہوتا ہے جو محمد شاہ کے وقت تک ملتے ہے اور سیستانی، تبریزی، مازندرانی، کرمانی اور اسی قسم کے دوسرے القاب بکثرت ملتے ہیں۔ کلچرل اثرات کو بڑھانے کی ضرورت کی بنا پر باہرت اہل علم

اور بہترین لوگوں کو بلانے کی کوشش شروع ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ محمد دوم جو خود بھی عربی اور فارسی کا عالم تھا عرب اور ایرانی شعرا کو دکھن میں بلاتا رہا تاکہ اپنے ملک کو علم و تہذیب کا مرکز بنا دے۔ وہ اچھے شاعروں کو بڑی بڑی رقمیں دیتا تھا اور اصلی قدر و قیمت کی شناخت میں مشہور تھا اور جو لوگ اس کے مستحق تھے انھیں فیاضی سے تنخواہیں اور وظیفے دیتا تھا[۵۳]۔ اس نے میر فضل اللہ انجو[۵۴] کو صدر جہاں کا عہدہ دیا اور اس نے خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو دکھن بلانے کی کوشش کی۔ حافظ کو دکھن کے سفر خرچ کے لیے بہت بڑی رقم بھیجی گئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقروض تھے اور اس رقم کا کچھ حصہ قرض ادا کرنے میں صرف کیا اور کچھ غریب بیواؤں اور خود اپنے بھانجوں میں تقسیم کر دیا اور تھوڑی سی رقم ہندوستان کے سفر کے لیے بچا لی۔ لیکن جب وہ لار پہنچے تو انھیں کچھ ایسے لوگ ملے جو بالکل نادار تھے اور انھوں نے باقی سب روپیہ انھیں دے دیا لیکن یہیں انھیں دو تاجر خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد گرزونی ملے جنھوں نے انھیں ضرورت بھر کا روپیہ دیا اور انھیں اپنے ساتھ لے کر ہرمز پہنچایا جہاں ایک مخصوص جہاز انھیں بہمنی بندرگاہ دابول لے جانے کے لیے تیار تھا لیکن جب حافظ جہاز پر سوار ہوئے تو آندھی اور طوفان کا زور ہو گیا اس لیے انھوں نے ہندوستان آنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک بہت خوبصورت غزل لکھ کر انجو کو بھیج دی۔ محمد دوم نے جب سنا کہ حافظ ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو چکے تھے تو اس کی تلافی کے لیے ایک ہزار طلائی تنکہ کے ساتھ ملا محمد قاسم مشہدی کو شیراز بھیجا[۵۵]۔

محمد خود بھی اچھا شاعر تھا اور اس کے تین شعر جو فرشتہ نے نقل کیے ہیں شستہ اور شگفتہ اسلوب کے ہیں[۵۶]۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں بلا تکلف گفتگو کرتا تھا اور اپنی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں جیسے گلبرگہ، بیدر، قندہار، ایلچ پور، دولت آباد، جنیر، چال، دابول وغیرہ میں معلم مقرر کیے اور طلبہ کو جو اسلامی علوم پڑھنا چاہتے تھے وظیفے دیتا تھا۔ فضل اللہ خود شاہی خاندان کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا اور بعد کو ممتاز عہدہ پر فائز کیا گیا۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ باہر سے ایرانیوں اور عراقیوں کی آمد کو بہترین دماغ کے لوگ بھی پسند کرتے تھے اور ملک سیف الدین غوری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے بادشاہ کو فہمایش کی تھی کہ اسے ہمیشہ رسول اللہ کی اولاد یعنی کربلا، نجف اور مدینہ کے سادات اور نیز عالی خاندان اور آبائی روایات کے لوگوں کو ترجیح دینا چاہیے[۵۷]۔

عرب، ایرانی اور ترکوں کی آمد نے دکھن کی آیندہ تاریخ و تہذیب پر بہت بڑا اثر کیا۔ بیرونی اثرات محمد اول ہی کے وقت سے نمایاں ہو گئے تھے اور فوجی اور نیز غیر فوجی تعمیرات جیسے گلبرگہ کی مسجد اور بھنگر کے قلعہ پناہ اسلام میں ان کے اثرات صاف نظر آتے ہیں[۵۸]۔ دکھن میں ملک سیف الدین غوری کی ایک بہت

بڑی شخصیت موجود تھی جو یکے بعد دیگرے پانچ سلاطین کا دست راست رہا اور جس کا سلطنت کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے میں موثر ہاتھ رہا ہوگا۔ ۲۲ رجب ۷۹۹ھ (۲۱ اپریل ۱۳۹۷ء) کو اس کے انتقال کے بعد ہر اُس قسمت آزما کے لیے راستہ صاف ہوگیا جس میں آگے بڑھنے کی سکت تھی۔ چنانچہ ترک تغل چین کے واقعہ سے جس نے محمد دوم کے لڑکے اور جانشین غیاث الدین کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا اور اتنا با اقتدار ہوگیا تھا کہ ایک کٹھ پتلی کے حکمران شمس الدین کو تخت نشین کر دیا ظاہر ہوتا ہے کہ ہوا کا رُخ کیا تھا۔ آفاقیوں کے مسئلہ کی اس تقریباً غیر محسوس شروعات نے اگلے برسوں میں زبردست اہمیت حاصل کر لی[۴]۔

اس اثر کے ساتھ ساتھ جو قطعی طور پر غیر ملکی تھا مقامی ہندوؤں نے بھی بہمنیوں کی تہذیبی ساخت پر اثر ڈالا۔ اس خانوادہ کا تیسرا حکمران مجاہد اپنی رعایا میں خالص ہندو لقب بلوان سے مشہور تھا[۵]۔ علاوہ بریں اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم شادیوں کا وقت ابھی نہیں آیا تھا جو بعد کو ہمیں فیروز کے عہد میں نظر آتا ہے تاہم دونوں تہذیبوں کے علم برداروں کے تعلقات بہت ہی خوشگوار رہے ہوں گے اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو تمدن کا اثر اگرچہ بہت آہستہ آہستہ سہی بہمنیوں کی مذہبی عمارات میں بھی نظر آتا ہے۔ مجاہد اول کے عہد سے لے کر فیروز تک بہمنی حکمران جن مقبروں میں دفن کیے گئے ان کے مشترک نام ہفت گنبد یا سات گنبد والے ہیں اور اگرچہ مجاہد کے مقبرہ سے لے کر شمس الدین کے مقبرہ تک حکمرانوں کے مقبرے اُس ایرانی اثر سے الگ ہوگئے ہیں جو قلعہ کی جامع مسجد میں نظر آتا ہے اور ڈھلوان دیواروں، چپٹے گنبدوں اور سادے بیرونی حصہ کے خالص تغلق طرز پر آگئے ہیں تاہم غیاث الدین کے مقبرہ کی مغربی محراب میں صاف ہندو اثر نظر آتا ہے جو بعد کو فیروز کے مقبرہ اور افضل خاں کی مسجد میں اور بڑھ گیا ہے[۶] اور کچھ مدت بعد تغلق کی روایات کو ختم کر کے ان کی جگہ لے لی ہے۔

مختصر یہ کہ محمد اول کے انتقال سے لے کر فیروز کی تخت نشینی تک بائیس سال کے تغیرات کے دور میں مختلف تہذیبوں کی کشمکش جاری رہی یعنی خالص ہندو طرز کے امتزاج کی کوشش، بیرونی اثرات جن کے نمائندے آفاقی تھے جو بیشتر ایرانی اور عراقی تھے اور شمالی یا تغلقی روایات جن کے نمائندے "دکھنی" تھے۔

(ب) سیاسی حالات

(الف) علاء الدین مجاہد

۲۱ر اپریل ۱۳۷۵ء سے ۱۶ر اپریل ۱۳۷۸ء[11]

ذاتی خصوصیات

محمد اول کا جانشین ۲۱ر شوال ۷۷۶ھ (۲۱ر اپریل ۱۳۷۵ء) کو اُس کا لڑکا (ملک سیف الدین غوری کی لڑکی سے) علاء الدین مجاہد ہوا۔ اُس کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی اور اُس نے تین سال سے بھی کم حکومت کی۔ ۱۷ر ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۶ر اپریل ۱۳۷۸ء) کو وہ قتل کر دیا گیا۔[12] جب وہ تخت نشین ہوا تو شیخ سراج الدین جنیدی نے خود اپنا کرتہ اور پگڑی بھیجی اور یہی پہن کر وہ تخت نشین ہوا جس سے وقت کے مسلمان بزرگ کی حمایت کا یقین ہو گیا[13] اور جب وہ وجے نگر کی مہم پر روانہ ہوا تو اپنی کامیابی کی دُعا کے لیے خاص طور پر اپنے پیر کے پاس گیا۔ کہا جاتا ہے کہ نئے بادشاہ کو امن و جنگ کے تمام فنون کی بخوبی تربیت دی گئی تھی اور مزید برآں اُسے ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت تھی اور بحیثیت سپاہی کے بھی وہ اعلےٰ صلاحیت کا تھا اس لیے کہ تلوار چلانے اور تیر اندازی کی اسے اچھی مشق تھی اور وہ بہت اچھا شہسوار تھا۔[14] معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی قد و قامت اور قوّت کا تھا جس کی وجہ سے اُسے بلوان کہا جاتا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی ایک وقت میں تیس سیر کھانا کھا سکتا تھا۔[15] شہزادگی کے زمانے میں اُس نے اپنے مقابل بادشاہ کے خاصدان بردار مبارک کی گردن کی ہڈی توڑ دی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ وجے نگر کے خلاف مہم میں مصروف تھا تو اُس نے سُنا کہ ایک خونخوار شیر شاہی کیمپ کے پاس آگیا ہے اور صرف سات آدمیوں کو ساتھ لے کر وہ شیر کو مارنے چل پڑا اور شیر کے قریب آنے کا انتظار کیا اور جب شیر چند گز کے فاصلے پر آگیا تو اُس نے تیر کا نشانہ لگایا جو شیر کے دل میں پیوست ہو گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس پر اُس نے خوش ہو کر کہا کہ اگر تیر خطا کرتا تو وہ تنہا تلوار یا خنجر سے شیر پر حملہ کرتا۔[16]

تخت نشین ہونے پر اُس نے اپنے نانا ملک سیف الدین غوری کو وزیر اعظم بنایا مگر حکومت

میں چند تبدیلیاں کیں، ایک تو یہ کہ اس نے دولت آباد کے طرف دار کے عہدہ پر مسند عالی خان محمد کی جگہ اعظم ہمایوں کو مقرر کیا۔[17] اس تبدیلی کا سلطنت کے مستقبل پر بہت بُرا اثر پڑا۔

وجے نگر

نوجوان مجاہد کی مختصر حکومت کا تقریباً سارا زمانہ وجے نگر کے خلاف اعصابی جنگ میں صرف ہو گیا جس کا سلسلہ اس کے جانشین داؤد کے عہد تک جاری رہا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے مجاہد کی تخت نشینی کے وقت وجے نگر کا رائے بُکا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری یا فروری ۱۳۷۷ء تک حکومت کی اور اس کا جانشین ہری ہر دوم ہوا۔ مجاہد نے اپنی حکومت کے شروع ہی میں بُکا کو لکھا کہ چونکہ رائچور کا دوآبہ ہمیشہ دکھن اور وجے نگر کے مابین مابہ النزاع رہا ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ دونوں سلطنتوں کی درمیانی سرحد تنگ بھدرا کو قرار دیا جائے اور بنکاپور کا قلعہ اُس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس پر رائے نے جواب دیا کہ رائچور اور مدگل ہمیشہ وجے نگر سلطنت کے ماتحت رہے ہیں اس لیے یہ دونوں اور نیز وہ ہاتھی جو محمد شاہ لے گیا ہے اُس کے حوالے کیے جائیں تاکہ دونوں سلطنتوں میں مستقل صلح ہو جائے۔ اس پر مجاہد نے حکومت کا سارا انتظام ملک سیف الدین غوری کے سپرد کیا۔ اور فوراً دولت آباد، بیدر اور برار کی فوجیں جمع کر کے اور پانچ سو ہاتھی ساتھ لے کر تنگ بھدرا کو عبور کیا جو طریق جنگ اُس نے اختیار کیا وہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت جرأت مندانہ تھا، یعنی یہ کہ جنوبی سلطنت کے دارالسلطنت کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے اور اُس کے رسل و رسایل کے تمام وسیلے منقطع کیے جائیں مگر وہ خود جال میں پھنس گیا۔ اس لیے کہ اس کے وسایل نقل و حمل میں غیر معمولی پھیلاؤ ہو گیا اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا وہ خود مرتے مرتے بچا۔[18]

ادونی پہنچ کر سلطان نے صفدر خاں سیستانی کو قلعہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا اور امیر الامرا بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کو وجے نگر پر چڑھائی کا حکم دیا اور وہ خود آہستہ آہستہ گنگاوتی کی طرف بڑھا جو تنگ بھدرا پر واقع تھا اس لیے کہ اس نے سنا تھا کہ رائے وہیں خیمہ زن ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رائے کی ایک چال تھی[19] اس لیے کہ اس نے بجائے شمال کی طرف بڑھنے کے اپنے دارالسلطنت کو امرا اور عمایدکی سپردگی میں دے دیا اور خود اپنے دارالسلطنت کے جنوب میں جنگل میں جا کر پناہ لی تاکہ وہاں سے غنیم کے خلاف چھاپہ مار جنگ جاری رکھے اس لیے کہ کھلے میدان میں اُسے قابو پانے کی توقع نہ تھی۔ جب مجاہد وجے نگر کی فصیل کے پاس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ شہر کے

چاروں طرف جو پہاڑیاں ہیں انھیں قلعہ بند کرکے دارالسلطنت کو خوب مستحکم کردیا گیا ہے اور چونکہ رائے جنوب کے جنگل میں چلا گیا تھا اس لیے مجاہد سیتا بن رامیشور تک گیا جو دارالسلطنت سے "چھ سو کروہ" کے فاصلے پر تھا۔ مجاہد نے غنیم کا چھ ماہ تک پیچھا کیا مگر کوئی آمنے سامنے کی لڑائی نہ ہوئی۔ البتہ جب رائے بیمار ہوا تو وہ دارالسلطنت واپس آیا اور ایک پہاڑی چوٹی پر بنے ہوئے قلعہ میں محصور ہوگیا۔ مجاہد نے بہادر خاں کو غنیم کا تعاقب کرنے پر مامور کیا اور خود اعتماد کے ساتھ سیتا بن رامیشور کی طرف بڑھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پہنچ کر اس نے علاء الدین خلجی کی بنائی ہوئی ایک مسجد کی مرمت کرائی۔[۲۰]

فرشتہ کا بیان ہے کہ رامیشور سے دارالسلطنت کو جانے والی دو سڑکیں تھیں۔ ایک تو اگرچہ دوسری سے کشادہ تھی مگر کمین گاہوں سے بھری ہوئی تھی جہاں غنیم کے آدمی چھپے ہوں گے' اس لیے سلطان نے واپسی کے لیے زیادہ محفوظ تنگ راستہ اختیار کیا مگر یہاں بھی اُسے مسلسل لڑکر راستہ صاف کرنا پڑا۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اُسے برابر دشمنوں پر فتح ہوتی رہی۔ بالآخر وہ ایک جھیل کے کنارے پہنچا جو اس کے اور "رائے کے پہاڑی قلعہ" کے بیچ میں حایل تھی۔ پہاڑی پر ایک مندر سری رنگا نام کا تھا۔ جسے لوٹ لیا گیا۔ اب دونوں فوجوں میں دو بدو جنگ شروع ہوگئی اور عین اس وقت جب کہ لڑائی شدت سے ہورہی تھی سلطان نے اپنی شاہی چھتری پھینک دی اور صرف ایک سپاہی محمود افغان کے ساتھ اپنے مُشکی گھوڑے شیر رگ پر جھیل کو عبور کیا لیکن وجے نگر کے ایک سپاہی نے بادشاہ کو پہچان لیا اور فوراً اس پر حملہ کردیا۔ مجاہد نے تلوار کے ایک ہی وار میں اس کا صفایا کردیا۔[۲۱]

لڑائی میں اعظم ہمایوں میسرہ کی کمان پر اور بہادر خاں میمنہ کی کمان پر تھا اور صفدر خاں سیستانی کا لڑکا مقرب خاں توپ خانہ کا انچارج تھا۔ مقرب خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ توپ کی گاڑیاں اگلی صف میں لاکر غنیم پر گولہ باری شروع کردے۔ یہ کارروائی بہت موثر ہوئی اور غنیم بالکل شکست کے قریب تھا کہ رائے آٹھ ہزار سوار اور چھ لاکھ پیادہ کی بھاری فوج لے کر میدان میں آگیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ فریقین نے جی کھول کر کشت و خون کیا اور قتل عام میں مقرب خاں بھی کھیت رہا۔ سلطان کا چچازاد بھائی داؤد خاں جو سڑک کے سرے کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا سات ہزار پیادہ فوج لے کر آگے بڑھا اور بڑی بہادری سے لڑا اور اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس کے تین گھوڑے مارے گئے اور وہ نیچے اُترنے پر مجبور ہوا مگر جو شاہی علم اس کے ہاتھ میں تھا اس کی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ بادشاہ کو داؤد کا حال دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی اور اس نے خیال کیا کہ اگر سڑک کا سرا دشمن کے قبضہ میں چلا گیا تو ایک مسلمان بھی بچ کر نہ جاسکے گا۔ اب چونکہ اس نے سُنا کہ راستہ کے سرے پر دشمن کا قبضہ ہوگیا ہے اس لیے وہ خود تیزی سے وہاں پہنچ گیا۔

اور دشمن کو مار بھگایا اور جب تک اُس کا آخری سپاہی وہاں سے نہیں چلا گیا وہ وہاں سے نہیں ہٹا۔[22]

مجاہد کو اب اندازہ ہوا کہ وجے نگر کا فتح کرنا مشکل ہے اس لیے اس نے ادونی کی طرف پسپائی کی چال چلی جس کا کئی مہینہ سے اس کی فوج نے محاصرہ کر رکھا تھا۔[23] سلطان کی فوج سخت وقت میں پھنسی ہوئی تھی اور فریقین کے تحریری معاہدہ کے برخلاف جب چین اپا اودیار کمک لے کر پہنچا تو قلعہ بند فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور ایک شاہی نائب کا سر کاٹ کر توپ سے شاہی خیمہ کی طرف پھینک دیا گیا۔[24] اب بہمنیوں کی طرف سے کمک کی امید نہ تھی اور مشکلات میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ شاہی کیمپ میں وبا پھیل گئی اور قحط پڑ گیا جس سے بکثرت آدمی مر گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مجاہد کی قطعی پسپائی سے پہلے ایک جھڑپ ہوئی اور بیلور کھنڈ کے ایک کتبہ سے جس پر تاریخ نہیں ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجے نگر نے دو مسلم افسروں یعنی سیف الدین غوری اور شہزادہ فتح خاں کو قید کر لیا[25] اور یہ کہ دکھن کی فوج شکست کھا کر سرحد کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہوئی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ملک سیف الدین غوری نے جب سُنا کہ شاہی فوج سخت مشکل میں گرفتار ہے تو وہ مزید فوج لے کر پہنچ گیا[26] اور مجاہد اُس کے فوراً بعد واپس ہو گیا اس لیے ممکن ہے کہ کتبہ کا یہ مضمون صحیح ہو۔ بہر نوع جو صورت بھی ہو، سیف الدین غوری جلد ہی مجاہد کے پاس پہنچ گیا اور صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ چونکہ ادونی بلندی پر واقع ہے اس لیے جنگی اصول کے بموجب پہلے گوا سے بلگام تک بلکہ بنکاپور تک تنگ بھدرا کرشنا دوآبہ کے تمام قلعے تسخیر کیے جائیں اس کے بعد ادونی کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ مجاہد نے پیچھے کا رخ کیا اور تنگ بھدرا کو عبور کر کے دارالسلطنت کا راستہ لیا۔ مدگل پہنچ کر وہ صرف چار سو معتبر ساتھیوں کے ساتھ جن میں داؤد خاں، مسند عالی خان محمد، صفدر خاں سیستانی اور اعظم ہمایوں شامل تھے شکار کے لیے روانہ ہو گیا۔ اعظم ہمایوں اور صفدر خاں جو ہمیشہ ذات شاہی کے وفادار اور جاں نثار تھے انھیں اپنے اپنے ماتحت صوبوں یعنی برار اور دولت آباد بھیج دیا گیا اور خود مجاہد نے مچھلی کے شکار پر جانے کے لیے کرشنا کو عبور کیا۔[27] اب انتہائی افسوسناک حادثہ کے لیے میدان تیار ہو گیا اور خاصدان بردار مبارک جس کی گردن کی ہڈی شہزادگی کے زمانہ میں مجاہد نے توڑ دی تھی اُس کے لڑکے مسعود خاں نے داؤد خاں سے مل کر جسے ادونی کی چوکی چھوڑنے پر سرزنش کی گئی تھی بادشاہ کے خلاف سازش کی اور جب وہ اپنے خیمہ میں سو رہا تھا اُسے خنجر سے قتل کر دیا۔ مجاہد چونکہ طاقتور تھا اس لیے اگرچہ اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں وہ قاتلوں کے پیچھے دوڑا مگر گر کر سر کاٹ لیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۷ر ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۶ر اپریل ۱۳۷۸ء) کو پیش آیا۔

(ب) داؤد اوّل

۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء سے ۲۱ مئی ۱۳۷۸ء[۲۹]

مجاہد کے قتل کے فوراً ہی بعد داؤد کے دکھن کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا اور جتنے لوگ موجود تھے سب نے سلامی دی لیکن سلطنت میں اس وقت سخت انتشار تھا اور صفدر خاں سیستانی اور اعظم ہمایوں جنھوں نے بیجاپور میں بادشاہ کے قتل کا حال سنا وہ نئے بادشاہ کو سلامی دینے نہیں آئے بلکہ شمال کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ وجے نگر کے ہری ہر دوم نے پسپا ہوتی ہوئی بہمنی فوج کا تعاقب کیا اور تنگ بھدرا کو عبور کرکے رائچور کا محاصرہ کرلیا۔[۳۰] خود دارالسلطنت میں طرح طرح کی افواہیں اور جھگڑے تھے۔ بظاہر وہاں دو فریق برسرِ عمل تھے، ایک تو داؤد کے موافق تھا اور دوسرا ایک بارعب خاتون مجاہد کی بہن روح پرور آغا کی قیادت میں تھا جو بہمن شاہ کے چھوٹے لڑکے محمد کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا۔ مجاہد کے خسر بوڑھے سیف الدین غوری کو بادشاہ کے قاتلوں کا اقتدار پسند نہ تھا مگر اس کا جذبہ وطنیت غالب آیا اور ملک کے اتحاد اور تحفظ کا خیال کرکے اس نے غاصب بادشاہ کو سلامی دی لیکن اس کے باوجود روح پرور آغا درباری حلقوں میں اپنی حیثیت کی وجہ سے اور اُس جذبہ دل سوزی کی وجہ سے جو ہر شخص اس کے لیے محسوس کرتا تھا اور نیز اپنے مرحوم بھائی کو ثواب پہنچانے جو روپے فیاضی سے اس نے تقسیم کیے اس کی وجہ سے اُس کا اثر بڑھتا گیا۔

بہرحال داؤد کی تخت نشینی کے جلد ہی بعد مجاہد کے قتل کا انتقام لینے کا موقع آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ روح پرور نے شاہی عملہ کے ایک غلام مسمی باکا کو جسے مرحوم بادشاہ نے ترقی دی تھی اُجرت دے کر داؤد کے قتل پر مامور کیا اور عین اس وقت جب کہ ۲۲ محرم ۷۸۰ھ (۲۱ مئی ۱۳۷۸ء) کو داؤد گلبرگہ کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ رہا تھا اور سجدہ کی حالت میں تھا باکا نے اُس کے خنجر بھونک دیا۔ باکا کو فوراً پکڑ لیا گیا اور مسند عالی خان محمد نے جو مسجد میں موجود تھا اس کا سر قلم کردیا۔[۳۱] داؤد خطرناک حالت میں محل پہنچایا گیا اور مسجد کے اندر ہی دونوں فریقوں میں دست بدست لڑائی ہونے لگی جس میں روح پرور کی پارٹی غالب آئی اور جب داؤد نے اپنے حامیوں کی شکست کی خبر سن لی اس وقت اُس کا دم نکلا اور اُس نے آخری سانس لی۔[۳۲]

(ج) محمد دوم[۳۴]

۲۱ مئی ۱۳۷۸ء سے ۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء

روح پرور آغا جو کچھ چاہتی تھی وہ اُسے حاصل ہوگیا اور اس نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لے لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ جانشین کون ہو؟ داؤد کا ایک لڑکا سنجر تھا جس کی عمر اُس وقت نو سال کی تھی اور خان محمد اُسے تخت فیروزہ پر بٹھانا چاہتا تھا لیکن اُس نے دیکھا کہ اس کے لیے محل کا پھاٹک روح پرور نے بند اور مقفل کر دیا ہے اور یہ اعلان کر دیا ہے کہ غاصب کے لڑکے کو اپنے باپ کی جانشینی کا بالکل حق نہیں ہے۔ خان محمد فوراً ملک سیف الدین غوری کے مکان پر گیا جہاں وہ مجاہد کے قتل کے بعد گوشہ نشین ہوگیا تھا۔ خان محمد کا خیال تھا کہ چونکہ غوری "ہندو مسلمان، مرد عورت" سب میں مقبول ہے اِس لیے وہ صحیح رہ نمائی کر سکے گا لیکن غوری نے کہا کہ سنجر محل کے اندر ہی ہے اور اس معاملہ میں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس اثنا میں روح پرور نے سنجر کو اندھا کر دیا تھا اور بہمن شاہ کے پوتے کو تخت نشین کر دیا تھا۔[۳۵]

حکومت کی نوعیت

محمد دوم کی اُنیس سال کی کافی طویل حکومت بہمنی تاریخ میں سب سے زیادہ پُر امن رہی۔ وہ قطعی طور پر شائستہ اور صاحب استعداد تھا اور اس سلسلہ میں اس کی حکومت کی کامیابیوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خان محمد کو جو مجاہد کے قتل میں شریک تھا ساگر میں قید کر دیا جہاں وہ جلد ہی فوت ہوگیا۔ تخت نشین ہونے پر اس نے ملک سیف الدین غوری کو وزیر اعظم مقرر کیا اور یہ دستور بنا لیا کہ ہر ضروری معاملہ میں اس سے مشورہ کرے۔ امن پسند حکمران ہونے کی وجہ سے اس نے وجے نگر سے مصالحت کی راہیں نکالیں جس سے محمد اوّل کے وقت سے اب تک کش مکش چلی جا رہی تھی۔ اگرچہ بعض کتبوں میں ذکر ہے کہ ہری ہر دوم نے گوا سے مسلمانوں کو نکال دیا تھا[۳۶] لیکن یہ ممکن ہے کہ بہمنی فوجیں پھر ادونی پہنچ گئی ہوں جہاں کہا جاتا ہے کہ ۱۳۸۰ء میں ہری ہر کے بھتیجے چین ایا نے انھیں شکست دی تھی۔[۳۷] نیز یہ بھی ذکر ہے کہ ۱۳۸۴ء میں ہری ہر کی فوج تلنگانہ گئی لیکن ورنگل کے شمال مشرق میں کوتا کنڈا کے مقام پر اسے شکست دے دی گئی اور جنگ کے آخر میں وجے نگر کی فوج کا ایک جرنل سلووا راما

مارا گیا۔[۳۸] یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک لڑائی میں جو وجے نگری کے مقام پر بہمنیوں اور وجے نگریوں میں ہوئی وجے نگر کے جنرل نیچ اپا نے بہمنیوں کے خلاف نمایاں کارنامہ انجام دیا اور ۱۳۹۵ء میں رنگنی پر قبضہ کرلیا۔[۳۹] مگر یہ سب باتیں کچھ مبہم سی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت محض غیر مسلسل جھڑپوں سے زیادہ نہ تھی۔ اس اثنا میں ہری ہر نے خود رائچور کا محاصرہ کیا لیکن بالآخر محاصرہ اٹھالیا اور مصالحت کی گفتگو شروع کردی جس کے نتیجہ میں اُس نے سلطان کو خراج دینا منظور کیا۔[۴۰]

بادشاہ کی حکومت کے آخری دنوں میں ساگر کی ایک بغاوت نے رخنہ ڈال دیا۔ اُس نے رمضان دولت آبادی کے لڑکے بہاء الدین کو ساگر کا تھانہ دار مقرر کیا تھا لیکن تھانہ دار کے دو لڑکے محمد اور خواجہ غبن کے مقدمہ میں ملوث ہوگئے اور جب ان پر مقدمہ قائم ہوا تو انھوں نے بغاوت کردی اور اپنے والد کو مجبور کرکے اپنے ساتھ ملا لیا۔ سلطان نے ان کے خلاف ایک آزاد شدہ ترکی غلام یوسف اژدر کو روانہ کیا مگر اُسے کئی لڑائیوں میں شکست ہوگئی اور بزورِ قوت نہیں بلکہ جب بہاء الدین کے آدمیوں نے دھوکہ بازی سے اُسے قتل کردیا تب جاکر بالآخر ساگر پر قبضہ ہوسکا۔[۴۱]

جانشینی کا مسئلہ

محمد نے جانشینی کے مسئلہ کو بڑی قابلیت سے حل کردیا اور اگر اس کے انتقال پر غیر متوقع واقعات نہ ہوتے تو آیندہ شاہی خاندان کے افراد میں ناموافقت کا جذبہ پیدا ہونے کا کوئی سوال نہ ہوتا۔ بہت دنوں تک محمد کے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اس نے بہمن شاہ کے تیسرے لڑکے کے دو لڑکوں فیروز خاں اور احمد خاں کو متبنیٰ کرلیا اور یہ کوشش کی کہ ان دونوں کو علوم اور نیزہ بازی، تیر اندازی اور اُن تمام فنون میں بہترین تربیت دی جائے جو عالی خاندان لڑکوں کے شایان شان ہو اور شہرۂ آفاق میر فضل اللہ انجو کو ان کا استاد مقرر کیا۔ بڑے لڑکے فیروز کو محمد اپنا وارث اور جانشین کہتا تھا اور کبھی کبھی تخت فیروزہ پر اُسے اپنے برابر بٹھالیتا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ اُس نے خود اپنی لڑکیوں کی نسبت بھی کردی۔

لیکن محمد کے لڑکے غیاث الدین کے پیدا ہونے سے حالات بدل گئے اور قدرتاً اس کی شفقت خود اپنی اولاد کی طرف ہوگئی چنانچہ اس نے اپنے بستر مرگ پر یہ خواہش ظاہر کی کہ غیاث الدین اُس کا جانشین ہو اور اس کے دونوں داماد فیروز اور احمد اسے سلامی دیں۔[۴۲]

محمد کا انتقال ۲۱ رجب ۷۹۹ھ (۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء) کو میعادی بخار کے مرض میں ہوا۔ اس کے

دوسرے ہی دن دکھن کے مرد بزرگ ملک سیف الدین غوری کا انتقال ہوگیا جس نے پانچ بادشاہوں کا دور دیکھا تھا اور چار حکمرانوں کے ماتحت بہمنی حکومت کے پرشور زمانے میں وزیر اعظم رہ چکا تھا۔[۲۲]

(د) غیاث الدین، تہمتن[۲۴]

۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء سے ۱۴ جون ۱۳۹۷ء

محمد کا لڑکا غیاث الدین بلا کسی دقت کے تخت نشین ہوگیا۔ اُس کے بہنوئی فیروز خاں اور احمد خاں کی شائستگی نے انھیں محمد کی خواہش کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کیا اور انھوں نے سب کے ساتھ نوجوان بادشاہ کو سلامی دی۔ غیاث الدین نے اپنی حکومت خوش اسلوبی سے شروع کی اور تمام اعلےٰ حکام کو خلعتیں دیں اور صوبہ جات کے گورنروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ جب ایلیچ پور سے صفدر خاں سیستانی کے انتقال کی خبر آئی تو اس نے صفدر خاں کے لڑکے صلابت خاں کو مسند عالی کے خطاب کے ساتھ برار کا گورنر مقرر کر دیا اور اعظم ہمایوں خان محمد کے لڑکے محمد خاں کو سرنوبت کا عہدہ دیا اور احمد بیگ قزوینی کو پیشوا کا عہدہ[۲۵]۔ ایرانی نوواردوں میں یہ اعلےٰ عہدوں کی تقسیم گلبرگہ کے عمائد کے ایک طبقہ کو پسند نہ آئی جن میں بیشتر قدیم امرا اور دارالسلطنت کی ترک جماعت تھی جس کا سرغنہ بے ایمان تغل چین تھا جو خود وزیر اعظم بننا چاہتا تھا۔[۲۶] بادشاہ چونکہ نوجوان اور ناتجربہ کار تھا اس لیے اس نے صاف کہہ دیا کہ جو کچھ اس نے کیا وہ ٹھیک ہے اور بہر نوع وہ یقیناً تغل چین جیسے ذلیل شخص کو وزیر اعظم نہیں بنا سکتا تھا۔ اس سے تغل چین نہ صرف یہ کہ اعلےٰ عہدہ حاصل کرنے ہی سے مایوس ہوگیا بلکہ اسے اپنی جان کا بھی خطرہ محسوس ہوا اور بے ایمان ہونے کی وجہ سے اُس نے ایک ذلیل چال چلی۔

تغل چین کی ایک حسین لڑکی تھی جو موسیقی اور دوسرے ایسے فنون میں ماہر تھی جن سے ایک لڑکی میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ بادشاہ سے اس کی خوبیاں بیان کی گئیں جو انھیں سن کر بہت مشتاق ہوگیا اور تغل چین یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک پرتکلف ضیافت کا انتظام کرکے بادشاہ کو مدعو کیا اور ایسا انتظام کیا کہ شراب اور عیش و عشرت کی کوئی ایسی چیز باقی نہ رہ جائے جس سے بادشاہ کی جنسی حس ابھر نہ سکتی ہو اور ایک غلام مستی طرب کو اس کام پر مقرر کیا کہ بادشاہ جس قدر بھی شراب مانگے اُسے دی جائے۔ جب بادشاہ شراب سے بدمست ہوگیا اور اپنے ہوش میں نہ رہا تو تغل چین نے اُس کے کان میں کہا کہ سب

لوگوں کو ہٹا دیا جائے اس لیے کہ وہ اپنی لڑکی کو بادشاہ کے سامنے تخلیہ ہی میں لاسکتا ہے۔ سب کے چلے جانے کے بعد تغل چین بالاخانہ پر گیا اور واپسی میں لڑکی کو ساتھ نہیں لیا بلکہ کھلا ہوا خنجر ہاتھ میں لیے ہوئے آیا۔ غلام طرب نے فوراً بادشاہ کے دونوں ہاتھ پیچھے سے مضبوط پکڑ لیے اور جب بادشاہ نے بھاگنے اور چیخنے کی کوشش کی تو تغل چین نے اس کے بال پکڑ کر گھسیٹے اور خنجر کی نوک سے اس کی آنکھیں نکال لیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد تغل چین نے باہر سے بادشاہ کے ہمراہیوں کو ایک ایک کر کے یہ کہہ کر بلایا کہ بادشاہ انھیں طلب کر رہا ہے اور چوبیس آدمیوں کو قتل کر دیا۔

اس ہولناک کارروائی کے بعد نابینا غیاث الدین کو قید کر کے ساگر بھیج دیا گیا اور اس کا سوتیلا بھائی شمس الدین تخت نشین کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ / ۱۴ جون ۱۳۹۷ء کو پیش آیا۔[47]

(۵) شمس الدین داؤد دوم[48]

۱۴ جون ۱۳۹۷ء سے ۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء

تغل چین جو کچھ چاہتا تھا وہ اُسے مل گیا اور نوجوان بادشاہ سے سب سے پہلا کام اُس نے یہ لیا کہ خود کو ملک نائب یا سلطنت کے میر جملہ کے عہدہ پر مقرر کرالیا۔[49] آزاد شدہ لونڈی جو شمس الدین کی ماں تھی اُسے مخدومہ جہاں یا مادرِ ملکہ کا لقب یا اعزاز دیا گیا اور بادشاہ جو خلاف توقع خون کے دریا میں تیر کر حکومت کے تخت تک پہنچا یا گیا تھا اُسے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ ہر معاملہ میں ملک نائب کے حکم پر چلے۔

لیکن اس لڑکے کی تخت نشینی کے جلد ہی بعد بہمنی سیاست نے نیا چولا بدلنا شروع کر دیا یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ فیروز خاں اور احمد خاں نے اپنے خسر محمد دوم کی وصیت کا احترام کیا تھا اور اُس کے لڑکے غیاث الدین کو سلامی دی تھی جسے باوجود اس کے کہ فیروز اور احمد کی خود محمد کے اپنے لڑکوں کی طرح پرورش ہوئی تھی اور بہترین تربیت دی گئی تھی تخت نشین کر دیا گیا تھا لیکن جب غیاث الدین کو بے رحمی سے اندھا کر کے تخت سے اتار دیا گیا تو ان کی بیویوں نے جو غیاث الدین کی سگی بہنیں تھیں، اپنے شوہروں سے اصرار کیا کہ ان کے بھائی پر جو ظلم کیا گیا اس کا انتقام لیں۔ تغل چین نے جب دیکھا

کہ اس کا اثر و اقتدار خطرے میں ہے تو اُس نے شمس الدین کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ فیروز اور احمد کو قید کر دیا جائے اور اس کی ماں سے یہ کہا کہ ان دونوں کو قتل کرا دے اس لیے کہ یہ اس کے لڑکے کو معزول کرنے کی فکر میں ہیں۔ دونوں بھائیوں کو جب اپنے خلاف سازش کا پتہ چلا تو وہ بھاگ کر ساگر چلے گئے اور وہاں ایک شخص سدھو کو جو شہر کے انتظام پر مامور تھا اپنے ساتھ ملا لیا[۵۰]۔ اب انھوں نے گلبرگہ پیام بھیجا اور بادشاہ سے اپنی وفاداری کے اقرار کے ساتھ یہ مطالبہ کیا کہ تغل چین جس نے سابق بادشاہ کو اندھا کرکے سخت جرم کا ارتکاب کیا ہے اُسے برطرف کر دیا جائے۔ اس کا جواب انھیں وہی ملا جس کی توقع تھی یعنی یہ کہ تغل چین بہ ہر حال وزیر اعظم اور عملاً ملک کا حکمران رہے گا۔

فیروز اور احمد اب صرف تین ہزار سواروں کے ساتھ گلبرگہ کی طرف روانہ ہوئے اور اس امید میں کہ ہر شخص ملک نائب۔ کے طرز عمل سے بیزار ہو گیا ہے اور فوج ان سے جا ملے گی۔ دریائے بھورا کے کنارے پہنچ کر فیروز نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور اپنے چھوٹے بھائی احمد کو امیر الامرا، میر فضل اللہ انجو کو وکیل یا وزیر اعظم اور سدھو کو سر نوبت بنایا۔ اندھا غیاث الدین بھی ان کے ساتھ تھا اور یہ سب دار السلطنت سے چار کروہ کے فاصلے پر پہنچ گئے مگر جس بات کی انھیں توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی بلکہ جو شاہی فوج تغل چین نے بھیجی اس نے فیروز کو مرتول کے مقام پر شکست دے دی اور ساگر کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا[۵۱]۔

اب دونوں بھائیوں نے ایک چال چلی۔ انھوں نے میر فضل اللہ انجو کے لڑکے سید کمال الدین کو چند سیدوں اور علما کے ساتھ تغل چین اور ملکہ مخدومہ جہاں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ اپنی حرکت پر نادم ہیں اور گلبرگہ واپس آنے کے خواہاں ہیں۔ ان کی معذرت قبول کی گئی اور ایک معاہدہ لکھا گیا جس میں ان کی جانوں کی پوری حفاظت کی ذمہ داری کی گئی۔ جس وقت وہ دار السلطنت کی طرف روانہ ہونے والے تھے ایک کشمیری جو نیم مجنوں سا تھا شہر سے باہر آتا اور فیروز کو "روز افزوں" کے لقب سے پکارتا ہوا نظر آیا اور اس نے کہا کہ وہ فیروز کو تخت پر بٹھانے آیا ہے۔ بھائیوں نے اسے فال نیک سمجھا اور اطمینان کے ساتھ خاموشی سے گلبرگہ میں داخل ہوئے۔ لیکن جب وہ شہر میں پہنچے تو فیروز کی بیوی نے جو بادشاہ کی سوتیلی بہن تھی انھیں خبر دی کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے[۵۲]۔ چنانچہ فیروز نے ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا جو درباری فریق کے مخالف تھے جیسے 'زردرخاں' ملک شتاب، سید تاج الدین جاکا جوت، شاب ملک وغیرہ اور بارہ ہمراہیوں کے ساتھ جن کے پیچھے تین سو آدمی پورے طور پر مسلح تھے دو دو تین تین کرکے دربار ہال میں داخل ہوگئے۔ احمد خاں کے آدمیوں اور دربار ہال کے

باہر کے پہرہ داروں میں سخت لڑائی ہوئی لیکن احمد خاں زبردستی آگے بڑھا اور بالآخر تغل چین کے لڑکوں کو قتل کرکے ہال کے اندر پہنچ گیا۔ اب ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور درباریوں میں تلواریں چلنے لگیں اور خود بادشاہ بھاگ کر محل کے تہ خانہ میں چلا گیا[53]۔ اب فیروز تخت پر بیٹھا اور حکم دیا کہ شمس الدین اور تغل چین کو گرفتار کرکے پابہ زنجیر کر دیا جائے۔ تغل چین کو غیاث الدین نے تلوار کی ایک ضرب سے قتل کر دیا اور شمس الدین کو اس کی والدہ کے ساتھ پانچ ہزار طلائی سکوں کا وظیفہ دے کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا گیا۔ — شمس الدین سنہ ۸۱۶ھ (سنہ ۱۴۱۳ء) تک زندہ رہا اور مدینہ منورہ میں فوت ہوا[54]۔

پانچوں حکومتوں پر سرسری تبصرہ

پچھلے بائیس برس کے حالات پر نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس مدت کا ایک حصہ بدنظمی اور بے اطمینانی کا تھا۔ لیکن دو ایک پہلو ایسے ہیں جو اس کی تلافی کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس مدت میں سے انیس سال محمد دوم کی شائستہ اور ترقی پذیر حکومت کے ہیں جو دکھن کی تاریخ کا ایک سنگ میل ہیں اس لیے کہ محمد دوم ہی نے اس ملک کو تہذیب اور علم و فضل کا گہوارہ بنانے کی کوشش کی اور اگر ہوس مند ترک تغل چین کے ماتحت سازش وجود میں نہ آئی ہوتی تو غالباً سلطنت میں جانشینی کا اصول باضابطہ ہو جاتا۔ بعد کے دنوں میں فیروز نے ترقی پذیر پالیسی اختیار کی مگر یہی بالواسطہ دکھنیوں اور آفاقیوں کا مسئلہ اُبھرنے کا سبب ہوا جس نے بہمنی تاریخ کے بیدر کے دور میں سر نکالا۔ علاوہ بریں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ داؤد اوّل کے انتقال کے بعد سے دکھن اور وجے نگر کے درمیان لڑائیوں کا بالکل خاتمہ ہوگیا جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ محمد اوّل کی سرگرمی اور محمد دوم کے ماتحت پرامن ترقی نے بہمنی سلطنت کو نسبتہً زیادہ مضبوط کر دیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ اس مدت میں بار بار بادشاہوں کے قتل کے واقعات ہوئے مگر سلطنت کا ڈھانچہ امکانی حد تک مستحکم رہا اور ملک کی سرحدوں پر کامل امن رہا۔ اب یہ کام فیروز کے لیے اُٹھ رہا تھا کہ وہ اسے اور زیادہ مستحکم اور مربوط کر دے اور احمد گلبرگہ کی بادشاہ کش فضا کو بیدر کی زیادہ صحت بخش اور پرسکون فضا میں تبدیل کر دے اور اس طرح اس خانوادہ اور اس کی سلطنت کو پہلے سے زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم کر دے۔ اگر اونچے درجہ کے عہدہ داروں میں فرقہ بندی کا جذبہ نہ ہوتا تو سلطنت کی وہ [illegible]ت و [illegible]یثیت نہ ہوتی جو بعد کے دنوں میں ہوئی۔

تشریحات

۱ - اے - ایم، صدیقی کے مضمون آرگنائزیشن آف دی سنٹرل اور پراونشیل گورنمنٹس آف دی دکن انڈر دی بہمنیز، آل انڈیا اورئنٹل کانفرنس منعقدہ میسور ۱۹۳۵ء صفحات ۴۶۳ و مابعد میں ہے کہ سلطنت کے قیام کے تین ہی چوتھائی کے اندر جو لوگ "شمال سے" دکھن آئے وہ غیر ملکی سمجھے جانے لگے اور شبہ و حقارت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ "شمال سے" آنے والوں کی افراط بالکل نہیں ہوئی بلکہ افراط ایران، عراق، ساحل کیسپین اور مغرب سے آنے والوں کی ہوئی ہے۔

۲ - یہ انکشاف اے - ایم، صدیقی نے اپنے مضمون محمد دوم دی فاونڈر آف دی میڈیول کلچر آف دی دکن (انڈین ہسٹری کانگریس حیدر آباد ۱۹۴۱ء) میں کیا ہے۔

۳ - میر فضل اللہ انجو، شاگرد ملا سعد الدین تفتازانی - بلند پایہ عربی مصنف - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۲ - سعد الدین کے لیے دیکھو براون - پرشین لٹریچر انڈر دی تاتار ڈومینین مطبوعہ کیمبرج ۱۹۲۰ء صفحات ۳۵۲ و ۳۵۴ - وہ ۱۳۲۲ء سے ۱۳۸۹ء یا ۱۳۹۴ء تک زندہ رہے۔

۴ - یہ سب فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۲ میں ہے -

حافظ، شیراز کا مشہور شاعر (۱۳۱۵ء سے ۱۳۸۸ء) - براون کی کتاب مذکور میں اس شاعر پر بڑا اچھا تبصرہ ہے - یہ غزل دلواب مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۹ء کے صفحہ ۹۷ پر ہے اور اس میں دس شعر ہیں - براون نے صفحات ۲۸۶ و ۲۸۷ پر چار شعر دیے ہیں اور ان کا مس جرٹ یوڈ کا کیا ہوا خوبصورت ترجمہ - اشعار یہ ہیں :

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بہ مے بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ دلکش است اما بدردسر نمی ارزد

بکوے مے فروشانش بجامے بر نمی گیرد
زہے سجادہ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غم دریا ببوے سود
غلط کردم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد

دراصل یہ محمود شاہ" نہیں تھا جیساکہ براون نے صفحہ ۲۸۵ پر لکھا ہے بلکہ محمد دوم تھا جس نے حافظ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ دیکھو نیچے تشریح نمبر ۲۴۔

۵۔ فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۰۲ پر جو اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں :

خضر بد سود است از بیع متاع عافیت — می روم ایں جنس را از جائے دیگر می خرم
عافیت در سینہ کار خون فاسد می کند — رخصتے اے دل کہ از الماس نشتر می خرم
آنجا کہ لطف دوست دہد منصب مراد — بخت سیاہ و طالع میمون برابر است

۶۔ دیکھو اے۔ ایم صدیقی کا مضمون ملک سیف الدین غوری (روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس کلکتہ ۱۹۳۹ء صفحات ۱۰۷ و مابعد)۔ بحوالہ عبدالجبار تذکرہ سلاطین دکھن۔

۷۔ دیکھو اس کے پیشتر کا باب زیر عنوان "فوج"، صفحہ ۸۰۔

۸۔ جیسا میں نے تشریح نمبر ۱ میں کہا ہے شمال کے نو واردوں نے مسئلہ نہیں پیدا کیا بلکہ عربوں، عراقیوں اور ایرانیوں نے جنھیں اس وقت تک خوش آمدید کہا گیا جب تک ان کی تعداد تھوڑی تھی اور انھیں علم نواز محمد دوم نے اور بعد کو فیروز نے مدعو کیا تھا مگر جب ان کی تعداد بڑھی اور نظامِ حکومت میں ان کا ہاتھ ہونے لگا تو ان سے بیزاری پیدا ہوئی۔

۹۔ غوری کے انتقال کی تاریخ۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۳۔ رفیع الدین شیرازی تذکرۃ الملوک، مخطوطہ آصفیہ شعبہ تاریخ نمبر ۱۰۰۸، فولیو ۸ (الف)۔ کتاب کا نام تحفۃ الملک غلط لکھا ہے۔

۱۰۔ رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۲۶-۱۹۲۵ء صفحات ۷-۵۔ داؤد کے جانشین کا نام محمود غلط لکھا ہے۔ دراصل وہ محمد تھا۔ دیکھو تشریح نمبر ۳۴۔ رپورٹ نے فرشتہ کی نقل کی ہے جس نے غلطی سے اس کا نام محمود لکھا ہے۔

۱۱۔ مجاہد کی تخت نشینی اور وفات کے متعلق دیکھو ونکٹ رام نیا کی کتاب مذکور میں مجاہد شاہ بہمنی، جہاں اس نے فرشتہ کی تاریخ ۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ (۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء) لغایت ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء) کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس نے مجاہد کے سکوں کا بھی حوالہ دیا ہے جن میں سب سے آخری تاریخ ۷۷۸ھ ہے۔ دیکھو کاڈرنگٹن کوائنز آف دی بہمنی ڈائی نسٹی (نیومسمٹک کرانیکلز ۱۸۹۳ء)۔ تخت نشینی کا لقب علاء الدین اس کے سکوں پر صاف ہے۔ دیکھو اسپیٹ کا مضمون کوائنز آف دی بہمنی کنگس، اسلامک کلچر ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۹۰۔

انھوں نے مجاہد کے سکوں کا بھی حوالہ دیا ہے جس کے آخری سکہ پر ۷۷۸ھ کی تاریخ ہے۔ کاڈرنگٹن کی کوائنس آف دی بہمنی ڈائی نسٹی لیکن تاریخ ۱۸۹۳ء غلط ہے جب کہ وہ کہتے ہیں کہ داؤد اوّل کا سب سے پہلا سکہ ۷۹۹ھ کی تاریخ

کا ہے اور یہ شمس الدین داؤد دوم کے عہد کی تاریخ ہے جس نے ۱ رمضان ۷۹۹ھ سے ۲۳ صفر ۷۹۹ھ تک حکومت کی۔ نیز دیکھو عبدالولی خاں کی بہمنی کوائنس صفحہ ۳۵۔

۱۲۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۶۔

۱۳۔ تذکرۃ الملوک فولیو ۸ (الف)۔

۱۴۔ تذکرہ فولیو ۸ (الف)۔ عبدالجبار صفحہ ۳۰۸۔ فرشتہ نے بہمن نامہ سے حسب ذیل شعر نقل کیا ہے:

زگہوارہ چوں پیر بیروں نہاد بہ تیر و کمان دست و بازو نہاد

۱۵۔ تذکرہ فولیو ۸ (الف)۔ یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۶۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۷۔

۱۷۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۶۔

۱۸۔ ونکٹ رام نیا کی کتاب مجاہد شاہ بہمنی مذکورہ بالا۔ سیویل اینڈ اینگر، ہسٹاریکل انسکرپشنز آف ساؤتھ انڈیا مطبوعہ مدراس صفحات ۲۰۰ و ۲۰۱۔ گرتی ونکٹ راؤ کا مقالہ بہمنی وجے نگر ریلیشنز (انڈین ہسٹری کانگریس، الہ آباد ۱۹۳۵ء)۔ بنکاپور، ریاست مہاراشٹر کے ضلع دھارواڑ میں ایک چھوٹا شہر۔ ۵۵ر ۱۸ شمال، ۱۶ ر ۷۵ مشرق۔

۱۹۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۵۔ ایک لمحہ میں منظر تنگ بھدرا کے شہر گنگاوتی سے شہر وجے نگر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور میں نے مبہم فقرہ کی جو تشریح کی ہے وہی ممکن ہو سکتی ہے۔ گنگاوتی ریاست اندھرا پردیش کے ضلع رائچور میں اسی نام کے تعلقہ کا مستقر ۲۶ ر ۱۵ شمال، ۳۲ ر ۷۶ مشرق۔

۲۰۔ شاید یہی وقت تھا جب کہ بُکا کا انتقال ہوا اور ہری ہر دوم اُس کا جانشین ہوا۔ دیکھو ونکٹ رام نیا کی مجاہد جس میں لکھا ہے کہ بُکا کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۳۷۶ء اور ۲۴ فروری ۱۳۷۷ء کے درمیان ہوا۔ اس کا بیان ہے کہ بُکا بہت بوڑھا تھا اور اس کی مسلسل نقل و حرکت نے اس کی صحت پر بُرا اثر کیا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل ڈاکٹر کو اس کا یقین نہیں ہے کہ مجاہد کبھی رامیشورم پہنچا ہوگا اور اسے ثابت کرنے کے لیے وہ سیویل کی اے فارگاٹن ایمپائر کے صفحہ ۴۴ کا حوالہ دیتا ہے۔ برگس نے بھی اپنی ہسٹری آف دی رایز آف دی محمڈن پاوران انڈیا کے صفحہ ۳۳۳ کے ذیلی نوٹ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مجاہد ایک مقام مسمی رامیشورم یا راس رامس تک پہنچا جو گوا کے جنوب میں ہے لیکن ہمیں ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۲۹۸ پر صاف لکھا ہے کہ تقریباً سارا جنوبی علاقہ وجے نگر کا باج گذار تھا۔ اور یہ جگہ دارالسلطنت سے ۶۰۰ کروہ کے فاصلہ پر ہے۔ ڈاکٹر ونکٹ رام نیا نے ایک مسمی تختی، ایپی گرافیا کارومنڈل ۷، کے جی ۳۴ کا حوالہ دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہری ہر کو جو سلطنت اس کے والد نے حاصل کی تھی اُسے پھر سے بحال کر دیا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ساری سلطنت کو مجاہد نے چھان ڈالا ہوگا۔ یہ ظاہر کر دینا ضروری

ہے کہ فرشتہ کو اس کا علم تھا کہ گوا اور ملا بار اور نیز سارا جنوبی ملک یا تو وجے نگر کے قبضہ میں تھا یا اس کا باجگذار تھا اس لیے وہ دونوں رامیشورم کو خلط ملط نہیں کر سکتا تھا۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۸۔ رامیشورم ریاست تمل ناڈو کے ضلع مدورا میں جزیرہ پامبان میں ہے۔ اس میں ہندوؤں کا ایک مقدس ترین مندر ہے جو کہا جاتا ہے کہ شری رام چندر جی نے راون کے خلاف اپنی فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ ۱۷ر۹ شمال، ۱۹ر۷۹ مشرق۔

راس رامس گوا کے جنوب میں تقریباً ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۵ر۱۵ شمال، ۵۵ر۷۳ مشرق۔

۲۱۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیویل کو (صفحہ ۴۴ پر) اس کا علم نہیں ہے کہ سری رنگا کے مندر کا فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۲۹۷ میں صاف صاف ذکر کیا ہے۔ یہ جھیل کملاپورم میں ہوگی مگر یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ سری رنگا کا مندر قلعہ کے بالکل اندرونی حصہ میں زنانہ احاطہ سے متصل ہے۔ اگر مطلب اسی مندر سے ہے تو مجاہد دارالسلطنت کے اندر تک پہنچ گیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ قلعہ کے باہر بھی کوئی سری رنگا مندر رہا ہو مگر اب اس کا مطلق کوئی نشان نہیں ہے دیکھو لانگ ہرسٹ کی ہمپی روئنیس مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء۔ نقشہ کتاب کے شروع میں ہے۔

۲۲۔ داؤد کو فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۲۹۹ میں مجاہد کا "چچا" لکھا ہے حالانکہ دراصل وہ اس کا چچازاد بھائی تھا۔ دیکھو نظام الدین احمد کی طبقات اکبری مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۵ء جس میں داؤد کو "ابن عم" یا چچازاد بھائی کہا گیا ہے لیکن برہان مآثر کے صفحہ ۲۶ میں داؤد کو مجاہد کا چھوٹا بھائی کہا گیا ہے۔ برہان کے صفحہ ۳۵ میں داؤد کی فوعومہ والیسی کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ داؤد بظاہر اطاعت گذار تھا مگر درحقیقت وہ تخت نشین ہونا چاہتا تھا۔

برہان معاصر صفحہ ۲۶ جس میں داؤد کو محمد خاں داؤد کے چھوٹے بھائی کا لڑکا "صحیح ترین معلومات کی بنا پر" کہا گیا ہے۔

۲۳۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ محاصرہ نو ماہ تک رہا لیکن تذکرہ میں ایک سال ہے۔

۲۴۔ ونکٹ رام نیا کی کتاب مذکور مجاہد۔

۲۵۔ ایپی گرافیا کارومنڈل، ۵، کتاب ۳۔

۲۶۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۹۹۔

۲۷۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۰۔

۲۸۔ یہ بیان فرشتہ کا جلد اول صفحہ ۳۰۰ میں ہے۔ برہان مآثر کے صفحہ ۳۵ میں ہے کہ بادشاہ کرشنا ندی کے کنارے قتل کیا گیا، لیکن تذکرۃ الملوک میں بالکل مختلف صورت بیان کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بادشاہ صحیح سلامت احسن آباد گلبرگہ پہنچ گیا اور شہر کے باہر خیمہ زن ہوا تاکہ نیک ساعت پر شہر میں داخل ہو۔ یہاں مجاہد اور ایک حبشی کے درمیان کچھ تکرار ہوئی اور دوسرے دن مجاہد کا سر کٹا ہوا جسم تخت پر پڑا دیکھا گیا۔

۲۹۔ صرف فرشتہ نے اُس کی جانشینی کی تاریخ ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ (۱۶ اپریل ۱۳۷۸ء) لکھی ہے اور وہ کہتا ہے کہ داؤد نے ایک ماہ پانچ دن حکومت کی لیکن طبقات اکبری میں ایک ماہ تین دن ہے۔ اس سے اس کے قتل کی تاریخ ۲۲ محرم ۷۸۰ھ یا ۲۴ محرم ۷۸۰ھ قرار پاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ داؤد جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے قتل ہوا تھا، اور چونکہ جمعہ کا دن ۲۲ شوال ۷۸۰ھ (۲۱ مئی ۱۳۷۸ء) کو تھا۔ اس لیے ہم بلاتکلف اس کی حکومت اور اس کی زندگی کے خاتمہ کی یہی تاریخ قرار دے سکتے ہیں۔

۳۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۰۔

۳۱۔ برہان صفحہ ۳۶۔ یہی نام فرشتہ کی جلد اوّل صفحہ ۳۰۱ میں ہے۔

۳۲۔ خان محمد داؤد کا چچازاد بھائی تھا۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۱۔

۳۳۔ یہ بیان طبقات کا صفحہ ۴۱۰ میں ہے۔ برہان نے لکھا ہے کہ داؤد فوراً ہی مرگیا اور فرشتہ نے صاف بات نہیں کہی ہے۔ میں طبقات کے بیان کو ترجیح دوں گا اس لیے کہ داؤد اُس وقت سجدہ کی حالت میں تھا اور پشت کی طرف خنجر مارنے پر وہ فوراً نہ مرا ہوگا۔

۳۴۔ محمد دوم کا نسب اور اس کا نام تک فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۰۱ میں غلط لکھا ہے۔ محمد دراصل علاء الدین بہمن شاہ کا لڑکا نہیں بلکہ پوتا تھا۔ حسب ذیل سکوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے:

چاندی کا ٹنکہ: اوپر کی طرف: الناصر لدین الدیان الحامی لاہل الایمان۔

نیچے کی طرف: الواثق بتائید الرحمن ابوالمظفر محمد شاہ سلطان

حاشیہ پر: ضرب حضرت احسن آباد ۷۸۰ھ

اس میں محمد شاہ کا ۷۸۰ھ میں موجود ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔

پیتل کا فلس: اوپر: عبدالعبود۔

نیچے: محمد محمود۔

اس میں محمد کے والد کا نام محمود ہے جو پہلے بہمنی سلطان کا لڑکا تھا۔

دیکھو اسپیٹ کا مضمون کوائنز آف دی بہمنی کنگس (اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحات ۲۹۰ و ۲۹۴)۔ فرشتہ نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ محمود کا نام عصامی کی فتوح السلاطین میں ہے اس لیے کہ یہ کتاب ۷۵۰ھ (۱۳۵۰ء) میں مکمل ہوئی اور بہمنی سلاطین میں سے صرف ایک یعنی علاء الدین بہمن شاہ کا اس میں نام ہے۔ عصامی، فتوح السلاطین مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۸ء۔

(۲) سکوں کی شہادت جن سے خود ہی فرشتہ کی تردید ہوتی ہے اس کا مزید ثبوت ساگر کے بعض کتبات

سے ملتا ہے۔

(الف) ایک کتبہ ساگر کے عاشور خانہ کی دیوار پر جس کی ۷۹۳ھ میں مرمت ہوئی تھی۔

(ب) ایک تختی جو صوفی سرمست کے مزار کے پاس پڑی ہے (جن کا انتقال ۸۰۸ھ میں ہوا) اس کا اہم کتبہ جس میں بادشاہ کا نام محمد محمود دیا ہے، وہی جوپیتل کے فلس میں ہے۔

(ج) صوفی سرمست کے صاحبزادے تاج الدین شیخ منور کے مزار پر کئی کتبے ہیں جن میں تحریر ہے کہ مزار کی تعمیر کوتوال مبارک نے کی جس کا ذکر کتبات الف و ب میں بھی ہے کہ وہ محمد شاہ کے عہد میں تھا۔ دیکھو ایپی گریفیا انڈو سلیمیکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحات ۱۲-۹۔

(۳) برہان نے صفحہ ۳۶ میں صاف لکھا ہے کہ بادشاہ کا نام محمد تھا جو بہمن شاہ کے لڑکے محمود کا لڑکا تھا۔ اس کی مزید تصدیق طبقات کے صفحہ ۱۴۰ اور ظفر الولیہ کے صفحہ ۱۶۰ سے ہوتی ہے۔

۳۵- یہ سب کچھ ایک ہی دن میں یعنی ۲۲ محرم ۷۸۰ھ (۲۱ مئی ۱۳۷۸ء) کو ہوا۔ نوجوان مجاہد کے اندھا کرنے کا واقعہ دکھن کی تاریخ میں پہلی مثال ہے اور شاید اسی نظیر پر محمد کے دو لڑکوں کو اندھا کیا گیا جو اپنی بدقسمتی سے اس مخدوش تخت پر بیٹھے تھے۔ محمد نے بقول فرشتہ ۱۹ سال ۹ ماہ ۲۰ دن حکومت کی اور طبقات میں ۱۹ سال ۹ ماہ ۲۴ دن ہے حالانکہ دونوں نے قطعی طور پر لکھا ہے کہ غیاث الدین ۲۱ رجب ۷۹۹ھ یا ۲۰ رجب ۷۹۹ھ کو تخت نشین ہوا لیکن ظفر الولیہ میں ہے کہ غیاث الدین ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ کو تخت نشین ہوا اور طبقات میں ہے کہ اس نے ایک ماہ ۲۰ دن حکومت کی جس سے اس کی معزولی کی تاریخ ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ قرار پاتی ہے۔ شمس الدین کی تخت نشینی کی تاریخ فرشتہ، برہان اور طبقات میں واضح طور پر ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ لکھی ہے اور سارے خانوادہ کی تاریخوں میں یہی منجملہ قطعی تاریخوں میں ہے، چنانچہ اس سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

محمد دوم - ۲۲ محرم ۷۸۰ھ (۲۱ اپریل ۱۳۷۸ء) لغایت ۲۱ رجب ۷۹۹ھ (۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء)۔

غیاث الدین تہمتن - ۲۱ رجب ۷۹۹ھ (۲۰ اپریل ۱۳۹۷ء) لغایت ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ (۱۴ جون ۱۳۹۷ء)۔

شمس الدین داؤد دوم - ۱۷ رمضان ۷۹۹ھ (۱۴ جون ۱۳۹۷ء) لغایت ۲۳ صفر ۸۰۰ھ (۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء)

۳۶- ایپی گریفیا کرناٹیکا ۱۲ کے جی ۱۳، اور الف ۱- رایل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ بمبئی جلد ۹ صفحہ ۲۲۷ جس کا حوالہ گرتی ذلکٹ راؤنے اپنے مضمون مذکورہ کے صفحہ ۲۷ میں دیا ہے۔

۳۷- سیویل اینڈ اینگر ہسٹاریکل انسکرپشنز آف ساؤتھ انڈیا صفحہ ۲۰۲۔ بحوالہ ایپی گریفیا کرناٹیکا ۱۲ کے جی ۴۳۔

۳۸۔ ایضاً صفحہ ۲۰۳ بحوالہ ایپی گریفیا کرناٹیکا ۱۲ اسی کے د ۱۔ ڈاکٹر اینگر کا خیال ہے کہ یہ ۱۳۶۳ء کے کسی واقعہ کا ذکر ہوگا "جب کہ بہمنی فوجوں نے ورنگل کی سلطنت کو بالکل تباہ کر دیا تھا" ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن ورنگل کی سلطنت کو محمد اول نے تباہ نہیں کیا تھا بلکہ صرف گولکنڈہ کو سرحد قرار دیا تھا۔

کوٹالکنڈہ شاید موجودہ کوٹاپلی ہے جو ورنگل کے شمال مغرب میں شاہراہ پر ۲۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۵ ر ۱۸ شمال، ۲۳ ر ۹۷ مشرق۔

۳۹۔ ایضاً صفحہ ۲۰۵۔ بحوالہ ایپی گریفیا کرناٹیکا ۱۲ ٹی جی ۴۴، ای سی ۷، ایچ آئی ۱۷، ای سی ایس بی ۱۲۱، ای سی ایس کے ۱۴۲۔

۴۰۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۱۔ گرتی ذنکٹ راؤ کی مذکورہ کتاب میں ہے کہ معاہدہ خراج دینے کا نہ تھا مگر اس کے ثبوت میں اس نے کوئی سند نہیں پیش کی ہے۔

۴۱۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۱۔

۴۲۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۵۔

۴۳۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۳۔ نیز دیکھو اے۔ ایم، صدیقی کا مضمون ملک سیف الدین غوری۔ (انڈین ہسٹری کانگریس، کلکتہ ۱۹۳۹ء صفحہ ۷۰۱)۔

۴۴۔ غیاث الدین کے سکوں پر تہمتن کا لقب ہے۔ دیکھو اسپیٹ کی کتاب مذکور صفحہ ۲۹۴۔ سکے کی عبارت یہ ہے:

اوپر کی طرف: المؤید بنصر اللہ ابو المظفر۔

نیچے کی طرف: تہمتن شاہ بن محمد شاہ۔

برہان مآثر کے حیدر آباد ایڈیشن میں صفحہ ۲۸ پر غیاث الدین بہمن ہے لیکن یہ تہمتن کو غلطی سے بہمن پڑھا گیا ہے۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۰۴ میں تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۱۲ سال لکھی ہے اور برہان نے صفحہ ۳۸ میں ۱۷ سال۔

۴۵۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۴۔ پیشوا کے عہدہ کا ذکر پہلی مرتبہ آیا ہے جو اس وقت دوسرے درجہ کا عہدہ تھا۔

۴۶۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۴ میں اور برہان صفحہ ۳۸ میں تغلچین کو آزاد شدہ ترکی غلام کہا گیا ہے مگر ظفر الوالیہ جلد اول صفحہ ۱۹۰ میں اُسے ایک "خلجی امیر" بتایا گیا ہے جو کسی زمانہ میں اپنے آقا کا غلام تھا۔ کیا ہمیں اس پارٹی بندی کی بنیاد نہیں نظر آتی جو بالآخر بیدر کے بہمنیوں کی تباہی کا باعث ہوئی؟

۴۷ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۴ - شمس الدین ایک باندی کے بطن سے محمد دوم کا لڑکا تھا۔

۴۸ - برہان صفحہ ۳۹ میں ہے کہ یہ داؤد کا لقب تھا۔

۴۹ - ملک نائب یا وکیل - دیکھو قریشی کی کتاب دی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیت آف دہلی صفحہ ۱۰۰۔ مخدومہ جہان کا لقب بھی مادر ملکہ کے لیے دہلی میں استعمال ہوتا تھا۔ ایضاً صفحہ ۶۳۔

۵۰ - ساگر کے کتبے جن کا ذکر ایپی گرافیا انڈو سلیمیکا سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں ہے انمیں سدھو کا نام نہیں ہے البتہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد دوم کے عہد میں مبارک نام کا ایک کوتوال تھا۔

۵۱ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۶ - بھتورا دریائے بھیما کی ایک شاخ ہے۔

۵۲ - مارقوی شاید ماتور ہے جو گلبرگہ کے جنوب میں تقریباً آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۱۳ر۱۷ شمال، ۵۰ر۷۶ مشرق۔ درمیانی "ت" درمیانی "ق" کی شکل سے مل سکتی ہے اور آخری "ی" "ر" کی شکل سے۔

۵۳ - برہان صفحہ ۳۹۔

۵۴ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۶۔

چھٹا باب

بہمنی تمدّن کا امتزاج

تاج الدین فیروزؒ

۱۶ر نومبر ۱۳۹۷ء سے ۲۲ر ستمبر ۱۴۲۲ء

الف۔ کلچرل حالات

آبادی کے عناصر

۲۴ر صفر ۸۰۰ھ (۱۶ر نومبر ۱۳۹۷ء) کو جب فیروز تخت نشین ہوا تو وہ ادھیڑ عمر سے اوپر ہو چکا تھا اور اس میں شک نہیں کہ بہمنی سلطنت کے عناصر ترکیبی میں توازن قایم کرنے کے روز افزوں وقت طلب کام کو اس نے پوری ذمہ داری اور سوجھ بوجھ کے احساس کے ساتھ شروع کیا۔ اُس نے تغل چین ترک کے اقتدار کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی جو دکھن کے قدیم امرا و شرفا کے لیے دردِ سر ہو رہا تھا۔ لیکن ایک آدمی کے زوال سے مسئلہ حل نہیں ہو گیا۔ اب ایران اور بیرون ملک سے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا جس کی سلطان اپنے خسر محمد دوم کی روایت کو قایم رکھنے کے لیے ہمت افزائی کرتا تھا یعنی دکھن کو مشرق میں تمدّن کا گہوارہ بنانا اور اس مقصد میں شمال کی رقیب سلطنت دہلی کے زوال پذیر ہونے

سے نسبتہً زیادہ آسانی ہوگئی تھی۔ شاید ایران اور عراق کے اثرات کا توڑ کرنے کے لیے اس نے یہ جرأت مندانہ اقدام کیا کہ آبادی کے ہندو عنصر کو حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں شریک کیا اور شاید اُسی نے سب سے پہلے برہمنوں کو بڑے عہدوں پر مقرر کیا اس لیے کہ ہندوؤں میں غالباً یہی طبقہ تعلیم یافتہ تھا کھیرلا کے نرسنگھ نے جب ہتھیار ڈال دیے تو فیروز نے اُسے بہمنی سلطنت کا امیر بنادیا اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مورث بہمن شاہ کے نقشِ قدم پر چل کر دکھن کے ہندو امرا کو دوست بنانا چاہتا تھا۔ اُس نے اِس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے نہ صرف وجے نگر اور کھیرلا کے پڑوسی شاہی خاندانوں سے بلکہ عوام ہندو خاندانوں سے رشتہ مناکحت قائم کیا۔

اس سلسلہ میں دو ایک اور باتیں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کونڈا ویڈو کے ویماساون اور تلنگانہ کے ویلاماون میں مسلسل جھگڑا رہتا تھا اور دکھن میں جو مذہبہ کارفرما تھا اس کی بنا پر ویلاماون نے اپنے دشمن ویماساون کے خلاف فیروز کی حمایت کا خیر مقدم کیا اور ویماساون نے اپنی مدد پر وجے نگر کے رائے کو بلایا۔ ظاہر ہے کہ مذہبی عناد کی جو خلش بہمنی وجے نگر کے تعلقات میں تھی وہ دور ہو رہی تھی اور مشرق کے بعض ریڈیوں نے وجے نگر کے خلاف سلطان کا ساتھ دیا اور وجے نگر کا رائے تلنگانہ پر اسی طرح حملہ کر رہا تھا جیسے وہ بہمنی سلطنت پر چڑھائی کر رہا ہو۔ ہندوؤں سے فیروز کے خوشگوار تعلقات کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ سدھو نے ساگر پر بغاوت کو فرو کرنے میں مدد دی اور اس کے لڑکے بھیروں سنگھ کو مدصول اور چوراسی گاؤں کی جاگیر ۲۵ ربیع الثانی ۸۰۰ھ (۱۵ جنوری ۱۳۹۸ء) کو دی گئی۔[۳۵]

بادشاہ کی علمیت

ہندوستان کے حکمرانوں میں فیروز کا شمار فاضل ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے اور دوسرے ذی علم بادشاہ محمد تغلق کے مقابلے میں یہ کمتر نہ تھا۔ عمدہ خوش نویس ہونے کے علاوہ وہ تفسیر قرآن، اصول قانون، حکمت و فلسفہ، صوفی مصطلحات، مکتبی فلسفہ، اقلیدس، فنِ مناظرہ اور ریاضیات میں بھی ماہر تھا اور علوم کے ہر شعبہ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے ہر ہفتہ میں تین دن ان علوم میں خود باضابطہ تعلیم دینے کے لیے مخصوص کر لیے تھے۔[۳۶] اِس میں شک نہیں کہ اُس نے اپنے فاضل خسر محمد دوم اور اپنے استاد ملا فضل اللہ انجو سے جو تربیت حاصل کی تھی اس کی بنا پر اُس نے علم و فضل میں نام پیدا کیا۔ وہ ایک ممتاز شاعر بھی تھا اور عروجی اور فیروز تخلص رکھتا تھا[۳۷] اور اس کے اشعار جو فرشتہ اور برہان نے کہیں

کہیں نقل کیے ہیں اُن سے اُس کی علمی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ تعمیر عامہ کے سلسلہ میں اُس نے جو کام کیے وہ دولت آباد کے قریب پہاڑی سلسلہ پر ۸۱۰ھ (۱۴۰۷ء) میں بالا گھاٹ کے نام سے ایک رصدگاہ کی تعمیر تھی جس کے لیے سید محمود گازرونی اور حکیم حسن گیلانی کو مامور کیا گیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ حکیم حسن گیلانی کی قبل از وقت وفات سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔[۵۶]

اُس کی زبان دانی کی قابلیت کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ فرشتہ نے اُس کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ اگر معتبر ہیں تو فیروز نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی زبانوں ہی سے خوب واقف تھا بلکہ تلنگی، کنٹری، مرہٹی، گجراتی، بنگالی اور دیگر زبانیں بھی جانتا تھا اس حد تک کہ جن لوگوں کی یہ مادری زبان تھی۔ اُن سے انھیں کی زبانوں میں بلا تکلف گفتگو کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی کئی بیویاں اور زنانے میں بہت سی عورتیں مختلف قوموں اور نسلوں کی تھیں اور ہر ایک کے پاس اُسی قوم کی باندیاں تھیں اور سلطان ان سب سے انھیں کی مادری زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی شہوانی قوت بہت زبردست تھی مگر اسلام کے اصول یعنی ایک شادی یا مخصوص حالات میں محدود تعداد کی شادیوں کی اجازت کی وجہ سے وہ مجبوراً ان جذبات کو دبائے رکھتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ آبادی کے متضاد عناصر میں توازن قایم کرنے کے لیے رسمی اخلاق کی شادیاں کو ضروری سمجھتا ہو۔[۵۷] بہر نوع اُسے سخت فکر تھی کہ اپنے طرز عمل کو شرع کے مطابق کس طرح قائم رکھے اور اس نے اپنے استاد میر فضل اللہ انجو سے مشورہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ایران اور عراق سے شیعہ تعلیمات دکھن میں نفوذ کر رہی تھیں اور اگرچہ خود بادشاہ سنی تھا مگر ممکن ہے کہ میر فضل اللہ شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہو چنانچہ اس نے بادشاہ سے کہا کہ شیعہ مذہب میں متعہ یا عارضی شادی کی اجازت ہے اور بادشاہ کے لیے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی یہی صورت ہے کہ اپنے اعمال و اطوار اور عبادات وغیرہ میں تو وہ سنی رہے لیکن شیعہ مذہب کے متعہ کے اصول کو قبول کرلے۔ سلطان کو یقیناً اس تجویز سے خوشی ہوئی ہوگی اور اس نے عارضی شادیاں کرکے اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیا۔[۵۸] اس کے محل کا عملہ بہت وسیع تھا جس کی سربراہی محمد دوم کی لڑکی ملکہ دکھن کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں نہ صرف ہر قوم کی عورتیں تھیں بلکہ ہر مذہب کی بھی۔ مذہب کے احترام کا اسے اتنا لحاظ تھا کہ وہ شاید حرم کی یہودی اور عیسائی عورتوں کی تشفی کے لیے عہد قدیم اور عہد جدید کی انجیل پڑھا کرتا تھا۔[۵۹]

کلچرل اثرات

بہمنی سلطنت میں اکیلا سلطان ہی ہندو کلچر سے متاثر نہ تھا بلکہ ہم درباری قاضی سراج[۶۰] کے

واقعہ سے دیکھتے ہیں (جس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علوم اسلامی کا عالم تھا یا کم ازکم علما کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا) کہ جنوب کے مسلمانوں نے فنون اور موسیقی کی روایات میں ہندو اثرات کو کس حد تک قبول کرلیا تھا۔ یہ واقعہ ہمارے لیے دلچسپ ہے کہ قاضی سراج ہندو فقیر کے بھیس میں وجے نگر کے کیمپ کے اندر تک جاسکتا تھا اور وہاں بغیر اپنی اصلی شخصیت ظاہر کیے بلا تکلف مقامی زبان میں گفتگو کرسکتا تھا۔ سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) میں سلطان کی دیورائے کی لڑکی سے شادی کا لازمی نتیجہ بہمنی سلطنت میں ثقافتی ردِعمل کی شکل میں ظاہر ہوا ہوگا اور فیروز کو کلچرل عوامل کے امتزاج میں مدد ملی ہوگی جو اُس کا عزیز ترین مقصد تھا اور اس کی علامت یہ تھی کہ سلطان سوار ہوکر بے دھڑک وجے نگر کے شہر میں گیا اور رائے کے محل میں تین دن معزز مہمان کی حیثیت سے قیام کیا۔ بہمنی دربار میں ہندو کلچر کے اس براہ راست اثر کے ماسوا آبادی کے اندر دونوں مذہبوں میں باہمی خلاملا ہوا ہوگا اس لیے کہ تجارت بیشتر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو تاجر باہر کے ملکوں سے کاروبار کرتے تھے اور بہمنی حکمران کے لیے ہرمز کے گھوڑے، سیلون کے ہاتھی اور چین کی مشک اور سمور" مہیا کرتے تھے۔

فرشتہ نے جو تفصیلی حال باریک بینی کے ساتھ فیروز کے حرم کا لکھا ہے اور میر فضل اللہ انجو کی فہمایش کی تمہید سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز کس حد تک ان عوامل سے متاثر تھا جو آہستہ آہستہ مگر قطعیت کے ساتھ بہمنی سلطنت میں نمایاں ہورہے تھے۔ اگرچہ وہ یقیناً ہندو آبادی سے مصالحت کا خواہاں تھا مگر اسی کے ساتھ اس کی یہ بھی بہت بڑی خواہش تھی کہ دکھن کو اُن بہترین چیزوں کا مرکز بنادے جو مشرقی ایشیا میں مل سکتی ہیں۔ وہ گوا[۱۱] اور دابول سے ہر سال بہمنی جہاز تجارت کے لیے بیرونی ممالک بھیجا کرتا تھا اور اسی کے ساتھ خاص طور پر یہ ہدایت کرتا تھا کہ بہمنی سفرا کو یہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ سلطان کو کوئی تحفہ ایک ذی علم آدمی سے زیادہ پسند نہیں ہے۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ اس کا یہ فرض ہے کہ تمام ممالک سے زیادہ سے زیادہ ذی علم اور نیک کردار لوگوں کو بلاکر دکھن میں جمع کرے تاکہ اُس وقت کی دنیا کے بہترین تجربات اس کی مرضی پر حاصل ہوسکیں۔ یہی مقصد تھا کہ دکھن میں مولانا لطف الدین سبزواری، حکیم حسن گیلانی، سید محمود گرزونی اور اس طرح کے بہت سے ممتاز افراد ایران اور ساحل کیسپین کے دوسرے ممالک سے آکر جمع ہوگئے۔ ان نوواردوں کا ہمیشہ اُس کے دربار میں خیر مقدم ہوتا تھا اور وہ بے تکلفی کے ساتھ اُن سے خلاملا پسند کرتا تھا۔ اگرچہ دربار میں اُسے شاہی وقار کا بڑا خیال رہتا تھا تاکہ لوگ اس کی قوت و سطوت کو محسوس کریں[۱۲]

وہ کہتا تھا کہ دربار کے بعد وہ ایک معمولی آدمی سے بہتر نہیں ہوتا اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ

اہل علم اس سے بے تکلفی کے ساتھ نہ ملیں۔ دراصل وہ شام کا ایک حصہ اس لیے مخصوص رکھتا تھا کہ شعرا، اہل علم، داستان گو وغیرہ سے گھل مل کر بات چیت کرے۔ اس وقت وہ نہایت سادے لباس میں ملبوس ہوتا تھا اور صرف ایک ادب سب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے برائی نہ کرے[111]

بیرونی اثر کئی اور بہت سی باتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ بادشاہ کو کربلا، نجف اور مدینہ منورہ کے سادات کی طرف خاص توجہ تھی یہاں تک کہ اس نے پرانا بہمن شاہ کا چاندی کا تخت (جو رائے تلنگانہ کے محمد اول کو تخت فیروزہ نذر کرنے سے پہلے استعمال ہوتا تھا) توڑوا کر اس کی قیمت ضرورت مند سادات اور دوسرے مستحق لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے ملک کے باہر بھیج دی[112]

تعمیرات

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے فیروز نے بیرونی اثرات کا توڑ کرنے کے لیے ہندوؤں کو نظم ونسق کے کاموں میں شریک کیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ دکھن کے کلچر اور فن تعمیر میں ہندو اثرات کا نفوذ بڑی حد تک نمایاں ہے۔ یہ ایرانی، ہندو اور دہلوی اسلوبوں کا امتزاج تھا جس نے فیروز کے مقبرہ کو "گلبرگہ کی شاندار ترین یادگار بنادیا۔

اگرچہ یہ مقبرہ (بلکہ دو مقبرے بالکل یکساں ایک دوسرے سے متصل) یک منزلہ ہے لیکن باہر سے دو منزلہ عمارت معلوم ہوتی ہے جس میں کئی محرابیں ایک دوسرے کے سہارے مسلسل ہیں اور اوپری محرابوں میں پتھر کے کٹاؤ کا آرایشی کام ہے۔ ہمیں یہ ایرانی بہمنی ملے جلے طرز کی محرابیں معلوم ہوتی ہیں جن کے دروازہ کے دونوں طرف ہندو طرز کے بازو ہیں اور چھجے کو سنبھالے ہوئے جو دیوارگیریاں وہ دکھن کے ہندو مندروں کی دیوارگیریوں سے مشابہہ ہیں۔ گچ کی استرکاری اور پلاستر کا بھاری کٹاؤ کا کام جو شاید ایرانی نمونہ ہے، محرابوں کے اوپر، ان کے درمیانی حصہ میں اور مقبرہ کے اندر بنا ہوا ہے۔ اگرچہ تغلق طرز کی ڈھلوان دیواریں غائب ہیں لیکن ایک گنبد کے اندرونی حصہ میں مجوف نالیاں جو باریک کتبہ کی دھاریوں سے مزین ہیں دہلی کے قطب مینار کی بیرونی آرایش کے مشابہہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پتھر کی جالیاں جو اوپری محرابوں کی آرایش ہیں وہ مخروطی شکل کی ہیں جو چوکھٹے کے تقریباً تہائی حصہ پر حاوی ہیں یہ اسی نمونہ کی ہیں جو فیروزآباد میں اور آخری دو بہمنیوں کے مقبروں میں اور دکھن کے دوسرے مقامات پر نظر آتی ہیں۔

فیروز کا مقبرہ ایک چھوٹے پیمانے پر فن تعمیر کا شاہکار کہا جاسکتا ہے لیکن اس کی حیرت میں ڈالنے

والی تعمیرات میں تنہا یہی نہیں ہے۔ اپنی کثیر التعداد عارضی اور مستقل بیویوں کے لیے اس نے دریائے بھیما پر ایک بڑا شہر تعمیر کیا" جس میں کشادہ اور سیدھی سڑکیں، خوبصورت دوکانیں اور بازار ہیں" اور دریا سے پانی محل کے اندر تک پہنچایا گیا ہے[۱۶] ایک دوسرے اور عظیم تر حکمران فتح پور سیکری کے بانی کی طرح اس نے فیروز آباد کو عملاً اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ فیروز آباد کی تعمیرات فن تعمیر میں اپنی آپ مثال ہیں جن کے "انوکھے تعمیری منصوبے" دکھن کے باہر کہیں اور نہیں نظر آتے جیسا کہ مسٹر من نے ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد دکن کو ایک خط میں لکھا ہے[۱۷] "اصل خصوصیت گنبد اور مخروطی چھت کا ملا جلا استعمال ہے جو میں نے سب سے پہلے چھوٹے پیمانے پر گلبرگہ کے قلعہ کے اندر کے بازار میں دیکھا جو جامع مسجد سے ذرا فاصلہ پر ہے"۔ باوجود امتداد زمانہ کے جو اس وقت سے اب تک گذر چکا ہے، جب کہ فیروز فیروز آباد میں مجمع خواتین کا سربراہ تھا ہمیں اب بھی بہت کچھ ملتا ہے جس سے ہم اس کی سابقہ شان و شوکت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ شہر کے چار بڑے پھاٹک، دیوان خاص اور کنچنی محل جس کے گرد حرم شاہی کے کمرے ہیں، مسافر خانہ، زنانخانہ کے محرابی کمرے، غسل خانے، نام نہاد باورچی خانہ اور مسجد، ان سب سے فیروز کی فن تعمیر میں جدت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے گنبد اور مخروطی میناروں کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ مثلاً نام نہاد باورچی خانہ کی چھت پر" ایک بڑا گنبد اور چاروں طرف چار مخروطی مینار ہیں۔ چھتوں پر نیچی دیواریں بھی بالکل نئے طرز کی ہیں اور نیز وہ چھوٹے چھوٹے مینار جو کناروں پر ہیں۔ چھت کے اندر کی طرف بڑی افراط سے آرایش اور مخروطی نقش و نگار ہیں"۔ مسجد میں داخلہ کا دروازہ "بہمنی طرز تعمیر کا بہت عمدہ نمونہ ہے"۔ خود مسجد ۲۰۰ × ۲۵۰ فٹ کی ہے جس کے چاروں طرف محراب دالان ہیں جن کے مغربی سرے پر کبھی مخروطی آرایش کے گنبد تھے۔ گنبد اور مخروطی مینار جیسا کہ مسٹر من کا بیان ہے گلبرگہ کے پھاٹک کے قریب بازار اور رائچور قلعہ کے پھاٹک کی چھتری، دلدگیر اور دیگر مقامات پر بھی ملتے ہیں۔

گلبرگہ کے ولی اللہ

اس عہد کے خالص سیاسی پہلو پر نظر ڈالنے سے پیشتر حضرت سید محمد گیسو دراز ولی اللہ کی گلبرگہ میں آمد کا ذکر ضروری ہے جس کا دکھن کے لوگوں پر بہت بڑا اثر ہوا اور اہم نتائج ظہور پذیر ہوئے حضرت کے خاندان کا دکھن سے تعلق پہلے سے تھا جب کہ وہ تقریباً ۸۰۳ھ (۱۴۰۱ء) میں گلبرگہ وارد ہوئے اس لیے کہ آپ کے والد سید یوسف محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد آئے تھے اور ۲۰ رمضان ۷۲۵ھ

(۳۰ اگست ۱۳۲۵ء) کو خلد آباد میں فوت ہوئے۔ خود حضرت گیسو دراز ۴ رجب ۷۲۱ھ (۳۰ جنوری ۱۳۳۱ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے اوپر تھی۔ یہاں ۸۱۹ھ (۱۴۱۳ء) میں وہ قلعہ گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے کثیر التعداد مریدوں کے ساتھ ایک خوبصورت خانقاہ میں مقیم ہو گئے۔ اُس وقت فیروز دارالسلطنت سے باہر تھا لیکن واپسی پر جب اُس نے سُنا تو امرا اور اعلےٰ حکام کو ساتھ لے کر انھیں سلامی دینے حاضر ہوا[۱۸] جب کہ انھوں نے اہلِ علم طبقہ میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی جن کا لوگوں میں بڑا اثر تھا اور بہت جلد گلبرگہ میں مریدوں کا ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ فیروز نے حضرت کو اُن کی اور اُن کے ہمراہیوں کی گذر اوقات کے لیے کئی گاؤں وقف کیے[۱۹] لیکن حضرت نے فیروز کے ذہن پر جو اثر ڈالا تھا وہ جلد ہی ختم ہو گیا اور سلطان چونکہ خود ذی علم تھا اس لیے اُن کی خالص ادبی استعداد پر شبہہ کرنے لگا۔ کھنچاؤ بڑھتا رہا یہاں تک کہ بادشاہ نے انھیں پیام بھیجا کہ چونکہ ان کی قیام گاہ شاہی محل کے بہت قریب ہے اور اُن کے یہاں قوالیوں اور مریدوں کی بلند آواز سے تعلیم کا شور و غل ہوتا ہے اس لیے وہ کہیں اور چلے جائیں۔ چنانچہ آپ وہاں سے اُٹھ کر اُس مقام پر چلے آئے جہاں اب آپ کا مزار ہے اور جو اب تک دکھن کے ہندو اور مسلمانوں کے احترام و تقدس کا مرجع ہے۔ جیسا کہ بعد کو معلوم ہوگا اس کھنچاؤ کے بہت ہی اہم نتائج سامنے آئے[۲۰]

ب۔ سیاسی حالات

وجے نگر

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے فیروز نے اپنے بھائی احمد خاں کو خان خاناں کا خطاب دیا تھا اور اپنے استاد میر فضل اللہ انجو کو ملک نائب اور وکیل یا وزیر اعظم کا اور شاید غیر ملکی اثر کا توڑ کرنے کے لیے اور نیز ہندو آبادی کو ملانے کے لیے کئی برہمنوں کو معزز اور ذمہ داری کے عہدوں پر مقرر کیا۔

فیروز کی طویل حکومت کی تقریباً ساری مدت ہمسایہ سلطنت وجے نگر سے کش مکش میں صرف ہوئی اور یہ کش مکش وجے نگر کے رائے کی طرف سے شروع ہوئی[۲۱] اس کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۳۹۸ء میں جنوب مغرب میں ساگر کے زمینداروں کی بغاوت آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ان زمینداروں نے دارالسلطنت کی ہلچل سے فائدہ اٹھایا اور بہمنی فوج کو قلعہ سے نکال دیا، نیز شمال

میں کھیرلا کے نرسنگھ دیو نے بہمنی اقتدار کے خلاف بغاوت کردی اور مانڈو اور اسیر کے حکمرانوں کی مدد اور وجے نگر کے رائے کی شہ سے اُس نے ماہور تک سارے علاقہ پر چھاپہ مارا[۲۲]۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیروز نے پہلے ساگر کا رُخ کیا اور کچھ شدید جنگ کے بعد جس میں انادیو ویلاما جسے ریڈیوں نے ملک سے نکال دیا تھا اور اُس نے فیروز سے مدد مانگی تھی اور نیز مقامی حاکم سدھو بہمنی افواج کے شانہ بشانہ باغیوں کے خلاف لڑے اور سدھو جنگ میں قتل بھی ہوگیا۔ ساگر کی بغاوت ۵ ربیع الثانی ۸۰۰ھ (۱۵ جنوری ۱۳۹۸ء) سے پہلے دبادی گئی اور سدھو کے لڑکے بھیرون سنگھ کو مدھول اور ضلع رائے باغ کے چوراسی گاؤں کی جاگیر دی گئی۔

شمال کی طرف کی مہم فیروز نے اُس وقت تک کے لیے ملتوی کردی جب تک کہ وہ وجے نگر سے نہ نپٹ لے۔ شہزادہ بکا نے اس اثنا میں وجے نگر کی بہت بڑی فوج جمع کرلی تھی جس میں منجملہ دوسرے سامان کے .....۸ تیر انداز اور بندوقچی تھے۔ اس فوج کے ساتھ اس نے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور پھیلاؤ کے ساتھ بیک وقت مدگل، رائچور اور دوآبہ کے دوسرے بہمنی مقبوضات نیز تلنگانہ پر چڑھائی کردی۔ تلنگانہ کے ویلاما حکمران محمد اوّل کے وقت سے عہدنامہ کے ذریعہ سے بہمنیوں کے حلیف تھے۔ دوسری طرف بکا کی مدد پر راجہ سندری کا تپا ویما تھا اور چونکہ فیروز کی اصل فوج رائچور کے دوآبہ کے دفاع میں مصروف تھی اس لیے بکا کی جو فوج تلنگانہ کی طرف بڑھی تھی۔ اُس نے بہ آسانی دشمن کو شکست دے دی۔ شمال میں کھیرلا کی طرف کا حملہ بھی موثر ہوا اور سلطان کو مجبوراً برار اور دولت آباد کی فوج کو شمال کی طرف بھیجنا پڑا۔ اب بارش شروع ہوگئی تھی اور کرشنا ندی سیلاب پر تھی اس لیے فریقین میں سے کسی کو بھی اسے عبور کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور دریا کے کنارے ایک طرح کی بے بسی مسلط تھی۔ چونکہ اس مشکل کو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے فیروز کے ساتھیوں میں سے ایک باکمال درباری مسمی قاضی سراج کو ایک نئی چال سوجھی وہ یہ کہ چند آدمیوں کے ساتھ رات کی تاریکی میں وجے نگر کے کیمپ میں گھس کر رائے کے لڑکے کو قتل کردیا جائے۔ قاضی سراج نے سات آدمی ساتھ لیے اور مخبوط الحواس فقیروں کے بھیس میں کسی نہ کسی طرح وجے نگر کے کیمپ میں داخل ہوگئے[۲۳]۔ سلطان سے انھوں نے یہ استدعا کی کہ چار پانچ ہزار کا منتخب رسالے کا دستہ تیار رہے جو دوسری طرف سے شور وغل ہونے پر فوراً وہاں پہنچ جائے۔ قاضی سراج اور ان کے آدمی وجے نگر کے کیمپ میں پہنچ کر اُس خیمے میں گئے جو ناچنے والیوں اور طوائفوں کے لیے مخصوص تھا اور ان میں سے ایک کے ساتھ عشق کے پینگ بڑھائی[۲۴]۔ شام کے وقت انھوں نے دیکھا کہ ایک طوائف کپڑے اور زیور سے آراستہ ہوکر شاہی کیمپ

میں جانے کی تیاری کر رہی ہے اور قاضی سراج نے اس کی خوشامد کی کہ اُسے بھی ساتھ لے چلے اس لیے کہ اُس نے کبھی شاہی کیمپ نہیں دیکھا ہے لیکن طوائف نے کہا کہ وہاں صرف گانے بجانے والے جا سکتے ہیں جس پر بنے ہوئے فقیر نے طبلہ بجا کر اسے سنایا کہ اُسے اس کی اچھی مشق ہے۔ طوائف اتنا خوش ہوئی کہ وہ نہ صرف قاضی سراج کو بلکہ اس کے سب ساتھیوں کو اپنے ساتھ شاہی کیمپ میں لے گئی۔ جلسہ ناچ سے شروع ہوا اس کے بعد گانا ہوا اور کچھ نقلیں جس میں سراج اور اس کے ساتھیوں نے بھی حصہ لیا۔ جس وقت سب لوگ جشن منا رہے تھے اور شاہزادہ اور اس کے ساتھی شراب کے نشہ میں بدمست تھے تو سراج کے دو آدمی آگے بڑھے اور شہزادے کے خنجر بھونک دیا جو وہیں مرگیا۔[۲۵]

وجے نگر کے کیمپ میں ہلچل مچ گئی اور چونکہ رات سخت تاریک تھی اور خیمہ کی روشنیاں گل کر دی گئیں اس لیے سراج اور اس کے ساتھی اندھیرے میں نکل بھاگے اور پکڑے نہ جا سکے۔ اس اثنا میں فیروز نے تین چار ہزار سپاہی گھوڑوں پر اور بید کی تیرنے والی ٹوکریوں پر روانہ کر دیے تھے جو دریا پار کرکے وہاں پہنچ گئے۔ سلطان نے خود صبح ہوتے ہی دریا پار کیا اور پسپا ہوتی ہوئی فوج کا وجے نگر کے پھاٹک تک تعاقب کیا اور فضل اللہ انجو اور خان خاناں کو جنوبی صوبوں کی طرف روانہ کر دیا۔[۲۶]

ہری ہر دوم نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور ملک نائب سے صلح کی گفت و شنید شروع کر دی جو بظاہر جنوب کے صوبوں کو تاراج کرکے واپس آ گیا تھا۔ معاہدہ لکھا گیا جس کے بموجب بہمنی سلطان نے تمام گرفتار شدہ قیدیوں کو چھوڑ دیا اور اس شرط پر وجے نگر سے واپس جانے کا وعدہ کیا کہ ہری ہر دس لاکھ ہُن شاہی خزانہ میں داخل کرے[۲۷] اور ایک لاکھ ہُن ملک نائب کو گفت و شنید کامیابی سے انجام دینے کے صلہ میں نذر کرے۔ صفدر خاں کے لڑکے فولاد خاں کو رائچور دوآبہ کا گورنر مقرر کرکے سلطان دارالسلطنت کی طرف واپس ہوا۔[۲۸]

اب ان لوگوں کی باری آئی جنھوں نے پچھلی مہم میں بہمنیوں کے پشت میں چھرا بھونکنے کی کوشش کی تھی۔ ساگر میں پہلے ہی تسلط ہو چکا تھا اور شروع ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں سلطان اس قلعہ میں گیا جہاں اُس نے مقامی رئیسوں اور رایوں کی سلامی لی اور ساگر کا نام بدل کر نصرت آباد رکھا۔ یہیں اُس نے ہری ہر کی طرف سے ۳۳ لاکھ ٹنکہ کا سالانہ خراج وصول کیا۔ واپسی میں کچھ دن بھیما کے کنارے قیام کیا اور وہاں فیروز آباد شہر کی بنیاد ڈالی اور جب عمارتیں مکمل ہو گئیں تو وہ دارالسلطنت واپس آیا۔[۲۹]

کھیرلا

گلبرگہ میں دو تین ماہ اور قیام کرکے سلطان کھیرلا کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ ماہور پہنچا تو وہاں

کے مقدم نے جو برابر نرسنگھ کا ساتھ دیتا رہا تھا سلطان سے معافی کا طلبگار ہوا اور سلامی کی اجازت پاکر خراج کی پیشکش کی۔ سلطان نے ماہور کے قلعہ میں ایک ماہ پانچ دن قیام کیا[۱۳۰]۔ اب نرسنگھ بالکل اکیلا رہ گیا تھا اس لیے کہ ماہور کا رئیس بہمنیوں کی طرف چلا گیا تھا اور گونڈوانہ کے رئیس سے اس نے جو مدد مانگی وہ نہیں مل سکی۔ پھر بھی وہ سلطان کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے کھیرلا سے دو منزل آگے بڑھا۔ خراج دینے پر راضی ہونے کے لیے جو پیام نرسنگھ کو بھیجا گیا تھا اُس کا اُس نے نفی میں جواب دیا اور فیروز کے لیے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، لیکن وہ ماہور سے ایلچ پور چلا گیا اور لڑائی کا اہتمام اُس کی عدم موجودگی میں ہوا۔ فضل اللہ انجو نے میسرہ کی کمان سنبھالی اور خان خاناں نے میمنہ کی۔ لڑائی بہت سخت ہوئی اور شجاعت خاں، بہادر خاں، دلاور خاں اور رستم خاں جیسے بہمنی امرا جنگ میں مارے گئے۔ یہ افواہ بھی اُڑی کہ خان خاناں مارا گیا مگر انجو نے حکم دیا کہ فوج کو ہمت نہ ہارنا چاہیے اور افواہ خواہ غلط ہو یا صحیح اسے بالکل راز میں رکھنا چاہیے اور یہ اعلان کرنے کے لیے کہ بادشاہ سلامت بہت بڑی فوج لے کر ایلچ پور سے آگئے ہیں اُس نے نقارے بجوا دیے۔ خان خاناں شہید نہیں ہوا تھا اور وہ جلد ہی انجو کی فوج سے آکر مل گیا۔ نرسنگھ کے لڑکے کوشل سنگھ کو قید کر لیا گیا اور نرسنگھ کو کھیرلا کے قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا جس کے آخر میں نرسنگھ نے ہتھیار ڈال دیے اور بذات خود ایلچ پور جاکر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور یہ درخواست کی کہ سلطان خراج لینا منظور کرے جیسے اُس کے پیش رو گلبرگہ کے بادشاہوں کا دستور تھا۔ نرسنگھ نے یہ بھی پیشکش کی کہ بادشاہ اس کی لڑکی کو "شاہی خادمہ" کے طور پر حرم شاہی میں داخل کرلے اور چالیس ہاتھی، پانچ من سونا اور پچاس من چاندی کی نذر گزرانی۔ بادشاہ نے اپنی طرف سے کھیرلا کی ریاست اُسے بحال کردی اور اُسے سلطنت کا امیر بنا لیا اور ایک خلعت بشمول زرکار ٹوپی کے عطا کی[۱۳۱]۔

تلنگانہ

کھیرلا کی مہم کے بعد ہی شاید سلطان نے فوج لے کر تلنگانہ پر چڑھائی کی جہاں ویلاماون اور دیماون میں سخت جنگ جاری تھی۔ ویلاماون کو سلطان نے مدد دی تھی اور ویماون کو وجے نگر نے۔ دراصل یہ جنگ اس لیے ہوئی تھی کہ کتایا دیما ہری ہر کو جو مدد دیا کرتا تھا وہ دینے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ سلطان نے انادیوا اور دیگر ویلاما سرداروں کے ساتھ مشرق کا رُخ کیا۔ ان میں سے ایک سردار گج راؤ ٹپا گندوکولم میں کتایا ویما کو ملا اور شاید اُسے قتل کر دیا[۱۳۲]۔ اندھرا دیش میں فیروز کی رفتار کچھ مبہم سی معلوم ہوتی ہے اِس

لیے کہ ایک طرف تو فرشتہ کا بیان ہے[۳۳] کہ اس نے راستہ میں کئی قلعوں کو تسخیر کر لیا اور راجہ سندری کے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا لیکن دوسری جگہ ہمیں یہ بیان ملتا ہے کہ وہ گوداوری کو عبور نہ کر سکا اس لیے کہ دودا یا الآیا الادی رنڈی جیسے شاید دیورائے کی مدد حاصل تھی وہ بہت طاقتور ثابت ہوا اور بہمنی کمان دار علی خاں کو شکست دے دی[۳۴] اور فیروز کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ مزید براں فرشتہ کا یہ بھی بیان ہے کہ اس مہم کے نتیجہ میں تلنگانہ بہمنی سلطنت میں شامل ہو گیا لیکن بعد کو ہم دیکھتے ہیں کہ تلنگانہ سے خراج کا مطالبہ کیا گیا جو وصول بھی ہو گیا[۳۵] لیکن اگر یہ ریاست پہلے ہی بہمنی سلطنت میں شامل ہو گئی ہوتی تو خراج طلب کرنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ شروع میں سلطان کو راجہ سندری پر چڑھائی میں پوری کامیابی ہوئی لیکن آخر میں وہاں اُسے شکست ہوئی اور اُسے مقامی سرداروں کو پورے طور پر زیر کیے بغیر واپسی پر مجبور ہونا پڑا، اگرچہ یہ سردار خراج کی رقم شاہی خزانہ میں داخل کرتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تلنگانہ پر بہمنیوں کا قبضہ ہوا بھی ہو گا تو وہ مکمل قبضہ نہ ہو گا اس لیے کہ جیسا بعد کو معلوم ہو گا سلطان برابر ایک فریق کی دوسرے کے خلاف مدد کرتا رہا۔

تیمور

بہمنی سلطنت اور ہندوستان کے شاہان مغل کے مورث اعلیٰ فاتح اعظم تیمور کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اُس سے دکھن کے بیرونی ممالک سے تعلقات اور اس زمانہ کے بین الاقوامی رسم و رواج پر عجیب طرح کی روشنی پڑتی ہے۔ فیروز نے جب سنا کہ تیمور ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے اور شاید اپنے ایک لڑکے کو ہندوستان کا بادشاہ بنائے گا تو اس نے صورت حال کی پیش بندی کی اور میر فضل اللہ انجو کے داماد میر تقی الدین محمد اور مولانا فضل اللہ سبزواری کو سمندر کے ذریعے سے ایک پیام اور تحفے لے کر تیمور کے پاس بھیجا۔ یہ دونوں تیمور کے دارالسلطنت پہنچ گئے مگر اپنے تحفے پیش کرنے کے لیے چھ مہینے انتظار کرتے رہے۔ فیروز کے پیام میں یہ تحریر تھا کہ اگر تیمور کا قصد دہلی آنے کا ہے اور اپنے ایک لڑکے کو یہاں کا بادشاہ بنانے کا ہے تو وہ خود حاضر ہو کر نئے بادشاہ کو سلامی دے گا۔ تیمور نے فیروز کو ایک فرمان بھیجا۔ جس میں اسے اپنا لڑکا کہہ کر مخاطب کیا اور اسے تمام شاہی لوازم اور ساز و سامان استعمال کرنے کی اجازت دی۔ تیمور نے فیروز کو تحفے بھی بھیجے اور اُس کے دکھن کی سلطنت کے قبضہ کی تصدیق کی۔ نیز گجرات اور مالوا کے قبضہ کی بھی۔ اگرچہ یہ دونوں تیمور یا فیروز کی دسترس سے باہر تھے۔ مالوا اور خاندیش کے حکمرانوں نے یہ سوچ کر کہ آئندہ نہ جانے کیا صورت پیش آئے تیمور کو پیام بھیجا کہ وہ دکھن کے حکمران کو اپنا بھائی سمجھتے

ہیں اور اسی کے ساتھ ایک خفیہ پیام وجے نگر کے رائے کو بھیجا کہ اگر وہ دکھن پر حملہ کرے تو لبشرط ضرورت یہ اس میں سرگرم مدد دیں گے اور شاید اسی بھروسے پر رائے نے مقررہ خراج گلبرگہ نہیں بھیجا لیکن سلطان نے خیال کیا کہ ابھی وجے نگر کے خلاف جنگ مناسب نہیں ہے تاہم خود وجے نگر کے رائے نے بالکل خلاف توقع بنیاد پر خود ہی لڑائی چھیڑ دی[36]

وجے نگر سے پھر آویزش

۱۴۰۶ء میں ہری ہر کے لڑکے بکا دوم کا جانشین اس کا نوجوان بھائی دیوراج اول ہوا[37] اور فوراً ہی ایک عشق بازی کے معاملہ میں اُلجھ گیا جس سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ فرشتہ نے ملا داؤد بیدری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رائے کو یہ اطلاع ملی کہ بہمنی علاقہ کے مدگل میں ایک سنار کی بہت ہی خوبصورت جوان لڑکی ہے[38] جس کا نام پرتھل ہے اور جو بات چیت میں سلیقہ مند اور فنون لطیفہ میں ماہر ہے اور رائے اس کی تعریف سن کر اس کا مشتاق ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک برہمن جاتری جو بنارس سے وجے نگر جا رہا تھا راستہ میں رک کر سنار کے مکان میں ٹھہرا اور جب اُس نے سُنا کہ اُس کے میزبان کی لڑکی اتنی باکمال ہے تو اس نے اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن سنار نے کہا کہ لڑکی غیر مردوں سے پردہ کرتی ہے تاہم بہت کہنے سننے سے وہ لڑکی کو لے کر آیا اور پرتھل نے اتنی خوبی سے ساز بجائے کہ مہمان بہت متاثر ہوا[39] اور وجے نگر واپس پر اس نے سارا قصہ اپنے مدگل کے دوستوں سے بیان کیا جس کی خبر دیو رائے تک پہنچی۔ اس نے فوراً چند برہمنوں کو مقرر کیا کہ وہ مدگل جا کر اس لڑکی کو معہ اس کے پورے خاندان کے جس طرح بھی ہو مناسب یا غیر مناسب ترکیب سے یہ بہانہ کر کے لے آئیں کہ وجے نگر کے باعظمت مندروں کی زیارت بڑے ثواب کا کام ہے۔ یہ برہمن مدگل گئے اور لڑکی کے والدین سے کہا کہ وہ بڑے خوش قسمت ہو جائیں گے اگر ان کی لڑکی رائے کے زنان خانہ میں پہنچ جائے لیکن خود پرتھل کسی طرح مدگل چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی اور کہا کہ رائے کے محل میں جو لڑکی پہنچ جائے وہ زندگی بھر واپس نہیں آ سکتی اور نہ اپنے والدین سے مل سکتی ہے[40]

رائے یہ سن کر بہت غضبناک ہوا اور باوجود اپنے خیر خواہوں کے منع کرنے کے تیس ہزار سواروں کی فوج لے کر سرحد پر دھاوا کرنے اور تنگ بھدرا کو عبور کر کے مدگل پر حملہ کرنے اور اس لڑکی کو وجے نگر لانے کے لئے اس کے باپ نے جو معاہدہ بہمنی سلطان سے کیا تھا اُس کی خلاف ورزی پر تیار ہو گیا۔[41]
جب مدگل میں سنار نے اور وہاں کے لوگوں نے سُنا کہ وجے نگر کی فوج نے تنگ بھدرا کو پار کر لیا ہے تو

وہ گھر بار چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگ گئے اور فوج کو جب اپنا شکار نہ ملا تو وہ راستہ میں قتل و غارت کرتی ہوئی واپس ہوگئی۔ دوآبہ کے گورنر فولاد خاں نے ان کا پیچھا کر کے مار بھگایا اور اس کی اطلاع فیروز آباد بھیجی جہاں سلطان مقیم تھا۔

۸۰۹ھ (۱۴۰۶ء) میں سلطان خاں خاناں اور انجو کے ساتھ بہت بڑی فوج لے کر جنوب کی طرف روانہ ہوا اور دونوں دریاؤں کو پار کر کے وجے نگر کی طرف بڑھا۔ ایک جھڑپ میں وہ تیر سے زخمی ہوگیا جسے اس نے خود ہی اپنے جسم سے کھینچ لیا۔ جب فیروز نے دیکھا کہ دارالسلطنت کی حفاظت کا زبردست انتظام ہے اور اس کی تسخیر نسبتاً مشکل ہے تو اس نے اپنی فوجوں کا رخ دو طرف پھیر دیا۔ ایک کے ساتھ اس نے خاں خاناں کو دکھن کے تاراج کرنے کے لیے بھیجا اور دوسرے حصّہ کو سرنوبت سدھو کی قیادت میں بنکاپور کا محاصرہ کرنے بھیجا اور خود دیوراج کے مقابل خیمہ زن ہوگیا۔[۴۲]

دیوراج نے خصوصی پیمبر گجرات، خاندیش اور مالوا کی طرف مدد کے لیے بھیجے اس لیے کہ ان تینوں کے متعلق خیال تھا کہ یہ دکھن کی سلطنت کے خلاف ہیں مگر اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ جب کہیں سے مدد نہ آئی دوسری طرف بنکاپور سرنوبت سدھو کے ہاتھوں تسخیر ہوگیا اور خاں خاناں دکھن کی طرف سے قیدیوں کی بہت بڑی تعداد لے کر واپس پہنچ گیا۔[۴۳] سلطان کے کیمپ میں بڑی خوشیاں منائی گئیں لیکن چونکہ وجے نگر اب تک اڑا ہوا تھا اس لیے فیروز نے بڑھ کر ادونی کا محاصرہ کرنا طے کیا اور خاں خاناں کو جو کئی بار اپنی قابلیت کا ثبوت دے چکا تھا رائے کے خلاف کارروائی کے لیے چھوڑ دیا۔ جس وقت سلطان روانہ ہونے والا تھا۔ اس نے سُنا کہ رائے نے صلح کی گفت و شنید کے لیے اپنے سفیر وزیر اعظم انجو کے پاس بھیج دیے ہیں اور انجو نے انھیں فوراً سلطان کے سامنے پیش کر دیا۔ جو معاہدہ لکھا گیا وہ تقریباً سلطان کے بتائے ہوئے الفاظ میں تھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ: (۱) دیوراج اپنی لڑکی کی شادی سلطان کے ساتھ کر دے، (۲) رائے دس لاکھ ہن، پانچ من موتی، پچاس ہاتھی اور دو ہزار مرد عورت غلام جو پڑھنے لکھنے اور ناچنے گانے میں ماہر ہوں سلطان کے نذر کرے، (۳) بنکاپور جس پر سلطان کا قبضہ ہو چکا تھا لڑکی کے جہیز میں سلطان کو دیا جائے۔[۴۴]

جب یہ شرائط طے ہو گئے تو ایک باضابطہ عہد نامہ مسلم سلطان اور ہندو شہزادی کے مابین مرتب کیا گیا جو دکھن کی تاریخ میں اس قسم کا پہلا معاہدہ تھا۔ سلطان وجے نگر سے سات فرسخ کے فاصلے پر خیمہ زن ہوا۔ پرانی دشمنیاں فراموش ہوگئیں اور ایک نیا شان دار شہر شاہی کیمپ اور وجے نگر کے دارالسلطنت کے درمیان آباد ہوگیا جس میں سڑک کے دونوں طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوکانیں تھیں۔ وزیر اعظم

انجو دلھن کو وجے نگر سے لانے پر مامور ہوا اور جب دلھن پہنچ گئی تو سلطان شاہانہ شان کے ساتھ اپنے خسر سے ملنے دار السلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ شہر کا پھاٹک جس سے جلوس گذرنے والا تھا دار السلطنت سے تقریباً تین فرسخ کے فاصلہ پر تھا اور رائے نے راستہ پر دس میل تک مخمل اور زربفت کے فرش بچھوا دیے تھے۔ دیو رائے نے شہر کے پھاٹک پر اپنے شاہی داماد کا استقبال کیا۔ اور دونوں بادشاہ پہلو بہ پہلو سواری پر روانہ ہوئے اور راستہ میں ان پر سونے چاندی کے پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ جب یہ شان دار جلوس جو ہندو مسلم اتحاد کا بے مثل نظارہ تھا۔ شہر کے بیچ میں پہنچا تو رائے کے عزیز جو راستہ پر دورویہ کھڑے تھے جلوس کے ساتھ محل تک پیدل گئے۔

سلطان کی غیر معمولی جرأت اور رائے کی طرف سے دل کی تبدیلی کا اگرچہ عارضی سہی اس سے اظہار ہوتا ہے کہ سلطان رائے کے محل میں تین دن ٹھہرا اور جب وہ اپنے کیمپ کی طرف واپس آنے لگا تو بے شمار تحفوں سے لاد دیا گیا۔ جب وہ اپنے کیمپ واپس آیا تو وہاں اتنے دن قیام کیا کہ سنار کی لڑکی کو مدگل سے بلا بھیجا اور اس کی اپنے لڑکے حسن کے ساتھ شادی کر دی۔ لڑکی کے والدین کو بہت بیش بہا تحفے دیے گئے اور وہ مالدار ہو کر ہنسی خوشی اپنے وطن کو واپس آ گئے۔[۴۵]

بدقسمتی سے یہ صلح جس کا فریقین نے ایسا اچھا اہتمام کیا تھا زیادہ دن قائم نہ رہی ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں سلطان نے جزیرہ نمائے سارے مشرقی ساحل پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اپنے پرانے دشمن کونڈاویڈو کے پیڈا کومانی دیما سے اتحاد کیا جو راجہ سندری کا دعوے دار تھا۔ متحدہ فوجیں دوداپالا کے مستقر کی دیواروں تک مسلسل کامیابی کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں مگر یہ شہر بہت مستحکم ثابت ہوا اور سلطان کو بغیر اس پر قبضہ کیے واپس آنا پڑا۔ سلطان اڑیسہ کے حکمران نرسمہا چہارم کے ملک میں دور تک گھس گیا اور اسے شکست دے کر بہت سے ہاتھی پکڑ لایا۔ شاید اسی وقت یہ خبر آئی کہ وجے نگر کے رائے نے تلنگانہ پر حملہ کر دیا اور پنگل کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ دراصل وجے نگر نے خراج ادا کرنے میں پھر کوتاہی کی تھی اور شاید یہ چاہتا تھا کہ اس طرح دباؤ ڈال کر سلطان کو مجبور کرے کہ وہ اپنے دعوی سے دستبردار ہو جائے چنانچہ ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں جب کہ سلطان قریب ۷۰ برس کی عمر کا ہو گیا تھا اس پر مجبور ہوا کہ رائے سے قطع تعلق کر کے پنگل کا محاصرہ کرے۔ محاصرہ دو سال تک جاری رہا اور سلطان نے قلعہ بند فوج کی رسد رسانی کامیابی کے ساتھ روک دی۔ ویلاما ابھی تک سلطان کے حلیف تھے اور دیورکنڈہ کے رام چندر نے وجے نگر کے ایک فوجی دستہ پر جو شہر کی مدد کے لیے جا رہا تھا حملہ کر کے اسے مار بھگایا۔[۴۶]

اب حالات نے پلٹا کھایا۔ دیو رائے نے ویلاماؤں کو کھڑکا کر اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح حکمت عملی

میں ایک کامیابی حاصل کی اور اب وہ بہت بڑی فوج لے کر پنگل کو بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ نتیجہ بالکل ظاہر تھا۔ رائے کے پہنچتے ہی قلعہ کی فوج نے اچانک حملہ کر دیا اور لڑائی میں خان خاناں زخمی ہو گیا اور بہمنی فوج کو سخت شکست ہوئی۔ سلطان کو دلی صدمہ ہوا کہ اُس کے استاد اور سلطنت کے وزیر اعظم میر فضل اللہ انجو کو خود اس کے ہندو ملازمین نے قتل کر دیا۔ دیو رائے نے بہمنی فوج کا تعاقب کیا اور راستہ میں کئی مسجدوں کو گرا دیا اور جب تک دیلور کے موضع تک نہیں پہنچ گیا۔ اُس نے دم نہ لیا —— ویلا مانا یوٹا کو موقعہ مل گیا اور اُس نے پسپا شدہ فوج کو خوب پریشان کیا اور میدک پر قبضہ کر کے بویا قبیلہ کی آبادی کو لوٹ لیا۔ پھر وہ خود کونڈا ویڈو پر حملہ آور ہوا جہاں پیڈا کوماٹی ویما کو شکست ہوئی اور شاید وہ مارا گیا۔[47]

فیروز نے سخت پریشان ہو کر انجو کے لڑکے میر غیاث الدین کو مدد مانگنے کے لیے گجرات بھیجا مگر وہ بھی ناکام واپس آیا۔ احمد شاہ حال ہی گجرات کا بادشاہ ہوا تھا اور اس نے بہانہ کر دیا۔[48] بڑی ہی مشکل سے خان خاناں نے حملہ آوروں کو شکست دے کر پیچھے ہٹایا اور دوآبہ کو وجے نگر والوں سے بچا لیا۔[49]

حضرت گیسو دراز، خان خاناں اور سلطان

۱۴۲۲ء کے آخری مہینوں میں وجے نگر کے دیوراج[50] اور فیروز دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ دیوراج کا جانشین بکا سوم ہوا اور فیروز کا جانشین اُس کا بھائی شہاب الدین احمد اول۔ فیروز نے ۸۱۸ھ (۱۴۱۶ء) میں اپنے لڑکے حسن خاں کو ولی عہد بنا دیا تھا اور اُسے تاج، پیٹی، چھتری، سیاہ مخمل پردہ، ہاتھی اور تخت کے شاہی نشانات استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی، یہاں تک کہ اُسے حسن شاہ کا خطاب بھی دے دیا تھا اور تمام ممتاز لوگوں سے اُسے سلامی دلا دی تھی تاکہ اس کی موت کے وقت کوئی نامناسب جھگڑا نہ ہو۔[51] اس کارروائی کے چند سال پیشتر حضرت سید محمد گیسو دراز گلبرگہ آئے تھے اور جیسا اوپر ذکر ہوا ہے ان کے اور سلطان کے درمیان ناچاقی ہو گئی تھی جس کے نتیجہ میں حضرت گیسو دراز کو محل کے قرب سے ہٹ کر چند میل کے فاصلے پر منتقل ہونا پڑا تھا۔[52]

فیروز کے بھائی احمد خاں خان خاناں کو شاید اس کا علم تھا کہ حضرت گیسو دراز کا روحانی اور اخلاقی اثر دکھن کے لوگوں پر بہت ہے اور اس سے فایدہ اٹھانے میں اُس نے بالکل تامل نہ کیا۔ وہ اکثر ان کی خانقاہ میں رہتا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوتا اور اس کے علاوہ ان کے ہمراہیوں اور مریدوں سے سلوک کرتا۔[53]

ناچاقی نہ صرف حضرت گیسو دراز اور سلطان کے درمیان ہوئی بلکہ دونوں بھائیوں یعنی سلطان اور خان خاناں میں، اُس وقت بہت بڑھ گئی جب ۸۱۸ھ (۱۴۱۵ء) میں حسن خاں کو باضابطہ ولی عہد بنایا گیا۔ جب رسوم سے فراغت ہوئی تو یہ جواب دیا کہ جب تمام شاہی نشانات شہزادے کو دے دیے گئے تو دعا کی کیا ضرورت ہے لیکن جب شاہی سفرا نے بہت اصرار کیا تو کہا کہ اللہ تعالے نے پہلے ہی خان خاناں احمد خاں کو فیروز کا جانشین کر دیا ہے اس لیے اُن کا حسن خاں کے لیے دعا کرنا بیکار ہے۔ یہ سن کر فیروز بہت برہم ہوا اور حضرت گیسو دراز سے کہلا بھیجا کہ چونکہ ان کی خانقاہ میں ہمیشہ مجمع رہتا ہے اور وہ محل کے بہت قریب ہے اس لیے وہ شہر کے باہر چلے جائیں۔ یہ سن کر حضرت گیسو دراز اُس مقام پر منتقل ہو گئے جہاں اب ان کا مزار ہے اور جو قلعہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے اور وہیں آخر عمر تک مقیم رہے جب کہ ۱۶ ذیقعدہ ۸۲۵ھ (یکم نومبر ۱۴۲۲ء) کو احمد اوّل کی تخت نشینی کے چند ہفتے بعد قمری مہینوں کے حساب سے ۱۰۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔[54]

فیروز کی حکومت کا خاتمہ

فیروز اب بہت ضعیف ہوتا جاتا تھا اور اس نے کم و بیش اپنے سارے اختیارات دو آزاد شدہ غلاموں ہوشیار اور بیدار کو سونپ دیے تھے جنھیں ماہور کی مہم کے بعد اس نے عین الملک اور نظام الملک کے خطاب دے دیے تھے۔[55] انھوں نے بوڑھے بادشاہ کو جو ستر سے اوپر ہو چکا تھا یہ باور کرانا شروع کیا کہ احمد اپنی ذاتی قابلیت اور نیز حضرت گیسو دراز کے اثر سے ہر طبقہ کے لوگوں میں بہت مقبول ہوتا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ خود احمد کو یقین ہو گیا ہے کہ حضرت گیسو دراز کی پیشگوئی پوری ہو کر رہے گی اور اب وہ اس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ ان دونوں نو دولتوں نے بادشاہ سے کہا کہ جب تک احمد خاں زندہ ہے حسن خاں کی حیثیت کمزور ہوتی جائے گی اس لیے بوڑھے بادشاہ کو انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے بھائی کو قتل کر دے۔ فیروز اس پر آمادہ نہ ہوا کہ احمد جیسے عزیز بھائی کو جو اس کی ابتدائی زندگی کے دور زمانے میں اُس کا مددگار اور دست راست رہا ہے قتل کر دے مگر اپنی کمزوری کی حالت میں وہ عین الملک اور نظام الملک کی اس تجویز پر راضی ہو گیا کہ خان خاناں کو اندھا کر دیا جائے تاکہ وہ حسن کے راستہ میں حایل نہ ہو سکے لیکن احمد خاں کے بھتیجے شیر خاں کو اس کا پتہ چل گیا اور اس وفادار شہزادے نے فوراً احمد خاں کے پاس جا کر بتایا کہ اُسے کیا خطرہ درپیش ہے۔[56] احمد خاں کو یہ بھروسہ تھا کہ حضرت گیسو دراز اُس کے مخلص دوست ہیں اس لیے وہ اپنے بڑے لڑکے ظفر خاں کو لے کر ان کے پاس پہنچا[57] جو بڑی مہربانی

سے پیش آئے اور انھیں اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنی دستار پھاڑ کر آدھی احمد خاں کے سر پر باندھ دی اور آدھی ظفر خاں کے سر پر۔ اور دونوں کو مستقبل کی بادشاہی کی بشارت دی۔

احمد خاں جب اپنے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اُس کا ایک دوست بصرہ کا گھوڑے کا تاجر خلف حسن[59] اس کا انتظار کر رہا ہے۔ احمد نے اُس سے اپنے خطرہ میں ہونے کا حال بیان کیا اور اُس سے کہا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے لیکن خلف حسن اس پر بالکل راضی نہ ہوا اور اصرار کیا کہ جب خوش حالی میں اُس نے ساتھ دیا ہے تو مصیبت کے وقت اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔ آخر کار صرف چار سو سواروں کے ساتھ احمد خانپور کی طرف روانہ ہوا اور وہاں قسم کھائی کہ اگر وہ کبھی بادشاہ ہوا تو اس شہر کا نام بدل کر رسول آباد کر دے گا اور اسے مکہ مدینہ اور کربلا کے مسافروں کے لیے وقف کر دے گا۔[60]

عین الملک اور نظام الملک کو سخت مایوسی ہوئی اور وہ بادشاہ کے پاس گئے لیکن بادشاہ نے پھر کہا کہ وہ اپنے بھائی کی مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تاہم ان لوگوں کو روکنے کی بادشاہ میں سکت نہ تھی اور اب انھوں نے تیس ہاتھی اور بیس ہزار رسالہ کی فوج جمع کی[61] اور ایک دن صبح کو احمد نے دیکھا کہ ایک بڑی فوج اُس کی طرف آرہی ہے۔ احمد نے بھاگنا چاہا لیکن خلف حسن نے کہا کہ بغیر لڑے بھڑے بھاگنا شرم کی بات ہوگی اس لیے اُس نے ایک چال چلی۔ کچھ بنجارے وغیرہ چند سو مویشی لے کر برار سے کلیانی آئے تھے۔[62] خلف حسن نے یہ سب خرید لیے اور رات کی تاریکی میں ان کی سینگوں پر کپڑا باندھ کر چھپا دیا اور ان پر سپاہیوں کو سوار کر دیا اور اصلی رسالہ کو آگے کر دیا، چنانچہ گلبرگہ کی فوج کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب کی سب رسالہ کی فوج ہے۔[63] شاہی فوج کے آگے جو ہاتھیوں کی صف تھی اس پر بتھ پھول پھینکے گئے جس سے ہاتھی اپنی ہی فوج پر ٹوٹ پڑے اور تباہی برپا کر دی۔ اب احمد نے جو ایک ہزار رسالے کا دستہ جمع کر لیا تھا اُسے لے کر آگے بڑھا اور لڑائی میں شاہی فوج بُری طرح پسپا ہوئی۔ احمد کی بادشاہی کا میدان جنگ ہی میں اعلان کر دیا گیا اور وہ دارالسلطنت کی طرف بڑھا۔ اس کی پیش قدمی زبردست ذاتی فتح تھی اس لیے کہ جدھر سے وہ گذرا اسے لوگوں نے سلامی دی۔ بیمار اور کمزور فیروز دارالسلطنت سے تین کروہ آگے بڑھ کر فاتح فوج کے مقابلہ کے لیے نکلا مگر اس کے سات ہزار رسالہ کے دستہ کے چار ہزار احمد کی طرف چلے گئے[64] اور بیماری اور ضعف کی وجہ سے سلطان بغیر لڑے ہوئے میدان جنگ میں بے ہوش ہو گیا۔[65]

۵ شوال ۸۲۵ھ (۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء) کو احمد کے لیے شہر کا دروازہ کھول دیا گیا اور اُسے فوراً قریب المرگ بادشاہ کے پاس پہنچا یا گیا۔[66] یہ منظر بڑا دردانگیز تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور فیروز کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ برہان مآثر نے جن الفاظ میں اس منظر کو بیان کیا ہے

ان کا ماحصل یہ ہے:

" احمد ۔ حضور عالی! میں نے جو کچھ کیا وہ محض اپنی جان بچانے کے لیے کیا۔

فیروز ۔ اللہ کا شکر ہے کہ حکومت حقدار کے ہاتھ میں جارہی ہے ۔ یہ میری غلطی تھی کہ تم جیسے بھائی کے ہوتے ہوئے میں حکومت ایک کمتر صلاحیت والے کو دے رہا تھا ۔ میری آخری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے بھتیجے حسن خاں سے مہربانی کا سلوک کرو جو تمھارے شایاں شان ہے اور میری اولاد سے ویسی ہی محبت کرو جیسی مجھے تم سے ہے۔"

یہ کہہ کر فیروز نے اپنی کمر سے تلوار نکالی اور احمد کی کمر میں حمایل کردی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت فیروزہ پر بٹھا دیا۔[96] فیروز ایک ہفتہ کے اندر ہی ۱۱ شوال ۸۲۵ھ (۲۸ ستمبر ۱۴۲۲ء) کو فوت ہوگیا ۔ اس کی موت کے متعلق متفرق روایتیں بیان کی جاتی ہیں مگر قرین قیاس یہی ہے کہ وہ اپنی فطری موت سے مرا اس لیے کہ وہ پہلے ہی سے بیمار اور کمزور تھا اور پچھلے چند دن کے واقعات سے اُسے جو صدمہ ہوا ہوگا اُس سے اس کی زندگی ختم ہوگئی۔[97] نئے بادشاہ نے اُسے بڑی شان و شوکت سے خود اس کے تعمیر کردہ مقبرہ میں اس کے اجداد کی قبروں کے قریب ہی دفن کردیا۔

فیروز گلبرگہ کے دور کی بہمنی سلطنت کے ناموزترین حکمرانوں میں تھا اور اس کے عہد میں تمدن کا وہ امتزاج ہوا جو آگے ترقی کرکے دکھنی کلچر بن گیا ۔ کچھ لوگ اُسے ہندوؤں کا دشمن کہتے ہیں مگر جب ہم اس امر واقعہ پر نظر کرتے ہیں کہ اس نے وجے نگر کے خلاف اس وقت تلوار اٹھائی جب اُسے معلوم ہوا کہ وجے نگر اُس کے دشمنوں کی مدد کررہا ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ متعصب نہ تھا ۔ اُس نے یہ کوشش کی کہ جنوب کی سلطنت بہمنیوں کی باج گذار ہوجائے اور اگرچہ اس میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی مگر دوآبہ اور بنکاپور پر اُس نے اپنا دعویٰ پورا کرلیا ۔ ماہور کو اپنا ماتحت ملک بنانے میں وہ یقیناً کامیاب ہوگیا اور تلنگانہ سے دھاوا کرتا ہوا راجہ سندری تک پہنچ گیا ۔ یہ غالباً اُس کی دوراندیشی اور پیش بینی کا قصور تھا کہ اُس نے حضرت گیسو دراز سے جھگڑا کرلیا جس کے نتائج بہت خطرناک ہوئے اس لیے کہ اُسے اُس کا لحاظ کرنا چاہیے تھا کہ موصوف کا اُس کے امرا اور عوام الناس پر کتنا زبردست اثر ہے ۔ یہ ایک سیاسی غلطی تھی جو اُس سے سرزد ہوئی کہ اس نے ایسے بزرگ کی ہمدردی کھودی اور انھیں اپنی خانقاہ چھوڑنے کا حکم دے دیا جس سے اُن کے مریدوں اور دوستوں پر نظر رکھنے کا موقع جاتا رہا ۔ جس وقت اس نے اپنے مصیبت کے وقت کے رفیق اور وفادار خان خاناں جیسے بھائی کے خلاف فریق کا ساتھ دیا اس وقت وہ ضعیف اور خستہ حال تھا تاہم اس کے الزام سے ہم اُسے بری الذمہ نہیں کرسکتے ۔ آخر میں یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ فیروز کی سلطنت میں جو مختلف قوتیں برسرِعمل تھیں ان میں اُس نے اپنی مصالحانہ پالیسی سے توازن قائم رکھا جس کی مثال آئندہ برسوں میں نہیں ملتی۔

تشریحات

۱- تاج الدین کا لقب فیروز کے سکوں میں ملتا ہے۔

چاندی کا ٹنکہ : اوپر کی طرف : سلطان العہد والزمان الواثق بتائید الرحمٰن۔

نیچے کی طرف : تاج الدنیا والدین فیروز شاہ السلطان۔

نیچے کی طرف حاشیہ میں : احسن آباد ۸۰۳-

اسپیٹ کا مضمون کوائنز آف دی بہمنی کنگس' اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۹۰- پلیٹ ۲- فرشتہ اور برہان کے بیان کے مطابق فیروز کے پیشرو داؤد دوم نے ۵ سال ۷ ماہ حکومت کی۔ اس طرح ہم فیروز کی تخت نشینی کی تاریخ ۲۴ صفر ۸۰۰ھ (۱۶ نومبر ۱۳۹۷ء) قرار دے سکتے ہیں جو برہان کی تاریخ صفر ۸۰۰ھ کے مطابق ہوتی ہے اور طبقات اکبر شاہی کی ۲۴ صفر ۸۰۰ھ سے بھی۔ انتقال کے وقت وہ ۷۰ سال سے اوپر تھا اور چونکہ قمری سال کے حساب سے اس نے ۲۵ سال حکومت کی۔ اس لیے تخت نشینی کے وقت وہ ۴۵ سال سے اوپر رہا ہوگا۔ یہ برہان کے صفحہ ۵۴ کے بیان کے مطابق ہے لیکن فرشتہ کی جلد اول صفحہ ۳۰۵ میں یہ روایت ہے کہ ۷۸۰ھ میں جب داؤد قتل ہوا تو فیروز کی عمر صرف ۷ سال کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تخت نشینی کے وقت وہ ۲۷ سال کا جوان تھا۔ لیکن فرشتہ ہی کی جلد اول صفحہ ۳۱۶ پر ہمیں یہ بیان ملتا ہے کہ ۸۰۹ھ میں فیروز نے یہ کہا کہ "چونکہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے" اس لیے بہتر ہوگا کہ اس کے لڑکے حسن کی شادی پرتھل سے کر دی جائے۔ اب فرشتہ جلد اوّل کے حساب سے اس وقت فیروز کی عمر صرف ۳۶ سال کی ہوگی اور اسے "بڑھاپے کی عمر" نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اندازہ کیا کہ یہاں اور نیز کئی دوسرے مقامات پر برہان فرشتہ سے زیادہ مستند ہے۔

۲- کہا جاتا ہے کہ پہلے بہمنی حکمران کی ملازمت میں کئی برہمن تھے جن کا افسر گنگو تھا لیکن اس کے ثبوت میں ہمیں کوئی شہادت نہیں ملی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے گنگو کے نام کی حیثیت ہی محض افسانوی ہے۔ دیکھو شیروانی کا مضمون

گنگو بہمنی، جرنل آف انڈین ہسٹری دسمبر ۱۹۴۰ء۔

۳ - ریڈیوں اور فیروز کے عہد میں ان کی لڑائیوں کے متعلق دیکھو ونکٹ رام نیا کی کتاب ویلوگوتی وری ونس دلی۔ مقدمہ صفحات ، الغایت ۳۶ - بھیرون سنگھ اور اس کے باپ کے متعلق دیکھو ڈی - وی - اپٹے کی کتاب مدصل سمتا چیا گھوڑ پڑے چرنچیا اتہاس مطبوعہ پونہ ۱۹۳۴ء مقدمہ۔ دستاویز ۲ - جس میں اس کے بائیں ہاتھ کی چھاپ دی گئی ہے۔

۴ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۸ - سلطان کی خوشخلی کے متعلق دیکھو تذکرۃ الملوک، فولیو ۹ -

۵ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۹ - جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

بدان شاہ زغم دہر دلم تنگ است	کہ دل بہ لذت سودائے عشق در جنگ است
گل امید شگفت از نسیم وعدہ دے	ز آفتاب غم انتظار بے رنگ است
بقطع راہ محبت بخور فریب امید	کہ غایت املش ابتدائے فرسنگ است
دماغ طبع عروجی چہ دلکشا چمنیست	چمن مگوئے کہ آن آسمان فرہنگ است
کرشمہ جنبش آموزاست مژگان درازش را	ستم کرد است واجب ہر زماں تعلیم نازش را
فروزی قامت ورخسار آں خورشید تابان را	سرور ولالہ می سنجد کہ بنیش امتیازش را

۶ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۰ - دولت آباد بالاگھاٹ اس پہاڑی سلسلہ کا ایک حصہ جو ضلع اورنگ آباد کے آخری مغربی حصہ سے شروع ہو کر خلد آباد اور دولت آباد ہوتا ہوا چلا گیا ہے۔

۷ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۹ - یہ کہنا شاید مبالغہ ہوگا کہ اس نے محض سماجی رابطے قائم کرنے کے لیے شمال اور جنوب کی ہندو عورتوں خصوصاً مہاراشٹر، تلنگانہ اور کرناٹک سے شادیاں کیں۔ دیکھو اے۔ ہیلی کا مضمون، روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد صفحہ ۲۹۰ -

۸ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۷ - فرشتہ نے حسب معمول یہاں بھی سخت مبالغہ کیا ہے۔ فولیو ۹ ب میں ایک قابل ذکر فقرہ ہے کہ فیروز کی صرف ایک بیوی تھی۔

۹ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۷ -

۱۰ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۹ - اس واقعہ کی تفصیل بعد کو دی گئی ہے۔ ممالک غیر سے تجارت کے متعلق دیکھو کے - اینگر کی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری (بحوالہ ہر بلاسم آف ہری ناتھ) صفحہ ۱۱ -

۱۱ - فیروز کے عہد میں گوا بہمنی مقبوضہ ہو گیا یا شاید وجے نگر کی "زیر معاہدہ" بندرگاہ - اس لیے کہ ۱۴۷۲ء میں محمد سوم کے عہد میں محمود گاواں کو اسے دوبارہ فتح کرنا پڑا - دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں دی گریٹ بہمنی وزیر صفحات ۱۳۰ سے ۱۳۹ - نیز نیچے گیارھواں باب

۱۲- فیروز پہلا بہمنی حکمران تھا جس نے دستار کی شکل میں مرصع تاج تیار کرا کے استعمال کیا۔ دیکھو نظام الدین احمد کی کتاب طبقات اکبرشاہی صفحہ ۲۸۸۔

۱۳- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۶۔ لباس کے بارے میں دیکھو تذکرۃ الملوک ۹ ب۔

۱۴- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۸۸۔

۱۵- رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۲۵-۲۶ء صفحہ ۴۔ فیروز کی قبر یقیناً بڑی پُر وقار ہے مگر اس کے جانشین احمد اوّل نے جو حضرت سید محمد گیسو دراز کا مقبرہ اس سے تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر تعمیر کیا اس کے برابر نہ یہ باوقار ہے اور نہ اتنی شان دار۔ عبدالجبار نے اپنی کتاب محبوب الوطن کے صفحہ ۷۴ پر مفرح القلوب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فیروز کے پاس جو قبر ہے وہ شاہ کمال پیر کی ہے۔

۱۶- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۸۔ فیروز آباد ضلع گلبرگہ میں بھیما اور اس کی چھوٹی شاخ بھورا کے سنگم پر ۱۷٫۸ شمال، ۷۶٫۵۶ مشرق۔

۱۷- مسٹر من کا خط سپرنٹنڈنٹ حیدرآباد آرکیالوجی کے نام، رپورٹ ۱۹۱۴-۱۵ء صفحہ ۴۴۔ دراصل مسٹر من کے خط کے بعد قلعہ فیروز آباد کی بہت سی عمارتیں منہدم ہو گئی ہیں اور ان کے پتھر لوگ اٹھائے گئے ہیں۔ بادگیری ضلع گلبرگہ میں ایک تعلقہ کا مستقر، ۱۶٫۴۷ شمال، ۷۷٫۹ مشرق۔

۱۸- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۶۔ اس خانقاہ کا حال حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ ۱۳۴۷-۴۸ فصلی کے صفحہ ۲ پر بیان کیا گیا ہے۔

۱۹- برہان صفحہ ۴۴۔

۲۰- اس واقعی عظیم شخصیت کے متعلق اردو میں ایک یا دو کتابچے شائع ہوئے ہیں مگر یہ غیر فطری واقعات اور دوسری ایسی ہی باتوں سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ابھی ثبوت نہیں ملا ہے۔ ضرورت ہے کہ حضرت گیسو دراز کی زندگی پر ایک مستند ناقدانہ کتاب لکھی جائے جس سے یقیناً ملک کے لوگوں کے سماجی اور سیاسی حالات پر کافی روشنی پڑے گی حال ہی میں ان کی متعدد تصنیفات پر توجہ کی گئی ہے جن میں سے بعض شائع ہو گئی ہیں۔ دیکھو حامد صدیقی کی کتاب حضرت گیسو دراز مطبوعہ حیدرآباد اور ظہیر الدین احمد کی کتاب سلطان احمد شاہ بہمنی دوسرا باب۔ حضرت کی سوانح عمری سب سے پہلے ان کے ایک مرید محمد علی سامانی نے لکھی مگر یہ اب تک مسودہ کی حالت میں ہے اور گلبرگہ میں حضرت کے مزار کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا خلاصہ اور اقتباسات خود حضرت کی مصنفہ کتاب کے مطبوعہ ایڈیشن کے خاتمہ میں شائع ہوئے ہیں مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۴۰ء۔ بظاہر وہ دہلی واپس گئے اور ۸۰۰ھ (۱۳۹۸ء) سے پہلے دکن واپس نہیں آئے۔ حضرت کی سوانح عمری کے لیے دیکھو غلام علی آزاد کی کتاب روضۃ الاولیا صفحہ ۳۳۔

۲۱- رائے کے نام کے لیے دیکھو سیویل اینڈ اینگر کی انسکرپشنز آف ساؤتھ انڈیا صفحہ ۲۰۰- سیویل کی اے فارگاٹن ایمپائر صفحہ ۱۵۲- بی ایس راؤ کی ہسٹری آف وجے نگر صفحہ ۲۰- سوال یہ ہے کہ یہ جملہ ہری ہر دوم نے کیا تھا یا اس کی طرف سے شہزادہ بکا نے- نیز دیکھو لرتی ونکٹ راؤ کا مضمون بہمنی وجے نگر ریلیشنز، انڈین ہسٹری کانگریس الٰہ آباد صفحات ۲۹۴ و مابعد سیویل اینڈ اینگر کا بیان ہے کہ حملہ سردی کے موسم میں ہوا تھا لیکن چونکہ اس کے بعد ہی بارش شروع ہو گئی تھی اس لیے یہ سردی کا نہیں بلکہ گرمی کا موسم ہوگا۔

۲۲- فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۹- مانڈو کے پہلے حکمران کے متعلق فرشتہ کے بیان میں غلطی معلوم ہوتی ہے ——

دلاور خاں غوری نے ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) سے پہلے اپنی آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں اسیر کا حکمران ناصر خاں فاروقی تھا۔ کھیرلا اب مہاراشٹر میں بتول کے شمال میں تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ ۳۶ ر ۲۱ شمال، ۸ ر مشرق۔ انادیو ویلاما کا حوالہ ویلوگ صفحہ ۵ میں ہے جہاں اندھرا ہسٹاریکل ریسرچ سوسائٹی جلد اول صفحہ ۲۸۴ کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ویلاماؤں کے محمد اول سے معاہدانہ تعلقات تھے۔ ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۲۱- کیپٹیو آف پنگل، ویلوگ مقدمہ صفحہ ۲۱۔

راجہ سندری اندھرا پردیش کے مغربی گوداوری ضلع کے ایک سب ڈویژن کا مستقر، ۱ ر ۱۷ شمال، ۴۶ ر ۸۱ مشرق۔

ساگر پر دوبارہ قبضہ کی تاریخ میری قیاسی ہے اور میں نے اس کا حساب بھیرول سنگھ کے مدھول کے عطیہ سے لگایا ہے۔ برہان نے ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) کی تاریخ لکھی ہے۔ ڈاکٹر ونکٹ رام نیا نے راجہ سندری پلیٹس میں شمس الدین کے باپ کا نام محمود شاہ غلط لکھا ہے اور فیروز کی تخت نشینی کی تاریخ ۱۴ فروری ۱۳۹۷ء بھی غلط ہے۔ دیکھو تشریح نمبر ۱۔

۲۳- فرشتہ نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ اردو ہے جو ترکی لفظ "اُردو" یا کیمپ کے ہم معنی ہے اور یہ شاید لاطینی "آرڈو" سے مشتق ہے جس کے معنی باضابطہ صف یا لائن ہیں۔

۲۴- فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۰۔

۲۵- شہزادہ بکا کا نوجوان لڑکا۔ دیکھو سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۰۶- فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۰۔

۲۶- فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۰- سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۰۶۔

۲۷- دس لاکھ ہُن- یہ تقریباً ۳۳ لاکھ ٹنکہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ کے لیے وجے نگر کا سالانہ خراج مقرر ہوا تھا اور اس رقم کی بروقت ادائی نہ ہونے سے آیندہ کئی لڑائیاں ہوئیں۔

۲۸- فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۱۱۔

دیکھو اپی گرافیا انڈو سلما جلد ۲۶ صفحات ۲۹ و ۳۰ جس میں کہا گیا ہے کہ تیلگو چولا نادیلا نے فیروز کی مدد کی۔

۲۹- برہان، صفحہ ۴۴۔

۳۰ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۰ - برہان صفحہ ۴۴ -

۳۱ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۱ و ۳۱۲ - ایلچ پور پہلے برار کا مستقر تھا - اب ریاست مدھیہ پردیش کے ضلع امراوتی کے ایک سب ڈویژن کا مستقر ہے - ۲۱ر۱۶ شمال، ۷۷ر۳۳ مشرق -

۳۲ - برہان صفحہ ۴۴ - ویلاماؤ ویما کے مناقشے اور طرفداریاں - ویلوگ مقدمہ صفحہ ۴۲ - گنڈاکلم ریاست مدراس کے ضلع مغربی گوداوری کے ایلور تعلقہ میں -

۳۳ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۱ میں ہے کہ سلطان نے راستہ میں کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا اور خود اس قلعہ پر بھی قابض ہو گیا - مگر یہ فرشتہ کے مبالغوں میں سے ایک مبالغہ معلوم ہوتا ہے -

۳۴ - سیویل اینڈ اینگر بحوالہ ویما گرام سی پی گرانٹ - ویلوگ صفحہ ۲۵ میں شاعر سری ناتھ بھیمیشور اپورانم جلد اوّل صفحہ ۶۲ کا حوالہ ہے -

۳۵ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۶ - دراصل تلنگانہ کو اگلے حکمران کے عہد میں دوبارہ فتح کرنا پڑا - سیویل اینڈ اینگر کا صفحہ ۲۱۳ میں بیان ہے کہ ۱۳۲۲ء میں کونڈاویڈو ریڈی پتیوں کے قبضہ میں تھا مگر یہ ظاہر ہے کہ کونڈاویڈو ۱۳۳۴ء میں کپلیشور کے عروج سے پہلے اوڑیسہ کی ماتحتی میں نہیں آیا - دیکھو بینرجی کی ہسٹری آف اوڑیسہ جلد اوّل صفحہ ۲۹۰ - کونڈاویڈو جو بعد کو مرتضیٰ نگر کے نام سے موسوم ہوا ریاست تامل ناڈو کے ضلع گنٹور میں ایک پہاڑی قلعہ ہے - ۱۶ر۶۰ شمال، ۸۰ر۶۰ مشرق -

۳۶ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۲ - تیمور اپریل ۱۳۹۸ء میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، ۲۴ ستمبر ۱۳۹۸ء کو دریائے سندھ عبور کیا اور اسی سال کے ۱۷ دسمبر کو دہلی پر قبضہ کر لیا -

۳۷ - بکا ۱۳۷۷ء میں وجے نگر کا راجہ

ہری ہر ۱۳۷۷ء تا ۱۴۰۴ء

بکا دوم ۱۴۰۴ء تا ۱۴۰۶ء

دیورایا اوّل ۱۴۰۶ء تا ۱۴۲۲ء

فروز سورسز جلد اوّل صفحات ۸۰ تا ۹۲ -

۳۸ - یہ کاشتکار نہ تھا جیسا کہ سیویل اینڈ اینگر کے صفحہ ۲۰۹ میں ہے -

۳۹ - جو ساز اس نے بجایا وہ تار کا جنتر اور سور منڈل یا رباب تھی -

۴۰ - یہ سب فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۴ میں ہے -

۴۱ - طبقات اکبر شاہی صفحہ ۴۱۱ - لیکن اس میں لڑکی کے نام کا ذکر نہیں ہے -

۴۲ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۵ - برہان کے صفحہ ۴۴ میں ہے کہ بعض صوبہ جات جیسے بھنور اور موسل کل پر

سلطان کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دیکھو ونکٹ رام نیا کی انڈین اینٹی کوریز ۱۹۴۱ء صفحہ ۳۵۔

۴۳۔ فرشتہ نے ...... ۶ لکھا ہے مگر یہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔

۴۴۔ برہان صفحہ ۳۴ میں ہے کہ ۳۳ لاکھ ٹنکہ کی رقسم دی گئی جو بقایا تھی۔ یہ تقریباً ۱۰ لاکھ ہن کے برابر ہے۔ برہان میں پرتل کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ فرسخ = ۱۸۰۰۰ فٹ، اسٹین گراس پرشین انگلش ڈکشنری۔ ، فرسخ = تقریباً ۵ر۳ میل۔

۴۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۶۔ جس میں اس قصہ کی ساری تفصیلات دی گئی ہیں۔

۴۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۶۔ برہان صفحہ ۴۷۔ نلگنڈہ شہر نہیں ہے جیسا ظہیر الدین نے صفحہ ۳۵ میں لکھا ہے۔ یہ سارا واقعہ مبہم سا ہے خصوصاً راجہ سندری کی مہم' اڑیسہ سے جنگ اور پنگل کے محاصرے کا تسلسل اور ان کے باہمی تعلق کا سوال۔ میں نے عموماً اس سلسلہ واقعات کی سندلی ہے جو ڈاکٹر ونکٹ رام نیا نے ایپی گریفیا انڈیکا ۱۹۴۱ء کے صفحات ۴۴ تا ۴۷ میں بتائی ہے۔ اسی کے ساتھ جہاں تک اڑیسہ کی مہم کا تعلق ہے میں نے برہان کی سندلی ہے۔ راجہ سندری میں شکست۔ ویلوگ مقدمہ، صفحہ ۲۷۔ اڑیسہ کی مہم کا حال بینرجی کی ہسٹری آف اڑیسہ جلد اوّل کے صفحہ ۲۸۷ میں بھی ہے۔ دد دایا الا ۱۴۲۳ء تک راجہ سندری میں حکمران رہا۔ سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۱۰۔ پنگل نلگنڈہ سے دو میل کے فاصلہ پر۔ ۵ر۱۷ شمال' ۵۵ر۸۰ مشرق۔ دیورکنڈہ اندھرا پردیش کے ضلع نلگنڈہ میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۴۲ر۱۶ شمال' ۵۵ر۸۰ مشرق۔

۴۷۔ ویلوگ صفحہ ۲۸۔ برہان صفحہ ۴۶۔ فرور سورسز جلد اوّل صفحہ ۷۱۔

میدک اندھرا پردیش میں اسی نام کے ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۳ر۱۸ شمال' ۱۶ر۷۸ مشرق۔

۴۸۔ دیکھو عبداللہ المکی کی ظفر الوالیہ۔ راس ایڈیشن صفحہ ۱۹۲ جس میں یہ روایت ہے کہ گجرات سے مدد کا وعدہ ہوا تھا۔

۴۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۷۔

۵۰۔ "۳ر اگست سے کچھ دن پہلے" سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۱۳ بحوالہ ای سی' گرتی ۴۴ وغیرہ۔

۵۱۔ برہان صفحہ ۴۰۔ بیعت یا معاہدہ اطاعت میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہی۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اوّل صفحہ ۵۸۰ جس میں اس کا مفہوم بھی ہے۔

۵۲۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۶۔

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ حضرت گیسو دراز کا مقبرہ۔ رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۲۰-۱۹۱۸ء پلیٹ ۴۔

۵۵ - برہان صفحہ ۴۳ -

۵۶ - برہان صفحات ۴۷ و ۴۸ - ظفر الولیہ جلد اوّل صفحہ ۱۶۲ میں ہے کہ فیروز نے خود عمایدِ سلطنت کو بلایا اور ان سے کہا کہ اس کا لڑکا حسن جانشین ہوگا اور احمد کو قید کر دینا چاہیے -

۵۷ - بعد کو سلطان علاء الدین احمد دوم - دیکھو برہان صفحہ ۴۸ جس میں صاف لکھا ہے کہ ظفر خاں اُس کا بڑا لڑکا تھا - نیز فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۸ -

۵۸ - تاریخ کی نامور ترین شخصیتوں میں گمنام شخصیت - خلف حسن کے معنی ابن محض" حسن کا لڑکا" یہیں معلوم ہے کہ اس کے بھائی کا نام خمیس تھا لیکن خود اُس کا نام بالکل معلوم نہیں - ظفر الولیہ صفحہ ۱۶۳ میں اسے خلف العرب الاحسانی کہا گیا ہے -

۵۹ - برہان صفحہ ۴۸ -

۶۰ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۸ - برہان نے صفحہ ۴۹ میں لکھا ہے کہ میلد کا نام بدل کر خان پور رکھا گیا تھا -

۶۱ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۸ میں رسالہ کی تعداد تین سے چار ہزار تک لکھی ہے -

۶۲ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۸ میں ہے کہ ۲۰۰ مویشی مع غلّہ کے اور تین سو تاجر کلیانی پہنچے - ظہیر الدین نے صفحہ ۴۳ میں ۲۰۰۰ بیل لکھے ہیں، لیکن اس کی کوئی سند نہیں دی ہے -

۶۳ - برہان صفحہ ۵۰ -

۶۴ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۸ - برہان نے صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ ہوشیار اور بیدار میدانِ جنگ میں مارے گئے - لیکن فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۱۹ میں لکھا ہے کہ گلبرگہ واپس پہنچ گئے -

۶۵ - برہان صفحہ ۵۱ -

۶۶ - فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۱۹ میں لکھا ہے کہ بادشاہ اس قدر بیمار تھا کہ وہ بستر پر لیٹا تھا اور وہیں اس نے اپنے بھائی کو بلایا لیکن برہان کا بیان ہے کہ جب فیروز آیا تو احمد تخت پر بیٹھا ہوا تھا - خود میرا خیال ہے کہ فرشتہ کی روایت صحیح ہے اس لیے کہ فیروز گلبرگہ کے باہر بے ہوش ہو گیا تھا اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ لڑائی کے بعد صاحبِ فراش ہو -

۶۷ - یہ برہان کے صفحہ ۵۲ میں ہے -

۶۸ - ظہیر الدین نے صفحات ۶۶ تا ۷۰ میں وہ سب روایتیں نقل کی ہیں جو فیروز کی موت کے متعلق مشہور تھیں فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۱۹ میں یہ قصہ نقل کیا ہے کہ اُسے شیر خاں کے اشارے سے قتل کر دیا گیا - لیکن رفیع الدین شیرازی

کا بیان ہے کہ اُسے خود اس کے ایک حبشی غلام نے قتل کیا جب کہ وہ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔

فیروز نے ۲۵ سال ۷ ماہ ۱۱ دن حکومت کی اور ۲۴ فروری ۸۰۰ھ کو جب وہ تخت نشین ہوا اس وقت سے حساب لگا کر ہم ۵ شوال ۸۲۵ھ (۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء) تک پہنچتے ہیں اور یہی بقول فرشتہ، برہان اور طبقات کے اس کے جانشین کی تخت نشینی کی تاریخ ہے۔

ساتواں باب

نیا ماحول

شہاب الدین احمد اوّل[1]

۲۰ ستمبر ۱۴۲۲ء سے ۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء

الف۔ کلچرل حالات

نیا بادشاہ خواہ کتنا ہی "نیک دل"[2] رہا ہو اور اپنے باپ کی موت کے سلسلہ میں وہ کتنا ہی بے قصور ہو لیکن اس نے جب یہ سنا ہوگا کہ اس کا بھائی اب دنیا میں نہیں رہا تو اس نے اطمینان کی سانس لی ہوگی۔ اپنی حکومت کے شروع میں اسے اپنے محسن حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا جو اس کی تخت نشینی کے ایک ہی مہینہ کے اندر واقع ہوئی[3]۔ حضرت موصوف احمد کے اس وقت سے حامی تھے جب سے وہ گلبرگہ میں آکر آباد ہوئے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت کے گرد وپیش جو لوگ جمع ہو گئے تھے اور جو ایک طرح سے فیروز کے خلاف جماعت کے لیڈر ہو گئے تھے اگر ان کی مدد نہ ہوتی تو احمد اپنے بھائی اور بھتیجے کو بآسانی تخت سے بے دخل نہ کر سکتا۔ ممکن ہے کہ دارالسلطنت کے گلبرگہ سے بیدر منتقل ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب حضرت گیسو دراز کی وفات بھی ہو۔ لیکن گلبرگہ سے روانہ ہونے سے پہلے اس نے حکم دیا کہ

حضرت کے مزار پر ایک مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ شان دار عمارت تعمیر ہوئی جو گلبرگہ کا نشانِ عظمت ہے

دارالسلطنت کی تبدیلی

دارالسلطنت کی تبدیلی دراصل اس انقلاب کی علامت تھی جو بہمنی سلطنت کے اندر اور باہر رونما ہو رہا تھا۔ علاء الدین بہمن شاہ کی قائم کی ہوئی اور محمد اول کی منظم کی ہوئی سلطنت منصب شاہی کی غیر یقینیت سے دوچار تھی اور محمد دوم کو مستثنیٰ کر کے مجاہد سے لے کر اُس کے بعد تک ہر حکمران کی موت تشدد سے واقع ہوئی۔ بہمنیوں کی حکومت کو مشکل سے پچھتر سال ہوئے تھے اور تیز فہم احمد نے محسوس کیا ہوگا کہ خون آشام روایات کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں اُس کی حکومت محفوظ نہیں ہے پچھلی چوتھائی صدی کی تاریخ حکومت کی جانشینی کے تمام قواعد وضوابط سے خالی رہی اور اس صورت حال نے گلبرگہ میں ہر تخت نشین کے خلاف سازش اور نا وفاداری کی فضا پیدا کر دی تھی۔ مزید برآں احمد کو علم تھا کہ کن تدابیر اور ذرائع سے وہ اپنے بھتیجے کو محروم کر کے بادشاہ ہوا تھا۔ اس کی تخت نشینی کے بعد ہی حضرت گیسو دراز کی اتنی جلد وفات (۱۶ ذی القعدہ ۸۲۵ھ مطابق یکم نومبر ۱۴۲۲ء) کا صدمہ اُسے بری طرح محسوس ہوا ہوگا اور وہ شدت کے ساتھ یہ سوچنے لگا ہوگا کہ اُسے گلبرگہ کی ساری بندشوں سے کس طرح نجات حاصل کرنا چاہیے جہاں امرا اور عوام کی ایک بڑی جماعت یقیناً اُسے محض غاصب خیال کرتی ہوگی۔

اگر ہم بہمنی حکومت کے گلبرگہ کے دَور کا بیدر کے دَور سے مقابلہ کریں تو ہمیں سلطنت کی طبعی حالت میں بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ بیدر کی سلطنت کا دور ملک کے اندرونی امن کا دور تھا۔ سازشیں تو ضرور تھیں اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا آفاقیوں اور دکھنیوں کی باہمی عداوت ہی بالآخر زوالِ سلطنت کا باعث ہوئی۔ لیکن قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ باوجود اس خون آشام فضا کے جسے احمد نے گلبرگہ میں چھوڑا تھا اور باوجود آفاقی دکھنی کشمکش کے جس نے سلطنت کے اندر ہی کئی سلطنتوں کو جنم دیا اور سلطنت کے زوال کا باعث ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۴۲۲ء سے جب کہ شہاب الدین احمد تخت نشین ہوا سولھویں صدی کے اوائل تک جب کہ سارا اقتدار ختم ہو گیا حکمران کے قتل کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ دراصل اسی عہد میں اولادِ اکبر کی جانشینی کا حق پورے طور پر جاری وساری ہوا جس کا شمالی ہند میں پورے قرونِ وسطیٰ میں وجود نہ تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس صورت حال کے وجود میں لانے کا سہرا بڑی حد تک اسی کے سر ہے

جس نے سلطنت کو نئے علاقہ میں منتقل کیا۔

ایک اور روایت بھی تھی جس سے دارالسلطنت کی تبدیلی پر بالآخر خلاصی ہوئی اور وہ تغلق کی روایت تھی۔ اوپر کہا گیا ہے کہ فیروز پہلا بہمنی سلطان تھا جس نے بیرون ملک کے ایرانیوں، عراقیوں اور عربوں کی کثیر تعداد میں آمد کی ہمت افزائی کی اور ان کے اثرات کا توڑ کرنے کے لیے دکھن کی زندگی میں ہندو روایات کی آمیزش کی۔ جتنا وقت گذرتا گیا خالص تغلق اثرات زوال پذیر ہوتے گئے اور ایک ہی چبوترے پر مجاہد کے مقبرے اور فیروز کے دوسرے مقبرہ میں جو نمایاں فرق ہے وہ اس رجحان کا بین ثبوت ہے۔ یہ پہلے ہی ظاہر کیا جا چکا ہے کہ ہندو اثر کس طرح مذہبی مسلم عمارات میں بھی جیسے غیاث الدین تہمتن کے مقبرہ اور فیروز کے مقبرہ کے نماز کے گوشہ میں نمایاں بے نفوذ کر رہا تھا۔ بیدر کے عہد میں دکھن کے فن تعمیر کی تاریخ میں ایک نئی صورت نمایاں ہوتی ہے اس لیے کہ اگر ایک طرف تغلق اثر تقریباً معدوم ہو گیا ہے تو دوسری طرف ایرانیوں اور ماورائے جیحونیوں کا اثر جو ہمیشہ سے زیادہ دکھن میں جمع ہو رہے تھے ملک کی زندگی میں فن اور تعمیر، سیاسات، مذہب اور دوسرے شعبوں میں نمایاں ہو رہا ہے جو شمالی آبادکاروں کو جو خود کو اب دکھنی کہتے تھے سخت ناگوار تھا۔ عمارات میں ایرانیوں کا اثر اس حد تک نمایاں ہے کہ مخصوص ایرانی دکھنی محراب یا بہمنی بلند چوٹی والی محراب کی نقل اُن کے دشمن، وجے نگر والوں نے بھی کی اور آج بھی جس نے شاندار ہمپی کھنڈرات کو دیکھا ہے وہ اس پر حیرت کرتا ہے کہ تنداری گٹا روڈ، زنانہ احاطہ، نگرانی کا مینار و نایک احاطہ میں، نام نہاد فیل خانے اور ان کھنڈرات کی دیگر یادگاروں میں، خالص ہندو مندروں، عبادت خانوں، چبوتروں میں ابھرے ہوئے نقوش کے بدوش بدوش کس باریکی کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں[4]۔

ایک بات جس کا احمد کو خیال ہوا ہوگا وہ بیدر کی زرخیزی اور صحت بخش ہوا کے مقابلہ میں گلبرگہ کی گرم فضا تھی —— گلبرگہ یا کل برگہ کے معنی کنڑی زبان میں "پتھریلی زمین" کے ہیں اور دکھن کا یہ حصہ بارش کی قلت کے لیے مشہور رہا ہے۔ دوسری طرف بیدر ایک مرتفع زمین پر واقع ہے۔ جو سطح سمندر سے ۲۳۳۰ فٹ بلند ہے اور دکھن کی سطح مرتفع پر یہ یقیناً سب سے زیادہ صحت بخش جگہ ہے اور یہی وجہ ہوگی کہ ہمارے مورخین نے اس قسم کی روایتیں نقل کی ہیں جیسے بیدر کا خرگوش یا لومڑی دوسری جگہ کے کتے کا پیچھا کرتی ہے یا یہ کہ بیدر کا بوڑھا دکھن کی دوسری جگہ کے جوان سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے[5]۔

آخری بات یہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں فیروز کے عہد میں بہمنی فوجیں تلنگانہ تک پہنچ گئی تھیں اور اگرچہ فیروز کو راجہ سندری چھوڑنا پڑا تھا لیکن دکھن کے مشرقی علاقوں پر اس نے اپنا قبضہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ مستحکم کر لیا تھا[6]۔ بیدر میں دارالسلطنت کو منتقل کرنے میں احمد کے ذہن میں ویسے ہی خیالات آئے

ہوں گے جیسے محمد بن تغلق کو اپنی وسیع سلطنت کا دوسرا دارالسلطنت دولت آباد کو قرار دینے کے سلسلہ میں؛ اس لیے کہ بہمنی سلطنت جو پچھلے پچیس برسوں میں بہت وسیع ہوگئی تھی اس کے لیے گلبرگہ بطور دارالسلطنت کے موزوں نہ تھا۔ بیدر دکھن کی سطح مرتفع کے تقریباً کنارے واقع تھا اور زیادہ محفوظ تھا اور اس کے علاوہ دور دراز گلبرگہ کے مقابلہ میں بیدر نئی سلطنت کے درمیان میں واقع تھا۔

شاید یہی ملحوظات تھے جنھوں نے احمد شاہ کو دارالسلطنت بیدر میں منتقل کرنے پر آمادہ کیا۔ اس اہم واقعہ کی ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) اور ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) کے درمیان مختلف تاریخیں بتائی گئی ہیں۔ اول الذکر تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں کہ جیسا فرشتہ کا بیان ہے کہ احمد نے بیدر کی آب وہوا کی خوبی کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے کتے اور لومڑی کی ڈرامائی دوڑ کا انتظار کیا ہو۔ بیدر دکھن کی فتح کے وقت ہی سے مسلمانوں کے قبضہ میں تھا اور قبل ازیں کہ محمد بن تغلق دولت آباد کو سیاسی مرکز بنائے وہ جنوبی صوبہ جات کا مرکز رہ چکا تھا۔ یقیناً احمد جیسا سمجھ دار آدمی جو متعدد بار بیدر سے ہو کر گذرا ہوگا۔ یہاں کی سرسبزی اور خوشگوار آب وہوا سے واقف ہوگیا ہوگا اور اُسے یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ ایک زمانہ میں یہ دکھن کا مرکزی شہر رہ چکا ہے۔ برہان مآثر اور تذکرۃ الملوک دونوں کا متفقہ بیان ہے کہ بیدر کو بادشاہ کی تخت نشینی کے فوراً بعد دارالسلطنت بنا دیا گیا۔ مزید برآں ہمارے پاس ایک اور شہادت ایک کتبہ کی ہے جو بیدر کی جامع مسجد "سولہ کھمبہ مسجد" میں ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ اس کی تعمیر ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) میں یعنی احمد کی تخت نشینی کے دو ہی سال کے اندر شہزادہ محمد نے کی جس کے نام پر بیدر کا نام محمد آباد رکھا گیا[۵۰] اور یقیناً ۸۲۷ھ میں تنہا یہی مسجد شاہی عمارت نہ رہی ہوگی۔ اس لیے ہم بجا طور پر یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ احمد نے تخت نشین ہوتے ہی دارالسلطنت کی تبدیلی کا خیال کرنا شروع کر دیا ہوگا اور شہزادہ محمد کو سطح مرتفع کے کنارے قدیم ہندو قلعہ کے پاس ایک قلعہ کی تعمیر کی نگرانی پر مامور کر دیا ہو اور جب ساری عمارتیں شاہی عملہ کے لیے بشمول مسجد کے ۸۲۷ھ میں مکمل ہوگئی ہوں گی تو اس نے دارالسلطنت کو وہاں منتقل کر دیا ہوگا۔ در اصل ہماری خوش قسمتی سے دارالسلطنت کی تبدیلی کی صحیح تاریخ بھی مل گئی اس لیے کہ برہان مآثر نے صاف لکھا ہے کہ بادشاہ اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال یعنی رجب ۸۲۷ھ (جون ۱۴۲۴ء) میں نئے دارالسلطنت میں منتقل ہوگیا۔

برہان نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ ولی عہد شہزادہ ظفر خاں کی خاندیش کے ناصر خاں فاروقی کی لڑکی شہزادی آغا زینت سے شادی کی تقریبات یہیں منعقد ہوئیں جس میں "موسیقی، خوشبو اور شراب'' کی بہتات تھی۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت "بیدر کا دارالسلطنت" اعلیٰ معاشرت کی بکثرت مختلف اشیا سے بھرا ہوا تھا اور فنون لطیفہ کے اہل دربار اور عوام الناس قدر دانی کرتے تھے اور آسایش اور تعیش کے سامان

کی دوکانوں اور تجارت خانوں کی افراط تھی۔[9]

• تعمیرات

گلبرگہ کی ممتاز یادگاروں میں جسے یقیناً احمد اول نے شروع کیا تھا ایک حضرت گیسو دراز کا مقبرہ ہے یہ مقبرہ جس کے پاس ہی حضرت کے صاحبزادے سید اکبر حسینی کا مزار ہے مخلوط ایرانی دکھنی یا بہمنی فن تعمیر کا مکمل نمونہ ہے اور انھیں اصول پر تعمیر ہوا ہے جن پر فیروز کے مقبرہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگرچہ پہلی نظر میں یہ دو منزلہ عمارت معلوم ہوتی ہے جس کے چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے گلدان ہیں اور اوپر ایک عظیم الشان گنبد ہے جس پر بیل کے نقوش ہیں اور یہ حضرت کے صاحبزادے کے مزار کے ساتھ گلبرگہ کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔ محرابیں، کھمبے، اور محرابوں کی درمیانی آرایش فیروز کے مقبرہ کے مشابہہ ہیں لیکن اس میں ایک سادگی اور عظمت ہے جو دیکھنے والے کو بہت متاثر کرتی ہے اس لیے کہ عمارت کا منصوبہ اس سے بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا اور دونوں "منزلوں" پر محرابیں سادی اور قریب قریب ہیں جو فیروز کے مخروطی نمونے سے مختلف ہیں۔ باپ اور بیٹے دونوں کے مقبروں کے اندرونی حصے باعظمت اور غم انگیز ہیں اور دیواریں زمین کے بالکل زاویہ قائمہ پر ہیں اور چھت ابھری ہوئی شکل کی ہے جس پر دس اٹھلے گنبد ہیں۔ حضرت کا مقبرہ ان کی وفات کے دو سال بعد احمد شاہ اول نے شروع کیا تھا اور اس کی تکمیل اس کے لڑکے علاء الدین احمد دوم نے کی۔[10]

گلبرگہ میں ایک اور عمارت ہے جو احمد اول کے عہد سے منسوب کی جاسکتی ہے یعنی وہ مسجد جو گلبرگہ کے پہلے گورنر قلندر خاں نے تعمیر کی۔ یہ سادی عمارت ہے جس میں پانچ محرابوں کی دوہری قطار ہے اور چھت کے اوپر پانچ گنبد ہیں۔ محرابوں کا نمونہ وہی ہے جیسے فیروز کے مقبرہ کی محرابوں کا۔ لیکن جن ستونوں پر یہ محرابیں ہیں وہ نسبتہً زیادہ لمبی ہیں اور ساری روکار بہت ہی سادہ ہے۔ قلندر خاں کی مسجد کے قریب ایک دلچسپ مربع کمرہ ہے جو فیروز   کی طرز تعمیر سے مشابہہ ہے یعنی اس کمرے کے اوپر گنبد نہیں ہیں بلکہ ایک مخروطی شکل ہے جو نیچے کی طرف موٹی ہے اور اوپر پتلی ہوتی گئی ہے۔ یہ شاید گلبرگہ کی آخری عمارت ہے جس میں اس طرز کی نقل کی گئی ہے جو شاید فیروز نے ایجاد کیا تھا۔[11]

اب ہم بہمنیوں کے نئے دارالسلطنت بیدر کی طرف چلتے ہیں اور احمد ؒ تعمیر کردہ شاہکار میں داخل ہوتے ہیں جو نل دمینتی کے رومان سے منسوب ایک قلعہ کی جگہ تعمیر ہوئی ہے اور پرانے قلعہ کے کارخانہ توپ سازی اور اس ذخیرہ آب کے پاس ہے جس سے محل میں پانی جاتا تھا۔

خود یہ قلعہ[12] یا اس کا بیشتر حصہ احمد شاہ کی ذہانت کی زندہ یادگار ہے اور اگرچہ بعد کے حکمرانوں

نے اس میں کئی اضافے کیے ہوں گے لیکن عمارت کا بیشتر حصہ قطعاً اسی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس کا وسیع احاطہ تین چوتھائی میل لمبا اور نصف میل چوڑا ہے[13] جس کے چاروں طرف ۴۵۰۰ گز لمبی دیوار ہے اور یہ بیدر کی سطح مرتفع کے کنارے تعمیر ہوا ہے جس کا مغربی رُخ یکایک سمندر سے ۲۳۲۰ فٹ بلند ہو گیا ہے۔ خندق ٹھوس چٹان سے کاٹ کر بنائی گئی ہے لیکن معماروں نے اس کے کئی حصے کر دیے ہیں جس سے ایک خندق کی بعض جگہ تین خندقیں ہو گئی ہیں اور ان کی حفاظت ایسے حصوں سے کی گئی ہے جو نیچے تہہ سے اُبھرے ہیں۔ بڑے بڑے بُرج جن کے نام کالا بُرج، کلیانی بُرج اور بڑی توپ کا بُرج ہیں، بہت وسیع ہیں۔

قلعہ میں ہم مشرق کی طرف سے نام نہاد شرزہ دروازہ سے داخل ہوتے ہیں جو اورنگ زیب کا تعمیر کردہ ہے اور نوبت دروازہ پر پہنچتے ہیں جس کی رنگین کھپروں سے آرائش کی گئی ہے۔ یہاں ہمیں ایک شاندار کتبہ خطِ ثلث میں ملتا ہے جو ۹۰۹ھ (۱۵۰۴ء) میں سلطان محمود شاہ بہمنی نے لکھا تھا اور اس کے گرد نوبت خانہ ہے۔ تیسرا پھاٹک گنبد دروازہ بہمنی طرز تعمیر کا پہلا ممتاز نمونہ ہے جو ہمیں ملتا ہے اس لیے کہ اس میں بلند محرابوں اور چپٹے گنبدوں کا آزادی سے استعمال ہے جو سابقہ تغلق روایات کی یادگار ہیں اور جن کا اوپری حصہ زمین کی سطح سے ۷۰ فٹ بلند ہے۔ یہ بالکل سادی عمارت ہے جس کا سب سے نمایاں پہلو بیرونی محراب کی اونچائی ہے۔ اب ہم ایسی عمارات کے پاس سے گذرتے ہیں جو بریدی عہد کی ہیں اور سولہ کھمبہ مسجد میں پہنچتے ہیں جو ۸۲۷ھ (۱۴۲۴ء) میں شہزادہ محمد کی زیر ہدایت اور قبلی سلطانی[14] کی نگرانی میں تعمیر ہوئی۔ اسے سولہ کھمبہ مسجد اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی چھت سولہ بھاری کھمبوں پر کھڑی ہے جن میں سے ہر ایک کا قطر ۱۴ فٹ ہے۔ اس مسجد سے متعلق دو دلچسپ باتیں ہیں، اوّل تو مسجد میں اور شاید محل میں پانی پہنچانے کے لیے ذخیرہ آب جو چھت کے اوپر ہے اور دوسرے اس مسجد کا خاکہ جو کم و بیش گلبرگہ کی بڑی جامع مسجد کے نمونہ کا ہے اگرچہ کمتر پیمانہ پر اور باوجود اتنے کھمبوں کے تقریباً ہر نمازی امام کو دیکھ سکتا ہے اور باوجود وسیع مسقف رقبہ کے ہوا کی کھلی آمد و رفت ہے[15]۔ دونوں مسجدوں میں فرق یہ ہے کہ اس میں ایک کھلے ہوئے چبوترے کا اضافہ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک عمارت ہے جسے پہلے ملکہ کا احاطہ سمجھا جاتا تھا اور جو بعد کو ۱۹۲۹ء میں سارے رقبہ کی کھدائی پر دربار ہال ثابت ہوا۔ اس سے آگے بڑھ کر دو چبوترے ہیں جن کے درمیان سے ایک چوڑی سڑک گذری ہے جو تخت محل اور دوسرے ملحقہ کمروں کو جاتی ہے۔ ان میں سے ایک چبوترہ ۱۰۶ فٹ لمبا ہے اور ۵۲ فٹ چوڑا۔ اس کے مقابل کا چبوترہ ۱۰۷ فٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا ہے۔ اوّل الذکر شاید ایوان بار خاص[16] یا دیوان خاص کی جگہ ہے اور

دوسرا ایوان بارِعام یا دیوان عام کی جگہ۔ چھوٹے چبوترے پر کرسیوں کی قطاریں ہیں جن پر چھت کو سہارا دینے کے لیے ستون تھے اور بڑے چبوترے کے مشرقی اور مغربی سمت میں چھوٹے چھوٹے ہال کے آثار ہیں جو شاید سلطان کے آرام کے کمرے تھے۔ بڑے چبوترے سے الگ بھی چھوٹے چھوٹے کمروں کے آثار ہیں جو شاید سلطان کے کپڑے بدلنے کے کمرے تھے۔

اب ہم تخت محل اور اس کے متصل محلات پر پہنچتے ہیں جو سب مل کر شاندار منظر پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب بیدر کے عادل شاہی گورنر کو معلوم ہوا کہ ان پر عنقریب اورنگ زیب کا قبضہ ہونے والا ہے تو اس نے ان محلات کو مغل فاتح کے حوالے کرنے کے بجائے بارود سے اڑا دیا، چنانچہ یہ بہمنی عمارات جو بڑی شاندار ہونگی اب محض کھنڈر ہیں۔ بعض عمارتوں میں صرف چبوترے باقی رہ گئے ہیں جو حال میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔ دوسری عمارتوں میں صرف دیواریں باقی رہ گئی ہیں جیسے تخت محل وغیرہ کی اور تیز غسل خانوں اور "ہزار کوٹھری" کی جو اب تک بہمنیوں کی شاندار سلطنت کی نشاندہی کرتی ہیں [۵۱]۔ تخت محل کے قریب ملبہ صاف کرنے پر بڑے بڑے بہت ہی وسیع ہال ملے، بعض ۷۰ فٹ لمبے اور ۳۵ فٹ چوڑے ہیں اور تہ خانے اور ہشت پہل کمرے جن کے زینے اب تک طرح طرح کے رنگین کھپروں سے مزین ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے زیادہ شاندار عمارت تخت محل ہے جس میں شاید کئی بہمنی حکمرانوں کی تخت نشینی ہوئی ہوگی جس کے مناظر مورخین نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ مسٹر غلام یزدانی جو کسی زمانہ میں حیدر آباد کے ناظم آثار قدیمہ تھے وہ اس محل کے متعلق لکھتے ہیں کہ "محرابیں اتنی بلند ہیں کہ بڑی شاندار معلوم ہوتی ہیں اور گلکاری کی خوبصورت کھپروں سے آرائش، جس کے پاسنگ میں منقش سیاہ رنگ کی دھاریاں ہیں جو بیش قیمت ہونے کے علاوہ اعلےٰ ترین مذاق سلیم کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کمروں کے اندرونی حصّوں کا نقشہ نہایت فنکارانہ ہے۔ عمارت کی بیرونی مربع شکل کو گوشوں پر نہایت خوشنما شکل کے طاقچے بنا کر ہشت پہل کر دیا گیا ہے۔ طاقچوں کو الگ کر کے کمرہ ۴۴ فٹ لمبا ہے۔ قلعہ اور گرد و پیش کی سرزمین کا منظر بڑا دلفریب ہے اور تخت محل کی تعمیر کے لیے ماہر تعمیرات کو اس سے بہتر موقع کی زمین نہیں مل سکتی تھی [۵۲]۔" محرابیں بہت بلند ہیں اور یہ ایرانی اثر کا کافی ثبوت ہے۔ نظم و نسق پر آفاقیوں کے اثر پر آئندہ سیاسی حالات کے باب میں مفصل بحث کی جائے گی لیکن مشرقی اور شمالی رو کار کے دونوں طرف جو دو ایرانی نشانات شیر اور اس کے پشت پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کے ہیں اُن سے زیادہ دکھن کے فن پر نمایاں ایرانی اثر کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا لیکن ان واضح ایرانی نقش و نگار میں بھی ہمیں ہندو اثر اس کے حاشیہ پر سنگ سیاہ کی بعض نقاشیوں اور محل کے کئی دروازوں کی

محرابوں کو سہارا دینے والے ہندو بازوؤں میں نظر آتا ہے جس سے اس امتزاج کا صاف پتہ چلتا ہے جو دکھن کے تمدن میں ہو رہا تھا۔ شاید اسی مخلوط طرز کی عمارت کی عظمت ہی نے ولی عہد کے اُستاد ایران کے شیخ اذری اصفہانی کو اتنا متاثر کیا کہ اُس نے حسب ذیل اشعار کہے :

جنداقصر مشید کہ بہ فرط عظمت — آسمان سدہ از پایۂ این درگاہ است

آسمان ہم نتواں گفت کہ حد ادب است — قصر سلطان جہان احمد بہمن شاہ است

یہ تو قلعہ کا حال تھا لیکن احمد اوّل کی ایک اور یادگار بھی ہے جس نے بیدر کو پچھتر سال تک ایک طرز کا نمونہ دیا اور وہ خود احمد شاہ کا مقبرہ ہے جو شہر بیدر کے باہر چند میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں مسمی اشتور میں واقع ہے اور کئی مقبروں کی قطار میں سب سے پہلا ہے اگرچہ فیروز کے انتقال کو بمشکل بارہ سال گذرے تھے مگر احمد شاہ کے مقبرہ اور فیروز کے مقبرہ میں نمایاں فرق ہے۔ احمد شاہ کے مقبرہ میں باہر سے دیکھنے پر دو نہیں بلکہ تین منزلیں معلوم ہوتی ہیں اور چاروں سمت داخلہ کے دروازوں پر جو محرابیں ہیں وہ فیروز کی نسبتہً چھوٹی محرابوں کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند اور شاندار ہیں۔ احمد کے مقبرہ کے استحکام کا تصور اس لیے اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے کہ اس کے کناروں کے گلدان بہت چھوٹے ہیں اور پُرانے تغلق طرز کے گنبد کے بجائے شاندار بیضوی گنبد ہے جو ایک بھاری چرخ پر رکھا ہے جس کا اوپری حصہ منقش ہے لیکن بیرونی حصہ سے زیادہ اندرونی حصہ کے نقش و نگار میں گلبرگہ کی عمارت کے طرز سے بہت فرق نظر آتا ہے۔ اس میں ہمیں نمایاں طور پر صوفی یا شیعہ اثر نظر آتا ہے۔ اندر کی آرایش کی نگرانی خوش نویس مغیث شیرازی نے کی تھی جو شاید خود شیعہ مذہب کا تھا اور جس نے پیغمبر اسلام اور چوتھے خلیفہ حضرت علی کا نام سیکڑوں طرز سے لکھا ہے اور شیعی درود[۱۹] بھی لکھ دیا ہے۔ مقبرہ میں داخل ہوتے ہی اس کی عظمت اور حزن کی کیفیت ذہن پر مسلط ہو جاتی ہے اور اس کی وسعت کا اثر کچھ اس طرح کا ہوتا ہے جیسے کمتر پیمانے پر استامبول کی مسجد کا۔ اس میں عربی خط کے ہر طرز کوفی، طغرا، نسخ وغیرہ کے نمونے ہیں اور شاید اندر کی تاریکی کے خیال سے کتبے سنہرے اور قرمزی رنگ کے ہیں اور ان کی بنیاد بھی شوخ رنگ کی ہے جس میں جابجا چمک دار جواہرات جڑے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان میں بعض بیش قیمت اصلی ہیرے ہیں۔ احمد شاہ کے مقبرہ کا اندرونی حصہ یقیناً قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی فن خطاطی کا شاہکار کہا جا سکتا ہے[۲۰]

پُرانے آنے والے اور نئے آنے والے

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نوواردوں[21] کا جو ممالک غیر سے آکر دکھن میں بس گئے تھے اُن کا لوگوں کے فن اور تعمیر اور عام زندگی پر کتنا بڑا اثر پڑا۔ اُن کی آمد کا سلسلہ کئی سال پہلے سے جاری تھا لیکن یہ پہلا موقعہ تھا کہ احمد نے خلف حسن کو (جس نے ایک طرح سے اس کی جان بچائی تھی اور تخت نشین کیا تھا) وکیل سلطنت یا وزیر اعظم کا عہدہ دیا اور اُسے ملک التجار کا خطاب دیا جو آگے چل کر دکھن میں ایک بہت بڑا خطاب ہو گیا۔[22] اس مدبّر تاجر نے جو بلند رتبہ حاصل کیا اُس سے اس کے سارے مخالفین میں سخت حسد پیدا ہو گیا جو آفاقیوں اور دکھنیوں کی باہمی رنجش کی ابتدا تھی اور جو بعد کو دکھنی حکومت کے خاتمہ کی باعث ہوئی۔ احمد نے اپنے "آفاقی" درباریوں کی وفاداری کا بار بار امتحان لیا خصوصاً اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں وجے نگر کی مہم کے دوران میں وہ دشمنوں میں گھر گیا تھا اور سلطان حسین بدخشی، میر علی سیستانی، عبداللہ کرد اور دوسرے نوواردوں کی حسن تدبیر اور جرأت کی وجہ سے بال بال بچ گیا تھا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ تین ہزار عراق، خراسان، ماورائے جیحوں، ترکی اور عرب کے تیر اندازوں کا ایک مخصوص شاہی فوجی دستہ بنایا جائے اور خواجہ حسن اردستانی کو شہزادوں کو تیر اندازی سکھانے پر مامور کیا۔ ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں ملک التجار کی ماتحتی میں کونکن کی مہم کی کامیابی پر بادشاہ نے خود اپنے شاہی توشہ خانے سے اُسے خلعت دیا اور نیز دوسرے ایسے تحفے دیے جو کبھی کسی بادشاہ نے اپنی رعایا کو نہیں دیے تھے۔[23] نوواردوں کے اس غیر معمولی عروج نے عناد کا جو جذبہ پیدا کیا اُس کا پہلا افسوسناک ردعمل بہت جلد ظاہر ہوا، یعنی ماہم پر گجرات کی مہم میں[24] کہا جاتا ہے کہ جب مہم ختم ہوئی تو پرانے آنے والوں کی جماعت وفد بنا کر ولی عہد کے پاس گئی جو بہمنی افواج کا کمان دار تھا اور اُس سے کہا کہ دراصل پسپائی کا فیصلہ انھوں نے نہیں بلکہ نوواردوں نے کیا تھا۔ اس کہنے کا شہزادے پر اثر ہوا اور دونوں جماعتوں میں اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک التجار کی فوج کو شکست ہو گئی اور اس کا بھائی خمیس بہت سے اور آدمیوں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔

نوواردوں کا اگلا ریلا شاید شاہ نعمت اللہ کرمانی کے لڑکے شاہ خلیل اللہ کی آمد سے شروع ہوا۔ بہمنی علم و فضل اور تقویٰ کے بڑے قدر دان تھے اور ان میں جو زیادہ ذی فہم تھے انھوں نے یہ کوشش کی کہ ایسے لوگوں کو دکھن بلایا جائے جنھوں نے اپنے فن میں نام وری حاصل کی۔ احمد خود علوم و فنون کی مہارت کے لیے مشہور تھا اور ہمیشہ اس کا افسوس کرتا تھا کہ حضرت گیسو دراز کے بعد دکھن میں کوئی ممتاز اہل علم نہیں

رہا۔[25] چنانچہ جب اس نے شاہ نعمت اللہ کے علم و فضل اور تقویٰ کا شہرہ سنا تو وہ انھیں دکھن میں بلانے کی فکر کرنے لگا اور شیخ حبیب اللہ جنیدی اور میر شمس الدین قمی کو بہت سے تحفوں کے ساتھ شاہ صاحب کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے قدم مبارک سے دکھن کو سرفراز کریں۔ شاہ صاحب نے اپنے بجائے اپنے ایک مرید قطب الدین کرمانی کو بیدر بھیج دیا اور ان کے ہاتھ بادشاہ کے لیے ایک بارہ گوشیہ تاج کا تحفہ بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ ملا صاحب جیسے ہی بادشاہ کے پاس پہنچے ویسے ہی وہ پکار اٹھا کہ فیروز سے جنگ کے دن اُس نے رات کو خواب میں انھیں حضرت کو دیکھا تھا جو ایسا ہی تاج ہاتھ میں لیے تھے۔[26] بادشاہ نے پھر ایک وفد خواجہ عماد الدین سمنانی اور سیف اللہ حسن آبادی پر مشتمل کرمان بھیجا اور شاہ نعمت اللہ سے استدعا کہ اگر وہ خود نہیں آسکتے تو اپنے ایک صاحبزادے کو بھیج دیں مگر اس دفعہ شاہ صاحب نے پھر معذرت کی کہ ان کے صرف ایک ہی لڑکا خلیل اللہ ہے جسے وہ اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتے اور اس کے بجائے انھوں نے اپنے پوتے شاہ نور اللہ کو بھیج دیا۔ اس مبارک پیام کو سُن کر احمد نے خود اپنی پالکی چاول بندرگاہ بھیجی اور سید محمد صدر اور میر ابوالقاسم جرجانی کو متعین کیا کہ وہ جہاز ہی پر شاہ صاحب کا استقبال کریں اور جب یہ جماعت بیدر پہنچی تو خود بادشاہ معزز مہمان کا استقبال کرنے رین تور تک گیا۔ جس مقام پر شاہ نور اللہ بادشاہ سے ملے اُس کا نام نعمت آباد رکھ دیا گیا اور شاہ نور اللہ کو ملک المشایخ کا خطاب دیا گیا اور ان کا رتبہ دکھن کے تمام مشایخ سے بشمول حضرت گیسو دراز کی اولاد کے جن کی بادشاہ بڑی عزت کرتا تھا بلند کر دیا گیا۔[27] بادشاہ نے اُن سے اپنی لڑکی کا عقد کرکے انھیں اپنے خاندان میں شامل کر لیا۔

۲۲ رجب ۸۳۴ھ (۵ مئی ۱۴۳۱ء) کو شاہ نعمت اللہ کے انتقال کے بعد اُن کا سارا خاندان بشمول شاہ حبیب اللہ عرف غازی کے بیدر منتقل ہو گیا اور شاہ حبیب اللہ کو بھی بادشاہ نے اپنا داماد بنا لیا۔ انھیں بیڑ کی جاگیر دی گئی اور شاہ محب اللہ کے ساتھ ولی عہد علاء الدین کی لڑکی کی شادی کر دی گئی۔[28] بادشاہ کو مشایخ و سادات پر اتنا اعتقاد ہو گیا کہ شاہ نعمت اللہ کی پہلی برسی پر جب مشایخ جمع ہوئے تو بادشاہ نے خود ان کے ہاتھ دھلائے۔

دو واقعات ایسے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد کو عراق سے آنے والوں کا بڑا لحاظ تھا اور شاید شیعہ عقیدہ کی طرف رجحان تھا۔ پہلی بات یہ ہے کہ اُس نے ضرورت مند سادات کربلا میں تقسیم کرنے کے لیے تیس ہزار چاندی کے ٹنکے بھیجے جس سے اُس کے شیعہ عقیدہ کے رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دکھن کے امرا میں سے ایک شخص مسمی شیر ملک نے جب سید نصیر الدین کربلائی کی توہین کی تو اُس نے شیر ملک کو پاگل ہاتھی کے پیروں سے کچلوا دیا اور اُس کے رتبہ کا بھی لحاظ نہ کیا۔[29] معلوم ہوتا ہے کہ اپنی

حکومت کے آخری دنوں میں اُس نے پُرانے آنے والوں یعنی "دکھنی" جماعت سے بالکل بے رُخی برتی اور اپنے ہمراہیوں میں سارے نووارد بھر لیے۔

تمدنوں کا امتزاج

نوواردوں کی آمد کی کثرت کا جو حال اوپر بیان ہوا ہے اُس سے شاید یہ خیال ہو کہ بہمنی سلطنت میں ہندو اثر کا نام ونشان بھی نہیں باقی رہا تھا، مگر یہ حقیقت سے بہت دُور ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ فیروز نے دکھن میں ایک مخلوط کلچر پیدا کرنے کی کوششیں کیں اور یہ کوششیں احمد نے بھی جاری رکھیں۔ اس اثر کی ایک مثال وہ رسوم ہیں جو بادشاہ کے سالانہ عرس کے موقع پر آج تک برتی جاتی ہیں۔ پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ عرس ہجری حساب سے نہیں منعقد ہوتا ہے بلکہ ہندو جنتری کے حساب سے، یعنی اس قمری مہینے کی بیس تاریخ کو جس میں ہولی کا تیوہار ہوتا ہے اور یہی تاریخ ہے جس پر عرس کی متعلقہ تقریبات شروع ہوتی ہیں لیکن یہ جنگم موضع مدھیال (ضلع گلبرگہ) کے موروثی پولیس پٹیل کی اولاد اور لنگایت ذات کے ہیں جو شیوی عقیدہ کے ہیں اور تقریباً تین سو آدمیوں اور متعدد اونٹوں اور گھوڑوں کے ساتھ بیدر آتے ہیں۔ یہی جنگم ہیں جو عرس کے زمانہ میں روزانہ راگ باجے کے ساتھ شاہانہ شان سے سنکھ بجاتے ہوئے مقبرہ کی عمارت میں داخل ہوتے ہیں اور ہندو مذہبی رسم کے مطابق ناریل توڑتے ہیں اور مزار پر پھول چڑھاتے ہیں لیکن ان کا لباس بالکل راسخ رسم میں ہزاروں ہندو مسلمان شریک ہوتے ہیں جو احمد کو ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوادیر وذات کے بعض خاندانوں کے پاس اشتور میں زمینیں ہیں جو ہر روز مزار پر حاضری کے لیے اپنے نمایندے بھیجتے ہیں۔[30]

احمد خود تخلیقی مزاج کا آدمی تھا اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے توپ خانہ کی ترکیب اور ساخت میں کئی ایجادیں کیں[31] اسلحہ جنگ کی تیاری کے لیے بیدر بہت بڑی جگہ رہی ہوگی اور شہر میں اب تک ایک محلہ لوہے پر پالش کرنے والوں کے نام سے موجود ہے جہاں تلواروں اور خنجروں پر پالش کی جاتی ہوگی۔ بیدر کے عام لوگوں کو بھی مردانہ ورزشوں پر توجہ دلائی جاتی تھی اور آج بھی جو کچھ بیدر میں رہ گیا ہے وہ چار بڑے فوجی اور ورزشی کھیلوں کی تربیت گاہوں میں منقسم ہے اگرچہ پہلی سی شان برائے نام رہ گئی ہے۔[32]

ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ وجے نگر کی فنِ تعمیر پر کس حد تک بہمنی اثر ہوا لیکن شاید اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات ہے کہ ۲۶ر جون ۱۴۲۴ء کی لکھی ہوئی ایک تانبے کی تختی میں وجے نگر کے دیورائے دوم کو "سورت رتن" یعنی سلطان کہا گیا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۴۳۰ء میں وجے نگر کے رسالہ میں دس ہزار مسلمان تھے اور

یہ کہ دیورائے کے مصاحبوں میں ایک مسلمان مسمی احمد خاں تھا۔[۳۴] ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شاہ کے عہد میں تفریق فرقہ وارانہ بنیاد پر بالکل نہ رہی ہوگی۔

زندگی کے اس پہلو کا اظہار اس ہدایت سے بھی ہوتا ہے جو بادشاہ نے اپنی حکومت کے آخری دنوں میں اپنے بڑے لڑکے کو ولی عہد مقرر کرتے وقت دی اور سلطنت کے صوبوں کا چارج اپنے دوسرے لڑکوں کو دیا۔ اُن سے قسم لے کر یہ اقرار لیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف نہ ہوں گے اور اس کے ماسوا انھیں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی رعایا کے حسب ذیل طبقوں سے حسن سلوک کریں گے یعنی (۱) علمائے جو دینوی اور دینی اسرار سے واقف ہیں (۲) سلطنت کے ملازم جن کے اختیار میں لوگوں سے سلوک کرنا ہے (۳) مشیران شاہی سے اس لیے کہ یہی حکومت کی پالیسی کا تعین کرتے ہیں اور (۴) کاشتکار و مزارع سے اس لیے کہ یہی خاص و عام کو خوراک بہم پہنچاتے ہیں۔

(ب) سیاسی حالات

مصالحانہ پالیسی

۳ر شوال ۸۲۵ھ (۲۰ر ستمبر ۱۴۲۲ء) کو تخت نشین ہوتے ہی نئے سلطان نے اس ناچاقی کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش شروع کر دی جن سے وہ تخت حکومت پر پہنچا تھا جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اُس نے خلف حسن بصری کو جس نے اس کی جان بچائی تھی ملک التجار اور سلطنت کا وزیر اعظم بنا دیا اور اسی کے ساتھ اُس نے اپنے مخالفین کی طرف بھی مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور عین الملک ہوشیار اور نظام الملک بیدار پر دست شفقت رکھا اور انھیں علی الترتیب امیر الامرا اور سرلشکر دولت آباد کے عہدے دیئے۔ رواداری کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اُس نے اپنے بھتیجے حسن کو جو اس کا دشمن ہو سکتا تھا ..د کا منصب دے دیا اور ایک جاگیر دی جس کا مستقر اس کے والد کے دارالسلطنت فیروز آباد میں تھا۔ حسن خاں کی نقل و حرکت پر صرف یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ محل سے چار کروہ یا سات سے زیادہ فاصلہ پر نہ جائے۔ وہ عیش و عشرت بلکہ عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگا اور اپنے چچا کی زندگی کے آخری دنوں تک زندہ رہا۔ کہتے ہیں کہ احمد کے جانشین علاء الدین احمد دوم نے اس کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور اس کے بعد پھر اُس کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے[۳۵]۔

معلوم ہوتا ہے کہ احمد نے منصب داری کے طریقے کو منظم کر دیا اور سرلشکر کو ۲۰۰۰ کا منصب دیا۔

امیر الامرا کو ۱۵۰۰، وکیل کو ۱۴۰۰ کا اور دوسرے امرا کو ۱۰۰ سے ۱۰۰۰ تک کے مناصب دیئے۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ جن لوگوں کا منصب ۱۰۰۰ سے اوپر ہو وہ اپنا علم نقارہ اور گلوبند استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔[35] سرلشکر اور امیر الامرا کا نقدی منصب وزیر اعظم سے زیادہ ہونے کی یہ وجہ تھی کہ اول الذکر دونوں فوجی کمانڈر تھے اور اگرچہ فوج کے اخراجات کے لیے ان کے پاس جاگیریں تھیں مگر انھیں منصب کی رقم سے اپنی حیثیت اور وقار کو برقرار رکھنا پڑتا تھا۔

وجے نگر اور تلنگانہ

احمد نے اپنی تخت نشینی کے جلد ہی بعد وجے نگر سے چھیڑ شروع کر دی اس لیے کہ ۱۴۲۲ء میں فیروز اور وجے نگر کے دیو رائے دونوں کے انتقال کی وجہ سے بعض معاملات غیر منفصل رہ گئے تھے۔ اپنے مرحوم بھائی کی حکومت کے آخری دنوں میں جو کھلی شکست ہوئی تھی اس کی کسک احمد نے محسوس کی اور تخت نشین ہونے کے جلد ہی بعد چالیس ہزار سواروں کی زبردست فوج لے کر جنوب کی طرف روانہ ہوا۔[36] بکّا نے جو اس وقت حکمران تھا شاید اپنے لڑکے دیو رایا کی شرکت میں جو بالآخر ۱۴۲۴-۲۵ء میں اس کا جانشین ہوا بجا طور پر محسوس کیا کہ اس میں تنہا مقابلہ کرنے کی بالکل سکت نہیں ہے چنانچہ اس نے تلنگانہ کے اناپوتا ویلاما کے پاس مدد کے لیے پیام بھیجا جس پر اناپوتا نے شاید لنگا کے کمان میں ایک فوج اپنے جنوبی ہمسایہ کی مدد کے لیے روانہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ ویلاما کی فوج نے تورگل بدامی اور ایت گیر کے مقامات پر بہمنی فوج کو شکست دے دی۔[37] بہمنی اور وجے نگر کی فوجوں کا مقابلہ تنگ بھدرا کے کنارے ہوا اور اگرچہ وجے نگر والوں کے پاس پیادہ فوج توپ خانہ اور تیر اندازوں کی تقریباً دو لاکھ فوج تھی مگر انھوں نے چھاپہ مار جنگ کا فیصلہ کیا اور روز رات کے وقت بہمنی کیمپ پر حملہ کر کے بہت سے آدمی اور گھوڑے مار ڈالتے۔ احمد جب انتظار کرتے کرتے بالکل زچ ہو گیا تو اس نے ۲۰۰۰ توپ گاڑیاں لے کر اس خیال سے دریا کو عبور کیا کہ دشمن کو باضابطہ جنگ پر مجبور کرے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وجے نگر کی فوج اور پیچھے ہٹ گئی اور اپنا علاقہ احمد کی فوج کو تاراج کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بہمنی کیمپ میں جنگ کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی اور یہ طے کیا گیا کہ پوری فوج کے ساتھ تنگ بھدرا کو عبور کیا جائے۔ ویلاما سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوئے اور تلنگانہ واپس چلے گئے۔ اب ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جب عالم خاں، لودی خاں اور دلاور خاں نے ۱۰۰۰ فوج کے ساتھ تنگ بھدرا کو عبور کیا تو انھیں راے ملا جو ایک ایکھ کے کھیت کے کنارے سو رہا تھا۔ اُس نے جب بہمنی فوج کو بے پروائی

کے ساتھ کھیت سے گذرتے دیکھا تو اتنا خوف زدہ ہوا کہ جب ان کا سامنا ہوا تو خود کو محض رکھوالا بتایا اور فوج کے حکم پر ایک گٹھا ایکھ کا بھی انھیں پہنچا دیا اور دیوتاؤں کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اسے پہچانا نہیں۔ اس اثنا میں وجے نگر کیمپ میں یہ افواہ اڑی کہ احمد شاہ نے دریا کو عبور کر لیا اور رائے لاپتہ ہو گیا۔ چنانچہ وجے نگر کی فوج کی شکستہ دلی سے فائدہ اٹھا کر سلطان کی فوج نے جی کھول کر مار کاٹ کی۔ بکّا کو جیسے ہی موقع ملا وہ بھاگ کر اپنے عملہ سے مل گیا اور تیزی کے ساتھ دار السلطنت پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا۔ بہمنی فوج نے انتظار کرتے کرتے تھک کر بہت سی زیادتیاں کیں اور نیک شگون کے لیے چار بت حضرت گیسو دراز کے مقبرے کے سامنے رکھنے کے لیے بھیجے۔[۳۸]

اب سلطان کی باری آئی کہ بے خبری میں گھر جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی نوروز کے دن سلطان بطور تفریح کے ایک جھیل کے کنارے نیل کا شکار کھیلنے خیمہ زن ہوا اور اصل کیمپ سے آٹھ میل زیادہ دور چلا گیا جب کہ اُسے بے خبری میں دشمن کے پانچ یا چھ ہزار رسالہ نے گھیر لیا اور اُسے ایک کھیت میں کاشت کاروں کی بنائی ہوئی نئی غلہ کی کھتی کی طرف بے تحاشہ بھاگنا پڑا لیکن قبل ازیں کہ وہ کھتی کی دیوار تک پہنچے دشمن نے اس کے ہمراہیوں کو جا لیا اور لڑائی میں سلطان کے دو سو ہمراہی مارے گئے اور وہ خود بڑی مشکل سے احاطہ کی دیوار پر چڑھ سکا۔ اس روز جو سلطان کی زندگی کا سب سے زیادہ تشویش ناک دن تھا۔ اس کے بعض ہمراہیوں نے جن میں سید حسین بدخشی، میر فرخ بدخشی، میر علی سیستانی، میر علی کرد، عبید اللہ کابلی خسرو ازبک، خواجہ حسن اردستانی اور قاسم بیگ صف شکن کے نام لیے گئے ہیں غیر معمولی جرأت کا اظہار کیا۔ ہندوؤں نے جن کی تعداد کم و بیش بدستور تھی احاطہ کی دیوار گرانے کی کوشش کی لیکن اس اثنا میں بادشاہ کے غائب ہونے کی وجہ سے شاہی کیمپ میں کھلبلی مچ گئی اور فوج کے ایک اعلےٰ افسر عبد القادر نے خاصہ خیل یا سلطان کے باڈی گارڈ کے دو یا تین ہزار آدمی جمع کیے اور کھتی کی طرف گئے جس کی دیوار کا کچھ حصہ دشمن کے آدمی گرا چکے تھے۔ لڑائی میں بہمنی سپاہیوں کو غلبہ ہوا اور اس طرح سلطان کی جان بچ گئی جب کہ اور سب کچھ کھو چکا تھا۔[۳۹]

نوواردوں کے لیے یہ عظیم دن تھا اس لیے کہ جیسا ظاہر ہوگا جن لوگوں نے احمد شاہ کو دشمن کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ قتل ہونے سے بچایا تھا وہ سب کے سب اسی جماعت کے تھے۔ سلطان نے وہیں عبد القادر کو برادر جان بخش کہا اور خان خاناں کا خطاب دے کر برار کا سرِ لشکر اور ۲۰۰۰ کا منصب دار بنا دیا۔[۴۰] اس کے بھائی عبد اللطیف نے بھی سلطان کی جان بچانے میں بڑی بہادری سے جنگ کی تھی اُسے خانِ اعظم کا خطاب دے کر تلنگانہ کا سرِ لشکر بنایا گیا۔ دوسرے کئی نوواردوں جیسے سید حسین بدخشی اور میر علی

سیستانی کو تین تین سو کے منصب دیے گئے، قاسم بیگ صف شکن کو ۵۰۰ کا منصب دار بنایا گیا اور کلہری کی جاگیر دی گئی، خواجہ بیگ کو قلندر خاں کا خطاب دے کر گلبرگہ کا داروغہ بنایا گیا، میر علی کرد کو ہزاری کیا گیا اور خواجہ حسن اردستانی اور خسرو بیگ ازبک کو ولی عہد سلطنت کو تیر اندازی سکھلانے پر مامور کیا گیا اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ خلف حسن ملک التجار کو حکم دیا گیا کہ وہ شاہی فوج کے لیے تین سو تیر انداز عراق، خراسان، ماورائے جیحوں کے علاقوں اور ایشائے کوچک اور عرب سے بھرتی کرے۔

اس طرح بال بال بچنے کے بعد بادشاہ نے خود وجے نگر پر چڑھائی کی اور رائے کو پیام بھیجا کہ صلح کی شرط یہ ہے کہ رائے خراج کا کل بقایا اپنے فیل خانے کے ہاتھیوں پر لاد کر بھیجے اور یہ بادشاہ کے کیمپ تک آگے آگے باجہ بجاتے ہوئے آئیں اور جلوس کے آگے وجے نگر کا ولی عہد ہو۔ اس کی فوراً تعمیل کی گئی اور جب جلوس بادشاہ کے کیمپ پہنچا تو بہمنی امرا نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے اسی وقت وجے نگر کے ولی عہد کو شاہی خلعت پہنائی اور عرب اور ترکی گھوڑے اور ہاتھی، شکاری کتے اور تین شکرے تحفۃً دیے۔ ان رسوم کے بعد بادشاہ کرشنا ندی کی طرف واپس ہوا اور وہاں وجے نگر کے ولی عہد کو رخصت کیا[۱۵]

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مہم کے آغاز میں ویلا ماون نے احمد شاہ کے خلاف وجے نگر کے رائے کا ساتھ دیا تھا۔ شروع ۱۴۲۳ء میں بکا کا انتقال ہو گیا اور دیو رائے دوم اس کا جانشین ہوا[۲۲] مگر اس سے احمد کے منصوبوں میں کوئی فرق نہیں آیا اس لیے کہ وہ ویلا ماون کو سزا دینا چاہتا تھا چنانچہ ۸۲۸ھ (۱۴۲۵ء) میں اس نے تلنگانہ پر چڑھائی کی اور راستہ میں کچھ دن گولکنڈہ میں ٹھہرا جہاں اس نے ایک ماہ بیس دن قیام کیا اور خان اعظم عبداللطیف خاں کو بطور ہراول تلنگانہ روانہ کیا جہاں اس کی اناپوتا دوم سے لڑائی ہوئی اور اناپوتا میدان جنگ میں مارا گیا۔ اب سلطان فاتحانہ ورنگل میں داخل ہوا اور خان اعظم کو مامور کیا کہ وہ سارے تلنگانہ کی تسخیر کرے جسے اس نے چند ماہ میں انجام دیا۔ حصول مقصد کے بعد بادشاہ دارالسلطنت کو واپس ہوا اور خان اعظم کو تلنگانہ کے گورنر کے طور پر چھوڑ دیا[۲۳]

ماہور کی مہمات

جنوب اور مشرق کی سخت مہموں کے بعد سلطان نے زیادہ آرام نہیں کیا اور ۸۲۹ھ (۱۴۲۶ء) میں پھر جلد ہی گھوڑے پر سوار ہو کر ماہور کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گیا جو کچھ دنوں سے ایک مقامی رئیس کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ ماہور کی مہم یا سلسلہ مہمات کا جو حال ہمارے مورخوں نے لکھا ہے وہ کچھ مبہم سا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو کئی بار ماہور کے خلاف جنگ کرنی پڑی۔ پہلی مہم میں جیسے ہی بادشاہ اس ملک کے قریب پہنچا، ماہور والے جنگل میں بھاگ کر پوشیدہ مقامات یا پہاڑ کی چوٹیوں پر چلے گئے اور بظاہر وہاں سے چھاپہ مار جنگ جاری رکھی۔ سلطان کو شکست ہوگئی اور اس نے ملک کو تاراج کر دیا اور گونڈوانہ کے رئیس کے علاقے میں ہیرے کی کان تک پہنچ گیا جو گونڈوانہ کی ملکیت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جزوی طور پر مقصد حاصل کر کے سلطان ایلچ پور چلا گیا اور وہاں پورے سال بھر قیام کیا اور اس اثنا میں گاول پر قبضہ کیا اور نرنالہ کے قلعہ کی مرمت کی۔ اگلے سال سنہ ۸۳۰ھ (۱۴۲۷ء) میں سلطان نے پھر ماہور پر چڑھائی کی جو پورے طور پر تسخیر نہیں ہوا تھا لیکن اب بھی اسے کامیابی نہ ہوئی اور اسے دار السلطنت واپس آنا پڑا۔ تیسری مرتبہ جا کر ماہور پر حملہ کامیاب ہوا اور اس مشکل سے حاصل کی ہوئی کامیابی کے سلسلہ میں سلطان کلم تک بڑھتا چلا گیا اور پہلے ہی دھاوے میں قلعے کو تسخیر کر لیا۔ اس مہم میں اس نے خاص طور پر بڑی سختی کی اور رئیس کو فوراً قتل کر دیا اور لوگوں سے بھی بالکل رحم کا برتاؤ نہ کیا۔[44]

مالوہ

احمد کی یہ خواہش تھی کہ اُس کی آمد و رفت کا راستہ صاف ہو جائے اور پشت کی طرف کی حفاظت ہو جائے اس لیے کہ اب وہ خاندیش، مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر کے جن کو تیمور نے اس کے بھائی فیروز کو دیا تھا، وجے نگر پر آخری حملہ کرے۔ بیدر کا پہلا بہمنی حکمران ہونے کی وجہ سے وہ اپنے جدا علیٰ بہمن شاہ گلبرگہ کے پہلے حکمران کے حوصلوں کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ٹھیک اندازہ کیا کہ کھیرلا کی ریاست مالوہ اور دکھن کے درمیان موقع کی جگہ ہے اور اس کے رئیس نرسنگھ نے شاید مالوہ کے ہوشنگ کے خوف سے سلطان کو تحفے اور قلعہ کی چابیاں بھیجی تھیں اور اُس سے استدعا کی تھی کہ وہ کھیرلا کو بہمنی سلطنت کی حفاظت میں لے لے۔ احمد شاہ نے برار کے گورنر خان جہان عبد القادر کو فرمان بھیجا کہ وہ فوراً صوبہ کی فوجوں کو لے کر نرسنگھ کی مدد کے لیے پہنچ جائے اور سلطان خود سنہ ۸۳۲ھ (۱۴۲۹ء) میں ۵۰۰۰ رسالہ فوج لے کر ایلچ پور کو روانہ ہو گیا اور وہاں سے کھیرلا پہنچ گیا۔ اب یہ افواہ اڑی کہ نرسنگھ باغی ہو گیا اور اپنی قسم توڑ کر ہوشنگ سے مل گیا[45] جسے بہمنی سلطان کے ارادوں کا کچھ سراغ لگ گیا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ نرسنگھ مالوہ کے حکمران کو اس کی کھیرلا کو روانگی کے دوران میں روزانہ ایک لاکھ ٹنکہ دے گا۔ ہوشنگ ۲۰۰۰۰ کی زبردست فوج کے ساتھ تیزی سے دھاوا کرتا ہوا کھیرلا پہنچ گیا۔[46] احمد کے ساتھ بہ مشکل اس کی نصف فوج تھی اس لیے وہ بہمنی سلطنت کے حدود میں واپس آ گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ ہوشنگ کے سامنے ہوتے

ہیں - یا تو وہ مالوہ واپس جائے اور یا دکھن پر حملہ کردے - اُس نے آخرالذکر صورت کو اپنے لیے زیادہ بہتر سمجھا اس لیے کہ وہ اس وقت خود اپنے ملک کی حفاظت بہتر کرسکے گا - امرا اور فوجی افسروں کی خواہش تھی کہ وہ مالوہ کی فوج سے فوراً نپٹ لیں لیکن ملا عبدالغنی اور مفتی صدرالدین جیسے لوگوں نے احتجاج کیا کہ جہاں تک ممکن ہو اُسے مسلمان کے خلاف جنگ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے - احمد شاہ نے ہوشنگ کو پیغام بھیجا کہ وہ واپس جانے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ خود ہوشنگ بھی اپنے ملک کو واپس چلا جائے اس لیے کہ دو مسلمان ملکوں میں ایک دوسرے کا خون بہانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے - جواب کا انتظار کیے بغیر احمد شاہ نے اپنا کیمپ اکھاڑ دیا اور واپس ہو گیا - مالوہ کی فوج نے تعاقب کیا اور اپنا کیمپ ٹھیک اُسی جگہ لگایا جہاں سے احمد شاہ چلا گیا تھا -

اس نازک موقع پر بادشاہ نے جرأت کے ساتھ اپنے عمل سے حجت کی اور اپنی پسپائی کو حق بجانب ثابت کیا اور کہا کہ پہلے شاید وہ خود غلطی پر تھا لیکن اب دشمن نے اس کے ملک پر حملہ کیا ہے جس کی مدافعت اس کا فرض ہے - اس کے بعد جو لڑائی ہوئی اس میں بادشاہ نے میمنہ پر خان جہان عبدالقادر کو متعین کیا اور میسرہ پر اسماعیل مُخ کے پوتے عبداللہ کو اور قلب پر ولی عہد علاءالدین کو - دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں، تیر و تبر ہوا میں اُڑنے لگے اور سارے دن دست بدست لڑائی ہوتی رہی اور دونوں طرف ہولناک خون ریزی ہوئی - سہ پہر کے وقت سلطان سربسجود ہو گیا اور اللہ تعالےٰ سے فتح کی دعا مانگی جس کے بعد وہ .... ا پورے طور پر مسلح رسالے اور ۱۲ ہاتھیوں کے ساتھ مالوہ کی فوج پر ٹوٹ پڑا - رات ہوتے ہوتے مالوہ کی فوج کی مکمل شکست ہو گئی اور وہ ... ۲ مقتولین کو میدان میں چھوڑ کر پسپا ہو گئی - خود مالوہ کا حکمران اپنے ملک کی طرف اس عجلت سے بھاگا کہ اپنے لڑکے لڑکیوں اور عورتوں کو پیچھے چھوڑ گیا - احمد نے اب اپنے کو زیردستوں کا حامی ثابت کیا اور مالوہ کے شہزادے شہزادیوں کو قیمتی تحفے دیے اور انھیں سب عورتوں کے ساتھ پوری حفاظت کے ساتھ سرحد کی طرف بھیج دیا۔[۴۴]

نرسنگھ اب بادشاہ سے معافی کا خواستگار ہوا اور بادشاہ نے اس کے محل جانے کی دعوت قبول کی جہاں سب کی شاہانہ طمطراق سے ضیافت ہوئی - بادشاہ نے کھرلا کے بہمنی زیرِ حفاظت ہونے کا اعلان کردیا اور نرسنگھ کو اعزاز دیا جو ماہور تک بادشاہ کے ساتھ آیا اور یہی اب دکھن کی شمالی سرحد قرار پائی - احمد شاہ نے اپنے منجھلے لڑکے محمود خاں کو اس علاقے کا گورنر مقرر کیا جہاں وہ اپنی زندگی بھر ماہور رہا۔[۴۵]

شہزادہ علاء الدین کی شادی

اب چونکہ مالوہ اور گجرات دونوں سے دشمنی تھی اس لیے قدرتاً احمد شاہ نے خاندیش کے حکمران ناصر خاں فاروقی سے اتحاد کا خیال کیا خصوصاً یہ دیکھ کر کہ فاروقی ہمیشہ گجرات کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف رہتا تھا چنانچہ اسی زمانہ میں اس نے عزیز خاں کو خاندیش بھیجا اور فاروقی کی لڑکی آغا زینت کے لیے ولی عہد سلطنت کا پیغام دیا۔ یہ لڑکی شادی کے لیے بیدر بھیجی گئی اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے دارالسلطنت میں کئی ہفتے تک جشن منایا گیا۔ شادی منجموں کی بتائی ہوئی ٹھیک نیک ساعت پر ہوئی اور تقریب کے اختتام پر بادشاہ نے قیمتی ریشمی لباس، موتی، زیورات شادی میں شریک ہونے والوں کو تقسیم کیے۔[49]

کونکن اور گجرات

سنہ ۸۳۰ھ (۲۷-۱۴۲۶ء) کے آخر میں سلطان نے ملک التجار خلف حسن بصری کو ۲۰۰۰ کا منصب دار بنا دیا اور اُسے دولت آباد کا گورنر مقرر کیا اور یہ حکم دیا کہ کونکن کے علاقہ کو ڈاکوؤں اور باغیوں سے صاف کر دیا جائے اور جو رئیس اپنے حدِ اختیار سے باہر عمل کرتے ہیں ان کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس مہم میں نئے گورنر کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور اُس نے مالِ غنیمت سے لدے ہوئے کئی ہاتھی دارالسلطنت روانہ کیے اور کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خلف حسن کی بیدر واپسی پر اُس کی بڑی عزت کی گئی جو پرانے آنے والوں کو سخت ناگوار ہوئی اس لیے کہ وہ خلف حسن سے راضی نہ تھے۔ اب گجرات کے ایک ممتاز ترین حکمران احمد اوّل اور مالوہ کے ہوشنگ شاہ میں کچھ جھگڑا ہو گیا اس لیے کہ احمد نے جھالور کے راجہ کنہا کا تعاقب کیا تھا جس نے ۸۳۳ھ (۱۴۳۰ء) میں ہوشنگ کے یہاں پناہ لی تھی۔ اس پر شہاب الدین احمد نے راجہ کی مدد کے لیے بہمنی فوج بھیجی جو نند دربار اور سلطان پور تک بڑھتی چلی گئی اور راستہ میں ہر چیز کو تاراج کرتی گئی اس پر گجرات کے احمد شاہ نے سپہ سالار مقرب الملک، افتخار الملک، سید ابوالقاسم اور سید عالم کو ولی عہد شہزادہ محمد کی قیادت میں نند دربار روانہ کیا جہاں دکھن کی فوجوں کو شکست ہو گئی اور شہاب الدین کو دولت آباد پسپا ہونا پڑا۔ اس اُفتاد کی خبر سن کر بہمنی سلطان نے ولی عہد شہزادہ علاء الدین کو روانہ کیا جس سے دولت آباد میں ناصر خاں فاروقی اور راجہ جھالور مل گئے۔ "مانک دوہ" پر گجرات کی فوج سے پھر ایک لڑائی ہوئی جس میں پھر دکھن کی فوج کو شکست

ہوئی۔ شہاب الدین احمد کو سخت رنج ہوا اور وہ اس نقصان کی تلافی کرنے والا ہی تھا کہ یہ خبر آئی کہ گجرات کی طرف سے مہایم کا جو گورنر رائے قطب تھا اس کا انتقال ہو گیا اور شہاب الدین احمد نے ملک التجار خلف حسن کو جو کونکن کی مہم میں مصروف تھا حکم دیا کہ وہ اس جزیرہ پر قبضہ کرلے۔

یہ سن کر گجرات کے حکمران نے خلف حسن کے خلاف افتخار الملک کے ساتھ اپنے لڑکے ظفر خاں کو روانہ کیا جو کئی لڑائیوں میں ناموری حاصل کر چکا تھا اور ڈیو کے کوتوال مخلص الملک کو حکم دیا کہ وہ کونکن کی طرف جائے چنانچہ وہ ویراول، گھوگھا، کھمبیات اور ڈیو کے ۱۷ جہازوں کا بیڑا لے کر پہنچ گیا اور اس نے مہایم کی طرف پیش قدمی کی جہاں بہمنی اور گجراتی فوجوں میں جنگ ہوئی جو دن بھر جاری رہی جس کے آخر میں خلف حسن کو ملحقہ جزیرہ بمبئی کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ اس نے دار السلطنت کو مدد کے لیے ہنگامی پیام بھیجا جس پر شہاب الدین احمد نے فوراً ..... اکی فوج شہزادہ محمد کے زیر کمان ۶۰ ہاتھیوں کے ساتھ مغرب کی طرف روانہ کردی جو بہت جلد اپنے بڑے بھائی ولی عہد علاء الدین کے ساتھ مل گیا۔ بدقسمتی سے علاء الدین بیمار ہو گیا اور اسے مقام جنگ سے چند دن کی منزل کے فاصلہ تک جانا پڑا۔ یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ آفاقیوں کے فوری عروج پر پرانے آنے والوں کے دلوں میں سخت حسد پیدا ہو گیا تھا اور عین اس وقت جب کہ دکھنی اور گجراتی فوجیں میدان جنگ میں فیصلہ کی تیاری کر رہی تھیں پرانے آنے والے وفد بنا کر شہزادے کے پاس پہنچے اور نو واردوں کے خلاف اس کے کان بھر دیے[۵۵]۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ طے کرلیا کہ وہ لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیں گے اور خلف حسن کو معلق چھوڑ دیں گے۔ گجراتیوں کو شاید بہمنیوں کی صف میں پھوٹ کی خبر ہو گئی اور موقع پا کر وہ بہمنی فوجوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں کاٹ کر ڈال دیا۔ انھوں نے ملک التجار کے بھائی خمیس بن حسن کو گرفتار کرلیا اور شکست خوردہ بہمنی فوج جو سامان چھوڑ گئی تھی اس میں سے بکثرت مال غنیمت گھوڑے، ہاتھی اور دوسرا بیش قیمت سامان لے گئے[۵۶]۔

اس سنگین حادثہ کی خبر سن کر بہمنی سلطان نے جس قدر بھی فوجیں مل سکیں محمد آباد بیدر میں جمع کیں اور بذات خود گجرات کی سرحد کی طرف روانہ ہو گیا اور بلیسول یا بیول کی سرحد پر خیمہ زن ہو گیا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ بیول کے ہندو رئیس نے گجرات کے حکمران کے پاس مدد کے لیے پیام بھیجا کہ اگر وہ جنوب سے آنے والے ناخواندہ مہمانوں سے نجات دلادے تو آئندہ سے وہ برابر خراج دیتا رہے گا۔ اس پیام کو سن کر گجرات کا حکمران بہت بڑی فوج لے کر اس طرف روانہ ہو گیا۔ گجراتی فوجوں کے بیول پہنچنے پر بہمنی سلطان کچھ اور پیچھے ہٹ گیا۔ گجرات کی فوجوں نے تعاقب کیا اور دونوں فوجیں تاپتی[۵۷] کے دونوں کناروں پر خیمہ زن ہوگئیں اور دونوں حکمرانوں میں سے کسی نے اپنی فوجوں کو دریا پار کر کے پوری قوت سے دشمن کا مقابلہ کرنے کی اجازت

نہ دی اگرچہ شاید کچھ جھڑپیں ہوتی رہیں۔ دونوں فریقوں نے علما سے مشورہ کیا جو شاید فوج کے ساتھ تھے کہ مزید خونریزی کو روکنے کے لیے کیا تدبیر کی جائے اور بالآخر بیول میں فریقین کے مابین معاہدہ لکھا گیا جس کے ماتحت بیول گجرات کو واپس دے دیا گیا اور باقی معاملات بدستور سابق رکھے گئے۔ بیول کے استثنا کے باوجود یہ معاہدہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ گجرات اور دکھن کے دونوں حکمرانوں نے ایک صدی تک اس کی پابندی کی اور جب تک بہمنی حکمرانوں کا موثر اقتدار ان کے گورنروں اور ماتحتوں پر سے بالکل ختم نہیں ہوگیا اس وقت تک یہ قائم رہا۔

مالوہ کی دُوسری مہم

احمد شاہ کو مالوہ کے ہوشنگ سے ایک بار پھر لڑنا پڑا۔ ہوشنگ نے جب دیکھا کہ بہمنی سلطان گجرات کی طرف مشغول ہے اور کچھ کمزوری ظاہر کر رہا ہے تو اُس نے ۸۳۷ھ (۱۴۳۴ء) میں دکھن کے حلیف کھیرلا کے نرسنگھ پر چڑھائی کر دی اور اُسے مار دیا۔ احمد فوراً اپنے کٹر دشمن سے لڑنے شمال کی طرف روانہ ہوگیا لیکن اس کا خویش خاندیش کا ناصر خاں بیچ میں پڑ گیا اور اپنے اثر کو استعمال کر کے دونوں کے درمیان معاہدہ کرا دیا جس کے ماتحت یہ طے ہوا کہ برار دکھن کے پاس رہے اور کھیرلا کو مالوہ کے اقتدار اعلٰے کے ماتحت کر دیا جائے۔[53]

تلنگانہ سے پھر جنگ

شاید ان تمام واقعات سے فایدہ اٹھانے کے لیے مملکت کے بعض زور افتادہ علاقوں اور خاص کر تلنگانہ نے بہمنی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ راجہ سندری پہلے ہی سے الگ ہو چکا تھا اور وہ دایا الا دہاں خود مختار رئیس کی طرح حکومت کرتا تھا اور دیلا مادن نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور شاید صوبہ کے گورنر اعظم خاں کو وہاں سے مار بھگایا تھا۔ احمد جو بہت بوڑھا ہو چکا تھا ۱۴۳۲ء میں زبردست فوج لے کر تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا اور راستہ میں جو قلعے ملے انھیں فتح کرتا گیا۔ ورنگل کے سنگا سوم کو ہتھیار ڈالنے پڑے مگر اسے سالانہ خراج پر اپنے علاقہ پر قابض رہنے دیا گیا۔ دوسرے رئیس جنھوں نے مقابلہ کیا انھیں سلطان نے سختی سے دبا دیا لیکن بیشتر صورتوں میں مفتوحہ قلعے مقامی حکمرانوں کے ہاتھ میں رہنے دیے گئے۔ اپنا کام پورا کر کے ضعیف العمر سلطان دارالسلطنت کو واپس ہوا اور ابراہیم سنجر خاں کو تلنگانہ کا سرلشکر مقرر کر کے بھونگیر کا قلعہ اور کافی وسیع جاگیر اُس فوج کے خرچ کے لیے دی گئی جو اس کے پاس

چھوڑی گئی[54]

سلطنت کی تقسیم

ضعیف العمر سلطان اب امورِ مملکت سے سبکدوش ہوگیا اور سارے اختیارات میاں محمود نظام الملک کے سپرد کر دیے جو اُس کے عہد میں سب سے زیادہ سمجھ دار اور ذی علم تھا اور ملک التجار کو دابول اور مغربی ساحل کے دوسرے شہروں کا انتظام سنبھالنے کے لیے روانہ کر دیا[55]۔ اپنی حکومت کے آخری سال میں اس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے علاء الدین ظفر خاں کو جو "بہت ہی ذی علم اور منجھے ہوئے کردار" کا تھا اپنا ولی عہد مقرر کر دیا اور اُسے خود اپنی زندگی میں سلطنت کا پورا اختیار دے دیا اور اپنے چھوٹے لڑکے محمد کو اُس کا شریک کار کر دیا۔ نیز اُس نے اپنے دوسرے لڑکوں کو مختلف صوبے سپرد کر دیے۔ پرنس محمود کو ماہور، کلم اور رتناگیری و برار کے کچھ حصوں کا گورنر کیا اور پرنس داود کو تلنگانہ کا گورنر بنایا۔ آخر میں یہ سوچ کر کہ پچھلے دنوں بہمنی خانوادہ میں بھائیوں کے درمیان کیا ہوتا رہا ہے اُس نے سب سے حلف لیا کہ وہ کسی حال میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں گے[56]۔

۲۹ رمضان ۸۳۹ھ (۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء) کو بادشاہ کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا[57]۔

حکومت کی اہمیت

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ شہاب الدین احمد کی حکومت نے بہمنی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا اس طرح کہ خلف اکبر کی جانشینی کا قانون بنا کر سلطنت کی بنیاد کو ہمیشہ سے زیادہ مضبوط کر دیا۔ اس قانون کی ایک مثال یہ ہے کہ اگرچہ سلطان کو اپنے تیسرے لڑکے شہزادہ محمد سلطان سے جس نے بیدر کو ہمیشہ کے لیے اپنے نام سے موسوم کیا سب سے زیادہ محبت تھی مگر اس نے سب سے بڑے لڑکے علاء الدین کو ولی عہد سلطنت نامزد کیا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس کا عہد حکومت انصاف اور مساوی برتاؤ کے لیے مشہور تھا[58] اور اپنے سابقہ دشمنوں سے اس کا فیاضانہ [illegible] ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے وجے نگر کے ولی عہد کا استقبال شاہانہ پیمانے پر کیا اور اس پر تحفوں کی بارش کر دی اور چلتے وقت اس کے شکست خوردہ باپ کے لیے تحفے دیے اور کھیرلا نرسنگھ کو واپس کر دیا جس نے اُس پر پیچھے سے وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ نیز گجرات اور مالوہ کے میدان جنگ میں اُس نے دشمنوں سے اتنی فیاضی کا سلوک کیا کہ مالوہ کے فرماں روا کو اس سے غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ اپنی حکومت کے آخری سال

سلطان نے تلنگانہ کی شورش فرو کرنے کے بعد تقریباً تمام مفتوحہ قلعے ان کے سابقہ مالکوں کو واپس کر دیے اور سنگا سوم کو ورنگل کا حکمران مان لیا۔

احمد نیک دل اور خدا ترس انسان تھا اور آج تک دکھن کی بہت بڑی اکثریت اُسے ولی سمجھتی ہے۔ اس کے عہد میں محمد آباد بیدر ایران، عراق اور عرب کے ہر حصّے کے ذی علم اور متقی لوگوں کا گہوارہ بن گیا۔ وہ خود بھی ایک حد تک صاحب علم تھا اور میر فضل اللہ انجو سے تحصیل علم کیا تھا اور فن موسیقی کا بھی ماہر تھا۔[۹۵] وہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا اور مہربانی کرتا تھا، خاص کر جب دکھن میں قحط پڑا تو اس نے سکّوں کی تھیلیاں کھول دیں اور دل کھول کر تقسیم کیا۔[۹۶] ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ بادشاہ کا صوفیوں کے طریقے کی طرف رجحان تھا اور شاید شیعہ عقیدے کی طرف بھی، اور اس نے بیرون ملک سے بکثرت اہل علم، شاعر، مدبر، سپاہی وغیرہ کے دکھن میں آنے کی ہمت افزائی کی جس سے کسی حد تک نو واردوں اور قدیم آباد کاروں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو گیا۔ بہمنی حکمرانوں میں جو مخلوط شادیوں کی پالیسی پر عمل ہوا اور خود اُن کی رعایا میں بھی خصوصاً پچھلے عہد حکومت کے بعد سے اس سے لوگوں کی سماجی زندگی اور فنون اور تعمیرات میں براہ راست ہندو اثر بھی ہوا۔ ہمیں ایک مصری نحوی ابی بکر بن عمر المخزومی الدمامینی کے قلم سے شہاب الدین احمد کی خوبیوں کی بہت بڑی شہادت ملتی ہے جو اس زمانے میں دکھن آیا تھا۔ اس فاضل مصنّف کا بیان ہے کہ اُس نے رمضان ۸۲۵ھ (ستمبر ۱۴۲۲ء) میں مہایم کے مقام پر عربی صرف و نحو پر کتاب لکھنا شروع کی جسے اُس نے ۱۲ ذی الحجہ ۸۲۵ھ (۶ دسمبر ۱۴۲۲ء) کو ختم کیا۔ اس کے بعد اُسے گجرات چھوڑنا پڑا اور وہ احسن آباد گلبرگہ آیا جو اس وقت بہمنی دارالسلطنت تھا۔ یہاں اُس نے ۲۲ صفر ۸۲۶ھ (۵ فروری ۱۴۲۳ء) سے ۱۰ جمادی الاول ۸۲۶ھ (۱۰ اپریل ۱۴۲۳ء) تک پوری کتاب کی نقل کی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ گلبرگہ اس لیے گیا کہ اُس نے اس عظیم شہر کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اُس کی تصدیق کرے اور جو سلطان اُس ملک پر حکمران ہے اور جس کا ممالک غیر میں اس قدر شہرہ ہے اُس کی حقیقت معلوم کرے۔ اُس کا بیان ہے کہ بادشاہ ہر خاص و عام میں بہت ہی ہر دلعزیز تھا اور اُسے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو بادشاہ کا دشمن ہو۔ سلطان کو بہادر، وقار اور دوسروں کی مدد کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اس مصنّف نے سلطان کی بکثرت تعریف کرنے کے بعد اپنی کتاب اُس کے نام یہ لکھ کر معنون کی کہ وہ سلطان العلوم ہے۔[۹۷]

یہ تاثر تھا جو احمد کا ان لوگوں پر ہوتا تھا جو اس سے ملتے تھے۔ ملک کے اندر اُس کی نرم پالیسی اور بیرون ملک سے دوستانہ تعلقات کے نصب العین نے بہمنی سلطنت کو معزز اور قابل احترام بنا دیا اور اگر دکھنی آفاقی کشمکش نہ ہوتی تو دکھن میں خوشحالی کا دَور دَورہ ہونا یقینی تھا۔

تشریحات

۱ - شہاب الدین کا لقب اُس کتبہ میں ہے جو ساگر کے مضافات میں روضہ کے مقام پر ایک قدیم مسجد کے گوشۂ عبادت میں ہے۔ دیکھو ایپی گرفیا انڈو سلیمیکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحہ ۱۶۔ یہ سلطان کے اُس لقب کے مطابق ہے جو برہان کے صفحہ ۵۳ میں ہے۔ برہان کے اس بیان کی کہ سلطان کا والد داؤد نہیں بلکہ احمد خاں تھا سکوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ ایک سکہ کی پشت پر صاف عبارت ہے :

سلطان احمد شاہ بن احمد الحسن البہمنی

دیکھو اسپیٹ کا مضمون کوائنز آف دی بہمنی کنگس' اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۹۵۔ شیروانی کی کتاب محمود گاواں' صفحہ ۵۴۔ شیروانی کی بہمنی کوائنز بطور تاریخ دکھن کے مواد کے۔ پوتدار کی یادگاری جلد صفحہ ۲۱۳۔ عبدالولی خاں کی کتاب مذکور صفحہ ۱۷۹۔

۲ - احمد اوّل کے ولی ہونے کو آج کل کے دکھن کے ہندو اور مسلمان بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمان اُسے حضرت احمد شاہ ولی اور ہندو اُسے عالم پربھو کہتے ہیں۔ یہ منظر خاص طور پر دیکھا جاتا ہے کہ سلطان کے عرس کے موقع پر ہندو مسلمان مرد عورتوں کے ہجوم اُس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ دکھن میں قحط کے موقع پر اس کی دُعا سے پانی برسا۔ اس کا مافوق الفطرت اور حضرت گیسو دراز اور شاہ نعمت اللہ کرمانی پر بڑا اعتقاد تھا۔ دیکھو ظہیر الدین احمد کی کتاب احمد شاہ بہمنی ۱۹۳۷ء دوسرا باب۔

۳ تخت نشین ہوتے ہی احمد نے کئی گاؤں حضرت گیسو دراز کو دیے اور اس عطیہ کو بعد کی نسلوں کے دکھن کے حکمرانوں نے قائم رکھا۔ دیکھو عبدالجبار خاں کی کتاب تذکرہ صفحہ ۷۰۔ جس میں لکھا ہے کہ اس کی دستاویز اب بھی مزار کے سجادہ نشین کے پاس ہے۔ نیز دیکھو غلام علی آزاد کی روضۃ الاولیا' اورنگ آباد ۱۳۱۰ھ۔

۴ - ہمپی کے حالات اور تصاویر کے لیے دیکھو لانگ ہرسٹ کی ہمپی روئنز مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء' خصوصاً

پلیٹ نمبر ۵، ۱۹، ۱۵، ۲۱، ۲۳، ۲۳، ۲۴ و ۲۶ - دیوراج کی فوج میں ..... مسلمان، دیکھو سیویل اینڈ اینگر کتاب مذکور صفحہ ۲۱۷ - (ایضاً، کیٹلاگ ۳، ۱۰ اے - آر ۱۵، ۱۰، ۶، صفحہ ۲۰۷، ۱۱، سی ڈی ۲۹)۔

۵ - گلبرگہ کے معنی پتھریلی زمین ہیں - بشیر الدین احمد کی کتاب مذکور جلد سوم صفحہ ۵۰ - یزدانی کی اینٹی کوئٹیز آف بیدر، ۱۹۱۷ء صفحہ ۱ - ڈاکٹر یزدانی نے ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ' بیدر، اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس' شائع کی ہے مگر بدقسمتی سے جب وہ شائع ہوئی تو موجودہ کتاب کا ٹائپ شدہ مسودہ تیار تھا اس لیے مصنف اس سے اتنا منتفع نہ ہو سکا، جتنا وہ چاہتا تھا - ہمارے مورخین نے بیدر کی دل کھول کر تعریف کی ہے - فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۲۴ میں لکھا ہے کہ "بیدر اتنا وسیع ہے جتنا خود آسمان اور اس کے قرب و جوار میں بڑی فرحت بخش ہوا ہے جو پھولوں کی خوشبو سے معمور ہے"۔ برہان نے صفحات ۵۴ و ۵۵ میں لکھا ہے کہ "بیدر کی زمین اتنی روشن ہے جیسے آسمان اور چشموں اور پھولوں سے بھری ہے اور ہوا تو بالکل جنت جیسی ہے"۔ طبقات کے صفحہ ۴۱۷ میں ہے : "بیدر سرسبز زمین کا وسیع خطہ ہے اور نہایت دل فریب آب و ہوا ہے"۔ لومڑی اور خرگوش کا قصہ تذکرہ فولیو ۱۰ - الف میں ہے - بیدر کے بوڑھے آدمی کا دوسری جگہ کے جوان سے طاقتور ہونے کا قصہ ظہیر الدین کی کتاب مذکور کے صفحہ ۷ میں ہے جس میں ایک مرہٹی مخطوطہ سلطان سوری کا حوالہ دیا ہے جو سولپور ضلع بیدر کے ایک پٹیل کے پاس ہے - عجیب بات یہ ہے کہ لومڑی اور کتے کی کہانی احمد نگر کو منتخب کرنے کے سلسلہ میں بھی دوہرائی گئی ہے - برہان صفحہ ۲۱۴ -

۶ - دیکھو اینگر کی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری صفحہ ۵ - نیز گرتی وینکٹ راؤ کا مضمون بہمنی وجے نگر ریلیشنز، روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد سیشن صفحات ۲۶۴ تا ۲۷۱ -

۷ - فرشتہ اور خافی خاں نے ۸۳۰ھ لکھا ہے لیکن برہان کے صفحہ ۵۴ میں رجب ۸۲۷ھ (جون ۱۴۲۴ء) ہے - سید علی بلگرامی نے اپنی اردو تاریخ دکھن کی جلد اوّل میں لکھا ہے کہ دار السلطنت کی تبدیلی ۸۳۲ھ میں ہوئی مگر یہ شاید طباعت کی غلطی ہے - اس لیے کہ اس کی تائید کسی اصل سند سے نہیں ہوتی - رفیع الدین کا بیان ہے کہ بیدر احمد کی تخت نشینی کے "فوراً بعد" دار السلطنت بنایا گیا -

۸ - ایپی گرافیا انڈو مسلیمکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحہ ۲۷ - رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۲۹-۱۹۲۸ء صفحہ ۸ - یزدانی کی کتاب بیدر صفحات ۵۴ تا ۵۶ - حیدر آباد کے عجائب گھر میں ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) کے "محمد آباد" کے ڈھلے ہوئے سکے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کے پہلے ہی ڈھلے ہوئے سکے ہیں - ڈاکٹر زبید دیوا کو مسجد کی تعمیر کی تاریخ جو ڈاکٹر یزدانی نے پڑھی ہے اس سے اختلاف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ۸۲۷ھ ہے نہ کہ ۸۳۰ھ اور یہ کہ سلطان محمد کا مطلب محمد بن تغلق ہے نہ کہ شہزادہ محمد بہمنی - دیکھو ہسٹری آف مڈیول دکھن جلد دوم صفحہ ۲۴۴ و نوٹ ۱۹ - اس سے کافی ثبوت اس بات کا ملتا ہے کہ دار السلطنت احمد کی تخت نشینی کے جلد ہی بعد تبدیل ہوا - مجھے ایپی گرافیا کے مضمون کے فاضل مصنف کے

اس بیان سے اتفاق نہیں ہے کہ دارالسلطنت کی تبدیلی شہزادہ محمد کے حسب خواہش ہوئی۔

۹ - برہان صفحہ ۷۵۔ گلبرگہ ۲۴ اپریل ۱۴۲۳ء کو دارالسلطنت تھا جب کہ المخزومی نے اپنی عربی صرف و نحو کی کتاب کی نقل مکمل کی۔ دیکھو نیچے تشریح نمبر ۶۱۔ نیز دیکھو بہمنی کوائنز مذکور صفحہ ۷۰، جس میں ہے کہ احسن آباد کے آخری سکہ کی تاریخ ۸۲۷ھ ہے۔

۱۰ - رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۔ مقبروں کی تصویر اردو گائیڈ رہنمائے روضتین ۱۳۵۹ھ میں۔

۱۱ - رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۲۵-۲۶ء صفحہ ۷۰۸۔ فیروزآباد کی تعمیرات کی مشابہت کا اس میں ذکر نہیں ہے۔

۱۲ - رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۲۸-۲۹ء صفحہ ۵ و مابعد، ۱۹۲۹-۳۰ء صفحہ ۲۳ و مابعد، ۱۹۳۱-۳۲ء صفحہ ۴ و مابعد و صفحہ ۶۲ و مابعد۔

۱۳ - فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۲۸ میں لکھا ہے کہ بیدر کی قلعہ بندی ۸۳۵ھ (۱۴۳۲ء) میں مکمل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ تعمیر کا کام اس کے پورے عہد حکومت میں جاری رہا۔ یہ اس نظریہ کے ثبوت کی مزید تائید ہے کہ احمد نے محل کی قلعہ بندی کی تکمیل کا بالکل انتظار نہیں کیا بلکہ جیسے ہی ضروری عمارتیں بن گئیں وہ وہاں منتقل ہو گیا۔ طول و عرض، حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ رپورٹ ۱۹۲۸-۲۹ء صفحہ ۱۶۔

۱۴ - ایپی گریفیا انڈو سلیمیکا ۱۹۳۱-۳۲ء صفحہ ۲۶۔ اس مسجد کا پورا حال یزدانی کی کتاب بیدر کے صفحات ۵۴ سے ۵۶ میں ہے۔

۱۵ - بیدر کی مسجد کا مسقف رقبہ ۲۴۰۰ مربع فٹ ہے حالانکہ گلبرگہ کی مسجد کا ۲۷۰۰ مربع فٹ ہے۔ بشیرالدین کی کتاب مذکور کے صفحات ۱۳ و ۳۰۵۔ اس فاضل مصنف کی تصنیف حال کی کھدائی سے بہت پہلے کی ہے اس لیے اس نے غلطی سے اسے "عورتوں" کی مسجد کہا ہے۔

۱۶ - شاید یہ وہی پیش گاہ کی عمارت ہے جس کا برہان نے صفحہ ۷۱ میں ذکر کیا ہے۔

۱۷ - ظہیرالدین کی کتاب مذکور صفحہ ۱۵۶۔

۱۸ - رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۲۸-۲۹ء صفحہ ۹۔

۱۹ - دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں صفحہ ۳۸۔ برہان نے صفحہ ۷۷ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے آذری کو ایک لاکھ دکھنی تنکہ اور ۵۰۰۰ ایرانی تومان انھیں اپنے وطن واپس جاتے وقت دیے اور ۱۲۰۰ تنکہ مولانا شرف الدین مازندرانی کو دیے جس نے محل کے پھاٹکوں پر یہ عبارت لکھی تھی۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۲۶ میں لکھا ہے کہ آذری

کو ..... ۴ ٹنکہ کے علاوہ ..... ۲ ٹنکہ سفر خرچ کے لیے دیے گئے۔ آذری بادشاہ کا استاد رہ چکا تھا اور خاندان بہمنی کی تاریخ بہمن نامہ کا مصنف ہے جو اب نایاب ہے مگر فرشتہ کی معاصر تاریخ کسی حد تک اسی پر مبنی ہے۔ اس کا انتقال ۸۲ سال کی عمر میں ۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء میں اپنے وطن اسفراین میں ہوا۔ پھاٹک پر لکھے ہوئے اشعار کا ترجمہ:

"کیا شان و شکوہ اور کتنا استحکام کہ خود آسمان اس عمارت کی بنیاد معلوم ہوتا ہے

مگر یہ مقابلہ بھی غیر موزوں ہے اس لیے کہ ہمارے سامنے دنیا کے بادشاہ احمد شاہ کا محل ہے"

۲۰۔ احمد شاہ کے مقبرہ کا مفصل حال بشیر الدین کی کتاب مذکور کے صفحہ ۴۴ تا ۱۲۶ میں ہے۔ نیز یزدانی کی کتاب بیدر کے صفحات ۳ تا ۵۶ میں "شیعی درود" رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۳۰ء صفحہ ۴۔

۲۱۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد دوم باب ۱۵ و ۱۶ میں ہیگ نے آفاقی کا جو ترجمہ غیر ملکی کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگرچہ شروع میں یہ ایران اور دیگر ممالک غیر سے آئے تھے مگر انھوں نے دکھن کی وطنیت اختیار کر لی تھی۔ میں نے اس جماعت کے لیے نو واردوں کا لفظ بہتر سمجھا۔ ان نو واردوں کے مقابلہ میں میں نے دوسری جماعت کے لیے پرانے آنے والوں کا لفظ پسند کیا خصوصاً اس لیے کہ ان میں حبشی بھی تھے۔ ہمیں احمد ثانی کے عہد سے پہلے کسی ممتاز دکھنی کے اسلام قبول کرنے کا پتہ نہیں چلتا۔ دیکھو بلگرامی کی کتاب مذکور حصہ اول صفحات ۱۰۶ و مابعد۔

۲۲۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم پندرہویں صدی میں تاجر ہونا اور تاجر کہلانا دکھن میں بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔

۲۳۔ فرشتہ جلد اول صفحات ۳۲۷،۱۰۰۔

۲۴۔ اس مہم کا حال بعد میں ہے۔ مہایم (موجودہ ماہم شہر بمبئی کے مضافات) میں شروع میں ایک جزیرہ تھا جس کے شمال میں مہایم ندی، مغرب میں سمندر اور شرق وجنوب میں نمک کی جھیل ہے۔ دیکھو برل کی کتاب بمبئی ان دی ڈیز آف کوئین این۔ ہکلویت سوسائٹی ۱۹۳۳ء۔ جزیرہ کا نقشہ جیسا کہ وہ ۱۶۷۰ء میں تھا صفحہ ۹۰ کے مقابل۔ محل وقوع ۵۵ د ۱۸ شمال، ۴۳ د ۲۷ مشرق۔

۲۵۔ برہان صفحہ ۴۳۔ شاہ نعمت اللہ کے حال کے لیے دیکھو براؤن کی کتاب پرشین لٹریچر انڈر تاتار ڈومینین صفحات ۴۶۳ و مابعد۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۲۹ میں سفرا کے جو نام دیے ہیں وہ برہان کے صفحہ ۴۵ کے ناموں سے مختلف ہیں۔ اس میں شاہ نعمت اللہ کے ایک مرید شیخ نوجن، شہزادہ محمد کے استاد قاضی موسیٰ نوکھی اور ملک الشرق قلندر خاں کے نام ہیں۔ شاہ نعمت اللہ کرمانی کا دیوان ۱۳۲۶ھ میں بمقام تہران شائع ہوا ہے۔ دیکھو جین آبن کی میٹریئن پور لا بیاگرفی دی شاہ نعمت اللہ کرمانی۔ انسٹی ٹیوٹ فرانکوایرانین، تہران ۱۹۵۶ء۔

۲۶- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۹ - منتخب جلد سوم صفحہ ۷۲ - سر وولزلی ہیگ کا خیال ہے کہ بارہ گوشیہ تاج کا مطلب یہ ہے کہ احمد نے اب شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا مگر اس سے لازمی یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔ دیکھو جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۲۳ء صفحات ۳، و مابعد۔ پی سائکس ہسٹری آف پرشیا مطبوعہ لنڈن سنہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۵۶ کا بیان ہے کہ کرمان کے جوار میں مہایم کے مقام پر ایک خوب صورت مقبرہ ہے جو سید نورالدین کی یادگار میں تعمیر ہوا ہے جن کا عرف نعمت اللہ تھا۔ ان کا مزار ایک گنبد کے نیچے ہے جس کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے سنہ ۸۴۰ھ (۱۴۳۷ء) میں بہمنی خانوادہ کے احمد شاہ نے تعمیر کیا جو شاہ موصوف کے مرید تھے۔

۲۷- برہان صفحہ ۶۵ - نعمت آباد جو اب نعمت اللہ باد ہے۔ اندھرا پردیش میں دریائے مینجرا پر ہے۔ ۱۸٫۰۲ شمال، ۷۷٫۳۵ مشرق۔

۲۸- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۹ - مشایخ کے : تھ دھلانا، برہان صفحہ ۶۸۔

۲۹- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۸ - عراق اور ایران خصوصاً کربلا سے آنے والے نووارد بیشتر یقیناً شیعہ تھے۔ شاہ نعمت اللہ عرف نورالدین (برہان صفحہ ۶۵) میاں عبداللہ کے صاحبزادے تھے جو پانچویں امام حضرت محمد باقر کی اولاد سے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بیدر میں شاہ خلیل اللہ کی اولاد شیعہ ہے۔ دیکھو رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء صفحہ ۴ جس میں لکھا ہے کہ وہ شیعہ عقیدہ کے تھے۔ نیز دیکھو نذیر احمد کی این اولڈ پرشین ٹری ٹیز آف دی بہمنی پیریڈ۔ اسلامک کلچر سنہ ۱۹۷۲ء صفحات ۲۰۹ تا ۲۴۶۔

۳۰- ظہیر الدین کی کتاب مذکور صفحہ ۱۶۶ - یزدانی کی کتاب بیدر میں جنگم اور ان کے ساز و سامان کی بہت عمدہ تصویر ہے۔ پلیٹ نمبر ۵۷۔

ان دو بیانات میں اور میرے متن کے بیان میں ذرا سا اختلاف ہے۔ میں نے جو لکھا ہے وہ مجھے مسٹر ایل کلکارنی نے بتایا ہے جن کی جائیداد اشٹیا میں ہے اور انھیں اس واقعہ کا براہ راست علم ہے۔

۳۱- منتخب جلد سوم صفحہ ۶۸۔

۳۲- ظہیر الدین کی کتاب مذکور صفحہ ۳۳ - یہ تعلیمات بیدر کے مخصوص ادارے ہیں اور سارا نظام بظاہر شیعہ عقاید کے اثر کی یادگار ہے اگرچہ قرین قیاس یہ ہے کہ شیعہ عقاید کے نفوذ سے پہلے بھی اس کا وجود تھا۔ بیدر کا شہر چار تعلیمی حلقوں میں منقسم ہے جن کا مرکز قدیم ہندو عمارت ہے (جس سے غالباً حیدر آباد کے نقشہ میں مدد لی گئی ہو جس کا مرکز چار مینار ہے)۔ ان تعلیمات کے نام ان کے بانیوں کے نام پر ہیں یعنی صدیق شاہ، نور خاں، مینار اور منپسل۔ انھیں چار پر سارا شہر منقسم ہے اور ہر حلقہ میں ایک اکھاڑہ، ایک ورزش گاہ، ایک مسجد اور کم از کم ایک سکول ہے۔ حلقے کے نوجوانوں کو ان کی نگرانی میں جسمانی، مذہبی اور بنیادی تربیت دی جاتی ہے۔ اگرچہ ان تعلیمات کا قریبی تعلق محرم کی تقریبات سے ہے،

جس کے لیے پورے سال سرگرمی سے تیاری کی جاتی ہے لیکن اس میں ہر مذہب و فرقہ کے نوجوان، ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی بلا تفریق داخل کیے جاتے ہیں اور ان کا نظام بالکل جمہوری نوعیت کا ہے۔ ان کے خصوصی نشانات نوجوان کی تعلیم کا "شیر"، صدیق شاہ کی تعلیم کا "شیر خدا" (شیر یزدان) اور مینار کی تعلیم کا "شیر بچہ" (شرزہ) ہیں۔ یہ سارے نشانات شیر خدا کے معزز نمونے کے ہیں جو چوتھے خلیفہ حضرت علی کا لقب تھا۔ یہ مفید معلومات مجھے اپنے دوست اور سابق شاگرد میر محمود علی سے حاصل ہوئیں جو اب عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے لکچرار ہیں اور خود بیدر کے رہنے والے ہیں۔

۳۳۔ سیویل اینڈ اینگر، انسکرپشنز آف سدرن انڈیا صفحہ ۲۱۴، کوالہ سیتہ منگلم سی پی گرانٹ اور وی آر کیم بلاری ۲۵۶، ۱۸ ۱۹۰۴ء۔

۳۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۱۹۔

۳۵۔ ایضاً صفحہ ۳۲۰۔ "طوق، علم، نقارہ"۔ اس میں جاگیری نظام کا بہت مفصل حال ہے جو بیشتر برنی کی فیروز شاہی منقولہ عبدالجبار صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۸ سے ماخوذ ہے۔

۳۶۔ سیویل اینڈ اینگر، کتاب مذکور صفحہ ۲۱۴۔ فردر سورسز جلد اوّل صفحہ ۹۳ تا ۹۵۔

۳۷۔ ویلوگ، منقولہ صفحہ ۳۵۔

۳۸۔ یہ بیان فرشتہ جلد اوّل صفحات ۲۲۰ و ۲۲۱ میں ہے۔ نیز دیکھو امین رازی کی ہفت اقلیم: ہمینوں سے متعلق حصہ رسالہ تاریخ حیدر آباد بابتہ جنوری ۱۹۲۹ء کے صفحات ۴۵ تا ۴۹ میں شائع ہوا ہے۔ برہان نے صفحہ ۱۶ میں وجے نگر کی مہم کا نہایت مختصر حال دیا ہے اور اسے ماہور کی جنگ کے بعد کا واقعہ قرار دیا ہے۔ برہان نے صفحہ ۵۰ میں تلنگانہ کی مہم کا وجے نگر سے الگ ذکر کیا ہے جس میں "منڈل اور ورنگل" فتح کیے گئے تھے اور جب "راج کنڈہ اور دیورکنڈہ کے رایوں نے صلح کی خواہش کے لیے سفیر بھیجے تھے"۔ یہ سارا واقعہ کچھ مبہم سا معلوم ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ تلنگانہ کی دو مہمیں ہوں۔ دیکھو فردر سورسز جلد اوّل صفحہ ۱۰۰۔

۳۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۳۲۰ و ۲۲۱۔

۴۰۔ عبدالقادر چالیس برس برار کا گورنر رہا۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۔

۴۱۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۲

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ یہ سیویل اینڈ اینگر کا صفحہ ۲۱۴ میں بیان ہے۔ سیویل اپنی کتاب اے فارگاٹن ایمپائر میں بکا سوم کو ویرا وجے کہتا ہے اور بکا کا نام بالکل نہیں لیتا۔ دیکھو شجرہ صفحہ ۴۴ پر۔ بکا نے ۱۴۰۶ء میں چند مہینے حکومت کی اور

اس کا جانشین بقول سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۴۰۰ کے دیورائے دوم ہوا۔ ایک دلچسپ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شاید اسی مہم میں بہمنیوں نے دو ہندو لڑکے گرفتار کیے، ایک برہمن اور ایک وجے نگر کا شہزادہ۔ انھیں دو سے احمد نگر کے نظام شاہی اور برار کے عماد شاہی خاندان چلے۔ دیکھو فرشتہ جلد دوم صفحات ۹۳ و ۱۴۷۔

۴۴۔ ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۳۶۔ فرشتہ صفحہ ۳۲۲۔ برگس، محمڈن ڈائی نسٹیز صفحہ ۴۰۶۔ شاید اسی مہم کا برہان نے صفحہ ۵۰ میں حوالہ دیا ہے۔ دیکھو اوپر تشریح نمبر ۲۹۔

۴۵۔ ہمارے مورخین نے جو مختلف اور بعض اوقات متضاد بیانات کیے ہیں اُن سے یہی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ برہان ہمیشہ بہت خوش ہو کر سلطان کے کاموں کی تعریف کرتا ہے جس کے متعلق یہ کہا ہے کہ "اُس نے سرزمین کو کافروں اور بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والوں سے پاک کر دیا" اور مندروں کی جگہ مسجدیں بنا دیں۔ یقیناً یہ سب غلط ہے۔ یہ ہندوستان کا وہ حصہ ہے جہاں مسلمان آج بھی بہت اقلیت میں ہیں اور بے شمار آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے مورخین ہمیشہ اس کے شایق ہوتے ہیں کہ حکمرانوں کے جن کاموں کو قابل تعریف سمجھیں انھیں بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ شاید کسی حد تک سختی ہوئی ہو اس لیے کہ ملک کو بڑی کوشش سے تسخیر کرنا تھا۔ دیکھو برہان صفحات ۵۸ تا ۶۰۔ فرشتہ صفحات ۳۲۳ تا ۳۲۵۔

گاول اب برار کے ضلع امراوتی میں ایک اُجاڑ قلعہ ہے۔ ۲۰ ر ۲۲ شمال، ۲۳ ر ۷۷ مشرق۔

ترنالہ یا نرنالہ برار کے ضلع اکولہ میں ایک پہاڑی قلعہ۔ ۱۵ ر ۲۱ شمال، ۴ ر ۷۷ مشرق۔

۴۶۔ برہان نے صفحہ ۱۹ میں مالوہ کے حکمران کا نام اِل خاں لکھا ہے جو غالباً الف خاں کا بگاڑ ہے۔ ہوشنگ نے مالوہ پر ۱۴۰۶ء سے ۱۴۳۵ء تک حکومت کی۔ دیکھو امیر احمد کی کتاب علوی شاہان مالوہ۔

۴۷۔ برہان صفحہ ۶۲، فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۳۔ ظہیر الدین نے صفحہ ۱۰۲ تشریح ایمن اس شرط کو غلط سمجھا اس لیے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ جب ہوشنگ سرحد پر آیا تو نرسنگھ نے اسے ایک لاکھ ٹنکہ دینے کا وعدہ کیا۔ احمد کی مہموں کا بیان بیشتر مبہم ہے اور مورخین کے بیانات میں کافی اختلاف ہے۔

۴۸۔ برہان صفحات ۶۲ تا ۶۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۳۲۳ تا ۳۲۴۔ جلد دوم صفحہ ۲۲۸۔

۴۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۷۔ برہان صفحہ ۵۷۔

۵۰۔ برہان صفحہ ۵۵ و ۵۶، فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۷۔ برہان نے اس مہم کی تاریخ سنہ ۸۳۰ھ (۱۴۲۶ء) لکھی ہے۔

۵۱۔ برہان کا صفحہ ۶۱ میں بیان ہے کہ شہزادہ اس وقت نوجوان تھا اور اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ "ارباب مکر و غدر" کے فریب کا دوسروں کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ علاءالدین کو (۱) اپنے چھوٹے

بھائی اور (۲) نوواردوں کی طرف اپنے واندکے خاص رجحان کی بنا پر آلہٗ کار بنایا گیا ہو۔

۵۲ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۸۰ - جلد اوّل صفحہ ۳۲۷ - برہان صفحات ۶۶ تا ۶۷ - کمسریٹ، ہسٹری آف گجرات ۱۹۳۸ء صفحہ ۸۹ - ظہیرالدین جلد سوم - ویراول، ریاست سوراشٹر میں ایک بندرگاہ، ۵۳ ر ۲۰ شمال، ۲۶ ر ۷۰ مشرق - گھوگھا، ریاست سوراشٹر کے جنوب مشرقی کنارے پر ایک بندرگاہ، ۲۱ ر ۴۹ شمال، ۳۵ ر ۷۲ مشرق - ڈیو کاٹھیاواڑ میں پرتگالی مقبوضہ، ۴۳ ر ۲۰ شمال، ۲ ر ۷۱ مشرق - سلطان پور، ب ریاست مہاراشٹر کے ضلع مغربی خاندیش میں ۴۸ ر ۲۱ شمال، ۵۵ ر ۷۴ مشرق۔

۵۳ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۸، جلد دوم صفحہ ۱۸۹ - برہان صفحہ ۶۶ - برہان اور فرشتہ کے بیانات میں بعض معمولی اختلافات ہیں - فرشتہ کا بیان زیادہ مفصل ہے، خصوصاً جب وہ گجرات کی تاریخ کے متعلق لکھتا ہے۔

۵۴ - برہان صفحہ ۶۹ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۸ -

۵۵ - ویلوگ، مقدمہ صفحات ۳۷ و ۳۸ - برہان صفحات ۶۹ تا ۷۰ -

۵۶ - برہان صفحہ ۷۰

۵۷ - برہان نے صفحات ۷۰ و ۷۱ میں لکھا ہے کہ یہ تقسیم اُس وقت ہوئی جب سلطان نے اپنی حکومت کے بارہ سال پورے کرلیے، یعنی انتقال سے بالکل قبل - لیکن فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۲۷ میں اسے علاءالدین کی شادی کے فوراً بعد کا واقعہ بتایا ہے - ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۳۸ میں ہے کہ راجہ چال ۱۴۳۲ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان فتح ہوا ہوگا لیکن رام گیری پچھلی مہم میں تسخیر ہوا تھا - دیکھو طبقات صفحہ ۱۴۵ - راجہ چال یا راجہ کنڈہ، اندھرا پردیش کے ضلع نلکنڈہ میں ۱۰ ر ۱۷ شمال، ۵۰ ر ۷۸ مشرق۔

۵۸ - احمد اوّل ۳ شوال ۸۳۸ھ (۲۰ ستمبر ۱۴۲۲ء) کو تخت نشین ہوا اور ۱۲ سال ۹ ماہ ۲۴ دن حکومت کی جس سے ہم ۲۸ رجب ۸۳۸ھ (۲۷ فروری ۱۴۳۵ء) تک پہنچ جاتے ہیں یعنی طبقات کی دی ہوئی ۲۰ رجب ۸۳۸ھ کی تاریخ کے آٹھ دن کے اندر لیکن ہمیں ایک اس سے مختلف تاریخ کی براہ راست اور تقریباً ہم عصر شہادت اُس کتبے سے مل جاتی ہے جو شکر اللہ قزوینی نے خود احمد کے مقبرہ کے اندرونی حصہ میں درج کی ہے جس کے مطابق بادشاہ کا انتقال ۲۹ رمضان ۸۳۹ھ (۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء) کو ہوا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تاریخ کو صحیح نہ مانیں - تذکرہ فولیو ۱۴۱ - ۱۰۴ میں ۸۴۲ھ (۱۴۳۹ء) جو احمد کے انتقال کی تاریخ دی ہے وہ غلط ہے - دیکھو یزدانی کی کتاب بیدر، اٹس ہسٹری اینڈ مانومنٹس صفحہ ۱۲۵ - حسن اتفاق سے یزدانی نے احمد شاہ کے مقبرہ کے تمام کتبے پڑھے ہیں جس کے بارے میں دیکھو صفحات ۱۱۴ تا ۱۱۹ - نیز دیکھو بشیرالدین، جلد اوّل صفحہ ۱۲۵ - شکر اللہ قزوینی نے جو مہینہ لکھا ہے وہ شہر الملک العالم یعنی خدائے دانا کا مہینہ جس کے معنی رمضان ہیں۔

۵۹- برہان صفحہ ۷۲- اس میں محمد کو منجھلا لڑکا بتایا گیا ہے لیکن دوسری جگہ ہمیں بیچ میں ایک اور لڑکا شہزادہ محمود بھی ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ایک ہی شہزادے کے نام کے دو تلفظ ہوں۔

۶۰- برہان صفحہ ۷۳-

۶۱- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۲۲-

۶۲- منحل الصافی فی شرح الوافی' آصفیہ' شعبہ نحو عربی ۵۰- خاتمہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ مصنف کا کئی جگہ ذکر ہے۔ (۱) جلد اوّل صفحہ ۳۱۲- (اور ضمیمہ صفحہ ۵۴۵) جہاں اس کا ذکر الرمیزہ' الشافیہ فی علم العروض و القافیہ کے سلسلہ میں محمد بن ابی بکر بن المخزومی کے نام سے ہے اور اس کے انتقال کی تاریخ سنہ ۸۲۷ھ (سنہ ۱۴۲۴ء) دی ہے۔ (۲) جلد دوم صفحہ ۲۶ میں (اور ضمیمہ صفحہ ۲۱ میں) جہاں اس کے والد کا نام محمد بن ابی بکر بن عمر ... بن ابی بکر بن محمد بن سلیمان ... المخزومی ... الدمامینی عرف بدر الدین ہے۔ یہاں ایک حوالہ شماوی کی دام جلد ہفتم صفحات ۱۸۴ تا ۱۸۷ کا ہے۔ وہ سنہ ۷۶۳ھ (سنہ ۱۳۶۱ء) میں بمقام اسکندریہ پیدا ہوا اور سنہ ۸۲۷ھ (سنہ ۱۴۲۴ء) میں بمقام گلبرگہ انتقال کیا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ تصنیف زیر تذکرہ کا ذکر نہ بروکلمین نے کیا ہے نہ کوڈیسی عربیئہ برٹش میوزیم سنہ ۱۸۷۱ء جلد دوم صفحہ ۴۴۴ میں ہے (جس میں مصنف کا ذکر ہے) اس لیے حیدر آباد کا مخطوطہ نادر معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم سے درخواست کی ہے کہ وہ اس کی مزید تحقیق کریں۔

آٹھواں باب

پارٹی بازی اور بڑھ گئی

علاء الدین احمد دوم

۱۷/اپریل ۱۴۳۶ء سے ۶/مئی ۱۴۵۸ء

الف۔ کلچرل حالات

احمد اوّل بحیثیت بادشاہ کے بہت کامیاب رہا اور جب اُس کا انتقال ہوا تو اتنا ہر دل عزیز تھا کہ ولی سمجھا جانے لگا اور ممالک غیر میں اور خود اپنی رعایا میں اُس کی بڑی عزت تھی۔ اُس کا جانشین ظفر خاں جس نے تخت نشینی پر علاء الدین احمد کا لقب اختیار کیا دوسری طرح کا انسان تھا[1]۔ ملک کو ایک طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی جو بہمنی سلطنت کے اندر آباد مختلف عناصر میں توازن قائم رکھ سکے لیکن احمد کمزور طبیعت کا انسان تھا اگرچہ یقیناً نیک دل تھا مگر تلون اور کم ہمتی کی طرف مائل تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا اور کثیر تعداد میں ممالک غیر سے آئے ہوئے نو واردوں یا آفاقیوں کی موجودگی نے اُن میں اور دکھنیوں یا پرانے آنے والوں میں شدید ناچاقی پیدا کر دی تھی جس کا خود سلطنت کے مستقبل پر بڑا افسوسناک اثر پڑا۔

پُرانے آنے والے اور نئے آنے والے

نئے سلطان کی تخت نشینی پر احمد اوّل کی پالیسی کا ردِ عمل ہوا اور مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے

کہ نئے سلطان نے اُن تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جو اُس کے باپ کے عہد میں ناواجب طور پر قید ہوئے تھے اور چند اعلےٰ عہدہ داروں کو برطرف کرکے اُن کی جگہ نئے عہدہ دار مقرر کیے۔ شروع ہی میں خاندیش کی پہلی مہم کے موقعہ پر جب بادشاہ نے مجلس شوریٰ منعقد کی اور ذمہ دار حکام سے پوچھا کہ دکھن پر حملہ کی صورت میں مدافعت کے لیے کیا کرنا چاہیے تو اسی وقت پرانے آنے والوں اور نوواردوں کی باہمی خلش واضح ہوگئی اور سلطان کو مجبوراً صرف نوواردوں کو خلف حسن بصری کی قیادت میں میدان جنگ بھیجنا پڑا۔ خلف حسن نے صاف صاف کہا کہ مرحوم بادشاہ کے عہد میں مہائم کی شکست فوج کے اندر پرانے آنے والوں اور نوواردوں کے مابین عناد کے جذبات کی وجہ سے ہوئی تھی۔ جب نووارد فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے واپس ہوئے اور خلف حسن کی ہمیشہ سے زیادہ آؤ بھگت ہوئی تو دوسرے فریق کو سخت جھنجھلاہٹ ہوئی۔ نوواردوں کے عروج کی ایک یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ اُن کے شاہی خاندان سے عزیزانہ تعلقات تھے اس لیے کہ بادشاہ کی تین بہنوں کی شادی جلال الدین (سید جلال بخاری کے پوتے) اور شاہ خلیل اللہ کرمانی کے دو لڑکوں شاہ نور اللہ اور شاہ حبیب اللہ سے ہوئی تھی اور بادشاہ کی ایک لڑکی کی شادی شاہ محب اللہ سے ہوئی تھی اور اب بادشاہ نے اپنی دوسری لڑکی کی شادی آفاقی شاہ قلی چنگیزی کے ساتھ کردی۔ بادشاہ نے یہ حکم بھی دیا کہ آیندہ تمام رسمی مواقع پر نووارد اس کے داہنے ہاتھ میں رہیں اور پرانے آنے والے بائیں ہاتھ پر۔ اس سے یقیناً توازن ختم ہوگیا اور آپس کی خلش ہمیشہ سے زیادہ بڑھ گئی۔

چاکن کے افسوسناک واقعہ میں علاء الدین نے سخت نافہمی اور غیر مآل اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ جب احمد اول کے دست راست خلف حسن ملک التجار کو جو مہائم کی شکست کے بعد آفاقی جماعت کا لیڈر ہوگیا تھا راجہ شرکے نے کونکن کے جنگل میں بے رحمی سے قتل کر دیا تو سلطان نے بلا واقعات کی جانچ کیے ہوئے حکم دے دیا کہ قلعہ چاکن میں جتنے لوگ قید ہیں اُن سب کو قتل کر دیا جائے اور جب اس بدنصیب جماعت کے بچے کھچے لوگ محمد آباد بیدر پہنچے تو سلطان نے اُن کا بڑا اعزاز کیا اور پہلے جن لوگوں نے اُن کے خلاف اطلاع دی تھی اُن کی جائدادیں ضبط کرلیں اور جنھوں نے اُسے دھوکہ دیا تھا اُن سب کو قید کر دیا۔ یہ سب اُس وقت تک جیل میں پڑے سڑتے رہے جب تک کہ چند سال بعد خراسان سے سید ازری کا خط آنے پر انھیں سزائے موت نہیں دی گئی دونوں جماعتوں میں کشمکش اس عہد کے آخر میں یہاں تک بڑھی کہ اگر دکھن کی سیاست میں دونوں جماعتوں کے درمیان توازن کا ایک اصول نہ قائم ہوگیا ہوتا تو بہمنی سلطنت اپنے وقت سے بہت پہلے ختم ہوگئی ہوتی۔ اس نئی پالیسی کی علم بردار دو نامور ہستیاں تھیں: ایک تو علاء الدین کی بہو نرگس بیگم اور دوسرے علاء الدین کی نئی دریافت محمود گاواں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ دکھن میں ہندو مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کا سوال اگر کبھی تھا بھی تو اب وہ ختم ہوگیا تھا اور وجے نگر اور بہمنیوں کے ناخوشگوار تعلقات محض سیاسی حیثیت کے رہ گئے تھے۔ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ فیروز مخلوط شادیوں کا بڑا حامی تھا اور اس وقت سماج کے مختلف طبقوں میں امتیاز کا خط عمودی نہیں بلکہ سطحی ہوگیا تھا۔ وجے نگر کی فوج میں مسلمانوں کی بھرتی، کچھ پتیوں سے اتحاد کی توقعات اور دکھن کی خاندیش، گجرات اور مالوہ کی مسلم حکومتوں سے لڑائیوں نے رفتہ رفتہ فرقہ واریت کو ہموار کردیا ہوگا اور ہندو مسلمانوں کے مابین خوشگوار تعلقات کے دور کی رہنمائی کی ہوگی جو مستقبل میں دکھن کی سیاسیات کی امتیازی خصوصیت تھی۔

تعمیرات

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے خلیل اللہ اپنے سارے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے دکھن آگئے اور اپنے لڑکوں کی شاہی خاندان میں شادیاں کیں۔ اُن کا انتقال ۸۶۳ھ (۱۴۵۹ء) میں ہوا اور ان کے مزار پر نہایت خوبصورت عمارت بنائی گئی۔ اس مقبرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی گنبد نہیں ہے اور شیراز کے منیش کا لکھا ہوا خط ثلث میں ایک نہایت خوبصورت کتبہ ہے اگرچہ اس کے حرفوں کی لمبائی چودہ انچ ہے اور پورا کتبہ چالیس فٹ لمبا ہے مگر یہ سب نہایت متوازن ہے۔ ساری عمارت سادہ مگر پرشکوہ ہے اور اُس وقت دکھن میں جو طرز رائج تھا اُس کی نفاست کا عمدہ نمونہ ہے۔ کتبہ بھی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ خط ثلث میں شاید یہ پہلا ہی کتبہ ہے۔ ایرانی اثر نہ صرف ذرا بلند محراب کی خوبصورت مناسبت میں نمایاں ہے بلکہ سنگ سیاہ کے حاشیوں میں بھی جن پر لکیروں، پتیوں اور پھولوں کے طرز کے نقوش کندہ ہیں، نیز زردکار پر اللہ اور رسول کے نام کے ساتھ خلیفہ چہارم حضرت علی کا نام بھی ہے[۵۳]۔ ایک اور خوبصورت کھپرے کی لوح بھی ہے جس پر دو الفاظ برج اور علی نہایت خوبصورتی سے طغرا کی شکل میں مزین ہیں جو یقیناً اسی عہد کی یادگار ہیں۔ اس دَور کی عمارات کی ایک خصوصیت رنگ برنگ کے نہایت خوبصورت کھپروں کا آزادانہ استعمال ہے خصوصاً گہرے نیلے اور سبز رنگ کے جو اب تک سلطان کے مقبرہ کی زینت ہیں مگر بدقسمتی سے یہ تیزی کے ساتھ روبزوال ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر رہے ہیں[۵۴]۔ اس زمانے کی بہمنی عمارات کی نمایاں خصوصیت طرح طرح کے کھپروں کا بڑے پیمانے پر استعمال ہے اور قلعہ میں جو چند نمونے محفوظ ہیں وہ غالباً احمد دوم کے عہد کی یادگار ہیں۔

ایک اہم عمارت جو شاید اسی عہد کی ہے نام نہاد تخت کرمانی ہے جس میں شاید وہ تخت رکھا ہے جو خود شاہ خلیل اللہ کے استعمال میں تھا۔ اس عمارت میں ایک بڑی محراب ہے جس سے پھاٹک کا راستہ گیا ہے اور پھاٹک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی محرابیں ہیں جن کے پلاستر کے بازو میں بڑے خوبصورت نقش ونگار ہیں۔ عمارت کے اندرونی حصہ میں ایک بڑا ہال ہے جو ستونوں کے ذریعہ سے تین حصوں میں منقسم ہے اور درمیان میں "ایک لکڑی کا تخت ہے جو محرم کے زمانہ میں بعض شیعہ رسوم کے لیے استعمال ہوتا ہے[5]۔"

افسوس ہے کہ علاء الدین نے جو محل باغ بیدر کے شمال مشرق میں چند میل کے فاصلے پر منجرا دریا کے کنارے نعمت آباد یا نعمت اللہ آباد میں تعمیر کیا تھا اور جو احمد اول اور شاہ خلیل اللہ کرمانی کی ملاقات کی جگہ تھی اُسے محفوظ کرنے کی ابھی تک کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔ اس محل کی تعمیر وجے نگر کی مہم کے بعد ہوئی تھی۔ احمد دوم کی زندگی بھر نعمت آباد عملاً دارالسلطنت رہا اور کہا جاتا ہے کہ اس کے گرد جلد ہی امرا اور رؤسا کے محلات بن گئے —— افسوس ہے کہ علاء الدین کے چچا کے تعمیر کردہ فیروز آباد کے دوسرے محلوں کی طرح یہ محل بھی کھنڈر ہوتا جا رہا ہے اور دراصل اب ایک شہ نشین اور باغ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا ہے اور اگر اُن کی حفاظت کا کچھ انتظام نہ ہوا تو یہ بھی ختم ہو جائیں گے[6]۔ ایک اور عمارت جو ختم ہو گئی ہے علاء الدین احمد کا تعمیر کردہ عالی شان شفاخانہ تھا جو دارالسلطنت میں تعمیر ہوا تھا اور جس کی دواؤں اور بیماروں کے کھانے پینے کے اخراجات کے لیے کئی گاؤں کی آمدنی وقف کی گئی تھی۔ اس میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے مسلمان اور ہندو حکیم اور وید مامور تھے۔

دکھن کی تعمیرات پر ایرانی اثر کی چھاپ کی ایک مثال وہ خوبصورت سا مینار ہے جو اس پہاڑ کے دامن میں ہے جس پر دولت آباد کا قلعہ ہے اور جسے چاند مینار کہتے ہیں۔ یہ ایک اکیلا مینار ہے جو ۸۲۹ھ (۱۴۲۵ء) میں خالص ایرانی طرز پر تعمیر ہوا۔ یہ مینار اسی طرح کے دو اور میناروں کی طرح یعنی ایک بیدر میں محمود گاواں کے مینار کی طرح جو ۸۷۶ھ (۱۴۷۲ء) میں تعمیر ہوا اور رائچور میں ایک مسجد کے مینار کی طرح جو ۹۱۹ھ (۱۵۱۶ء) میں تعمیر ہوئی بالکل مدور ہے جس کے گرد ہوا اور روشنی جانے کے لیے اور موذن کے اذان کہنے کے لیے برآمدے نکلے ہیں۔ یہ تینوں مینار جو پچھتر برس کے اندر تعمیر ہوئے نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج پتلے ہوتے گئے ہیں تاکہ اوپر کا حصہ بھاری نہ ہو جائے اور تینوں پر بہمنی طرز کا گنبد ہے۔ میناروں کی تعمیر کا یہ طرز اُن دو میناروں میں بھی ہے جو بیجاپور کے یوسف عادل شاہ کے تعمیر کردہ گلبرگہ کے روضہ شیخ میں ہیں لیکن ان میں کسی حد تک اس لیے تبدیلی ہو گئی ہے کہ ان پر خالص ہندوستانی اثر بھی آگیا ہے[7]۔

عام کلچر

اپنے انتقال سے پہلے سلطان نے اپنے سب سے بڑے لڑکے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور بستر مرگ پر بلا کر اُسے ہدایت کی کہ جب اس کے جانشین ہونے کا وقت آئے تو اُسے کوئی فیصلہ بغیر شاہی مشیروں کی رائے لیے ہوئے نہ کرنا چاہیے اور ان لوگوں کی رائے نہ ماننا چاہیے جو اپنی غرض کے بندے ہوں۔[۸] یہ وہ نصب العین تھا جو بادشاہ کے پیش نظر تھا مگر جس پر کمزور دل کا ہونے کی وجہ سے وہ عمل نہ کر سکا۔

شاید اس کی ایک وجہ ملک کی متلون فضا تھی جس سے اہل علم کی کثیر تعداد جو محمد دوم کے زمانہ سے برابر آ رہی تھی علاء الدین کے عہد حکومت میں کم رہی۔ تاہم اہل علم کی کشش کی جو بہمنی روایات تھیں وہ کسی حد تک قائم رہیں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شیخ ابراہیم بن شیخ فتح اللہ قادری ملتان سے آئے اور اپنی کتاب معارف العلوم جس میں انھوں نے تمام معلومہ علوم کی فہرست اور اُن کی تشریح دی ہے سلطان کے نام پر معنون کی۔[۹] ایک دوسرے اور ان سے زیادہ بلند مرتبہ شخص جو احمد دوم کے عہد میں بیدر آئے اور یہیں بس گئے وہ محمود گاواں تھے جنھوں نے آگے چل کر بحیثیت وزیر، سالار فوج، مشیر شاہی، اہل علم و ادب اور شہید کے ناموری حاصل کی۔ ۸۵۶ھ (۱۴۵۳ء) میں جب وہ بحیثیت تاجر کے مصطفےٰ آباد دابول میں اُترے اور محمد آباد بیدر پہنچ کر شاہ نعمت اللہ کرمانی کے پوتے شاہ محب اللہ کی قدمبوسی حاصل کی تو وہ بیالیس سال کی ادھیڑ عمر تک پہنچ چکے تھے۔[۱۰] شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری کی ترغیب یقیناً اس لیے ہوئی ہوگی کہ یہ بادشاہ کے داماد بھی تھے اور بیدر میں ان کے کئی ہم وطن بھی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ وہ بندرگاہ کے شہر کے گورنر کا سفارشی خط بھی لائے تھے مگر ان کی رسائی شاہی دربار میں بڑی مشکل سے ہوئی۔ تاہم اپنی فطری صلاحیتوں سے انھوں نے جلد ہی عروج حاصل کر لیا اور بادشاہ کا اعتماد اور لطف و کرم حاصل کر لیا۔ چنانچہ جلاوطنی کا "زخم شاہی مہر و عنایت کے مرہم سے بالکل مندمل ہو گیا"[۱۱] اور وہ بیدر کو اپنا وطن سمجھ کر وہیں بس گئے اور بہمنی سلطنت کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔

صلح و جنگ کے فنون

حسن اتفاق سے ہمارے پاس ہندوستانی زندگی کے بعض پہلوؤں کا مفصل حال ایک اطالوی سیاح نیکولو کونٹی کا لکھا ہوا موجود ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں آیا تھا۔ ہندوستانی

جہازوں کا چشم دید حال جو اُس نے لکھا ہے وہ ہمارے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہے اس لیے کہ اُس نے دکھن کے بندرگاہوں پر یہ جہاز لنگر انداز دیکھے ہوں گے اُس کا بیان ہے کہ یہ جہاز بہ نسبت اٹلی کے جہاز سازی کے کارخانوں کے بنے ہوئے جہازوں سے زیادہ بڑے ہیں اس لیے کہ اُن میں سے ہر ایک میں پانچ پانچ بادبان اور اتنے ہی مستول ہیں۔ ان جہازوں کا نچلا حصہ طوفانوں کے زور کا مقابلہ کرنے کے لیے جن کی برسات کے موسم میں کثرت ہوتی ہے تہرے تختوں کا بنا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان میں سے بعض اس طرح کے بنے ہیں کہ اگر ان کا کوئی حصہ طوفان میں ٹوٹ جائے تو باقی حصہ سلامتی سے بندرگاہ تک پہنچا دے گا۔

فنونِ جنگ کے متعلق کونٹی نے لکھا ہے کہ فوج، تیر، تلوار، بازوبند، مدور ڈھال اور تیر کمان استعمال کرتی ہے۔ وسط ہند کی فوجوں کے متعلق خصوصاً وہ کہتا ہے کہ وہ محاصرہ کے اوزاروں کے ساتھ منجنیق اور بم پھینکنے کی مشین استعمال کرتے ہیں۔ یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ وبائی امراض کا پتہ نہ تھا اور لوگ "ایسی بیماریوں میں نہیں مبتلا ہوتے تھے جن سے آبادی کا صفایا ہو جاتا ہے جیسا ہمارے ملک میں ہوتا ہے"[۱۱۲]

ب۔ سیاسی حالات

اپنے والد کے انتقال پر علاء الدین ظفر خاں تخت نشین ہوا اور علاء الدین احمد کا لقب اختیار کیا۔ انتقال کے تیسرے دن اُس نے اپنے والد کا سیوم کیا اور ان کے نام سے خیرات تقسیم کی جس کے بعد اُس نے تخت نشینی کی تقریب کی جب کہ اس کے داہنی طرف شاہ خلیل اللہ اور بائیں طرف سید حنیف تھے[۱۱۳] محمد اوّل کے بعد سے بہمنی سلطنت میں جو تغیر ہوا وہ یہ تھا کہ محمد اوّل نے تو اپنے خسر کو بھی دربار میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی مگر احمد دوم نے نہ صرف اپنا سہارا دینے والے دو بزرگوں کو بلکہ دوسرے سادات اور اہل علم جیسے قاضی قبول احمد صدر جہان اور اس رتبہ کے دوسرے لوگوں کو کرسیاں دیں۔ یہ مبارک تقریب بادشاہ کی سلامتی اور اقبال مندی کی دعا پر ختم ہوئی[۱۱۴]

نئے بادشاہ نے دلاور خاں افغان کو وکیل یا وزیر اعظم بنایا اور خواجہ جہان استر آبادی کو وزیر اور عماد الملک غوری کو امیر الامرا۔ اپنے چھوٹے بھائی محمد کو جو اپنے باپ کا چہیتا تھا اُس نے بہت بڑی جاگیر اور کئی ہاتھی دیے۔ اس طرح نئے بادشاہ نے اپنے والد کی اس خواہش کی تعمیل کی کہ اس کے انتقال کے بعد اس کی اولاد کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

وجے نگر

علاء الدین کو کئی مہمیں نہ صرف وجے نگر اور تلنگانہ کی ہندو سلطنتوں کے خلاف بلکہ گجرات، خاندیش اور مالوہ کی مسلم حکومتوں کے خلاف بھی کرنی پڑیں۔ وجے نگر سے پہلی لڑائی ۸۳۹ھ (۱۴۳۶ء) میں حسب معمول خراج کی عدم ادائیگی پر ہوئی جو پانچ سال سے باقی تھی[15]۔ بادشاہ نے اپنے بھائی محمد خاں اور امیر الامرا عماد الملک کو باصرار خراج کا مطالبہ کرنے روانہ کیا۔ مطالبہ موثر ہوا اور رائے نے فوراً سلطان کو آٹھ لاکھ ہن، بیس ہاتھی اور دو سو رقص و سرود میں ماہر عورتیں بھیج دیں۔

اس مختصر لیکن کامیاب مہم نے اسی سال اُس کے بھائی محمد خاں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ صورت یہ ہوئی کہ وجے نگر سے واپس ہوتے ہوئے شہزادہ نے چند دن مدصول میں قیام کیا اور وہاں وہ ان لوگوں کے جال میں پھنس گیا جو سلطنت کے دشمن تھے۔ اُس سے خود اس کی فوج کے بعض غیر مطمئن افسروں نے کہا کہ اس کے والد کی یہ وصیت تھی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حکومت کرے لیکن اس کے بھائی نے اُسے دوسرے درجہ کے کام میں لگا دیا اس لیے یہ بالکل حق بجانب ہے کہ وہ سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ کرے اور اُسے نصف سلطنت دی جائے یا اُس کے لیے دوسرا تخت فیروزہ بنا کر رکھا جائے اور کوئی فیصلہ بغیر اس کی رضامندی کے نہ کیا جائے۔ شہزادہ اس تجویز کی چال میں آگیا اور پرانے وفادار عماد الملک کو قتل کر دیا اور وجے نگر سے بھی مدد مانگ لی۔ دیو رائے جس نے شاید خود ہی اس سازش کی ترغیب دی تھی فوراً محمد کو مطلوبہ امداد دے دی اور اس طرح جو مقصد اُسے میدان جنگ میں نہ حاصل ہو سکا تھا، اُسے ہیر پھیر سے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ شہزادہ نے فوراً مدگل، رائچور، شولاپور، نلدرگ جیسے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور کرشنا ندی کے کنارے ایک مقام پر اپنے سر پر تاج بھی رکھ لیا۔ یہ حالات سن کر سلطان سخت متفکر ہوا اور اپنے بھائی سے نپٹنے خود دارالسلطنت سے روانہ ہو گیا۔ لڑائی میں محمد کو شکست ہو گئی اور وہ جنگل کی طرف بھاگا۔ سلطان کی فوج نے اس کا تعاقب کیا مگر اس کی سختی سے ہدایت کر دی کہ شہزادے کی ذات کو بالکل کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ بالآخر شہزادے نے ہتھیار ڈال دیے اور سلطان سے معافی کا خواستگار ہوا اور دونوں بھائیوں میں ایک معاہدہ ہوا جس کے بموجب سلطان نے شہزادہ داؤد کی جگہ جس کا انتقال ہو گیا تھا محمد کو راجہ چال کی جاگیر دے دی[16]۔

سلطان کی قسمت نے اُس وقت بھی یاوری کی جب اُس نے وزیر اعظم دلاور خاں کو ایرانی

نوروز کے دن خلعت دے کر ۸۴۰ھ میں (یکم ستمبر ۱۴۳۶ء کو)[17] سنگ میشور اور راینل کے راجاؤں کے خلاف روانہ کیا۔ لڑائی کچھ زیادہ نہیں ہوئی اور دلاور خاں راجہ کی حسین اور باکمال لڑکی کو لے کر واپس ہوا جس کے ساتھ سلطان نے باضابطہ شادی کر لی اور اُسے زیبا چہرہ کا خطاب دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلاور خاں پر کچھ شبہہ تھا کہ اُس نے رشوت لے لی اور جب اُس نے محسوس کیا کہ سلطان ناراض ہے تو اُس نے مہر وزارت واپس کر دی اور سلطان نے اس کی جگہ حبشی دستور الممالک کو وکیل یا وزیر اعظم مقرر کیا لیکن یہ وزارت بھی مختصر رہی اس لیے کہ وہ غیر ہر دلعزیز ثابت ہوا اور شہزادہ ہمایوں کے اشارے پر جسے اُس نے ناراض کر دیا تھا، وہ قتل کر دیا گیا۔ اب سلطان نے میاں مناع اللہ کو جو "اس عہد کا ہوش مند ترین انسان تھا" وزیر اعظم مقرر کیا۔[18]

خاندیش

اس کے جلد ہی بعد ۸۶۱ھ (۱۴۵۷-۵۸ء)[19] میں اُسے خود اپنے خسر خاندیش کے ناصر خاں فاروقی سے جنگ لڑنا پڑی۔ بات یہ ہوئی کہ جب سے سلطان نے سنگ میشور کے رائے کی لڑکی زیبا چہرہ سے شادی کی تھی اس وقت سے محل شاہی کے اندرونی حالات کچھ خوشگوار نہ تھے اور اُس کی سوت آغا زینب کو جسے سلطان نے اپنی تخت نشینی پر ملکہ جہاں کا خطاب دیا تھا، شکایت رہتی تھی۔ ملکہ جہاں نے اپنے باپ سے شکایت کی کہ اس کا شوہر اُس سے بُرا برتاؤ کرتا ہے اور ناصر خاں نے اپنے مربّی گجرات کے احمد شاہ کی مدد سے اور راجہ گونڈوانہ کی سرگرم امداد سے فوج لے کر برار پر چڑھائی کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ برار کے امرا میں کچھ بے اطمینانی تھی اور ان میں ناصر خاں کو فوراً ہی ایک جماعت مل گئی جس نے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کی اولاد ہونے کے سبب سے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ برار کے کمان دار خان جہان عبدالقادر کو نرنالہ میں قلعہ بند ہونا پڑا اور اُس نے فوراً مدد کے لیے سلطان کو پیغام بھیجا۔ اس دوران میں ناصر خاں آگے بڑھتا چلا گیا اور صوبہ کی بڑی مسجدوں میں جمعہ کے دن اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

علاء الدین احمد کو جب یہ تشویش انگیز خبر ملی تو اس نے سلطنت کی حفاظتی تدابیر پر غور کرنے کے لیے محمد آباد بیدر میں مجلس شوریٰ منعقد کی جس میں جلد ہی دونوں فرقوں کا اختلاف نمایاں ہو گیا اس لیے کہ حبشیوں اور دکھنیوں نے کہا کہ سابق حکمران کے عہد میں مہایم کے سلسلہ میں جو صورت پیدا ہوئی تھی اُس کے بعد گجرات، مالوہ اور گونڈوانہ کی متحدہ افواج پر غلبہ پانا مشکل ہے۔ ملک التجار خلف حسن نے جواب دیا کہ

مہایم میں بہمنی افواج کی شکست کی وجہ محض نو واردوں اور پرانے آنے والوں کے درمیان اختلاف تھا اس لیے کہ نو وارد جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تھے ان سے پرانے آنے والے متفق نہ تھے اور اب اگر سلطان صرف نو واردوں کو خاندیش کی افواج کے مقابلہ پر جانے کی اجازت دے تو کامیابی کی قوی امید ہے۔ دکھنی جماعت نے بھی میاں مناع اللہ اور خان زمان کی قیادت میں طنزاً اس سے اتفاق کیا کہ صرف نو واردوں ہی کو شمال کی طرف بھیجا جائے[۲۱]۔ سلطان نے قاسم بیگ صف شکن، قرا خان کرد، علی خاں سیستانی، افتخار الملک ہمدانی، رستم خاں زندرانی، حسین خاں بدخشی، خسرو خاں ازبک، مجنوں سلطان چنگیزی، شاہ قلی سلطان اور دیگر آزمودہ اور لائق افسروں کو روانگی کا حکم دیا اور خود اپنے باڈی گارڈ کے تین ہزار منتخب آدمیوں کو جو سب مغل تھے، ان کے ساتھ کر دیا۔

خلف حسن پہلے دولت آباد گیا اور وہاں گجرات کی طرف کی سرحد کی حفاظت کے لیے دکھنیوں اور حبشیوں کو مامور کیا اور خود ... عربوں کے ساتھ برار کی طرف روانہ ہوا۔ اب خان جہان بھی نرنالہ کے قلعے سے باہر آگیا اور مہکار میں خلف حسن کے ساتھ مل گیا۔ خلف حسن نے خان جہان اور بعض دکھنی دستوں کو شمال کی طرف سے راجہ گونڈوانہ کے متوقع حملے کو روکنے کے لیے ایلچ پور اور ملاپور روانہ کیا اور خود روہنکار کی طرف بڑھا جہاں ناصر خاں خیمہ زن تھا۔ روہنکار گھاٹ پر لڑائی ہوئی جس میں خاندیش کی فوج کو کامل شکست ہوئی اور ملک التجار نے اس کا دار السلطنت برہان پور تک تعاقب کیا[۲۲] لیکن عین اس وقت جب کہ فتح بالکل ہاتھ میں آگئی تھی خلف حسن نے سُنا کہ مالوہ کی فوج ناصر خاں کی مدد کے لیے نند دربار اور سلطانپور میں گجرات کی فوجوں سے مل گئی ہے، چنانچہ وہ بہت تیزی کے ساتھ لالنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ فریقین میں جو جنگ ہوئی اُس میں ناصر خاں اور اُس کے حامیوں کو کامل شکست ہو گئی اور وہ ستر ہاتھی اور بکثرت مال غنیمت میدان میں چھوڑ کر پسپا ہو گئے[۲۳]۔

اپنے مقاصد حاصل کر کے ملک التجار دکھن کی طرف واپس ہو گیا۔ ناصر خاں شکست سے دل شکستہ ہو کر فوت ہو گیا اور اس کا لڑکا میراں عادل خاں جو مالوہ کے ہوشنگ شاہ کا بھانجا تھا خاندیش کے حکمران کی حیثیت سے اس کا جانشین ہوا۔ اُس نے اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ پا کر دکھن سے فوراً صلح کر لی[۲۴]۔

فاتح فوج جب واپس پہنچی تو دار السلطنت میں بڑا جشن منایا گیا اور خلف حسن کے استقبال کے لیے سلطان خود دار السلطنت سے سات میل باہر آگیا۔ بادشاہ نو واردوں سے بہت خوش ہوا اور اپنی ایک لڑکی چنگیزی شہزادہ شاہ قلی سلطان سے بیاہ دی۔ اس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ آیندہ سے شاہی جلوس اور خود دربار میں نو وارد بادشاہ کے داہنی طرف رہیں اور پرانے آنے والے بائیں طرف، جس سے ملک کی آبادی کے

دو فرقوں کے درمیان مستقل اختلاف کی خلیج اور گہری ہو گئی ۸۲۵ھ

وجے نگر سے پھر جنگ

شہزادہ محمد کے ہاتھوں وجے نگر کے رائے کو جو شکست ہوئی تھی اس کی کسک سے وہ تلملا رہا تھا اور مزید براں شہزادہ محمد کو اس کے بھائی کے خلاف بھڑکانے کے سلسلہ میں بھی اُسے ناکامی ہوئی تھی چنانچہ تقریباً ۱۴۴۳ء میں اس نے اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ ان سب باتوں کا سبب شاید میدان جنگ میں اس کی کمزوری ہے اور اس نے اپنی فوجوں کی اصلاح شروع کر دی۔ ان اصلاحات کی صورت اور انداز بہت دل چسپ ہے اور اس سلسلہ میں فرشتہ کے انگریزی ترجمان کی پوری عبارت درج کر دینا مناسب ہوگا :

"اسی زمانہ میں بیجانگر کے دیو رائے نے اپنے امرا اور ممتاز برہمنوں کی ایک مجلس شوریٰ منعقد کی اور اس میں کہا کہ اگرچہ اس کا ملک (کرناٹک) بہمنیوں کے مقابلہ میں وسعت، آبادی اور مالیہ کے حساب سے بہت بڑا ہے اور اس کی فوج بھی بہت بڑی ہے چنانچہ اس نے حاضرین سے یہ خواہش کی کہ وہ اس کی وجہ بتائیں کہ مسلمان کیوں فتحیاب ہیں اور کیوں انھیں خراج دینا پڑتا ہے۔ بعضوں نے کہا دیوتاؤں کا یہ فیصلہ ہے کہ تیس ہزار سال تک ہندوؤں پر اُن کا غلبہ رہے گا جیسا کہ خود اُن کی کتابوں میں لکھا ہے .... دوسروں نے یہ رائے دی کہ مسلمانوں کے غلبہ کے دو اسباب ہیں : اوّل تو یہ کہ ان کے گھوڑے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں ...... دوسرے یہ کہ بہمنی حکمرانوں کی فوج کے ساتھ ہمیشہ ایک جماعت اعلیٰ درجہ کے تیر اندازوں کی ہوتی ہے .... اس پر دیو رائے نے حکم دیا کہ اُس کی فوج میں مسلمان بھرتی کیے جائیں اور انھیں جاگیریں دیں اور شہر بیجانگر میں ان کے لیے ایک مسجد تعمیر کر دی۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ مسلمانوں کو اُن کے مذہبی امور انجام دینے میں کوئی انھیں نہ ستائے۔ مزید براں اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ ایک قرآن بیش قیمت رحل پر اُس کے تخت کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ مسلمان اُس کے سامنے شاہی آداب بجا لانے میں کوئی قباحت نہ محسوس کریں۔ اُس نے تمام ہندو سپاہیوں کو بھی تیر اندازی سیکھنے کی ہدایت کی.... جلد ہی اُس نے یہ انتظام کر لیا کہ دو ہزار مسلمان اور ساٹھ ہزار ہندو تیر اندازی میں

> ماہر جمع کیے جا سکیں، علاوہ اسّی ہزار رسالہ اور دو لاکھ پیادہ فوج کے جو حسب معمول بھالے برچھوں سے مسلح ہوں۔[26]

اب یہ صورت پیش آئی کہ تقریباً ۱۴۴۲ء کے آخر یا ۱۴۴۳ء کے شروع میں رائے کے ایک بھائی نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا اور وہ مرنے سے بال بال بچ گیا۔[27] وجے نگر کی خاندانی سیاست میں قدرتاً شدید ہنگامہ برپا ہوا اور ممکن ہے کہ سلطان جنوبی سلطنت سے سات لاکھ ٹنکہ کا بقایا خراج وصول کرنے کے لیے حملہ کی تیاری کر رہا ہو۔ رائے نے یہ رقم دینے سے صاف انکار کیا اور اپنے ملک پر حملہ کے بچاؤ کے لیے پیش بندی کی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے سب سے پہلے وِنایک یا وزیر اعظم کو شمال کی طرف بھیجا اور پھر اپنے کو مضبوط سمجھ کر اور نئے طرز کی فوج ساتھ لے کر ۱۴۴۳ء میں اُس نے تنگ بھدرا کو عبور کیا اور مدگل پر قبضہ کر لیا اور اپنے لڑکوں کو رائچور اور بنکاپور پر قبضہ کرنے کے لیے آگے روانہ کیا۔ وہ خود دوآبہ سے گذرتا ہوا کرشنا ندی تک پہنچ گیا اور اس کے ہراول دستے نے نصرت آباد، ساگر اور بیجا پور میں جو کچھ پایا اُسے تباہ کر دیا۔

سلطان کو سخت پریشانی ہوئی اور اُس نے چاروں طرفداروں کو حکم بھیجا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے جتنی بھی فوج جمع کر سکیں، جمع کریں۔ بہمنی افواج کے قریب آنے پر رائے مدگل کی طرف پیچھے ہٹ گیا اور سلطان نے کرشنا کو عبور کر کے اس قلعہ سے تقریباً نو میل کے فاصلہ پر اپنا خیمہ نصب کیا۔ اس نے رائے کے لڑکوں کے خلاف خلف حسن ملک التجار کو دولت آباد کی فوج کے ساتھ روانہ کیا اور خان زمان سرلشکر بیجا پور اور خان اعظم سرلشکر برار کو خود دیو رائے کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ خلف حسن نے رائے کے لڑکے کے ماتحت فوج کا رائچور میں مقابلہ کیا جس میں رائے کا لڑکا زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بنکاپور کی طرف بڑھا مگر اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رائے کا دوسرا لڑکا محاصرہ اٹھا کر جنوب کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مدگل میں جہاں سلطان خود بہمنی فوج کی کمان کر رہا تھا، بہمنیوں نے سخت حملے کیے اور وجے نگر والوں نے سخت چھاپے مارے اور لڑائی کا پلہ کبھی ایک طرف جھکتا تھا اور کبھی دوسری طرف۔ آخر میں سلطان کا ستارہ چمکا اور رائے کی فوجوں کو کھلے میدانِ جنگ میں شکست ہو گئی اور اس کا زخمی لڑکا جو رائچور کا میدان چھوڑ کر بھاگا تھا وہ بھی مارا گیا۔[28]

رائے سخت غمگین ہو کر پھر مدگل کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا اور سلطان کے دو افسروں فخر الملک دہلوی اور اُس کے بھائی کو قید کر لیا۔ یہ سُن کر سلطان نے دیو رائے کو پیام بھیجا کہ اگر یہ دو افسر قتل کر دیے گئے تو موقع آنے پر وہ ان کے بدلہ میں رائے کے دو لاکھ آدمیوں کو تہ تیغ کرنے میں دریغ نہ کرے گا۔ رائے جنگ کو جاری رکھنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا اور اُس نے جواب دیا کہ وہ خراج کی ساری رقم ادا کرنے اور لڑائی بند کرنے

پر تیار ہے بشرطیکہ سلطان یہ وعدہ کرے کہ آیندہ وہ سرحد کو پار نہ کرے گا۔ سلطان اس پر راضی ہوگیا اور معاہدہ پر فوراً دستخط ہوگئے اور فخر الملک خراج کی پوری رقم کے ساتھ سلطان کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔[30]

۲۴ مئی ۱۴۴۶ء کو دیورائے دوم کا انتقال ہوگیا اور ملک ارجن اس کا جانشین ہوا۔[31] دور دراز اڑیسہ میں ایک نئی قوت کپلندر دیو یا کپلیشور کی شخصیت میں اُبھر آئی تھی جس نے شاید بہمنی سلطان کی مدد سے تقریباً ۱۴۳۵ء میں بھانو دیو چہارم کو تخت سے اُتار دیا تھا اور مشہور خانوادہ گج پتی کے حکمرانوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔[32] اس وقت تک کپلیشور نے ساحلی علاقہ کا بہت سا حصہ جو پہلے ریڈیوں کے پاس اور کچھ وجے نگر کے پاس تھا فتح کرلیا تھا اور اس ریاست پر قبضہ کرلیا تھا جس کا دارالسلطنت راجہ مندری تھا نیز کونڈاویڈو کے قلعہ کی بھی تسخیر کرلی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان احمد دوم نے اپنے طاقتور گج پتی ہمسایہ سے اتحاد کرلیا اور اُس نے متحدہ فوجوں کو شکست دے کر اپنے وطن کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔[33]

چاکن کا معاملہ

پہلے کہا جاچکا ہے کہ بدنصیب دلاور خاں کی قیادت میں جو مہم سنگ میشور کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی تھی وہ جلد ہی کامیابی سے ختم ہوگئی تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے بعد سے حالات درست نہیں رہے اور بہمنی سلطنت کے مغربی حصہ میں اکثر بدامنی اُبھرتی رہی۔ ۸۵۰ھ (۱۴۴۷ء) میں سلطان نے خلف حسن ملک التجار کو جو دولت آباد کا کمان دار تھا اس طرف روانہ کیا تاکہ ساحلی علاقہ کے منحرف حکمرانوں کو بشمول سنگ میشور کے جس کے قلعہ کی زبردست فوج سے حفاظت کی گئی تھی اور جس کے گرد گھنا جنگل تھا، خاتمہ کر دیا جائے۔ خلف حسن سات ہزار دکھنی اور تین ہزار عرب رسالہ کو ساتھ لے کر روانہ ہوا اور چاکن کو اپنا مستقر قرار دے کر وہاں ایک مضبوط قلعہ بنالیا۔ خلف حسن کے لیے مقامی حکمرانوں کو زیر کرنا مشکل نہ تھا مگر راجہ شنکر راؤ شرکے نے اُسے بہت پریشان کیا اور بڑی مشکل سے قابو میں آیا۔ جب وہ گرفتار ہوا تو ظاہر میں اسلام قبول کرلیا اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا اور یہ پیش کش کی کہ بہمنی فوج کی رہنمائی کرکے اُس گھنے جنگل سے نکال لے جائے گا جو اس کے جائے قیام اور سنگ میشور کے درمیان حایل ہے۔[34] خلف حسن کا ساتھ ساری فوج نے نہیں دیا اور کہا جاتا ہے کہ کئی حبشی اور دکھنی افسروں نے جنگل کے خطرات جھیلنے سے معذوری ظاہر کی۔ کچھ دُور چل کر نووارد ایک ایسے گاؤں میں پہنچے جو ایک خلیج کے کنارے واقع تھا اور جس کے باقی تین طرف بہت بلند پہاڑیاں تھیں۔ عین اس وقت خلف حسن سخت پیچش میں مبتلا ہوگیا اور ساری فوج بہت تھک گئی تھی۔ اس دوران میں چالاک شرکے نے سنگ میشور کے راجہ کو

اطلاع دے دی جس نے فوراً تیس ہزار نیزہ بردار پیادہ فوج اور توپ خانہ اس مقام پر بھیج دیا جہاں خلف حسن خیمہ زن تھا۔ رات کی تاریکی میں ایک المناک ڈرامہ کھیلا گیا اور ہندوؤں نے بہمنی فوج کو گھیر لیا۔ اور متعدد لڑائیوں کے ہیرو خلف حسن کو جب کہ وہ بیماری میں مبتلا تھا قتل کر دیا اور اُس کے ہزاروں ساتھیوں کو بشمول پانچ سو سادات مدینہ و نجف و کربلا کے مار ڈالا۔[۵۵] جو سپاہی بالکل قلیل تعداد میں اس قتل عام سے بچ گئے تھے وہ کسی نہ کسی طرح اس خونیں منظر سے نکل بھاگے اور چاکن واپس پہنچ کر ان دکھنیوں سے واقعہ بیان کیا جو پیچھے رہ گئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بیوقوف نووارد کی زبان سے یہ نکل گیا کہ چونکہ یہ حادثہ نوواردوں اور دکھنیوں کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے پیش آیا اس لیے بادشاہ کو اطلاع دینا چاہیے کہ دکھنیوں نے ساتھ نہیں دیا اور انھیں معلق چھوڑ دیا۔ دکھنیوں کو سخت تشویش ہوئی اور انھوں نے اس کی پیش بندی کے لیے خفیہ طور پر محمد آباد بیدر کو لکھا کہ نووارد باوجود ان کے احتجاج اور انتباہ کے ایک مجنونانہ تجویز پر عمل کر کے گھنے جنگل میں چلے گئے اور سلطان کے نام کو داغ لگایا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ حادثہ کے بعد انھوں نے سلطان کو اطلاع دینے کے لیے کہا مگر اس کے بجائے یہ چاکن کے قلعہ بند ہو گئے اور یہ اشارہ بھی کر دیا کہ شاید وہ خود کو کونکن کے حکمرانوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔

یہ اطلاع دو بھائیوں سالار حمزہ مشیر الملک اور راجہ رستم نظام الملک دکھنی کے ہاتھ بھیجی گئی جنھوں نے احمد دوم سے اس وقت کہا جب وہ شراب کے نشہ میں تھا اور اس نے فوراً مشیر الملک کو حکم دیا کہ باغیوں کا صفایا کر دیا جائے۔ یہ احتیاط کر لی گئی کہ نوواردوں کی کوئی عرضی بیدر تک نہ پہنچ پائے۔ اب مشیر الملک نے بے سہارے نوواردوں کا چاکن کے قلعہ میں محاصرہ کر لیا اور سلطان کو یہ اطلاع دی کہ انھوں نے اُس کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے اور گجرات کی سرحد میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اس پر سلطان سخت برہم ہوا اور حکم دیا کہ ان میں سے ایک ایک کو قتل کر دیا جائے۔

محصور نوواردوں نے جب یہ دیکھا کہ خوراک کا ذخیرہ کم ہو رہا ہے تو انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اپنے بیوی بچوں کو قلعہ میں چھوڑ کر محاصرین پر ٹوٹ پڑیں اور رزم۔ تر کھیتے بیدر پہنچ جائیں۔ اس پر پرانے آنے والوں نے ایک ہولناک چال چلی اور محصورین کو یہ پیام بھیجا کہ وہ ان کے ہم مذہب ہیں اور انھیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے ہیں۔ اسی دوران میں مشیر الملک اور باقی لوگ قلعہ کے اندر گھس گئے اور کہا کہ وہ بحیثیت دوست کے آئے ہیں۔ تیسرے دن انھوں نے بدنصیب نوواردوں کو پھسلا کر دعوت کے بہانے اپنے کیمپ میں بلایا اور جب وہ کھانے میں مصروف تھے تو مرد عورت بچے سب کو چُن چُن کر قتل

کر دیا جس میں "ایک ہزار سے اوپر کربلا، نجف اور مدینہ کے سادات بھی تھے"[۳۶]

لیکن کچھ مغل جو قاسم بیگ صف شکن کی قیادت میں تھے وہ اس قتل عام کے منظر سے دور جا چکے تھے اور مقتولین میں شامل نہیں ہوئے تھے چنانچہ ان لوگوں نے اپنی عورتوں کو مردانے کپڑے پہنائے اور انھیں ساتھ لے کر جتنی تیزی سے ہو سکا دارالسلطنت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پیچھے پیچھے دو ہزار سواروں کا ایک دستہ جو انھیں پکڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا ان کا تعاقب کر رہا تھا مگر خوش قسمتی سے انھیں ایک دوست بیڑ کا کماں دار حسن خاں مل گیا جس نے مشیر الملک کے پیامبر سے کہا کہ اگر نو وارد سلطنت کے دشمن ہوتے تو وہ دارالسلطنت کی طرف بھاگنے کے بجائے فوراً گجرات چلے گئے ہوتے۔

بالآخر یہ جماعت بیدر پہنچ گئی اور سلطان سے اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا۔ جب بادشاہ کو صحیح صورت حال نہ صرف ان لوگوں سے بلکہ شاہ نعمت اللہ کرمانی کے خاندان سے بھی معلوم ہوئی تو جن دکھنی لیڈروں نے بادشاہ کو غلط اطلاع دی تھی انھیں اس نے سخت سزائیں دیں۔ اس نے حکم دیا کہ مصطفٰے خاں جو عرضیوں کا انچارج تھا اور ان عرضیوں کو اس کے پاس نہیں پہنچنے دیا تھا اُسے فوراً قتل کیا جائے اور اس کے سر کو شہر میں گشت کرایا جائے[۳۷] اور یہ بھی حکم دیا کہ چاکن میں جو پرانے آنے والے ہیں انھیں پابزنجیر کر کے محمد آباد بیدر لایا جائے۔ سلطان نے نو واردوں کو اعلیٰ اعزاز اور عہدوں پر ترقی دی اور قاسم بیگ کو مرحوم خلف حسن بصری کی جگہ ملک التجار کا خطاب دے کر دولت آباد کا سرِ لشکر بنایا۔ دکھنی جماعت سے بادشاہ اتنا برہم ہوا کہ جب اُسے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں شیخ آزری کا طویل خط ملا جو اس وقت خراسان میں تھے تو اس نے بیشتر قیدیوں کو قتل کرا دیا اور دوسروں کو معزز اور ذمہ داری کے عہدوں سے برطرف کر دیا جن میں سب سے ممتاز خود وزیر اعظم میاں مناع اللہ تھا[۳۸]

تلنگانہ اور مالوہ

اس کے بعد احمد پانچ سال تک اور حکمران رہا مگر اس دوران میں صرف دو ایک اہم واقعات پیش آئے۔ تلنگانہ میں حالات بیشتر پُر امن رہے جب تک کہ اس کے برادر نسبتی جلال خاں نے بغاوت نہیں کی۔ یہ خبر اُڑی کہ ایک مزمن جلدی مرض میں جس میں سلطان کئی سال سے مبتلا تھا اُس کا انتقال ہو گیا اور نیز ولی عہد سلطنت شہزادہ ہمایوں کی غیر ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھا کر ۸۵۹ھ (۱۴۵۵ء) میں نلگنڈہ میں جہاں اُس کی جاگیر تھی جلال خاں نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ جب بادشاہ وہاں پہنچا تو جلال قلعہ کے اندر قلعہ بند ہو گیا اور اُس کا لڑکا سکندر تیزی سے ماہور کی طرف محمود خلجی سے مدد مانگنے روانہ ہو گیا جو ہوشنگ شاہ

کی جگہ اب مالوہ کا حکمران تھا اور اس سے کہا کہ علاء الدین احمد کا انتقال ہوگیا ہے اور اس سے استدعا کی کہ بہمنی حکومت سے جان و مال کا جو خطرہ ہے اُس سے اُس کی حفاظت کی جائے۔ محمود اپنے عہد کا بڑا حوصلہ مند اور بارسوخ حکمران تھا اور ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا۔[49] اُس نے خاندیش کے حکمران مبارک خاں سے اتحاد کیا اور ۸۶۰ھ (۱۴۵۶ء) میں سرحد پار کرکے ماہور پہنچ گیا جہاں اُس سے سکندر مل گیا۔ احمد دوم ۸۰۰۰۰ کی زبردست فوج لے کر نلگنڈہ سے ماہور گیا اور ملک التجار قاسم بیگ کو دولت آباد کی فوج کے ساتھ مالوہ کی فوج کے مقابلہ پر بھیجا اور برار کی فوجوں کو خاندیش کے مبارک کے خلاف روانہ کیا اور خود بیجاپور کی فوجوں کے ساتھ تقریباً آٹھ میل کے فاصلہ پر قیام کیا۔[50] محمود کو جب یہ معلوم ہوا کہ احمد کے انتقال کی خبر اُسے غلط دی گئی ا۱ اپنی ۵۰ ہزار کی مختصر فوج سے بہت بڑی فوج کا مقابلہ کرنا ہے تو اُس نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا اور ایک ہزار فوج کا ایک دستہ بظاہر سکندر خاں کی حفاظت کے لیے لیکن دراصل اس بات کی نگرانی کے لیے کہ سکندر بہمنی سلطان سے نہ مل جائے چھوڑ گیا۔

اس اثنا میں علاء الدین احمد نے نووارد محمود گاواں[51] کو ۱۰۰۰ کا منصب دار بنا کر نلگنڈہ میں جلال خاں کی بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا۔ نئے کمان دار نے نلگنڈہ پہنچ کر فوراً قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس دوران میں سکندر مالوہ کی فوج کی قید سے نجات حاصل کرکے اور اپنی بے بسی محسوس کرکے تیزی سے نلگنڈہ کی طرف بھاگا اور محمود گاواں سے معافی کا وعدہ لے کر اپنے باپ کو آمادہ کیا کہ قلعہ بہمنی کمان دار کے حوالے کردے۔ بادشاہ کی یہ بڑی نیک دلی تھی کہ باوجود باپ اور بیٹے کی مغویانہ حرکت کے دونوں کو معاف کردیا بلکہ نلگنڈہ کی جاگیر بھی جلال خاں کے پاس رہنے دی۔ یہ دراصل محمود گاواں کی مصالحت اور رواداری کی نئی پالیسی کا آغاز تھا جو اس وقت تک قائم رہی جب تک سیاسی معاملات میں اُس کا دخل رہا اور چوتھائی صدی سے زیادہ تک ملک کی مستحکم اور بنیادی پالیسی رہی۔

تلنگانہ کے بیچ قلب میں اس سنگین بغاوت کے باوجود بعض مقامی ریڈی حکمرانوں اور خصوصاً لنگا سوم نے اپنی حد سے باہر ہوکر "سلطان کو پرچانے" کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک حکمران مسمی مدودھا کا کو شکست دے دی جس کا رجحان سلطان کے خلاف تھا اور بھونداری قلعہ کی دیوار پار کرلی جس وقت جلال خاں نے علم بغاوت بلند کیا۔ لنگا نے سکندر سے کہا کہ وہ فوراً آسی نادو سے چلا جائے جو اس کی جاگیر میں تھا اور جہاں سکندر مقیم تھا اسی کے ساتھ یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ لنگا کے ماسوا بہمنیوں کے سامنے تنہا تلنگانہ کا مسئلہ نہ تھا اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بھونگیر کا قلعہ قبل ازیں کہ وہ تلنگانہ کے سرلشکر کی حیثیت سے سنجر خاں کو سپرد کیا جائے اُسے حملہ کرکے تسخیر کرنا پڑا[52] معلوم ہوتا ہے کہ اڑیسہ کے گج پتیوں نے بھی کچھ

مظاہرہ قوت کا کیا۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۵۵ء میں کپلیشور بیجواڑہ اور کونڈاپلی کے قرب و جوار میں حکمران تھا اور اپنی سلطنت کانچی تک بڑھائی تھی۔[43] یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سنجر خاں نے مشرقی ساحل پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر سلطان نے اُسے فہمائش کی کہ ایسے حکمران کے خلاف جنگ آسان نہیں ہے "جس کے پاس دو ہزار سے اوپر ہاتھی ہوں جب کہ پوری بہمنی فوج میں دو سو ہاتھی بھی نہیں ہیں" تاہم یہ ممکن ہے کہ اڑیسہ کے گجپتی حکمران اور بہمنیوں کے مابین کچھ آویزش ہوئی ہو جس میں کہا جاتا ہے کہ اڑیسہ کے کمانڈار راہو تنیا نے "دو ترکشار ئیسوں" کو شکست دی مگر اس مہم کے بارے میں ہمیں کچھ اور نہیں معلوم ہے۔[44]

تلنگانہ کی مہم میں اور مالوہ کے خلاف سلطان نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ اس کی پنڈلی میں جو مزمن زخم تھا اور جسے وہ برداشت کر رہا تھا وہ روز بروز بگڑتا گیا اور اس کی جلد موت کا باعث ہوا جو ۱۸ جمادی الثانی ۸۶۲ھ (۳ اپریل ۱۴۵۸ء) کو واقع ہوئی۔[45]

بادشاہ کا کردار

علاء الدین احمد کے کردار میں بعض خوبیاں تھیں۔ اس کی ہمدردانہ صفات کا اظہار اس سلوک سے ہوتا ہے جو اُس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا جن سے اسے ہمدردی اور اُنسیت تھی۔ یہ تو اُس کے لیے ممکن نہ تھا کہ شہزادہ محمد کو شریک حکومت بناتا لیکن یہ قابل لحاظ بات ہے کہ باوجودیکہ اُس نے غیر مطمئن افراد کے کہنے سننے میں آکر اور شاید وجے نگر کے ورغلانے سے ناکام بغاوت کی تاہم اُس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا گیا اور بادشاہ نے اُسے معقول جاگیر دے دی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے تخت و سلطنت کو بچانے کے لیے مالوہ کے محمود خلجی سے جنگ کرتا ہے جسے سکندر خاں نے اپنی مدد پر بلایا تھا۔ مگر جب خطرہ گذر جاتا ہے تو محمود گاواں کی سفارش پر وہ اسی سکندر اور اس کے والد جلال کو معاف کر دیتا ہے۔

احمد نے حکومت بڑی اچھی طرح شروع کی اور اپنی حکومت کے ابتدائی دَور میں اس نے سلطنت کے معاملات میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لی۔ اُس نے نظم و قانون کے نفاذ میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی اور ذی علم لوگوں کو پولیس اور جج کی حیثیت سے مقرر کر کے جوئے، شراب نوشی، زنا کاری اور جرائم کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وجے نگر کی دوسری مہم کے بعد وہ سہل انگاری اور تعیش کی زندگی بسر کرنے لگا اور شراب نوشی شروع کر دی جسے اُس نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۲ء) تک ترک نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی حکومت کا اعلےٰ اخلاقی معیار گر گیا اور سلطنت کے معاملات سے اس کی دلچسپی کم ہوتی گئی۔ اس کا واضح ثبوت اس افسوسناک واقعہ سے ملتا ہے کہ اس نے پہلے تو چاکن میں نوواردوں کے قتل عام کا حکم دیا اور پھر دکھنیوں کے قتل عام کا۔

جب اسے شیخ ازری کے خط میں یہ فہمائش ملی کہ وہ ہر کس و ناکس کی بات پر کان دھرنے کو تیار رہتا ہے۔

احمد کو اس کے باپ نے بہت معقول تعلیم دی تھی اور وہ ایسا اچھا خطیب تھا کہ کبھی کبھی وہ دارالسلطنت کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن منبر پر چڑھ جاتا اور فی البدیہ تقریر کر دیتا۔ ایسے ایک موقع پر ایک عرب گھوڑوں کا تاجر سید عجل[46] جامع مسجد میں موجود تھا اور کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ نے خود اپنی پرہیزگاری اور انصاف پسندی کی تعریف کی تو یہ تاجر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے کہا کہ یہ سب جھوٹ ہے اور بادشاہ ظالم بھی ہے اور جھوٹا بھی، اس لیے کہ کیا اُس نے چاکن میں محصور ہزاروں بے قصوروں کے قتل عام کا حکم نہیں دیا تھا؟ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو اس سے اتنی سخت ندامت ہوئی کہ اس کے بعد سے وہ محل سے باہر نہیں نکلا اور جب تحقیقات پر اُسے معلوم ہوا کہ اس شخص کو ان گھوڑوں کی قیمت نہیں دی گئی جو شاہی اصطبل کے لیے خریدے گئے تھے تو اُس نے حکم دیا کہ اس کی پائی پائی فوراً بیباق کی جائے۔ اپنی تعیش کی زندگی کے باوجود وہ آخر عمر تک مستعد رہا اور اس کی جرأت و ہمت کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ جب اُس نے نلگنڈہ اور ماہور میں فوج کشی کی تو وہ ایک مزمن زخم کی تکلیف میں مبتلا تھا اور شاید اسی بے پروائی سے چند ماہ بعد جلد ہی اس کی موت واقع ہو گئی۔

تشریحات

۱۔ احمد اول کا انتقال ۲۹ رمضان ۸۳۹ھ (۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء) کو ہوا۔ اس کے لڑکے احمد دوم نے بقول فرشتہ ۲۳ سال ۹ ماہ ۲ دن حکومت کی اور بقول ہفت اقلیم کے ۲۳ سال ۹ ماہ، جس سے ہم ۲۹ جمادی الثانی ۸۶۲ھ یا یکم رجب ۸۶۳ھ کی تاریخ تک پہنچ جاتے ہیں مگر برہان کے صفحہ ۸۰ میں صاف لکھا ہے کہ اس کا جانشین ہمایوں ۲۲ جمادی الثانی ۸۶۲ھ (۷ مئی ۱۴۵۸ء) کو تخت نشین ہوا۔ اس تاریخ کو ہم احمد دوم کی وفات کی تاریخ کہہ سکتے ہیں، اگرچہ برہان نے صفحہ ۸۰ میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال "جمادی الآخر کے آخر" میں ہوا۔ دیکھو شیروانی کی "سم ایسپیکٹس آف بہمنی کلچر"۔ "اسلامک کلچر" ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۷۔ نیز شیروانی کی "دی بہمنی ہسٹری آف میڈیول دکن" جلد اول باب دوم صفحہ ۱۷۰۔ تشریح ۹۲۔

احمد کا نام عبدالرزاق کی مطلع السعدین، ایلیٹ اینڈ ڈاوسن کتاب مذکور صفحہ ۱۲۱ میں ملتا ہے۔ اس کی تصدیق اس کے سکوں سے ہوتی ہے جن کی عبارت حسب ذیل ہے:

۱۔ اوپر کی طرف: السلطان الحلیم الکریم روف علی عباد اللہ الغنی المبیمنی۔

نیچے کی طرف: ابوالمظفر علاء الدنیا و الدین احمد شاہ بن احمد شاہ الولی البہمنی۔

حاشیہ پر: ضرب بحضرت محمد آباد ۸۵۹ھ

۲۔ اوپر کی طرف: المعتصم باللہ الحنان المنات سمی خلیل الرحمن۔

نیچے کی طرف: علاء الدنیا و الدین احمد شاہ بن احمد شاہ السلطان۔

۳۔ اوپر کی طرف: المتوکل علی اللہ الغنی۔

نیچے کی طرف: احمد شاہ بن احمد شاہ الولی البہمنی۔

عبدالولی خاں۔ کتاب مذکور صفحات ۸۶، ۹۲ و ۹۷۔

سپیٹ کا مضمون کوائنز آف بہمنی کنگس، اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحات ۱۹۱، ۲۹۶ و ۲۹۷۔ طبقات نے صفحہ ۱۱۰ میں سے کہ

اس نے جانشینی پر اپنے باپ کا لقب اختیار کیا۔ آخر میں معاصر ضور الامع جلد دہم صفحہ ۱۴۴ میں ہمایوں کو احمد شاہ کا لڑکا بتایا گیا ہے۔ یہ نام بیدر کے مضافات میں نوآباد بستی کے ایک دروازے پر بھی ملتا ہے۔ ایپی گریفیا مسلیمیکا ۱۹۳۵-۳۶ء صفحہ ۲۵۔

۲۔ اس کی تفصیل اور نیز بعد کے واقعہ کے متعلق دیکھو اسی باب کا حصہ ب۔

۳۔ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ رپورٹ ۱۹۲۸-۲۹ء صفحہ ۱۳، اور ۱۹۳۰-۳۱ء پلیٹ ۹۔ ایپی گریفیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۲۷-۲۸ء صفحہ ۱۳۔ بشیر الدین نے اپنی کتاب واقعات مملکت بیجاپور جلد سوم کے صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ یہ مقبرہ ۱۰۵۶ھ میں تعمیر ہوا تھا جو یقیناً غلط ہے اور اس بنا پر کہ یہ تاریخ شیعی نار علی میں لکھی ہے جو اس کی تعمیر کے ۱۵۰ سال بعد بیجاپور کے حکام نے اضافہ کیا تھا۔ دیکھو اسی کتاب کا صفحہ ۱۲۸ برج علی کی لوح کے لیے۔ ایپی گریفیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۳۱-۳۲ء صفحہ ۲۶۔

۴۔ افسوس ہے کہ ان کھپروں کو اپنی جگہ پر قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور اب بھی دیکھنے والا یہ دیکھ کر سہم جاتا ہے کہ سڑک کے لڑکوں نے کجی ذوق کے اس بے بہا کام کو کتنا برباد کر دیا ہے۔ قلعہ کی کھدائی میں جو خوبصورت نمونے ملے ہیں ان کی چمک بحال کرنے کی محکمہ نے کچھ کوشش کی ہے جیسا کہ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ ۱۹۲۹-۳۰ء کے صفحات ۲۲ و ۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ احمد دوم کے مقبرہ کی رو کار پر جن کھپروں کی زینت ہے انھیں اصلی حالت پر محفوظ کیا جائے۔ دیکھو یزدانی کی "بیدر، انس ہسٹری اینڈ مانومنٹس" مذکورہ بالا۔

۵۔ رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۳۰-۳۱ء صفحہ ۴، اور پلیٹ ۷۔ یزدانی کی کتاب بیدر صفحہ ۱۰۰۔

۶۔ دیکھو برہان صفحہ ۷۷۔

۷۔ بیدر کے اسپتال کے لیے دیکھو برہان صفحہ ۸۷۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۳۳۔ مذکورہ عمارات کے لیے دیکھو رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۹۲۹-۳۰ء صفحہ ۶۔ کتبات اور تاریخ کے لیے دولزلی ہیگ کا مقالہ این انسکرپشن ان دی فورٹ آف دولت آباد۔ ایپی گریفیا انڈو مسلیمیکا ۱۹۰۷-۰۸ء جس میں چاکن کے قتل عام کے متعلق دوررس نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

۸۔ طبقات صفحہ ۱۴۲۔

۹۔ عبدالجبار نے کتاب مذکور کے صفحہ ۵۵۴ میں لکھا ہے کہ خود ان کے پاس اس کتاب کا ایک نسخہ تھا جو ان کے سلسلہ مخطوطات کی لائبریری کے ساتھ دریائے موسی کے سیلاب میں ضائع ہو گیا۔

۱۰۔ رفیع الدین شیرازی نے اپنی کتاب تذکرۃ الملوک کے فولیو ۱۰ ب میں لکھا ہے کہ محمود گاواں احمد اول کے عہد میں ہندوستان آیا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ تمام شہادتیں اس کے ۸۵۶ھ (۱۴۵۳ء) میں آنے کی تائید میں ہیں۔ دیکھو

شیروانی کی کتاب محمود گاواں دی گریٹ بہمنی وزیر صفحہ ۲۲، نوٹ ۲ وصفحہ ۲۶، نوٹ ۱۹۔ محمود گاواں رشت کے قریب قاوان کا رہنے والا تھا اور یہی وجہ اس کے لقب کی ہے لیکن منتخبات جلد سوم صفحہ ۱۰۵ میں ہے کہ وہ گاواں اس لیے کہلاتا تھا کہ ایک مرتبہ اُس نے ۲۰۰۰ گایوں (گاواں) پر جو بعض بنجارے لے جارہے تھے اپنے سپاہیوں کو سوار کیا تھا اور اس طرح دشمن کو مغالطہ دیا تھا لیکن اس کی تصدیق کہیں اور سے نہیں ہوتی اور دراصل گایوں کا یہ قصہ کئی اور جگہ مختلف لوگوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے جیسے خلف حسن بصری کے متعلق اور ہمیں اس کی زیادہ اہمیت نہ دینا چاہیے۔ تذکرہ فولیو ۱۰ اب میں محمود کے بیدر آنے کے متعلق دلچسپ تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس کے پاس مصطفےٰ آباد دابھول کے گورنر کا سفارشی خط سلطان کے نام تھا لیکن سلطان نے محض ایک تاجر کو شرف باریابی بخشنے سے انکار کردیا، اور جب اُس نے چند شاہی درباریوں کو ہموار کر لیا اس وقت جاکر اُسے بادشاہ کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا۔ دستور وقت کے مطابق محمود سلطان کے لیے بہت سے تحفے لے کر گیا اور جس وقت وہ بادشاہ کے قریب پہنچا اُس وقت اس کے سر پر قرآن مجید کی ایک جلد تھی۔ وہ جلد ہی ترقی کرکے بادشاہ کا منظور نظر ہو گیا۔ دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں، پہلا باب۔

۱۱۔ ریاض الانشا، محمود گاواں کے خطوط کا مجموعہ۔ میں نے جو مخطوطہ اس عظیم بہمنی وزیر پر کتاب لکھتے وقت استعمال کیا وہ حبیب گنج لائبریری ضلع علی گڈھ میں تھا۔ اب اس مخطوطہ کو ایس۔ سی۔ حسن نے مدون کر دیا ہے اور ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں تقریباً چھپ چکا ہے۔

۱۲۔ پوگیو براسیولیری کا بیان نیکولو کونٹی کی سیاحت کے بارے میں۔ اس کی کتاب ہسٹوریا ڈی ویریا ٹیٹ فارچون لیب ایو جو میجر ہینگ کی کتاب انڈیا ان دی ففٹینتھ سنچری مطبوعہ لنڈن ۱۸۵۷ء کے صفحات ۳۱ و ۳۲ میں شامل ہے۔ اقتباس از صفحہ ۳۲۔ کونٹی ۱۴۴۱ء میں ہندوستان میں تھا۔

۱۳۔ سید السادات سید حنیف گیلانی کا انتقال طویل عمر پاکر سنہ ۹۰۵ھ میں ہوا۔ دیکھو اُس کنویں کا کتبہ جو اُن کے نام سے منسوب ہے۔ واقعات جلد سوم صفحہ ۱۱۷۔ نیز ایپی گرافیا انڈو مسلیمیکا جس میں مصنف نے غلطی سے لکھا ہے ان کا وطن ترکستان کے شہر گیلان میں تھا۔ نیز دیکھو یزدانی کی کتاب بیدر صفحہ ۲۰۸۔ یہ تاریخی کنواں اب سکھوں کو دے دیا گیا ہے۔

۱۴۔ برہان صفحہ ۷۵۔

۱۵۔ علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ راے نے سابقہ بادشاہ کے انتقال سے فائدہ اٹھا کر تنگ۔ بھدرا کی دوسری طرف انگنڈی پر قبضہ کرلیا تھا اس لیے کہ سیویل اینڈ انگر کی کتاب ہسٹاریکل انسکرپشنز آف سدرن انڈیا کے صفحہ ۲۱۸ میں ایک اہم دستاویز کا حوالہ ہے کہ ۱۴۶۳ء میں دیورائے کا اس قلعہ پر قبضہ تھا جو لڑائی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۰۔ برہان نے اس کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔

۱۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۰۔ برہان صفحہ ۷۹۔ ونکٹ رام نیا نے لکھا ہے کہ پرنس محمد کو رائچور دیا گیا تھا لیکن میں نے کنگ کی کتاب صفحہ ۷۲ میں دیکھا جو بقول اس کے برہان پر مبنی ہے کہ وہاں راجہ پال ہے نہ کہ رائچور۔ میں نے فرشتہ کی نقل کی ہے لیکن برہان نے اس بغاوت کو سنجر خاں کی تلنگانہ کی مہم کے بعد لکھا ہے۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ محمد نے تلنگانہ کے خلاف اپنی نمایاں کامیابی کے بعد حکومت میں حصّہ کا مطالبہ کیا ہو۔

شولاپور مہاراشٹر میں ایک ضلعے کا مستقر ۴۰ر۱۷ شمال، ۵۴ر۷۵ مشرق۔

نلدرگ مہاراشٹر کے ضلع عثمان آباد میں ایک گاؤں۔ ۴۹ر۱۷ شمال، ۴۹ر۷۶ مشرق۔

۱۷۔ تذکرہ سلاطین دکمن، بحوالہ تحفۃ السلاطین صفحہ ۵۳۵۔

۱۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۳۳۰ و ۳۳۱۔ سنگ میشور صوبہ مہاراشٹر کے ضلع رتناگیری میں۔ ۱۶ر۱۷ شمال، ۲۳ر۷۳ مشرق۔

۱۹۔ یہ فرشتہ کا جلد اول صفحہ ۳۳۱ میں بیان ہے لیکن برہان کے صفحہ ۷۸ میں اس کی تاریخ ۸۳۹ھ (۱۴۳۶ء) لکھی ہے جو قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ ... زرع خاندیش کی مہم سنگ میشور سے زیبا چہرہ کے آنے کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔

۲۰۔ ناصر خاں کا لقب اُسے گجرات کے احمد شاہ (۱۴۱۱-۱۴۴۲ء) نے دیا تھا۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۷۷۔ کمسریٹ کی ہسٹری آف گجرات جلد اوّل صفحہ ۲۰۵۔ راجہ گونڈوانہ، فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۱۔ ناصر خاں خاندیش کا حکمران (۱۳۹۹-۱۴۳۷ء) اس میں ملکہ جہاں کے اپنے والد کے پاس جانے کا ذکر نہیں ہے جیسا کہ تذکرہ کے صفحہ ۵۳۲ میں ہے۔

۲۱۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۱۔ برہان نے صفحہ ۷۷ میں لکھا ہے کہ تمام افسروں نے جو وہاں موجود تھے شمال کی طرف جانے سے انکار کر دیا، صرف خلف حسن نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن چونکہ فرشتہ نے کئی افسروں کا ذکر کیا ہے جو خلف حسن کے ساتھ گئے اس لیے اس کا بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔

۲۲۔ مہکار برار کے ضلع بلڈانہ میں ۱۰ر۲۰ شمال، ۲۷ر۷۶ مشرق۔ برہان پور اب مدھیہ پردیش کے ضلع نیماڑ میں ایک تعلقہ کا مستقر ہے۔ ۲۰ر۲۱ شمال، ۱۸ر۷۶ مشرق۔ یہ تفصیل فرشتہ جلد اوّل صفحات ۳۳۱ و ۳۳۲، اور منتخب جلد سوم صفحہ ۷۷ کے مطابق ہے لیکن برہان کے صفحہ ۷۸ میں ہے کہ وہ اسیر تک گیا۔ امین رازی کی ہفت اقلیم، رسالہ تاریخ حیدر آباد صفحات ۴۹ و مابعد برہان سے متفق ہے۔

۲۳۔ یہ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۲ میں ہے۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۸۰ میں ہے کہ صرف بیس ہاتھی پیچھے رہ

گئے تھے۔ نندوبار مہاراشٹر کے ضلع مغربی خاندیش میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۲۰ ر ۲۱ شمال۔ ۴۴ ر ۷۴ مشرق۔
فتح آباد لالنگ مہاراشٹر کے ضلع مغربی خاندیش میں ایک پہاڑی قلعہ۔ ۲۰ ر ۹۴ شمال' ۴۵ ر ۷۴ مشرق۔

۲۴۔ فرشتہ جلد دوم صفحات ۲۷۷ و ۲۸۰۔ ناصر خاں کا انتقال ۳ ربیع الاول ۸۴۱ھ (۴ ستمبر ۱۴۳۷ء) کو ہوا۔

۲۵۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۲۲۔ برگس' جلد دوم صفحات ۲۳۰ تا ۲۳۲۔ بی اے سلاٹور (ہسٹری آف وجے نگر جلد دوم صفحہ ۱۰۴) کا بیان ہے کہ " ۱۴۳۰ء دیورایا کی ملازمت میں ایک ہزار ترکشا سوار تھے (اسی کی جلد سوم' مقدمہ صفحہ ۲۳' ایس آر نمبر ۱۵ صفحہ ۱۱) بلسٹ ۱۴۳۰ء کے ایک کتبہ میں درج ہے کہ دیورایا دوم کے ایک ملازم احمد خاں نے ایک کنواں تعمیر کیا۔ زنگا چاری۔ ٹاپوگرافیکل ــــ جے اینڈ آروانی ۵۲ و ۹۴ صفحہ ۳۰۷۔ جس کا حوالہ سناٹور نے مذکورہ بالا کتاب میں دیا ہے۔

مسلم جاگیرداروں کے نام کے لیے دیکھو خود رسورسز جلد اول صفحہ ۱۰۷۔

۲۶۔ برگس کی ہسٹری آف دی رائز آف محمڈن پاور ان انڈیا' جلد دوم صفحات ۲۳۰ تا ۲۳۲۔

۲۷۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب وجے نگر کے دربار میں عراق کا سفیر عبدالرزاق ان دو تاریخوں کے درمیان کالی کٹ میں تھا۔ دیکھو ایلیٹ اینڈ ڈاوس کتاب مذکور جلد چہارم صفحہ ۱۱۵۔ سیویل۔ اے فارگاٹن ایمپائر صفحہ ۷۵۔ تاریخ کے تسلسل کے سلسلہ میں مختلف بیانات کا واحد حل وہی ہے جو میں نے تجویز کیا ہے۔

۲۸۔ ونایک' دھنایک' یا کمانڈر۔ سیویل صفحہ ۷۵۔ عبدالرزاق نے ونایک کا ترجمہ دیوان سیاست۔ دیکھو ایلیٹ اینڈ ڈاوس کتاب مذکور جلد چہارم صفحات ۱۰۸ و ۱۲۱۔

۲۹۔ یہ نام غیر معمولی ہے اس لیے کہ بہمنی سلطنت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونے والے دلی سے آنے والوں میں یہی ایک مثال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سب پرانے آنے والوں کے خاندان دہلی سے آئے مگر اب وہ بالکل "دکھنی" کہلاتے تھے۔ یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ جن لوگوں کو دیورائے نے گرفتار کیا تھا اُن میں ملک التجار نہیں شامل تھا جیسا کہ سیویل اینڈ اینگر نے صفحہ ۲۲۰ میں غلطی سے لکھا ہے۔

۳۰۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۲۲۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۸۷۔ برہان صفحہ ۷۹ میں اس مہم کی تاریخ میں کچھ الجھا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مہم ۸۳۹ھ (۱۴۳۶ء) میں شروع ہوئی اور دو سال تک جاری رہی اور بہمنیوں کے چندن منڈن اور ستارا کی تسخیر پر ختم ہوئی۔ عبدالرزاق کی غیر مبہم شہادت کی بنیاد پر جو سلسلہ واقعات میں نے بیان کیا ہے وہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۴۰۔ ستارا مہاراشٹر میں ایک ضلع کا مستقر۔ ۴۱ ر ۱۷ شمال' ۴ ر ۷۴ مشرق۔

۳۱۔ سیویل اینڈ اینگر کتاب مذکور صفحہ ۲۲۰ (بحوالہ ایپتھے' کیٹلاگ ۱۔ ایس۔ آر۔ بیل ۱۲۵۔ آئی۔ اے ۲۵ ۱۸۹۶ء

صفحہ ۲۴۶)- تاریخ ۱۴۳۳ء نہیں ہے جیسا کہ سیویل کے صفحہ ۷۹ میں ہے- فرشتہ برگز جلد اول صفحہ ۱۱۲- کا بیان ہے کہ کتبات کے بموجب ملک ارجن ۱۴۳۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۴۶۷ء کے وسط تک حکومت کی۔

۳۲- بینرجی ہسٹری آف اڑیسہ جلد اول صفحہ ۲۸۷- اڑیسہ میں جتنے بھی حکمران ہوئے ان میں کپلیشور یا کپلندر سب سے زیادہ اولوالعزم تھا اور ۱۴۳۴ء سے ۱۴۷۰ء تک حکمران رہا- دیکھو اندھرا ریسرچ ایسوسی ایشن کلنگا چرتر میں ایم رام پنتلو کا مضمون کرونالوجی آف اڑیسہ کنگس صفحہ ۶۴۵- ڈاکٹر سرینواس آچار نے حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ ۱۹۳۴-۳۵ء کے صفحہ ۳۰ میں کپلندر اور بہمنیوں کے تعلقات پر اپنے مضمون میں ایک اوڑیا کتاب منڈل پنجی کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ اڑیسہ سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کرنے میں کپلندر کی بہمنیوں نے مدد کی لیکن چونکہ دونوں فریق ملک کے ایک ہی حصہ میں توسیع پر تلے ہوئے تھے اس لیے ایک دوسرے سے لڑ پڑے- اس کا حوالہ بنرجی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۰۲ میں دیا ہے اور جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۶۹ سنہ ۱۹۰۰ء، حصہ اول صفحہ ۱۸۰ میں ایم چکرورتی کے مقالہ کو نقل کیا ہے۔ بنرجی نے صفحہ ۲۹۴ میں اڑیسہ اور دکھن کے درمیان کسی قسم کے اتحاد سے انکار کیا ہے لیکن کوئی وجہ نہیں بتائی ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کپلیشور وجے نگر کا شدید ترین دشمن تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اس نے پہلے سلطان سے اتحاد کیا ہو اور جب اپنے کو کافی طاقتور سمجھ لیا ہو تو بذات خود پہلے وجے نگر کے خلاف اور پھر خود بہمنیوں کے خلاف کارروائی کی ہو۔

۳۳- سیویل اینڈ اینگر نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۱ میں یہ غلط لکھا ہے کہ سلطان محمد سوم تھا- اس مہم کا حال سنسکرت ڈرامہ گنگا داس پرتاپ ولاسم پر مبنی ہے- دیکھو اینگر کی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری صفحات ۶۵ و ۵- لیکن سیویل اینڈ اینگر کا بیان ہے کہ اس کے متعلق کوئی قطعی بات کہنے سے پہلے مزید تصدیق کی ضرورت ہے۔

۳۴- یہ برہان کا صفحہ ۸۲ میں بیان ہے، لیکن فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۴۳ میں لکھا ہے کہ اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن یہ قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ (۱) اس سے پہلے دکھن میں اشاعت اسلام کے لیے جبر کے استعمال کی ایک بھی مثال نہیں ملتی (۲) اگر خلف حسن نے واقعی اُسے اپنی مرضی کے خلاف اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہوتا تو اس نے فوراً ہی اس پر کوئی بھروسہ نہ کیا ہوتا۔ بمبئی گزیٹیر جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ میں اس حکمران کا نام شنکر راؤ بتایا گیا ہے جو خلاف قیاس نہیں ہے اور اسی جلد کے صفحہ ۲۲۴ میں اسے شرکے خاندان کا بتایا گیا ہے جو مرہٹوں میں اکثر خاندانی نام ہیں۔

۳۵- نام برہان کے صفحہ ۸۳ میں- ان کے رشتے- منتخب جلد سوم صفحہ ۸۲ میں۔ "ہندو اور مسلم افواج کی تعداد" برہان صفحہ ۸۳ میں۔

۳۶- فرشتہ جلد سوم صفحات ۳۲۴ تا ۳۲۶- اس کا یہ بیان کہ پانچ یا چھ ہزار بچے قتل کیے گئے علاوہ

کام کے سپاہیوں کے "ایک سے لے کر سو برس کی عمر تک سب" بالکل مہمل ہے خصوصاً اس لیے کہ دراصل شروع میں صرف ۲۰۰۰ عرب رسالہ بھیجا گیا تھا۔ تذکرہ نے صفحہ ۳۴۵ میں تحفتہ السلاطین کے حوالے سے لکھا ہے کہ کوئی عورت یا بچہ قتل نہیں کیا گیا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس افسوسناک واقعہ کے تمام حالات نو واردوں کی اولاد کے لکھے ہوئے ہیں۔

۲۷۔ منتخب جلد دوم صفحہ ۸۵۔

۲۸۔ فرشتہ اور برہان دونوں میں اس واقعہ کی تفصیل غیر معمولی طور پر طویل ہے۔ میاں صناع اللہ کی برطرفی منتخب جلد سوم صفحہ ۸۵۔

۲۹۔ محمود خلجی کے حوصلے اور کارناموں کے متعلق دیکھو محمود گاواں جلد دوم صفحہ ۱۲۔ نیز امیر احمد علوی کی شاہان مالوہ۔ باب چہارم۔ یو این ڈے۔ میڈول مالوہ باب ششم مالوہ اور بہمنیوں کے تعلقات کے متعلق۔ نلگنڈہ اندھرا پردیش میں اسی نام کے ضلع کا مستقر۔ ۳ء ۱۷ر شمال، ۱۶ء ۷۹ر مشرق۔
ہوشنگ غوری مالوہ کا بادشاہ ۱۴۰۶ء لغایت ۱۴۳۵ء۔
محمد غوری مالوہ کا بادشاہ ۱۴۳۵ء لغایت ۱۴۳۶ء۔
محمود خلجی مالوہ کا بادشاہ ۱۴۳۶ء لغایت ۱۴۶۹ء۔
اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ شہزادہ محمد کا اس بغاوت سے کوئی تعلق تھا جیسا کہ ڈاکٹر ونکٹ رام نیا نے ویلوگ کے مقدمہ صفحہ ۳۹ میں لکھا ہے۔

۴۰۔ برہان صفحہ ۸۶۔

۴۱۔ دیکھو اوپر تشریح نمبر ۱۰۔

۴۲۔ ویلوگ مقدمہ صفحہ ۳۹۔ بغاوت کا مرکز نلگنڈہ تھا نہ کہ بلکنڈہ۔ فرشتہ نے صفحہ ۳۲۸ میں یہ بات واضح طور پر لکھی ہے۔ بلکنڈہ اندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد میں ۵۳ء ۱۸ر شمال، ۲۱ء ۷۸ر مشرق پر ہے۔ یہ شمال مغرب میں بہت فاصلہ پر ہے اس لیے تلنگانہ کا "مرکز" نہیں ہو سکتا۔ سنجر خاں کے لیے دیکھو برہان صفحہ ۷۶۔

۴۳۔ گرتی ونکٹ راؤ کا مقالہ بہمنی وجے نگر ریلیشنز، روئیداد الہ آباد ہسٹری کانگریس صفحہ ۲۰۴، بحوالہ اینگر، اے ٹل نون چیپٹر آف وجے نگر ہسٹری۔ نیز پوری کے مندر جگناتھ کا کتبہ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۴۵۰ء جس میں "ملیکا برلیسا" (ملک بادشاہ) پر کپلیندر کی فتح کا ذکر ہے۔ جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۳ء صفحہ ۹۰، جس کا حوالہ سریمواس اچار نے دیا ہے۔ رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۳۵-۱۹۳۴ء صفحہ ۲۰۔ شاید اسی کو ڈاکٹر ونکٹ رام نیا نے "ملیکا پولا ارجن" پڑھا ہے جسے انھوں نے ایک مقامی حکمران سمجھا ہے۔ دیکھو ویلوگ مقدمہ

صفحہ ۳۰۔ نیز دیکھو برہان صفحہ ۷۷۔ جنوبی ہند میں کپلیشور کی فتوحات، دیکھو بنرجی کی کتاب صفحات ۲۹۳ و ۲۹۴۔ جس میں انھوں نے گنگا داس پرا تاپو یلاسم پر بالکل اعتبار نہیں کیا ہے۔

۴۴۔ سیویل اینڈ ایگر صفحہ ۱۲۲۔ بنرجی صفحات ۲۹۱ و ۲۹۲۔ برہان صفحہ ۷۶۔ اس واقعہ کے متعلق روایات بہت ہی مبہم ہیں اور کوئی یقینی بات نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اگلے بادشاہ کے عہد میں کپلیشور نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ اس لیے اگرچہ برہان میں اسے خاندیش کی مہم سے بھی پہلے بتایا گیا ہے مگر یہ یقیناً علاء الدین احمد کے عہد کا واقعہ ہوگا۔

۴۵۔ دیکھو تشریح نمبر ۱۔

۴۶۔ نام برہان کے صفحہ ۷۸ میں۔ باقی قصہ بیشتر فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۸ میں۔ اس سے ہمیں حضرت عمر اور بوڑھی عورت کا واقعہ یاد آتا ہے۔

نواں باب

مزید شکر رنجیاں

علاء الدین ہمایوں شاہ

۷ مئی ۱۴۵۸ء سے ۴ ستمبر ۱۴۶۱ء[1]

ہمایوں کی تخت نشینی

جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا گیا ہے احمد دوم نے اپنے دوسرے لڑکوں پر ترجیح دے کر ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ ہمایوں بہت غصہ ور تھا اور اس کے تخت نشین ہونے پر امرا اس قدر خائف ہوئے کہ ان میں سے بعض جیسے راجہ رستم نظام الملک اور اس کا لڑکا جو قاسم بیگ صف شکن کے انتقال پر ملک التجار ہوا تھا، ترک وطن کر کے گجرات چلے گئے[2] اور دوسرے امرا جیسے شاہ حبیب اللہ اور ملو خاں وغیرہ نے ہمایوں کے منجھلے بھائی حسن خاں کی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور اسے تخت فیروزہ پر بٹھا دیا۔ حالات کا رُخ دیکھ کر ملک کے عوام الناس نے موقعہ سے فایدہ اٹھایا اور ہمایوں کے محل کے سامنے محل کو لوٹنے اور خود ہمایوں کو قتل کرنے کے ارادہ سے جمع ہو گئے۔ ہمایوں کی مدد پر اُس کا برادر نسبتی شاہ محب اللہ شاہ حبیب اللہ کا چھوٹا بھائی تھا جس نے شاہی درباری زندگی پر مذہبی زندگی کو ترجیح دی تھی اور اپنے والد شاہ خلیل اللہ

کا سجادہ نشین ہوگیا تھا۔ شاہ محب اللہ جیسی ایک بزرگ شخصیت کی حمایت نے اپنے بھائی کے مقابلہ میں جسے ہمایوں کی طرح کا اخلاقی تفوق نہیں حاصل تھا ہمایوں کا پلہ اس حیثیت سے بھاری کر دیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صرف اسّی آدمیوں کو لے کر مجمع میں گھس پڑا اور لڑتا ہوا محل کے تخت شاہی تک پہنچ گیا اور حسن کو تھپیڑ مار کر تخت سے اُتار دیا اور اس کی جگہ خود بیٹھ گیا اور حسنؒ حبیب اللہ اور دوسرے شرکا کو جیل میں ڈال دیا۔ یہ واقعہ ۲۲ ر جمادی الآخر ۸۶۲ھ (۷ مئی ۱۴۵۸ء) کو پیش آیا۔[۱۳]

برہان ماثر کا مصنف بہت شکریہ کا مستحق ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں ہمایوں کی وہ تقریر بجنسہ مل جاتی ہے جو اُس نے تخت نشین ہوتے ہی کی تھی اور جس سے ہمیں بہمنی وزرا کے نصب العین کا پتہ چلتا ہے:

"ہماری سلطنت کے امرا! مجھے یقین ہے کہ بغیر ایک ایسا وزیر مقرر کیے ہوئے جو ساری دنیا میں مشہور ہو اور عرب اور نیز عجم کے لوگوں میں سب سے زیادہ دانش مند ہو حکومت کا کام موثر طریقہ پر چلانا ممکن نہیں ہے اس لیے اس ملک کی تاریخ کے ایک نئے دَور کے آغاز میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک ایسے شخص کے مشوروں پر عمل کروں جو ظاہر میں سچائی اور وفاداری کی صفات سے آراستہ ہو اور باطن میں برائیوں اور کبر و نخوت سے پاک ہو، اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ خواجہ نجم الدین محمود گیلانی کو جو ملک میں اپنے جذبات انصاف پسندی اور مساوات میں اور نیز غایر نظر میں سب سے زیادہ شہرہ آفاق ہے اپنا وزیر اعظم مقرر کروں۔"

اس کے بعد بادشاہ نے خواجہ محمود گاواں کو موقعہ کے مناسب خلعت پہنایا اور طلائی ٹوپی اور پیٹی طلائی اور اسے ملک التجار اور طرف دار بیجاپور اور وکیل سلطنت مقرر کیا اور فوجی معاملات میں اُسے پورا مختار کیا۔[۱۴]

سکندر کی بغاوت

دراصل ہمایوں سابق بادشاہ کی خواہش کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اُس نے ملک شاہ کو جو خاندان چنگیز کا شہزادہ مشہور تھا خواجہ جہاں کا خطاب دے کر تلنگانہ کا طرفدار مقرر کیا اور خود اپنے چچازاد بھائی اور بچپن کے کھیل کے ساتھی سکندر خاں کو جو اپنی بغاوت اور سابق حکمران کی معافی کے بعد پھر درباری حلقوں میں مقبول ہوگیا تھا اسی صوبہ کا سپہ سالار بنایا۔[۱۵] سکندر بظاہر اس تقرر سے مطمئن نہ تھا اور اپنے والد جلال خاں کے پاس گیا جو اب تک بلکنڈہ میں جاگیردار تھا اور اسے پھر سلطان کے خلاف بغاوت میں ساتھ دینے پر آمادہ

کیا۔ وہ خود کو اس بنا پر اور زیادہ طاقتور سمجھ رہا تھا کہ اب وہ ویلاماون کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے بغاوت کا حال اس وقت سُنا جب باغی گولکنڈہ کی طرف بڑھ رہے تھے[۴۹] اور خواجہ جہان کو بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا مگر خواجہ جہان اس مہم میں کامیاب نہ ہوا اور نلکنڈہ کی طرف واپس آگیا۔ ہمایوں کے عہد کے ابتدائی دور کی یہ خصوصیت تھی کہ اُس نے بجائے باغیوں سے جنگ کرنے اور انھیں شکست دینے کے اپنے شدید ترین دشمنوں سے بھی سمجھوتہ کی بھی بوجھی پالیسی اختیار کی اور ان سے مصالحت کی خواہش ظاہر کی لیکن سکندر نے اس پیش کش کو قبول کرنے کے بجائے آدھی رات کے وقت "افغانوں، راجپوتوں اور دکھنیوں" کی فوج لے کر شاہی کیمپ پر حملہ کر دیا[۵۰]۔ بادشاہ نے اس پر بھی ضبط سے کام لیا اور غنیم کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ دکھن کے جوہر کی اس طرح تباہی سخت افسوسناک ہے اور سکندر کے تمام قصوروں کو معاف کر دینے کا وعدہ کیا اور یہ بھی کہا کہ دولت آباد کے صوبہ میں جو پرگنہ وہ پسند کرے اُسے جاگیر میں دے دیا جائے گا۔ اس پر ضدی سکندر نے یہ جواب دیا کہ ہمایوں میں اور اُس میں صرف یہ فرق ہے کہ ہمایوں احمد شاہ ولی کا پوتا ہے اور وہ نواسا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ سلطنت دونوں میں تقسیم کر دی جائے یا کم از کم اُسے تلنگانہ کا پورا صوبہ دے دیا جائے۔ اب اس کے بعد ہی بادشاہ نے پورے طور پر جنگ شروع کی۔ لڑائی بلا توقف پورے دن جاری رہی اور شام کے وقت تک غیر منفصل رہی بلکہ دراصل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمایوں کو شکست ہوگی اور سکندر تخت نشین ہو جائے گا[۵۱]۔ دفعتہً ملک التجار (محمود گاواں) اور خواجہ جہان ترک[۵۲] منظر پر آگئے اور دونوں نے بالترتیب داہنے اور بائیں بازو سے حملہ کر دیا۔ تھکی ہوئی شاہی فوج کو اس سے بڑا سہارا ملا اور ہمایوں نے پانچ سو منتخب تیر انداز اور اتنے ہی نیزہ بردار پاگل ہاتھیوں کے ساتھ پریشان دشمن کی صفوں کے بیچ میں جھونک دیے۔ عین لڑائی میں سکندر گھوڑے سے گر پڑا اور کچل کر مر گیا اور اس کی فوج کو کامل شکست ہو گئی[۵۳]۔

جلال خاں نے اب بلکنڈہ کے قلعہ میں پناہ لی اور ملک التجار اور خواجہ جہان نے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن جلال نے لڑنے کے بجائے محاصرین سے التجا کی کہ وہ بادشاہ سے اس کی جان بخشی کی سفارش کریں اور سلطنت میں بینتالیس سال قیام کے دوران میں اس نے جتنا خزانہ جمع کیا ہے وہ سب بادشاہ لے لے۔ بادشاہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور باوجود اس کی متواتر مفویانہ حرکات کے اسے صرف جیل میں ڈال دینے پر اکتفا کیا[۵۴]۔

تلنگانہ اور اڑیسہ

اس مہم کے دوران میں تلنگانہ کے حکمرانوں اور خصوصاً ویلاماون کے سردار لنگنا نے باغیوں کا ساتھ

دیا تھا اس لیے ہمایوں نے طے کیا کہ انھیں ہمیشہ کے لیے دبا دیا جائے۔[۱۱۲] لنگا کی شدید مزاحمت کارگر نہ ہوئی اور ہمایوں دیورکنڈہ کے مضبوط قلعہ تک پہنچ گیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہاں ترک اور نظام الملک کو حکم دیا کہ وہ بیس ہزار رسالہ فوج اور چالیس ہاتھی لے کر قلعہ کا محاصرہ کریں۔ لنگا نے اب محسوس کیا کہ باہری مدد کے بغیر دیورکنڈہ کو زیادہ دن تک بچانا ممکن نہیں ہے اور اس نے اڑیسہ کے راجہ کپلیشور اور نیز تلنگانہ کے رئیسوں سے مدد مانگی۔[۱۱۳] کپلیشور اڑیسہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ اولوالعزم حکمران تھا اور ساحلی تلنگانہ کو بشمول راجہ سندری اور کونڈاویڈو کے فتح کر چکا تھا۔ اسے وجے نگر کے خلاف لڑائیوں میں بھی فتح ہوئی تھی، اور اب اس نے موقعہ کو غنیمت سمجھا کہ بہمنی تلنگانہ پر بھی اپنا اقتدار قائم کرے خصوصاً اس لیے کہ ویلاما جس پریشانی میں مبتلا تھے اُس سے نجات دلانے پر خراج کی بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا۔

قبل اس کے کہ اڑیسہ سے مدد آئے[۱۱۴] بہمنی کیمپ میں ایک جنگی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس میں نظام الملک نے خان جہان ترک کو مشورہ دیا کہ محصورین کو قلعہ سے باہر آکر کھلے میدان میں دست بدست لڑائی پر آمادہ کیا جائے لیکن خواجہ جہان نے اس سے اختلاف کیا کہ ایسی کارروائی مزوری پر محمول کی جائے گی اور بہتر یہی ہے کہ محاصرہ جاری رکھا جائے۔ کپلیشور نے ہم ویرا کو لنگا کی مدد پر بھیجا اور جب وہ دیورکنڈہ پہنچ گیا تو لنگا فوج کے ساتھ قلعہ سے باہر نکلا اور بہمنی فوجیں اڑیسہ کی فوج اور لنگا کی فوج کے بیچ میں گھر گئیں اور سخت شکست کھائی جس میں ان کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔[۱۱۵] کپلیشور نے اب ہم ویرا کو ورنگل پر دھاوا کرنے کا حکم دیا جسے ۲۲ فروری ۱۴۶۱ء کو اس نے تسخیر کر لیا اور لنگا نے راجہ چال پر چڑھائی کی جو مرحوم بادشاہ نے شہزادہ محمد کو دیا تھا اور اُس پر قبضہ کر کے اُسے اپنا مستقر بنایا۔ ہمایوں خود دیورکنڈہ کی طرف آرہا تھا اور اس قلعہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر[۱۱۶] اُسے خواجہ جہاں ملا جس نے اُسے یقین دلایا کہ شکست کی ذمہ داری دراصل نظام الملک پر ہے۔ بادشاہ نظام الملک کے طرزِ عمل سے آتنا برہم ہوا کہ اُسے اپنی جان بچا کر معہ اپنے اہل و عیال کے مالوہ کی سرحد کی طرف بھاگنا پڑا۔[۱۱۷]

حسن خاں کی بغاوت

جس وقت ہمایوں دارالسلطنت کے باہر تھا تو اس نے سنا کہ یوسف ترک نے حسن خاں، حبیب اللہ اور ہزاروں قیدیوں کو جو بادشاہ کی حکومت کے ابتدائی دور میں حکومت اور بادشاہ کے خلاف سازش کے جرم میں ماخوذ تھے اور بیدر کے شاہی قیدخانہ میں مقید تھے انھیں رہا کر دیا ہے۔

اس پر بادشاہ نے محمد گاواں کو تلنگانہ کے معاملات سپرد کیے اور خود فوراً دارالسلطنت کی طرف روانہ ہو گیا جہاں وہ جمادی الاول سنہ ۸٦۰ھ (مارچ ۱۴۵٦ء) میں پہنچا۔[17] کہا جاتا ہے کہ یوسف نے پہلے حبیب اللہ کے سات مریدوں کو جمع کیا اور بادشاہ کے جعلی فرمان سے کہ فلاں فلاں قیدیوں کو اندھا کر دیا جائے جیل کے اندر جانا چاہا پہلی روک تو وہ پار کر گیا لیکن دوسری روک کے محافظ نے مطالبہ کیا کہ کوتوال کا حکم بھی ہونا چاہیے۔ یوسف نے اسے تلوار کی ایک ضرب سے قتل کر دیا۔ اس پر ہنگامہ برپا ہو گیا مگر قبل ازیں کہ کوئی کارروائی کی جائے اس نے حسن خاں، یحییٰ خاں، اسی سالہ جلال خاں اور تقریباً سات ہزار قیدیوں کو جن میں "کئی سید، علما اور متقی لوگ شامل تھے" رہا کر دیا۔[18] کوتوال کے آدمیوں اور رہا شدہ قیدیوں اور ان کے حامیوں میں جو ہاتھاپائی ہوئی اس میں جلال خاں اور یحییٰ خاں مارے گئے اور حسن خاں اور حبیب اللہ نے پہلے ایک حجام کے گھر میں پناہ لی جو حسن خاں کا ملازم رہ چکا تھا اور پھر فقیروں کا بھیس بدل کر بیٹر کی طرف چل دیے، جہاں حبیب اللہ کی جاگیر تھی۔ بیٹر پہنچ کر حسن نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور یوسف ترک کو امیر الامرا اور حبیب اللہ کو وزیر مقرر کیا[19] لیکن حسن کی بادشاہی زیادہ دن نہ رہی اس لیے کہ بالآخر شاہی فوج نے اُسے شکست دے دی اور حسن اور اس کے وزیر کو دھے نگر بھاگنا پڑا۔ راستہ میں بیجاپور کے نائب گورنر سراج خاں جنیدی نے بظاہر ان کا استقبال کیا لیکن جب وہ پوری طرح قابو میں آ گئے تو انھیں قید کرنے کی تدبیر کی۔ ہاتھاپائی میں حبیب اللہ مارا گیا اور حسن کو پابزنجیر کر کے بیدر بھیج دیا گیا

حسن اور اس کے ساتھی شعبان سنہ ۸٦۴ھ (جون سنہ ۱۴٦۰ء) میں دارالسلطنت پہنچے اور ہمایوں نے ان لوگوں کو جنھوں نے اس سے غداری کی تھی اور جان لینا چاہی تھی ہولناک سزائیں دیں اور اپنی پوری ظالمانہ فطرت کا مظاہرہ کیا۔ حسن کو اُس نے شیروں کے آگے ڈال دیا اور اس کے بعض ساتھیوں کو پانی اور تیل کے جوش کھاتے ہوئے کڑاہوں میں جھونک دیا اور دوسروں پر شیر اور دوسرے خونخوار جانور چھوڑ دیے کہ ان کا شکار کریں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اُن تمام لوگوں کو قتل کر دیا جنھیں بادشاہی کا خفیف ترین دعویٰ تھا اور جن امرا پر ذرا بھی مخالفت کا شبہہ تھا۔[20] اس ہولناک المیہ کے خاتمہ پر اس نے کئی دکھنی نومسلموں کو ترقی دی جن میں ایک ملک حسن بحری تھا جو احمد نگر کے نظام شاہی حکمرانوں کا جدِ اعلیٰ تھا اور جسے اب سارنگ خاں کا خطاب دیا گیا۔[21]

ہمایوں کا ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۸٦۵ھ (یکم ستمبر سنہ ۱۴٦۱ء) کو انتقال ہوا یا سوتے میں کسی خادمہ نے اسے قتل کر دیا۔[22]

ہمایوں کا کردار

ہمایوں کا کردار دکن کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ فرشتہ نے اس کا خاکہ بدترین رنگ میں کھینچا ہے اور سنگین ترین جرائم اس سے منسوب کیے ہیں۔ اُس نے بلاکسی حجت کے اُسے "ظالم" کا خطاب دے دیا ہے اور اسے ثابت کرنے کے لیے شہادتیں مہیا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مترجم اور خلاصہ کرنے والے کے الفاظ میں اس نے لکھا ہے کہ "ہمایوں نے تمام بندشوں کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ اپنی رعایا کے بچوں کو ان کے والدین کی گود سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تھا . . . . وہ اکثر سڑک پر بارات کو روک لیتا تھا اور دلہن کو چھین کر اس سے لطف اندوز ہوتا تھا اور پھر اسے شوہر کے گھر بھیج دیتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اپنے محل کی عورتوں کو معمولی سے معمولی قصور پر قتل کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر کو اس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا تو وہ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو کر جاتا تھا جیسے وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے"[۵۲] برہان کا لہجہ اگرچہ معتدل ہے مگر اس نے بھی ہمایوں کے مظالم کی چند مثالیں دی ہیں اور اس بات میں فرشتہ سے متفق ہے کہ لوگ اس کے مظالم سے اتنے تنگ آ گئے تھے کہ صرف نظیری شاعر نے اس کی تاریخ وفات کے قطعہ میں ان کے جذبات کی ترجمانی کی ہے:

ہمایوں شاہ مرد و رُست عالم	تعالے اللہ زہے مرگ ہمایوں
جہاں پر ذوق شد تاریخ فوتش	ہم از ذوقِ جہاں آرید بیروں ۸۶۵

۸۶۵

کسی تاریخی شخصیت کے کردار کا اندازہ کرتے وقت اس کی شدید ضرورت ہے کہ اُس ماحول کو بھی دیکھا جائے جس میں اس کی زندگی گذری تاکہ اُس کے رجحانات کا حتی الامکان صحیح اندازہ ہو سکے۔ ہمایوں نے ساڑھے تین سال سے کم حکومت کی اور سب سے پہلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اس دوران میں اس کے کسی ہمسایہ کے خلاف جارحانہ مہم نہیں ہوئی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصد اپنے پیشرو محمد اول کی طرح اپنی وسیع سلطنت کو مستحکم کرنا تھا بجائے اس کے کہ اُسے قابو میں نہ آنے والے حدود تک وسیع کرے۔ اس نقطۂ نظر کی تائید حکومت کے اس اعلیٰ نصب العین سے ہوتی ہے جو اُس نے اپنے تخت نشین ہونے پر اپنی تقریر میں ظاہر کیا لیکن اس کی حکومت تقریباً مسلسل بغاوتوں اور اُس کی جان لینے کی کوششوں سے داغدار رہی اور یہ بھی اُن لوگوں کے ہاتھوں جو اُس کے قریب ترین اور عزیز ترین افراد تھے۔ واقعات کے تقریباً سارے تسلسل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے سمجھوتے کی نئی پالیسی پر عمل کیا اور

۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) کے وسط تک بخشش اور رحم دلی کا پابند رہا اور جو مظالم بھی اُس سے منسوب کیے جاتے ہیں وہ شعبان ۸۶۴ھ (جون ۱۴۶۰ء) اور ۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ (۴ ستمبر ۱۴۶۱ء) کے مابین ہوئے ہوں گے۔ اس کے والد نے اسے تخت کا وارث بنایا تھا لیکن جو پارٹی احمد دوم کے وقت سے شیخ آذری کا خط آنے کے وقت تک برسرِ اقتدار رہی تھی یعنی نو واردوں کی اُس نے اُس کے چھوٹے بھائی کو تخت نشین کر دیا اور شاید واقعۂ مجمع کر اس کے قتل اور اس کا محل لوٹنے پر ابھارا لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان خون کے پیاسے دشمنوں سے انتقام لے اس نے صرف اس کے لیڈروں کو اور جنھوں نے مجمع کی حمایت کی تھی صرف قید کر دیا۔ اس کے بعد ہم اسے اپنے عزیز سکندر خاں سے نلکنڈہ میں جنگ کرتے پاتے ہیں اور جس وقت کہ وہ ایسی جنگ میں مصروف ہوتا ہے جس کا انجام ممکن ہے کہ اس کے خاتمہ پر ہوتا' وہ باغیوں سے گفت و شنید کرتا ہے اور صاف صاف کہتا ہے کہ وہ جنگ پر صلح کو ترجیح دیتا ہے اور پھر جب کہ لڑائی سارے دن جاری رہی' اس نے سکندر کو جاگیر دینے کی پیش کش کی اور سکندر کی موت اور جلال خاں کی شکست پر تو معجزہ ہی پیش آتا ہے کہ وہ ملک التجار کی سفارش پر جلال خاں کی جان بخشی کرتا ہے۔

ان سب باتوں سے ہمایوں بے دھڑک خون آشام رنگ میں نہیں نظر آتا ہے اور اس کی حکومت کے پہلے دو برسوں میں کوئی ایسی بات نہیں نظر آتی کہ جس سے اسے ملامت کرنے کا جواز ہو۔ صرف حسن خاں کے دوبارہ اعلان شاہی کے بعد اس وقت جب کہ ہم اور تقریباً ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) کے وسط میں اس کی گرفتاری کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنی ظالمانہ فطرت کا مظاہرہ کیا۔ ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ حسن سے دو لڑائیوں میں بادشاہ کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ نو واردوں کی جو جماعت احمد اوّل اور احمد دوم کے عہد میں برسرِ اقتدار آ گئی تھی وہ اب اتنی سرکش ہو گئی تھی کہ ایک مضبوط ارادہ کے ہمایوں جیسے بادشاہ کی جگہ اُس نے حسن جیسے ایک کٹھ پتلی بادشاہ کو تخت پر بٹھانے کے لیے منتخب کیا۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ پہلی بغاوت کی کوشش کے بعد جو چھ یا سات ہزار آدمی قید کیے گئے تھے ان کا حال بیان کرنے میں فرشتہ نے تقریباً وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو ان لوگوں کے لیے استعمال کیے تھے جو ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں چاکن میں قتل کیے گئے۔ سکندر کا باپ جلال جو دونوں ہمایوں کے عہد میں پکے غدار تھے وہ دونوں نو وارد تھے اور یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ۸۳۸ھ (۱۴۳۴ء) تک ہمایوں کو یہ امید تھی کہ وہ اس پارٹی سے کسی قسم کا سمجھوتہ کر سکے گا اور شاید اُس پالیسی کی پیش رفت کر سکے جو بعد کو محمود گاواں نے اختیار کی لیکن حسن خاں اور اُس کے ساتھیوں کی جبریہ رہائی ایک اور نو وارد یوسف ترک کے ہاتھوں اور اس کے بعد ہنگاموں کے اُبھرنے اور زندگی اور موت کی کش مکش پھر سے شروع ہو جانے پر اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ہمایوں حالات کو اس رنگ پر جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اپنی مختصر حکومت کے آخری تیرہ مہینوں میں اُس نے اپنے دشمنوں کو عبرت انگیز

سزائیں دیں۔ یہ محمود گاواں کی بہت بڑی قابلیت تھی کہ جب تک اُسے مصالحت کی امید رہی۔ اس نے مداخلت کی مگر جب حسن خاں اور اس کے حامیوں کی رہائی اور سنہ ۸۶۴ھ (سنہ ۱۴۶۰ء) میں اس کے دوبارہ اعلانِ شاہی سے ساری امیدیں بظاہر خاک میں مل گئیں تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

پرانے آنے والوں اور مقامی باشندوں کے عنصر کی تائید میں ایک اور غیر متوقع حلقہ سے شہادت ملتی ہے۔ شاعر نظیری نے جس کا طنزیہ قطعہ تاریخ اس کے پیشتر درج کیا گیا ہے اور جو یوسف ترک کے رہا کیے ہوئے قیدیوں میں تھا اس نے اپنی قید کے زمانے میں حسب ذیل قطعہ لکھا تھا:

گردوں خذف از بعینۂ گوہر نشناخت   طاؤس و ہمائے از کبوتر نشناخت
شکر شکنے چو بندہ از طوق کشید   از فاختہ طوطیِ سخنور نشناخت [25]

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمایوں پرانے آنے والوں اور نوواردوں میں توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایک ایسی پالیسی پر عامل تھا جو اس کے باپ اور دادا کی پالیسی سے بالکل مختلف تھی اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایک شاعر جسے بادشاہ سے مستقل شکایت رہی ہو وہ اس کی موت پر خوش ہوا اور اس خوشی کے اظہار میں قطعہ تاریخ لکھے اور یہ کہ جو لوگ فرشتہ اور برہان مآثر کے مصنف کی طرح نوواردوں کے ہمدرد ہوں وہ ہمایوں کے ملک میں نظم و ضبط قائم کرنے کی کوششوں کو مبالغہ آمیز رنگ میں بیان کریں۔ "ظالم" کا لفظ جو فرشتہ کے وقت سے ہمایوں کے نام کے ساتھ شامل ہے اور وہ پروپگینڈا جو اس کے انتقال کے بعد سے اُس کے خلاف جاری ہے اس کا عام ذہنوں پر اتنا اثر ہو گیا ہے کہ کوئی اُسے بغیر ظالم کے لقب کے نہیں جانتا۔ اس پروپگینڈا کا اثر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدر میں اس کے مقبرہ کے گنبد گر جانے کو ضعیف الاعتقاد عوام اُس کے ظالمانہ شیطانی افعال سے منسوب کرتے ہیں، حالانکہ یہ گنبد ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے سنہ ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۳ء) میں یعنی اُس کے انتقال کے چار سو برس بعد بجلی گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔[26]

اگر ہم محمود گاواں کے مجموعہ خطوط ریاض الانشا کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمایوں کے متعلق اس کی رائے فرشتہ سے بالکل مختلف ہے۔ ہمایوں کے متعلق محمود گاواں نے لکھا ہے: "ہر حاضر و غائب کو معلوم ہے کہ اس بندہ کے دوش ہمت پر کسی کا بار احسان نہیں ہے بجز اعلیٰ حضرت مرحوم سلطان ہمایوں شاہ کے لطف و کرم اور نیک صفات کے جس کی جمشیدی صفات اور مہربانی سورج کی طرح روشن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے مرقد کو ٹھنڈا رکھے۔"[27] ایک اور جگہ وہ اپنے ایک عزیز کو لکھتا ہے: "میری عندلیب زبان ہمیشہ اس باغ شاہی کے گل کی مدح و تعریف میں رطب اللسان ہے۔"[28] اور اسی کے ساتھ اُس نے ۳۰ شعروں کا ایک قصیدہ ہمایوں کی شان میں شامل کیا ہے جس کے چند اشعار یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا:

مین عمرم کز غبار غربت و غم بود تار — مشد کنوں روشن ز کحل خاکپائے شہریار
شہ ہمایوں شاہ بہمن اصل دارائی کہ ہست — عقل کل را خاطرش در کنہ اشیا مستشار
گر نسیم خلق تو بر سطح دریا بگذرد — ماہیاں در قعر بحر آیند یکسر مشکبار
بندہ را حالیست کان از حضرت تو ان نہفت — از سر لطف و کرم یک لحظہ حالم گوش دار
علت نمائی ز ہندم نیست الا خاک پائے — ورنہ از آب لقا در ظلمت آیام چہ کار
این زمانم یک مراد است از تو ائے کان کرم — گر شد آن حاصل از تو جان بکند از تن فرار
گوشہ خواہم کہ کردم منزوی از کل کنوں — وانگہی آرم نجاک کوئے وحدت افتخار
قصر قدرت باد در رفعت بحدّ کا ندرو — پردہ باشد آسماں کیواں ہندو پردہ دار [29]

بادشاہ کے ساتھ وفاداری اور احترام کا اظہار ان اشعار سے بہتر نہیں ہو سکتا اور کسی چیز سے اُس بے پایاں احترام کا اتنا اظہار نہیں ہو سکتا جتنا محمود گاواں جیسے ہمعصر کو اس بادشاہ سے تھا۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اشعار اُس شخص کے قلم کے ہیں جس کی صاف گوئی حتیٰ کہ تلخ بیانی ان خطوط سے ظاہر ہے جو اُس نے میدان جنگ سے بعض وزرائے شاہی کو لکھے۔ جو اُس کی بے پناہ حق و انصاف کی پائیداری کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔ محمود کے ذہن پر ہمایوں کا کتنا بڑا اثر تھا۔ اس کا مزید اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے جو اُس نے شاہ گیلان کو لکھا، جس میں وہ کہتا ہے: "اس غلام کے طوق حیات کی گردن پر مرحوم سلطان ہمایوں شاہ کی عنایات و ہدایات کے نشانات ہیں اور موجودہ تقویت اور مستقبل کی توقعات اعلیٰ حضرت کی عنایات و کرم کی رہین منت ہیں [30]" وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اپنے سرپرست کو یاد رکھتا ہے اور جب اس کے سر پر تلوار چمک رہی تھی تو اس کا احتجاج یہی ہوتا ہے کہ اُس کی ڈاڑھی ہمایوں شاہ کی خدمت میں سفید ہوئی ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی اور شہادت نہ ہوتی تو بھی محمود گاواں کی حیثیت کے مدبر کا قول جو خود بھی نوواردوں کی جماعت کا تھا اور اسی فرقہ سے متعلق تھا جس کے فرشتہ اور برہان مآثر کے مصنف سید علی طباطبائی تھے تو یہی ہمایوں کے بے رحمانہ طرز عمل کے پیشتر الزاموں کی تردید کے لیے کافی تھے جن سے اُس کی شہرت داغدار کی گئی ہے۔

چنانچہ یہ صاف ظاہر ہے کہ ہمایوں کے کردار کا جو خاکہ فارسی مورخین اور خصوصاً فرشتہ نے پیش کیا ہے اُس میں اُس کے عیوب کا اس قدر مبالغہ ہے کہ جرائم کا انبار جو اُس کے سر منڈھ دیا گیا ہے اُس میں اس کی اصلی شخصیت کی شناخت بہت مشکل ہے۔ اُس کی مختصر حکومت کے جو واقعات تاریخ میں درج ہیں اُن سے اور نیز دیگر وسایل معلومات کی بنا پر ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہمایوں معمولی طرز کا بھی حکمران

تھا مگر اسی کے ساتھ نظم و ضبط کا بڑا خیال رکھنے والا تھا اور پرانے آنے والوں اور نو واردوں اور مقامی باشندوں میں توازن قائم کرنے پر مصر تھا اور اپنی حکومت کو حتی الامکان پر امن رکھنا چاہتا تھا۔ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اُس کے سارے عہد حکومت میں ایک بھی مہم حدود سلطنت کے باہر نہیں پیش آئی جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بجائے دوسروں کے خلاف جارحانہ کارروائی کے خود اپنی سلطنت کو مستحکم کرنا چاہتا تھا لیکن اندرونی ہنگاموں نے اُس کے تمام قابل تعریف منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے خلاف پروپگینڈا کی مہم نے اُس کی شہرت کو بھی خاک میں ملا دیا۔

تشریحات

۱ - ہمایوں کے باپ احمد دوم کا انتقال ۲۲ جمادی الثانی ۸۶۲ھ کو ہوا (دیکھو آٹھواں باب تشریح ۱)۔ اگر ہم فرشتہ اور ظفر الولیہ کے بیان کو صحیح تسلیم کریں تو ہمایوں نے تین سال ۶ ماہ پانچ دن حکومت کی جس سے ہم ۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ کی تاریخ پر پہنچ جاتے ہیں۔ برہان کے "۶ ماہ اور ۵ دن" یقیناً غلط ہیں یا چھاپہ کی غلطی ہیں۔ لیکن ہمارے تینوں مورخین فرشتہ، برہان اور ظفر الولیہ اس پر متفق ہیں کہ ہمایوں کا انتقال ۲۷ یا ۲۸ ذیقعدہ ۸۶۵ھ (۳ یا ۴ ستمبر ۱۴۶۱ء) کو ہوا اور ہم انھیں میں سے ایک تاریخ کو صحیح قرار دے سکتے ہیں۔

ہمیں حیدر آباد کے عجائب گھر میں ایک عجیب سکہ ملتا ہے جس میں ہمایوں کا نام اور ۸۶۶ھ درج ہے (حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ ۳۳-۱۹۲۱ء کے صفحہ ۷۳ پر دیے ہوئے ۸۶۶ھ کے برخلاف) مگر یہ دکن کے سکہ ڈھالنے والوں کا ایک انوکھا پن ہوگا جس کے لیے دیکھو اسپیٹ کا مضمون اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۰۷ میں۔ خاص اس سکہ کا ذکر صفحہ ۲۹۹ میں ہے۔ نیز دیکھو عبدالولی خاں کی کتاب مذکور صفحہ ۱۱۶۔ اس تاریخ کے سکے صفحہ ۵۶۶ پر شاہی لقب کے لیے دیکھو صفحات ۱۷۱ و ۱۷۲۔ پلیٹ ۲۱ و ۲۲۔ نیز دیکھو اے ایچ صدیقی۔ جے این ایس آئی ۱۹۶۴ء۔

ہمایوں کی تخت نشینی کا لقب علاء الدین اس کے سکوں سے واضح ہے جن کے پشت پر یہ عبارت ہے:

علاء الدنیا والدین ہمایوں شاہ بن احمد شاہ الولی البہمنی۔

دیکھو اسپیٹ کا مضمون اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۹۸ میں۔

۲ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۳۹۔ برہان صفحہ ۸۸۔

۳ - برہان صفحہ ۸۸۔ طولر سے کرناٹک کی طرف مفرور رہا۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۳۹۔

۴ - برہان صفحہ ۸۹۔ اس میں محمود کا نام نجم الدین لکھا ہے مگر اور تاریخوں میں عماد الدین ہے۔ محمود گاواں کے مختصر حالات زندگی کے لیے دیکھو حدائق السلاطین، سالار جنگ، تاریخ فارسی نمبر ۲۱۶، فولیو ۱۳۹۔ "پورا قابو" طبقات صفحہ ۴۲۲۔

۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۳۹۔

۶۔ برہان صفحہ ۹۰۔ ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۴۳۔

۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۴۰۔ سکندر کی فوج میں راجپوتوں کی شرکت بڑی اہم ہے۔

۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۴۰۔

۹۔ ملک شاہ کے لقب میں "ترک" کا لفظ محمود گاواں سے امتیاز کے لیے ہے جو ملک شاہ کے انتقال پر خواجہ جہاں ہوا۔

۱۰۔ طبقات صفحہ ۳۲۴۔

۱۱۔ یہ دوسرا موقعہ تھا جب محمود گاواں نے جنگ کے میدان میں اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور غنیم کو کامیابی کے ساتھ شکست دینے کے بعد بادشاہ سے شکست خوردہ غنیم کی سفارش کی۔

۱۲۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۴۰۔ لنگا اور دوسرے تلیگو حکمرانوں کی اس جنگ میں شرکت کے متعلق دیکھو ویلوگ، مقدمہ صفحات ۴۱ و ۴۲۔

۱۳۔ جگناتھ مندر کے ایک کتبہ میں کپلیشور کو بکری کرناٹک حکمران کا شیر کہا گیا ہے جو "کال برگا پر فتحیاب ہوا" ایس۔ کے۔ اینگر، اے لٹل نون چیپٹر آف وجے نگر ہسٹری صفحہ ۹۔ بحوالہ مضمون گرتی ونکٹ راؤ، بہمنی وجے نگر ریلیشنز، انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد ۱۹۳۸ء صفحہ ۲۷۳۔ اڈیلک رائے جن کا فارسی تاریخوں میں اکثر ذکر ہے "ورنگل اور راجہ سندری کے درمیان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمران تھے" جو کہا جاتا ہے کہ بہمنیوں کے لیے بڑا دردِ سر تھے۔ دیکھو کے۔ ایشوردت کا مضمون دی وارس آف وجے نگر اگینسٹ کلنگا دیس، کلنگا دیس چرتر اندھرا دیس ریسرچ ایسوسی ایشن ۱۹۴۳ء صفحہ ۲۶۰۔ نیز تفصیل کے لیے دیکھو ویلوگ۔ بنرجی کی ہسٹری آف اوڑیسہ جلد اوّل صفحات ۲۹۲ و ۲۹۳۔ فرد رسورسز جلد اوّل صفحات ۱۱۷ و ۱۱۸۔

۱۴۔ کھمامیٹ۔ اندھرا پردیش میں ایک ضلع کا مستقر۔ ۱۵ ر ۱۷ شمال، ۱۱ ر ۸۰ مشرق۔

لنگا کے بعد دیورکنڈہ کے ویلاما تاریخ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ویلوگ، مقدمہ صفحہ ۴۳۔ ورنگل پر قبضہ کے متعلق دیکھو رپورٹ حیدرآباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۱۳۲۴ء فصلی صفحہ ۲۹۔ جس میں ڈاکٹر سرینواس آچار نے اس کے لیے ورنگل کے قلعہ کے جنوبی پھاٹک پر ایک کتبہ کا حوالہ دیا ہے۔ ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) میں دیورکنڈہ کی شکست نے بادشاہ کی نظر میں محمود گاواں کی عزت منفی طور پر بڑھا دی ہوگی۔ اگرچہ وہ احمد دوم اور ہمایوں کو تخت سے معزول کرنے والوں کی دو اہم بغاوتوں کو دبانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر تیلیگو حکمرانوں کے متحدہ محاذ کے خلاف خواجہ جہاں کی مہم ناکام ہو گئی۔ اس کا مقابلہ ہم فرانس کے ۱۷۹۹ء کے حالات سے کر سکتے ہیں جب کہ بونا پارٹ کی مشرق کی طرف مصروفیت پر فرانس کی فوجوں کو اسٹاکاخ میں

آسٹریوں نے اور نوبی میں روسیوں نے شکست دے دی اور وہ اٹلی کی سرزمین سے باہر کر دی گئیں۔ اس سے بوناپارٹ کی شہرت میں دس گنا اضافہ ہوگیا اور چند سال بعد اس کے فرسٹ کانسل کے رتبہ پر فائز ہونے کا راستہ صاف ہوگیا

۱۵۔ بیس فرسخ۔ طبقات کے صفحہ ۳۴۴ میں آمدہ کردہ ہے جو خلاف قیاس معلوم ہوتا ہے۔ ایک فرسخ = ۸۰۰۰ اگز = اسٹین گراس پرشین انگلش ڈکشنری۔

۱۶۔ یہ فرشتہ کا صفحہ ۳۴۰ میں بیان ہے۔ برہان کے صفحہ ۹۲ میں نظام الملک کی سزائے موت کا ذکر ہے لیکن میں اس کے فرار کی روایت کو ترجیح دوں گا خصوصاً اس لیے کہ کسی اور شخص کا ذکر نہیں جو اپنے خاندان کو لے کر سرحد پار کر گیا ہو۔ علاوہ بریں بادشاہ کے اسی رجحان کا اظہار نہیں ہوتا کہ سرکردہ افراد کے قصور کے بدلے اُن کے خاندان کو تباہ کر دے۔ نیز برہان نے صفحہ ۹۸ میں اگلے بادشاہ کے عہد میں محمود خلجی کی مہم کے سلسلہ میں نظام الملک کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۲۔

۱۸۔ برہان صفحہ ۹۳۔ رہا شدہ لوگوں اور اُن کے لیڈروں کے ناموں اور نیز اس دلچسپ واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچانک حملہ صرف نو واردوں یا آفاقیوں کا ساختہ و پرداختہ تھا۔

۱۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۲۔

۲۰۔ یہ سب فرشتہ کے صفحہ ۳۴۳ میں ہے۔ برہان نے اتنی تفصیل نہیں دی ہے۔

۲۱۔ برہان صفحہ ۹۵۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ دکن کی تاریخ میں کسی ممتاز آدمی کے مذہب کی تبدیلی کی یہ پہلی مثال ہے۔ ملک حسن کی سابقہ زندگی کے متعلق دیکھو خافی خاں کی منتخب اللباب جلد سوم صفحہ ۴۰۔ مآثر رحیمی جلد دوم صفحہ ۳۱۴۔ کن کیڈ کی ہسٹری آف مرہٹاز جلد اوّل صفحہ ۶۷۔

۲۲۔ یہ دونوں قصے ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر فرشتہ میں بیان ہوئے ہیں لیکن برہان نے قتل کے امکان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ مجھے یہ صورت قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ ہمایوں قدرتی موت سے مرا اس لیے کہ قتل کی نیت یعنی سختی کے برتاؤ کی وجہ بہت کمزور ہے۔ فرشتہ نے صفحہ ۳۴۳ میں لکھا ہے کہ نزع کی حالت میں بادشاہ نے حکم دیا کہ محمود گاواں کو مشرق سے واپس بلا کر سلطنت کا وزیر بنایا جائے۔

۲۳۔ برگس، کتاب مذکور جلد دوم صفحہ ۴۶۳۔

۲۴۔ برہان صفحہ ۹۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۴۔

(ترجمہ اشعار) ہمایوں شاہ مرگیا اور اس سے دنیا پاک ہوگئی — اللہ کی بڑائی ہو کیا ہی مبارک موت ہوئی

اُس کی موت پر دنیا مسرت سے بھر گئی — اس لیے تاریخ "ذوقِ جہان" سے نکالو

ظفر الولیہ جلد اوّل صفحہ ۲۲۹ میں اس کا ذکر ذرا اختلاف سے ہے۔

۲۵۔ برہان صفحہ ۹۵۔

(ترجمہ اشعار) "آسمان نے سوئی اور خزف میں امتیاز نہ کیا — نہ مور اور کبوتر میں

ایک کے گلے میں میرے ہی طرح پٹہ ڈال دیا گیا — اور خوش نوا طوطی اور معمولی فاختہ میں امتیاز کیا گیا۔"

۲۶۔ بجلی گرنے سے ٹوٹنے کا ذکر ایک عینی شاہد مولوی بشیر الدین نے کیا ہے جو اس وقت حیدر آباد کے ایک اعلیٰ حاکم کی حیثیت سے وہاں تعینات تھے۔ انھوں نے اپنی اردو کتاب واقعات مملکت بیجاپور جلد سوم صفحہ ۱۲۷، میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس قصّہ کا ایک دلچسپ حصّہ یہ ہے کہ وہاں ایک قبر محمد سوم کی ہے جس کی چھت بھی اسی طرح ٹوٹ گئی۔ اگر ہمایوں کی قبر اس کے مظالم کی وجہ سے خدا کے غضب سے تباہ ہوئی تو محمد سوم کی قبر اس کے اشارہ پر محمود گاواں کے قتل کی بنا پر تباہ ہوئی ہوگی۔

۲۷۔ محمود گاواں، 'ریاض الانشا' حیدر آباد ایڈیشن ۱۹۴۸ء نمبر ۹۴ صفحہ ۱۰۷۔

۲۸۔ ایضاً نمبر ۱۴۵ صفحہ ۲۹۹۔

۲۹۔ ایضاً۔ ان اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے:

میری زندگی کا منظر جو بالکل تاریک ہو گیا تھا — اس میں اعلیٰ حضرت کے پیروں کی خاک کی برکت سے نئی روشنی آگئی۔

اعلیٰ حضرت ہمایوں شاہ بہمن بادشاہت کا جوہر — ایسا ہے کہ اس کے خیالات کی حقیقت حضرت جبرئیل سے بھی پوشیدہ ہے۔

اگر تیری نرم دلی اور حسن کے پھول سمندر پر گذریں — تو سمندر کی تہ کی مچھلیوں میں فوراً مشک کی خوشبو پیدا ہو جائے۔

میرے حقیر معاملات کا حال ایسا ہے کہ اعلیٰ حضرت سے پوشیدہ نہیں ہے — تو میں عرض کروں گا کہ اپنی مہربانی اور لطف و کرم سے ایک لمحہ کے لیے میری بات سن لیں۔

اس سرزمین میں میرے قیام کا مقصد حضور کی قدم بوسی ہے — ورنہ بغیر اس زندگی بخش خاک کے میری زندگی بالکل بے مقصد ہے۔

اے کان کرم اس حاجت کے موقعہ پر میری تجھ سے صرف اتنی التجا ہے — اگر یہ قبول نہ ہوئی تو یقیناً میری روح اس مادی جسم سے پرواز کر جائے گی۔

میری التجا یہ ہے کہ مجھے ایک گوشہ عافیت عطا ہو کہ میں دنیا کے بکھیڑوں سے الگ ہو سکوں — اور جہاں سے میں تیرے قصر عالی کی دہلیز کا بوسہ دینے کا فخر حاصل کر سکوں۔

اللہ تعالٰے سے میری دعا ہے کہ حضور عالی کا قصر آسنا بلند ہو کہ آسمان اس کا پردہ ہو اور خود بار عب
زحل اس کا محافظ ہو۔

۳۰۔ ریاض الانشا، نمبر ۳۱ صفحہ ۱۰۲۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۸۔

دسواں باب

مجلس ولایت کی حکومت

نظام الدین احمد سوم[1]

۴ ستمبر ۱۴۶۱ء سے ۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء

مجلس ولایت

ہمایوں کے انتقال پر اس کا لڑکا احمد آٹھ سال[2] کی عمر میں نظام الدین احمد شاہ سوم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اُسے شاہ محب اللہ نے داہنا ہاتھ اور سید شریف خلف سید السادات سید حنیف نے بایاں ہاتھ پکڑ کر تخت فیروزہ پر بٹھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم بادشاہ نے جو انسان اور اس کی فطرت کا اچھا مبصر تھا یہ دور اندیشی کی کہ ایک مجلس ولایت مقرر کر دی جس کے اراکین خواجہ جہاں ترک، ملک التجار محمود گاواں اور مادر ملکہ مخدومہ جہاں بیگم تھے اور مادر ملکہ کو آخری رائے کا حق تھا۔[3] نئے بادشاہ کے تخت نشین ہوتے ہی محمود گاواں کو جمدۃ الملک وزیر کل اور طرفدار بیجاپور بنا دیا گیا اور خواجہ جہان ترک کو وکیل اور طرفدار تلنگانہ۔ ہر روز جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو خواجہ جہان اُس کے داہنے ہاتھ پر اور ملک التجار بائیں ہاتھ پر ہوتے اور یہی دو ملک کا انتظام ایک معتمد خاتون ماہ بانو کے وسیلہ سے مادر ملکہ کی مدد سے چلاتے۔ دراصل جس اعلےٰ دماغ نے احمد سوم کے عہد میں حکومت کی وہ یہی عالی مرتبت ملکہ تھی جس کے مقابلہ کی دانشمند عورت

ہندوستان میں نہیں پیدا ہوئی تھی اور اس کے لیے یہ کچھ کم قابل تعریف بات نہیں ہے کہ اس نے نہایت کامیابی سے اس سہ رکنی جماعت کو چلایا جس میں دو ایسے اشخاص تھے جو دکن کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ لائق و فائق تھے۔

داخلی قیام امن

حکومت کا آغاز ان لوگوں کی عام معافی سے ہوا جنھیں ہمایوں نے سیاسی قصوروں یا فرقہ دارانہ رجحان کی بنا پر قید کیا تھا۔ اس کارروائی کا سہرا بڑی حد تک وزیر اعظم ملک التجار محمود گاواں کے سر ہے[۲۶] لیکن مجلس ولایت نے ان لوگوں کی سرپرستی قائم رکھی جو علم و فن یا سلطنت کی خدمت میں ممتاز تھے اور نیز طبقہ امرا کے ممتاز لوگوں کی تھی لیکن یہ کارروائیاں جو حالات سدھارنے کے نیک ارادہ سے کی گئی تھیں کارگر نہ ہوئیں۔ بعض حکام نے خصوصاً وہ جو دور و دراز صوبوں میں تعینات تھے، یہ سوچا کہ تخت پر تو محض ایک بچہ براجمان ہے اس لیے انھوں نے مجلس ولایت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن حکومت اُس کے لیے تیار تھی اور کچھ دنوں تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں سنائی دی۔

اس چپقلش کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خواجہ جہاں ترک اور ملک التجار گیلانی دونوں آفاقی طبقہ کے تھے اور خواجہ جہاں نے جلد ہی اپنے آپ کو سب کے لیے تکلیف دہ بنا لیا حتیٰ کہ خود مجلس ولایت کی صدر ملکہ کو اُس پر شبہہ ہونے لگا اگرچہ محمود گاواں اندرونی مصالحت میں ہمایوں کی مقرر کردہ پالیسی پر برابر عامل رہا۔ دکن کی تاریخ کا یہ عجیب مسئلہ ہے کہ ہمایوں اور اُس کے متوسل محمود گاواں دونوں حتی الامکان اس کی کوشش کرتے رہے کہ دکن کی سلطنت کے اندر جو دو فرقے ہیں اُن میں میل ملاپ کا احساس پیدا کریں مگر دونوں کو جن لوگوں میں جینا مرنا تھا اُن میں پائیدار اثر نہ پیدا کر سکے۔ حکومت کے آغاز میں جو چہ میگوئیاں ہوئیں وہ غالباً دو افسوسناک عوامل کی بنا پر تھیں۔ اگر نو وارد نئی حکومت سے اس لیے غیر مطمئن تھے کہ جن بنیادی اصولوں پر حکومت قائم تھی اُن سے اُن کا وہ اقتدار ختم ہو گیا تھا جو علاء الدین احمد دوم کے عہد میں انھیں حاصل تھا اور پرانے آنے والے یہ سمجھتے تھے کہ نئی حکومت صرف دو نو واردوں یعنی خواجہ جہان اور ملک التجار پر مشتمل تھی۔

کلچرل حالات

مجلس ولایت کا عہد حکومت اڑیسہ کے کپلیشور اور مالوہ کے محمود خلجی کی بلا وجہ چھیڑی ہوئی دو لڑائیوں میں اس قدر مصروف رہا کہ وہ کوئی کلچرل حیثیت کا تعمیری کام نہ کر سکا۔ اس میں شک نہیں کہ محمود گاواں کی پختہ

بصیرت اور ہمہ گیریت یقیناً آگے بڑھ کر دکن کو اُس کلچرل عروج کی طرف لے جارہی ہوگی جو آگے چل کر جلد اُسے حاصل ہونے والا تھا لیکن اس کی سرکاری زندگی میں یہ بات ابھی بہت قبل از وقت تھی۔ دو یادگاریں ایک دیوانی اور ایک فوجی یقیناً ایسی ہیں جو اس زمانے سے منسوب کی جاسکتی ہیں، یعنی محمد آباد بیدر کے قلعہ کے اندر گگن محل اور ترکش محل کی تعمیر اور کلیانی قلعہ کی مستحکم دیواریں اور برج[۴۶]۔ ترکش محل میں کئی بڑے بڑے محراب دار کمرے ہیں جن میں یقیناً بعد کے اضافوں سے تبدیلی ہوتی ہوگی اور اُس عمارت کی یہ انوکھی خصوصیت ہے کہ ٹھیک اس کی چھت کے اوپر ایک فوارہ ہے اور گگن محل اس کے پیچھے کی طرف ہے جہاں سے خندق اور آگے کے وسیع میدان کا منظر نظر آتا ہے اور اس میں چار محراب دار دیوان خانے اور کئی غلام گردشیں ہیں[۴۷]۔ کلیانی قلعہ کی دیواریں اس قدر مستحکم ہیں کہ " اُس وقت کے جنگی اسلحہ اُن کے خلاف کارگر نہیں ہوسکتے تھے۔ خندق کی حفاظت باہر کی طرف دس بارہ فٹ چوڑی مسقف گذرگاہ سے کی گئی ہے جس کے سہارے کے لیے ایک نیچی دیوار اور ایک پشتہ ہے اور اس کے اندر کی طرف ٹھوس برجیاں ہیں۔ پشتہ کے پیچھے ایک اور مسقف گذرگاہ ہے جس کے سہارے کے لیے اندر کی طرف ایسے ہی پشتے اور ٹھوس برجیوں کی قطار ہے جن میں سے بعض مسقف گذرگاہ کی سطح سے پچاس فٹ بلندی پر ہیں[۴۸]۔"

اڑیسہ

قرون وسطیٰ کی بادشاہت کی کمزوری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کوئی بچہ تخت نشین ہو۔ دکن کے دشمنوں نے احمد سوم کی تخت نشینی کے تقریباً فوراً ہی بعد اس موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ پہلی ٹکر اڑیسہ کے اولوالعزم حکمران کپلیشور سے ہوئی جس کی اب یہ خواہش تھی کہ ہمایوں کے عہد میں اُسے اور اُس کے اتحادیوں کو جو کامیابی حاصل تھی اُسے موثر طور پر کام میں لائے اور اس نے بہمنی سلطنت سے خراج کا بھی مطالبہ کردیا۔ اپنے تلنگانہ کے اتحادیوں کے ساتھ وہ کولاس تک بڑھ آیا اور راستہ میں جو کچھ ملا اُسے تباہ کرتا ہوا آیا[۴۹] یہاں تک کہ وہ دارالسلطنت سے دس میل کے فاصلہ کے اندر تک بڑھ آیا[۵۰]۔ باہمت بیوہ ملکہ نے اپنے نوجوان لڑکے کو لڑائی پر بھیجا اور اس کے ساتھ خواجہ جہاں ترک اور پیدل، رسالہ اور ہاتھیوں کی فوج روانہ کی[۵۱]۔ دشمن کے سامنے پہنچ کر اور یہ سن کر کہ راجہ نے اس سے خراج کا مطالبہ کیا ہے نوجوان بادشاہ نے دلیری سے کہلا بھیجا کہ یہ بڑی اچھی بات ہوئی کہ رائے خود بہمنیوں سے ملنے آگیا ورنہ بادشاہ کو خود تکلیف کرکے اڑیسہ کے دارالسلطنت جاج نگر آکر رائے سے خراج وصول کرنا ہوتا[۵۲]۔ پہلا حملہ ہمایوں کے پرانے دوست اور برادر نسبتی محب اللہ نے کیا جس کے بعد شدید دست بدست لڑائی ہوئی اور تقریباً آٹھ بجے صبح سے لے کر سہ پہر تک جاری رہی[۵۳]

جب کہ رائے اور اس کے اتحادیوں کو سخت شکست ہوئی۔ خواجہ جہاں نے راجہ کا تعاقب کیا اور اس سے پانچ لاکھ نقرئی ٹنکہ تاوان جنگ وصول کیا۔

مالوہ اور گجرات

بادشاہ کی کمسنی سے دوسرا فائدہ اٹھانے والا دکن کا کٹر دشمن مالوہ کا سلطان محمود خلجی تھا۔ بظاہر مالوہ کے دارالسلطنت شادیاباد مانڈو[۵۸] میں دو پارٹیاں تھیں، ایک تو دکن سے سمجھوتہ کی حامی تھی جس کا سربراہ خلف المشایخ تھا جو پچھلے عہد میں صلح کی گفت و شنید کے دوران میں مالوہ کا سفیر تھا اور دوسرا فریق جس کے سرگروہ غدار نظام الملک اور اس کے اہل خاندان تھے۔ جو پچھلی حکومت کے عہد میں دکن سے مالوہ بھاگ آئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صلح جو پارٹی کا بہت اثر تھا چنانچہ نظام الدین احمد کی حکومت کے شروع ہی میں شادیاباد کے سفیر جوان سال بادشاہ کے لیے تحفے لے کر آئے تھے جن کا بیدر میں پرتپاک استقبال ہوا۔ دونوں سلطنتوں کے درمیان اتحاد مستحکم ہونے ہی والا تھا اس لیے کہ جب یہ سفیر اپنے وطن واپس پہنچے تو مالوہ کے حکمران کے لیے تحفوں سے لدے ہوئے تھے جو "تنہ بیش قیمت تھے کہ" فریقین کی حیثیت کے شایاں شان تھے"[۵۹] لیکن جلد ہی دوسرا فریق برسراقتدار آگیا جس کا خیال تھا کہ دکن پر حملہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے اس لیے کہ ایک کمسن بادشاہ ہونے کی وجہ سے ملک بہت کمزور ہو گیا ہے، خاص کر اڑیسہ کے رائے کے دو حملوں کی مزاحمت میں[۶۰]

محمود خلجی نے جب دکن پر حملہ کیا تو وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ اڑیسہ کا اولوالعزم حکمران کپلیشور بھی تھا[۶۱] اور خاندیش کا حکمران بھی اس حملہ کے خلاف نہ تھا۔ ۸۶۶ھ (۱۴۶۲ء) میں اتحادیوں نے خاندیش کے علاقہ سے ہو کر سرحد کو پار کیا اور بڑھتے ہوئے بیدر سے دس فرسخ یا تقریباً بتیس میل کے فاصلہ تک پہنچ گئے۔ پچھلی اڑیسہ کی فوج کے خلاف مہم کی طرح اس مرتبہ بھی جوان سال حکمران نے جنگ سے ذاتی دلچسپی لی اور خود بیجاپور، دولت آباد اور برار کی فوجیں لے کر ملک التجار محمود گاواں، خواجہ جہاں ترک، سکندر خاں ترک، اتابک اور کئی دیگر امرا کے ساتھ میدان جنگ میں پہنچ گیا[۶۲]۔ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اگرچہ بعض افسروں نے بے صبری کا اظہار کیا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ہمایوں نے دو فرقوں کے درمیان رواداری اور تعاون کی جو بنیاد ڈالی تھی وہ بارور ہو رہی تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ جو فوج ہمیشہ سے زیادہ خطرناک دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی وہ نوواردوں یا غریبوں اور نیز پرانے آنے والوں دکنیوں اور حبشیوں پر مشتمل تھی[۶۳]۔ فریقین کی فوجیں قندھار کے قلعہ بند شہر کے قریب مہکر میں ایک دوسرے سے دوچار ہوئیں (۱۲ جمادی الاول ۸۶۶ھ

۱۲ فروری ۱۴۶۱ء) ۔ صف بندی اس طرح ہوئی کہ نوعمر بادشاہ خواجہ جہان ترک، سکندر خاں اور ۱۱۰۰۰ ہزار رسالہ اور ۱۰۰ ہاتھیوں کے ساتھ قلب میں تھا اور ایک طرف نظام الملک ۰۰۰۰ نیزہ برداروں اور ۱۰۰ ہاتھیوں کے ساتھ اور دوسری طرف محمود گاواں ۰۰۰۰ ارسالہ اور ۴۰ ہاتھیوں کے ساتھ تھا[۱۸]۔ جوان سال بادشاہ رسالہ کی زبردست فوج کے ساتھ بالکل محمود خلجی کے مقابل میں تھا[۱۹] اور خواجہ جہان کے مقابل پر چندیری کا مہابت خاں اور ظہیر الملک اور نظام الملک کے مقابل پر اُس کا ہمنام نظام الملک غوری[۲۰] اور مالوہ کا ولی عہد سلطنت شہزادہ غیاث الدین تھے۔

چونکہ مالوہ کے بادشاہ نے اپنی فوج کے آگے مورچے بنا لیے تھے اس لیے شروع میں لڑائی دونوں فوجوں کے میمنہ اور میسرہ میں ہوتی رہی۔ محمود گاواں نے پہلے مہابت خاں اور ظہیر الملک کو شکست دی اور دونوں میدان جنگ میں کھیت رہے۔ دوسری طرف شہزادہ غیاث الدین نظام الملک ترک کے ہاتھوں زخمی ہو گیا اور میدان جنگ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شام تک جنگ کا فیصلہ بہمنیوں کے حق میں ہوگا کیونکہ خلجی خود فرار پر تیار ہو گیا تھا کہ دفعتہً ایک معجزہ پیش آیا جیسا کہ اکثر جنگ کا پانسہ پلٹنے اور تاریخ کا رُخ موڑنے میں پیش آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی بادشاہ ناتجربہ کار نوجوان ترکی افسروں کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا جنھوں نے بلا کسی کو ساتھ لیے دشمن کی طرف ہاتھی بھیجنا شروع کر دیے[۲۱] اس اثنا میں سکندر خاں کے ہاتھی کے ایک تیر لگا اور وہ بے تحاشا پیچھے کو بھاگا۔[۲۲] نوجوان سلطان جس خطرے میں پھنس گیا تھا اُس سے سکندر کو سخت تشویش ہوئی اور اُس نے سلطان کو گھوڑے سے اتار کر تیزی سے بیدر واپس بھیج دیا۔ بادشاہ کے گھوڑے کو کوتل دیکھ کر فوج میں سخت گڑبڑ مچ گئی اور ساری دکھنی فوج اپنے ہاتھ سے اس بری طرح فتح کو کھو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ محمود گاواں، خواجہ جہاں اور ذرا دیر پہلے کی فاتح فوج دارالسلطنت کی طرف پسپا ہو گئی۔

سارا واقعہ اتنا حیرت خیز تھا کہ مالوہ کے حکمران نے اسے جال میں پھنسانے کی ایک چال سمجھا اور تین دن کے انتظار کے بعد اُسے اطمینان ہوا کہ دکھنی فوج واقعی بیدر کی طرف پسپا ہو گئی تو اس نے تعاقب کا تہیہ کیا۔[۲۳] جب خواجہ جہان بیدر پہنچا تو اس نے مادر ملکہ سے شکایت کی کہ سکندر خاں کی ناسمجھی سے فتح شکست میں بدل گئی اور اُسے قید کرا دیا۔ ترک محافظین اس پر بہت برہم ہوئے اور انھوں نے ملکہ کو عرضی دی کہ سکندر کا قصور صرف اتنا تھا کہ جس وقت میمنہ اور میسرہ کی فوجیں غنیم کی صفوں کو لوٹنے میں مصروف تھیں اور بادشاہ کو تنہا چھوڑ دیا تھا تو اُس نے بادشاہ کو بڑے خطرے سے نکالا اور اس کی جان بچالی، اس لیے ایسے شخص کو قید کرنا جو بادشاہ سے گہری عقیدت رکھتا ہو سخت نامناسب ہے۔ ملکہ نے اپنے لڑکے کے ساتھ اس جوش عقیدت کا بہت اثر لیا لیکن کہا کہ سردست وہ اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتی بلکہ جب

مناسب موقع آئے گا تو خواجہ جہاں کو سزا دینے کے معاملہ پر غور کیا جائے گا۔[26]

پرانے آنے والوں اور نوواردوں میں سمجھوتہ کی نئی پالیسی کی ایک شہادت اس سے ملتی ہے کہ سہ رکنی مجلس ولایت نے پرانے آنے والوں پر اتنا زبردست اعتماد کیا کہ ان کے ایک آدمی طوغاں دکھنی[27] کو محمود گاواں کی سفارش پر ملکہ نے بیدر کا قلعہ سپرد کر دیا جب کہ اس کے گرد و پیش کا علاقہ خالی کرایا جا رہا تھا اور شاہی دربار فیروز آباد منتقل ہو رہا تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد محمود خلجی بیدر پہنچا اور شہر پر قبضہ کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اُس کی فوج نے برار، بیڑ اور دولت آباد کے صوبوں اور اضلاع پر قبضہ کر لیا۔[28]

اس نازک موقعہ پر دانشمند ملکہ اور محمود گاواں نے ایک نئی پالیسی کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر بہت بارور ہونے والی تھی یعنی مغربی ہند کے سب سے بڑے حکمران گجرات کے محمود کو بلایا کہ وہ بیدر پر زبردستی قبضہ کرنے والوں کو نکالنے میں آ کر مدد دے۔[29] اس کے چند ہی سال پیشتر سلطان محمود نے جو اُس وقت صرف تیرہ برس کا تھا اپنے چچا داؤد کو بہ مشکل سات دن کی مختصر حکومت کے بعد تخت سے اُتار کر سلطنت حاصل کی تھی، اور داؤد جو اب تک آزاد تھا اپنے بھتیجے کے خلاف سازش کر رہا تھا اس لیے گجرات کے امرا نے سلطان کو متنبہ کیا کہ ایسے نازک موقعہ پر اس کا اپنی سلطنت سے باہر جانا مناسب نہیں ہے لیکن بہادر سلطان نے حدیث شریف کا حوالہ دیا کہ دنیا کے نظام اور انسانیت کی فلاح کا انحصار اتحاد پر ہے۔ اگر کائنات اور عناصر باہم مل کر کام نہ کریں تو سب کچھ درہم برہم ہو جائے اور کامل بدامنی کا دور دورہ ہو جائے۔ نیز اگر انسان باہمی اتحاد کا رشتہ توڑ دیں تو جن قوانین کی فطرت پر حکومت ہے ان میں خلل پڑ جائے۔ جب سلطان محمود ملک سے باہر جانے کا ارادہ ترک کرنے پر راضی نہ ہوا تو اس کے وفادار امرا نے اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ بجائے دکھن جانے کے وہ خود مالوہ کا رُخ کرے تاکہ گجرات کے قریب رہے اور بالواسطہ دکھن کی مدد بھی ہو جائے۔[30] لیکن سلطان نے اسے بھی نہ مانا اور ۰۰۰۰۰ ۸ رسالہ فوج لے کر براہ راست دکھن روانہ ہو گیا اور راستے میں صرف گجرات اور دکھن کے سرحدی مقام سلطان پور میں قیام کیا۔[31]

دکھن کے اس نئے اتحادی کے نمودار ہونے پر خلجی کے سارے منصوبے بگڑ گئے۔ گجرات کے حکمران کے سرحد پر پہنچنے پر احمد سوم نے اُسے حسب ذیل خط لکھا:

"اللہ تعالےٰ کی بزرگی ہو کہ اس نے دو خدا سے ڈرنے والے اور طاقتور بادشاہوں کو ایک دوسرے کی مدد پر آمادہ کر کے ممالک کے اتحاد کی بنیادوں کو مضبوط کرنے پر آمادہ کیا اور لوگوں کے دلوں کے اندرونی گوشوں کو شاہانہ اتحاد کی روشنی سے منور کر دیا۔ مسند عالی نظام الملک اور ملک الشرق محمد پرویز سلطان تھانہ دار فتح آباد[32] کے عرایض سے معلوم ہوا کہ اعلےٰ حضرت اسلامی اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرنے میں سری

سلطنت کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔ اب میں اعلیٰ حضرت کو یہ اطلاع دینے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں کہ ہماری پیدل اور رسالہ فوج ہر صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیار ہے[۳۳]۔"

چنانچہ محمود گاواں ۰۰۰،۶ رسالہ فوج کے ساتھ بیڑ کے راستہ سے سرحد کی طرف روانہ کیا گیا جہاں اُسے ۰۰۰،۲۰ گجراتی فوج مل گئی۔ اس دوران میں اُس نے اور فوج بھی بھرتی کر لی اور ۰۰۰،۴۰ کی فوج کے ساتھ بیدر واپس آگیا۔ فیروز آباد کے دربار نے بھی خواجہ جہاں کو دار السلطنت کی طرف روانہ کر دیا ملو خاں کی یہ بڑی تعریف کی بات تھی کہ وہ اب تک خلجی کے مقابلہ میں قلعہ کی حفاظت کر رہا تھا اور اس طرح ملکہ نے اس پر جو اعتماد کیا تھا وہ حق بجانب ثابت ہوا[۳۴]۔ چنانچہ تین طرف کے دباؤ میں گھر کر خلجی کے لیے کوئی اور صورت نہ رہی بجز اس کے کہ مالوہ واپس جائے۔ پہلے وہ تھوڑی دور تک کلیانی کی طرف گیا لیکن جب اُسے خبر ملی کہ گجرات کا سلطان اُدھر آرہا ہے تو وہ تیزی سے برہان پور ہوتا ہوا اسیر کی طرف روانہ ہو گیا[۳۵]۔ خواجہ جہاں نے اُس کا سختی سے تعاقب کیا اور محمود گاواں نے اپنے ماتحت ۰۰۰،۱ فوج سے اس کا راستہ کاٹ دیا[۳۶]۔ اب خلجی نے اپنے ہاتھیوں کو اندھا کر دیا اور اپنا بھاری سامان جلا دیا اور گونڈوانہ، ایلچ پور اور اکل کوٹ کے راستہ سے واپس ہو گیا۔ راستے میں اس کی فوج کے پانچ چھ ہزار آدمی گرمی اور پانی کی قلت کی وجہ سے مر گئے اور باقی کو گونڈوں نے جی بھر کر لوٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مالوہ کا بادشاہ بالکل قلیل فوج کے ساتھ اپنے دار السلطنت واپس پہنچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے بہمنیوں کو دکھن سے نکال دینے کا اتنا یقین تھا کہ بیدر پہنچ کر اُس نے دکھنیوں کے ساتھ عزت اور مصالحت کا سلوک شروع کیا اور یہ حکم دیا کہ مالوہ کی فوج اور دربار کے لیے جو سامان بھی حاصل کیا جائے اس کی قیمت ادا کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ خلجی کا تازی سبزیوں کا ذخیرہ جب ختم ہو گیا تو اُس نے مولانا شرف الدین حق گو کرمانی کو جو اُس وقت شاہ خلیل اللہ کے مزار پر تھے خط لکھا اور اُن سے دریافت کیا کہ سبزی کے حقدار مالکوں سے سبزی کہاں خریدی جا سکتی ہے۔ بزرگ حق گو نے (اسی لقب سے وہ مشہور تھے) جواب دیا اور بے دھڑک سلطان کو اس کی منافقت پر سرزنش کی کہ ایک طرف تو اُس نے دوسرے کے ملک پر قبضہ کر رکھا ہے اور دوسری طرف خوراک کے معاملہ میں اتنی احتیاط ہے[۳۸]۔

خلجی کی ذلت آمیز پسپائی پر احمد سوم نے گجرات کے سلطان کو خط لکھ کر اُس کی تمام مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا جو اُس نے دکھن کی مدد پر آنے میں کی تھیں[۳۹]۔

لیکن مالوہ کی ڈرامائی حرکت کا یہ آخری منظر نہ تھا اس لیے کہ اگلے ہی سال ۸۶۷ھ (۱۴۶۳ء) میں محمود خلجی پھر ۰۰۰،۹۰ رسالہ کی زبردست فوج لے کر ۲۶ ربیع الاول ۸۶۷ھ (۱۹ دسمبر ۱۴۶۳ء) کو مانڈو سے

نکل پڑا[۵۳] اور بلا مزاحمت کے فتح آباد تک بڑھ آیا۔[۵۴] احمد سوم نے پھر گجرات کے سلطان محمود سے مدد مانگی اور رجب ۸۶۷ھ (اپریل ۱۴۶۳ء) میں خلجی کو معلوم ہوا کہ اس کا گجرات کا ہمنام دکمن کی مدد کے لیے سلطان پور پہنچ گیا ہے تو اپنے ملک کی طرف واپس ہوگیا۔[۵۵]

اس کے ٹھیک تین ماہ بعد ۱۳ ذلقیعدہ ۸۶۷ھ (۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء) کو عین اپنی شادی کی رات کو احمد سوم فوت ہوگیا اور اس کا چھوٹا بھائی محمد خاں شمس الدین محمد شاہ سوم کے لقب سے اس کا جانشین ہوا۔

تشریحات

۱ - علاء الدین ہمایوں شاہ کے جانشین کا نام فرشتہ نے نظام شاہ لکھا ہے جس کی تائید برہان نے بھی کی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کا پورا نام نظام الدین احمد شاہ تھا۔ ریاض الانشا نمبر ۱۹ صفحہ ۹۵ میں محمود گاواں نے مالوہ کے محمود خلجی کے سفیر شیخ داؤد کے نام خط میں پورا نام دیا ہے جس کی مزید تصدیق اس کے سکوں کی عبارت سے ہوتی ہے۔ جیتل یا فلس کی عبارت یہ ہے:

اوپر کی طرف: المستغز بنصر اللہ القوی

نیچے کی طرف: احمد شاہ بن ہمایوں شاہ البہمنی

اسپیٹ کا مضمون اسلامک کلچر ۱۹۲۵ء کے صفحہ ۲۹۹ پر۔ کاڈرنگٹن نے نیومسمیٹک کرانیکل ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۰۰ میں حسب ذیل سکہ غلط تاریخ کے ساتھ دیا ہے:

اوپر کی طرف: الراجی بتائید الرحمن ۸۶۶ھ۔

نیچے کی طرف: ابو المظفر احمد شاہ السلطان۔

اور لکھا ہے کہ ۸۲۶ھ پڑھنا چاہیے اور اس سکہ کو احمد اوّل سے منسوب کیا ہے جس نے ۸۲۵ھ سے ۸۳۸ھ تک حکومت کی۔ دراصل اس کے اندازہ میں غلطی اس لیے ہوئی کہ وہ ہمایوں کے جانشین کے پورے نام سے واقف نہ تھا۔ ہمارے سارے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ احمد سوم کا انتقال ۱۳ ذیقعدہ ۸۶۷ھ (۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء) کو ہوا۔ عبد الولی خاں کتاب مذکور صفحات ۱۲۳ و ۱۲۵۔

۲ - برہان نے صفحہ ۹۷ میں ہمایوں کی وصیت یہ لکھی ہے کہ اس کے تین لڑکوں میں محمود گاواں جسے اس اعلیٰ منصب کے لیے مناسب سمجھے تخت نشین کردے لیکن یہ قرین قیاس نہیں ہے اس لیے کہ اس کا سب سے بڑا لڑکا احمد نہ صرف آٹھ سال کا تھا اس لیے موزونیت کے لحاظ سے اس کے بہتر ہونے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔

۳۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۴۔

۴۔ برہان صفحہ ۹۶۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کارروائی تمام فرقوں اور پارٹیوں میں مجموعۂ اور خوش دلی کی پالیسی کے سلسلہ میں تھی جسے بعد کو محمود گاواں نے اور ترقی دی۔

۵۔ ریاض الانشا نمبر ۱۲ صفحہ ۲۱۔ محمود گاواں کا خط گیلان کے سلطان علاء الدین کے نام۔

۶۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۳۵۲۔

۷۔ رپورٹ حیدر آباد آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ ۲۹-۱۹۲۸ء صفحات ۹-۱۰۔

۸۔ ایضاً ۳۵-۱۹۳۴ء صفحہ ۱۹۔

۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۴۔

۱۰۔ فرشتہ میں ۱ کروہ ہے اور برہان میں ۳ فرسخ = ۵۴۰۰۰ گز۔

۱۱۔ تعداد میں اختلاف ہے۔ فرشتہ نے ۴۰۰۰ رسالہ لکھا ہے اور برہان نے صرف ۱۰۰۰۔

۱۲۔ جاج نگر، اب جاج پور۔ ریاست اڑیسہ میں اسی نام کے سب ڈویژن کا مستقر۔ ۵۱ر۲۰ شمال، ۲۹ر۸۶ مشرق۔
بنرجی نے جلد اوّل صفحہ ۲۹۶ میں یہ نہیں تسلیم کیا ہے کہ اڑیسہ کی فوج کو بہمنیوں نے شکست دے دی لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ جگناتھ مندر میں ایک کتبہ میں پرشوتم کے لیے جو "فاتح کل برگہ" کا فقرہ استعمال ہوا ہے اُس سے بنرجی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُس نے واقعی گلبرگہ کو فتح کر لیا۔ دراصل بہمنی سلطنت کو سلطنت بیدر بھی کہتے تھے اور سلطنت گلبرگہ بھی۔ مگر اس کی مطلق کوئی شہادت نہیں ہے کہ اڑیسہ والوں نے گلبرگہ کو بھی فتح کیا۔

۱۳۔ برہان صفحہ ۹۷۔

۱۴۔ شادی آباد مانڈو کے لیے دیکھو یزدانی کی کتاب مانڈو، دی سٹی آف جوائے، آکسفورڈ ۱۹۲۹ء۔ بہمنیوں کے مالوا سے تعلقات کے متعلق بہت عمدہ خلاصہ کے لیے دیکھو ڈے کی "سڈیول مالوا" باب ششم۔

۱۵۔ اس سفارت کا ذکر ریاض الانشا نمبر ۹ صفحہ ۴۹ میں ملے گا جو خلف المشائخ کے نام خط ہے۔

۱۶۔ برہان صفحہ ۹۸۔

۱۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۱۸۔ برہان صفحہ ۹۸۔ آتابک کے لقب کا ذکر ظفر الوالیہ جلد اوّل صفحہ ۱۹۶ میں ہے۔

۱۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۲۰۔ برہان صفحہ ۹۸ میں ہے کہ نظام الملک میمنہ پر تھا اور محمود گاواں میسرہ پر، مگر فرشتہ میں اس کا الٹا ہے۔

جنگ مہکا۔ دیکھو یو۔ این ڈے کی کتاب مذکور صفحہ ۱۵۲۔ بحوالہ شکیب حکیم کی مآثر محمود شاہی۔ بوڈلین، الیت ۲۳۷۔ مہکا دریائے بھجرا پر۔

۲۱۔ برہان میں ۲۰۰۰۰ ہے اور فرشتہ میں ۱۲۰۰۰۔

۲۲۔ یہ برہان صفحہ ۹۹ میں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظام الملک کو ہمایوں نے قتل نہیں کیا تھا۔

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۲۵۔ برہان صفحہ ۹۹۔

۲۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۲۷۔ ملّو وہی شخص ہے جو ہمایوں کی تخت نشینی کے وقت حسن کو تخت نشین کرنے کی سازش میں شریک تھا۔

۲۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۲۹۔ یہ خط محمود گاواں کی ایما سے لکھا گیا تھا۔ دیکھو فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

گجرات کے سلاطین: داؤد ۸۶۲ھ ۱۴۵۸ء۔ محمود بیقرہ اوّل ۸۶۲ھ ۱۴۵۸ء سے ۹۱۷ھ ۱۵۱۱ء۔ اس بادشاہ نے بہمنی سلطنت کا عروج بھی دیکھا اور زوال بھی۔ وہ خود گجرات کے حکمرانوں میں نامور ترین تھا (یہ شاید محمود بیقرہ ہے۔ مترجم)

۳۰۔ اس خط کے متعلق اور نیز گجراتی امرا کے ساز باز کے لیے دیکھو برہان صفحہ ۱۰۰۔

۳۱۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۵۔

۳۲۔ یہ فتح آباد بلا شبہ لانگ تھا، دھولیا سے چھ میل شمال۔ اسی نام کے ضلع میں۔ دیکھو ہوڈی والا کی کتاب اسٹڈیز ان انڈو مسلم ہسٹری جلد اوّل صفحہ ۴۳۷۔

۳۳۔ برہان صفحہ ۱۰۲۔

۳۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۶۔

۳۵۔ برہان صفحہ ۱۰۳۔ کلیان یا کلیانی ریاست کرناٹک کے ضلع بیدر میں۔ کبھی چالوکیا حکمرانوں کا دار السلطنت تھا۔ جائے وقوع ۱۷ر۳۲ شمال، ۷۶ر۵۷ مشرق۔ اسیر ریاست مہاراشٹر کی تحصیل برہان پور میں ایک اہم قلعہ ۲۱ر۲۸ شمال، ۷۶ر۱۸ مشرق۔

۳۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۷۔

۳۷۔ اس شہر کا محل وقوع میں معلوم نہ کر سکا۔ سابق ریاست حیدر آباد کے مغربی کنارے پر ایک اکل کوٹ ہے جو کسی زمانہ میں ایک ہندوستانی ریاست کا مستقر تھا، مگر یہ اکل کوٹ کسی اور جگہ ہوگا۔

۳۸- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۷-

۳۹- برہان صفحہ ۱۰۴-

۴۰- برہان صفحہ ۱۰۵- اس مہم کے حال کے لیے دیکھو ڈے کی کتاب مذکور صفحات ۱۵۶ و ۱۵۷-

۴۱- ظفر الوالیہ جلد اوّل صفحہ ۱۹۶-

۴۲- یہ پورا خط برہان میں ہے جس میں مہینہ بھی دیا ہوا ہے-

گیارھواں باب

محمود گاواں کا عہد

شمس الدین محمد سوم

۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء سے ۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء

الف۔ مجلس ولایت ۱۴۶۳ء سے ۱۴۶۶ء

شمس الدین محمد[1] جس وقت اپنے بھائی کا جانشین ہوا اُس وقت اُس کی عمر ۹ - ۱۰ سال کے درمیان تھی[2]۔ اسے تختِ فیروزہ پر شاہ محب اللہ نے (جو بظاہر محمود خلجی کی قید سے رہا ہو گئے تھے) اور سید حنیف نے بٹھایا۔ انھیں دو بزرگوں نے تین سال پیشتر احمد سوم کو تخت پر بٹھایا تھا۔ دانشمند ملکہ نے اپنے جوان سال لڑکے احمد کو شروع ہی سے اپنے چھوٹے بھائی محمد سے درگذر کے سلوک کی تربیت دی تھی اور یہ دونوں ہر وقت کے ساتھی، اور کھیل کود کے شریک ہو گئے تھے۔ اسی کے ساتھ ملکہ نے شاہی معلم کے طور پر اُس وقت کے سربرآوردہ عالم شرف الدین صدر جہان شوستری[3] کو مقرر کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیا بادشاہ بہمنی سلاطین میں سب سے زیادہ باکمال ہو گیا۔

خواجہ جہان ترک کا قتل

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ جہان ترک اپنے خود سرانہ طرز عمل کی وجہ سے امرا کے با اثر حلقہ کی ہمدردیوں سے محروم ہو چلا تھا۔ شروع میں اُس نے سر بر آوردہ امرا کے خاندانوں کے افراد کو برطرف کر کے ان کی جگہ نئے امرا کو مقرر کیا تھا اور اس طرح اُس توازن کو ختم کر دیا جو ہمایوں نے شروع کیا تھا اور جسے سابقہ حکومت میں سہ رکنی مجلس نے قائم رکھا تھا۔ وہ خود اپنا حکم چلانے پر اتنا تلا ہوا تھا کہ اُس نے ملک التجار محمود گاواں کو ایک دور و دراز کے سرحدی صوبہ میں بھیج دیا تھا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کر سکے۔ جلد ہی یہ افواہیں اڑیں کہ اُس نے شاہی خزانہ سے نقد اور جواہرات کا تغلب کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اُس کے سکندر خاں کے قید کرنے پر ملکہ اُس سے ناراض ہو گئی تھی اس لیے کہ ملکہ کے نزدیک سکندر کا قصور صرف یہی تھا کہ اُس نے سابق بادشاہ کی جان بچائی تھی۔ محمود گاواں کی دربار سے عدم موجودگی میں اُس کی میانہ روی کا جو اثر سہ رکنی مجلس میں تھا وہ ختم ہو گیا اور پرانے امرا جس برہمی سے پیچ و تاب کھا رہے تھے وہ سب خواجہ جہاں کے انجام کی نشان دہی کرتے تھے۔ ملکہ نے جیسا کہ اس نے ترکی محافظین کے وفد سے کہا تھا موقع کی منتظر تھی اور بالآخر خواجہ جہان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سنہ ۸۷۰ھ (۱۴۶۶ء) میں ایک دن صبح کو جب وہ بادشاہ کو سلامی دینے تخت شاہی کی طرف جا رہا تھا اچانک نظام الملک مسلح سپاہ کا ایک دستہ لے کر پہنچ گیا۔ جب خواجہ جہان دربار میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ دو خادمائیں محل کے زنان خانہ سے نکلیں جن کے اشارے پر نظام الملک نے خواجہ جہان کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور کمسن بادشاہ کے سامنے اُسے قتل کر دیا۔ اس طرح سہ رکنی مجلس کا خاتمہ ہو گیا جس نے ہمایوں کے انتقال کے بعد ۲۸ ذیقعد سنہ ۸۶۵ھ (۴ ستمبر ۱۴۶۱ء) کو حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا تھا۔

مجلس ولایت کی کامیابی

سہ رکنی مجلس ٹھیک پانچ سال قائم رہی اور اسے کئی لحاظ سے امتیاز حاصل رہا۔ پہلی بات جو یاد رکھنے والی ہے وہ مجلس ولایت کے ارکین کی وحدت مقاصد و عمل ہے جس کی بنیاد پر ملک کی حکومت رہی۔ عام پالیسی میں ایک نقطہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ملکہ، وزیر اعظم ملک التجار محمود گاواں اور خواجہ جہان ترک میں اختلاف رائے ہوا ہو اور اسی اتحاد عمل نے دکن کو مالوہ کے خطرہ سے نجات دی۔

مزید برآں اس عہد میں جو دو لڑائیاں ہوئیں، ایک اڑیسہ کے اولوالعزم کپلیشور کے خلاف اور دوسری مالوہ کے طاقتور حکمران کے خلاف، ان دونوں میں سہ رکنی مجلس کے دونوں مرد اراکین پہلو بہ پہلو شریک جنگ رہے اور بظاہر ان میں کسی قسم کا بھی اختلاف نہیں ہوا۔ مجلس کا اصول حکمرانی غیر معمولی حد تک مقبول تھا حتیٰ کہ جب سکندر خاں کے بادشاہ کو میدان جنگ سے بیدر پہنچانے اور اس وجہ سے جنگ میں شکست ہو جانے پر خواجہ جہاں نے اُسے قید کیا تو اگرچہ ملکہ جو حکومت کا موثر عنصر تھی اپنے جی میں خوش ہوئی ہوگی کہ اُس کے لڑکے کو میدان جنگ کی بھگدڑ سے نکال لیا گیا مگر وہ سکندر کو رہا نہ کر سکی۔ باوجود اس فطری کمزوری کے اس کے لیے یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ اُس نے دو لڑائیوں میں جو دو سال کے اندر ہی ہوئیں اپنے نوجوان لڑکے کو بیچ لڑائی میں بھیج دیا اور اس طرح دربار کی اس جرأت مندانہ رہنمائی کا سلطنت کے طبقہ خواتین پر بہت اچھا اثر پڑا ہوگا۔ آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلطنت کے امرا کے دو فریق یعنی دکھنیوں اور نام نہاد آفاقیوں میں سمجھوتہ کی پالیسی برابر قائم رہی۔ اس پالیسی کا قائم رہنا بالکل مناسب وقت تھا کہ سہ رکنی مجلس کے تینوں اراکین کی تربیت ہمایوں کی نگرانی میں ہوئی تھی جو اس پالیسی کا بانی تھا۔ ملّو خاں دکھنی کی رہائی جس نے مرحوم سلطان کے عہد میں اتنا پریشان کیا تھا اور اُس کا محمد آباد بیدر کے شاہی محل کے قلعہ کی حفاظت کے اہم عہدہ پر مقرر ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب تک موجودہ دور قائم ہے سیاسیات میں دونوں فرقوں کا امتیاز ختم ہو گیا ہے۔

لیکن محمد سوم کی جانشینی پر بعض حکام سلطنت کی خودسری اور خواجہ جہاں کے قتل سے جو تمام طبقوں میں غیر مقبول ہو گیا تھا۔ یہ اتحاد عمل کی پالیسی ختم ہو گئی۔ اب محمود گاواں کا شجاعت، ذہانت اور تدبر میں کوئی مدمقابل نہ تھا اور ہم محمد سوم کی حکومت کے اگلے دور میں اُسے سب پر حاوی دیکھیں گے۔

ب۔ محمود گاواں کا عروج۔ ۱۴۶۶ء سے ۱۴۷۳ء

محمود گاواں بہ حیثیت وزیر اعظم

تقریباً ۸۷۰ھ (۱۴۶۶ء) میں جب کہ محمد شاہ سوم چودہ سال کا ہو چکا تھا اُس کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور سلطنت کے ملکی اور فوجی حکام کو خلعتیں تقسیم کی گئیں[۵]۔ دانشمند مادر ملکہ نے جو اپنے شوہر ہمایوں کے انتقال کے بعد سے حکومت میں بہت بڑی متحد کرنے والی قوت تھی اب خیال کیا کہ اُس کا عملی سیاست سے کنارہ کش ہونے کا وقت آ گیا ہے اور اگرچہ بادشاہ بلاناغہ روز اُس کی خدمت میں

حاضر ہو کر عام پالیسی کے معاملات پر مشورہ کرتا تھا۔[۴۸] مگر اب اُس کا مشورہ بطور ایک عملی حکمران کے نہیں ہوتا تھا بلکہ محض ایک سلطنت کے خیر اندیش کی حیثیت سے۔ خواجہ جہان ترک پہلے ہی ختم ہو چکا تھا اور مخدومہ جہاں کی کنارہ کشی کے بعد ملک التجار محمود گاواں کے وزیر اعظم بنانے کا وقت آگیا تھا۔ اُس کے لیے ایک باضابطہ دربار منعقد کیا گیا جس میں بادشاہ نے حاضرین سے خطاب کیا اور اس کی تقریر اس کی دانشوری کے لحاظ سے خصوصاً قابل لحاظ تھی اور اس لیے بھی کہ اس سے ایک مرتبہ پھر بہمنی حکومت کے نظریہ کی توضیح ہو جاتی ہے۔ بادشاہ نے کہا:

"معلوم ہونا چاہیے کہ مذہبی اور دنیاوی معاملات میں مجلس شوریٰ کی ضرورت ہوتی ہے اور جن قوانین پر ہر سلطنت اور ملک کا انتظام مبنی ہے اُن پر بہت غور و خوض اور احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ حکومت کے معاملات میں دانشوروں کی رائے بڑی احتیاط سے لی جائے، اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے خود پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ انھیں دنیاوی معاملات میں مشورہ کرنا چاہیے۔ حضور اقدس نے فرمایا ہے کہ مشورہ توبہ کے مقابلہ میں ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ملامت کے خلاف پناہ گاہ ہے اور خلیفہ حضرت علی نے فرمایا کہ "بہترین وزیر مشورہ ہے اور بدترین اقتدار خود پسندی ہے"۔ اس سب کا مطلب یہ ہے کہ دانشمند وزیر سے مشورہ لینا بہت اچھی بات ہے اس لیے کہ اُس کی رائے مثل آئینہ حق و صداقت کے ہوگی۔ قدیم فلسفیوں نے کہا ہے کہ "بادشاہوں اور کامیاب لیڈروں کو بغیر بڑوں کا مشورہ لیے سلطنت کی پالیسی میں دخل نہ دینا چاہیے"۔[۵۰]

اس نصب العین کے حصول کے لیے بادشاہ نے مادر ملکہ کی رضامندی سے خواجہ محمود گاواں کو وزیر اعظم مقرر کیا اور اسے سلطنت کے تمام صوبے سپرد کیے اور تمام ادنےٰ و اعلےٰ معاملات کا اختیار دیا۔[۵۱] اُسے نہ صرف خواجہ جہان کا خطاب دیا بلکہ سرکاری کاغذات میں "آقائے ساکنان عالم، معتمد قصر شاہی اور نائب السلطنۃ" لکھا جانے لگا اور دو ہزار مغل سپاہ اُس کے جلو میں دی گئی۔

محمود گاواں کی وزارت عظمیٰ میں بہمنی سلطنت نے وہ عروج حاصل کیا جو اُس کی ساری تاریخ میں کبھی نہیں حاصل ہوا تھا۔ اُس کے عہد وزارت کی خالص کلچرل کامیابیوں کے ماسوا اُس نے کونکن علاقے کو گوا تک فتح کر کے اور مشرق میں گوداوری کرشنا دو آبہ کو سلطنت میں شامل کر کے سلطنت کی سرحدوں کو مضبوط کر لیا اور اڑیسہ کے اندرونی حصہ اور کانچی تک کارومنڈل کے ساحل پر کامیاب مہمات کیں۔ بہمنی سلطنت کی حدود پہلی مرتبہ سمندر تک پہنچ گئیں اور خواجہ کے عہد نے مالوہ، اڑیسہ اور وجے نگر کے حوصلوں کو کچھ دنوں کے لیے ٹھنڈا کر دیا۔

محمود گاواں کی عام پالیسی

یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ دارالسلطنت میں ایک جماعت کی خواجہ سے مستقل دشمنی کے باوجود ایسے نتائج حاصل ہو گئے۔ یہ دشمنی اس وقت اور اُبھر آئی جب خواجہ سلطنت کی مغربی سرحدوں پر امن قائم کرنے کے لیے تقریباً تین سال دارالسلطنت سے باہر رہا اور دشمنوں کو موقع ملا کہ نہ صرف جواں سال حکمران کے کان بھریں بلکہ خواجہ کے کاموں میں روڑے اٹکائیں؛ اور اس کے لیے بہمنی سلطنت کا جھنڈا بعید مغرب اور جنوب مغرب تک لے جانے میں مشکلات پیدا کریں۔ وہ بار بار محمد آباد بیدر کے حکام کو لکھتا ہے اور میدان جنگ میں سپاہ اور سامان کی کمی کی سخت شکایت کرتا ہے[۳۱] اور اگر باوجود ضعیف العمری کے اس کی فطری جرأت وہمت نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو بہمنی افواج کا بُرا حال ہوتا۔ باوجود اس کے جب کبھی اعزاز اور ذمہ داری کے عہدوں کی تقسیم کا وقت آیا تو اُس نے اپنے پچھلے سیکھے ہوئے سبق کو یاد رکھا کہ بہمنی امرا کے دونوں فرقوں یعنی پرانے آنے والوں اور نو واردوں کا لحاظ رکھنا اور دونوں میں توازن رکھنا ضروری ہے۔ اسی کی تحریک پر ملک حسن کو نظام الملک اور تلنگانہ کا سرلشکر بنایا گیا، خواجہ جہان ترک کے دانشمند ترین ماتحت فتح اللہ کو عماد الملک اور سرلشکر برار اور یوسف عادل کو جو خواجہ کے لیے بمنزلہ اُس کے لڑکے کے تھا اور ترکی امرا میں شاید سب سے زیادہ قابل تھا دولت آباد، جنیر اور چاکن کا سرلشکر کیا گیا جس کی ماتحتی میں ترکی امرا بشمول قاسم بیگ، شاہ قلی سلطان اور دوسرے مغل کیے گئے[۳۲]

محمود گاواں نے صرف پرانے آنے والوں اور نو واردوں ہی کے درمیان توازن کا پلہ برابر نہیں رکھا بلکہ ہندو آبادی کی ہمدردی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ بادشاہ سے اُس کی اس سفارش نے کہ بلگام کے رئیس پرکتیا کو اُس کی بدعملیوں کی معافی دی جائے اور اُسے سلطنت کا امیر بنایا جائے[۳۳] یقیناً مرہٹہ قوم کو مطمئن کرنے کا راستہ صاف کیا ہوگا جس کے بعد بیجاپور کے مغربی اضلاع میں حکمرانی کے وقت بڑے کارآمد نتائج نکلے۔ فرقہ واریت کو ختم کرنے کا رجحان جو کچھ دن پہلے سے کارفرما تھا وہ یقیناً کپلیشور کے خلاف بہمنیوں اور وجے نگر کے اتحاد سے اور جو مدد بعد کو محمد سوم نے اڑیسہ کے ہم ویر کو دی اُس سے اور زیادہ مستحکم ہو گیا ہوگا۔[۳۴] ہندوؤں کے بہمنیوں سے خوشگوار تعلقات کی ایک اور مثال وہ کارنامہ ہے جو مدھول کے رئیس نے مغربی مہموں کے دوران میں انجام دیا۔ محمود گاواں جب بارش کا موسم گذارنے کولھاپور واپس آیا تو اس نے مدھول کے حکمران کرن سنگھ سے کہا کہ مغربی گھاٹ کی دشمن

سنگ میشور اور کھیلنا کے راجاؤں سے حفاظت کرے۔ کہا جاتا ہے کہ بہمنی فوج کو ان کے خلاف جو فتح حاصل ہوئی اُس کی وجہ خاص کر کرن سنگھ اور اس کے آدمیوں کی ہوشیاری تھی۔ کھیلنا کا مستحکم قلعہ بہمنی فوجوں کے آگے بڑھنے میں بڑی رکاوٹ تھا اس لیے کہ اس پر اتنا ڈھال تھا کہ اس پر چڑھنا مشکل تھا۔ چنانچہ کرن سنگھ نے ایک چال چلی۔ اُس نے چند سوسمار پکڑے اور ان کی کمر میں رسی باندھی اور انھیں رات کی تاریکی میں دیوار پر چڑھا دیا۔ ان جانوروں نے دیوار کو اتنی مضبوطی سے پکڑا کہ کرن سنگھ کا لڑکا بھیم سنگھ اور اس کی مرہٹہ فوج رسیوں کو پکڑ کر فصیل پر چڑھ گئی اور خواجہ کے لیے محصورین کا قلع قمع کرنا آسان ہو گیا۔

محمود گاواں کی سفارش پر بادشاہ نے، جمادی الثانی ۸۶۶ھ (۲۲ر اکتوبر ۱۴۶۱ء) کو علاوہ وسیع جاگیر کے رانا بھیم سنگھ کو گھوڑپڑے بہادر (گھوڑپڑے سوسمار کی ہندی) کا خطاب دیا جو مدھول کے خاندان کے شرفا آج تک فخریہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔[۱۲۴]

کلچرل حالات

اس عہد میں کئی قلعے تعمیر ہوئے جیسے پرینڈہ[۱۲۵]۔ لیکن دکھن کے فن تعمیر کی یادگاروں میں جو عمارتیں نامور ہوئیں وہ فوجی عمارتیں نہ تھیں بلکہ وہ شان دار عمارت بیدر کا عظیم الشان کالج ہے جو فلاح عامہ کے ایک مستقل نشان کے طور پر موجود ہے اور جس کی محمود گاواں کو ہمیشہ دل سے فکر رہی تھی۔ یہاں مناسب ہوگا کہ دکھن کے ایک ماہر فن تعمیر کے الفاظ اس عمارت کے متعلق درج کر دیے جائیں جو آج بھی سابقہ دار السلطنت دکھن کا ایک ممتاز سنگ میل ہے: "سامنے کی عمارت جو مختلف رنگ روپ کے کاشی کاری کام کے کھپروں کے طرح طرح کی خوبصورت ترتیب سے مزین ہے اس کے دونوں طرف سو سو فٹ بلند دو مینار ہیں۔ ان میناروں کو بھی خوبصورت کھپروں کو لہردار شکل میں ترتیب دے کر مزین کیا گیا ہے جس سے ساری عمارت کا منظر نہایت خوبصورت ہو جاتا ہے۔ عمارت نہایت بارعب صورت میں تین منزل کی بنی ہے۔ اس کی پوری لمبائی ۲۰۵ فٹ اور چوڑائی ۱۸۰ فٹ ہے۔ اس میں روشنی اور ہوا کا بہت عمدہ انتظام ہے جس سے بہتر آجکل کی عمارتوں میں بھی نہیں مل سکتا۔"[۱۲۶] اس عظیم مرکز علم کے چاروں طرف بہت بڑا احاطہ ہے جس میں ایک ہزار کمرے بنے ہیں جہاں سارے مشرق سے نامور علما اور معلمین جمع ہوتے تھے اور طلبہ کو صرف ذہنی غذا ہی مہیا کی جاتی تھی بلکہ کھانا اور کپڑا بھی مفت ملتا تھا۔[۱۲۷] اس طرح کا مرکز بغیر ایک معقول لائبریری کے نہیں ہو سکتا تھا جو یقیناً اُس کی بہت ہی اہم خصوصیت ہے اور ہم نے پڑھا

ہے کہ محمود گاواں کو کوئی تحفہ اتنا پسند نہ تھا جتنا ایک مخطوط اور جو قلمی کتاب بھی اُسے نذر کی جاتی تھی وہ فوراً مدرسہ کی لائبریری میں پہنچ جاتی تھی[18]۔ خود خواجہ بھی اکثر اپنے فرصت کے اوقات میں مدرسہ کی غلام گردشوں میں دیکھا جا سکتا تھا بلکہ اُس کے خطوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُسے محمد آباد بیدر میں تعلیم دینے کے لیے ایران اور عراق سے اہل علم کے ممتاز ترین افراد کو بلانے کی کتنی فکر رہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے اُس عہد کے اعلےٰ ترین اصحاب علم جیسے مولانا نورالدین جامی، نامور ایرانی عالم جلال الدین دوانی، شیخ صدرالدین عبدالرحمٰن رواسی وغیرہ کو دکھن بلانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا[19]۔

یہ وہ عظیم الشان مدرسہ ہے جس کی محمود گاواں نے ۸۷۶ھ (۱۴۷۲ء) میں تکمیل کی جیسا کہ اُس کے قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:

ایں مدرسہ رفیع و محمود بنا ۔ چوں کعبہ شد است قبلۂ اہل صفا
آثار قبول بیں کہ شد تاریخش ۔ از آیہ ربنا تقبل منا[20]
۸۷۶

قرآن کی ایک آیت جو اب تک ایک سامنے کے دروازے کی زینت ہے ہر ایک کے لیے ایک دعوت ہے کہ یہاں آکر اس کی ذہنی ضیافت میں شریک ہو:

سلامٌ علیکم طبتم فادخلوا ہا خالدین[21]

اصل عمارت ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۶ء) میں اورنگ زیب کے عہد میں بارود کے ایک ذخیرہ میں آگ لگ جانے سے بشمول دو خوبصورت میناروں کے ٹوٹ گئی تھی۔ طلبہ کے کمرے بھی زمانہ کی دستبرد سے ختم ہو گئے اور شاید ان کی جگہ جنوبی، شمالی اور مغربی رخ پر مکانات بن گئے لیکن آج بھی یہ دکھن کی عظمت ہے اور ایک نمونہ "خوبصورت کھپروں کی اُس تعمیر کا جو بعد کے منگولوں کے عہد اور تیمور اعظم کے دربار میں ترقی پایا"[22]۔

ان کار آمد عمارتوں نے بیدر کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ باہر بھی شہرت دے دی ہوگی اور روسی سیاح اتھانی سیس نیکیٹین جو ۱۴۶۹ء سے ۱۴۷۴ء تک خواجہ یوسف خراسانی کے فرضی نام سے دکھن میں رہا لکھتا ہے کہ "سارے مسلم ہندوستان میں یہ خاص شہر ہے"[23]۔ اس شہر کا رقبہ تقریباً ۱۵ میل لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا جس میں بہت آبادی تھی اور گھوڑے، کپڑے، ریشم، سیاہ مرچ اور دیگر سامان تجارت کا بکثرت کاروبار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات پر خاص کر زور دیا جاتا تھا کہ بیدر کے بازاروں میں کوئی ایسی چیز نہ فروخت ہو جو ملک میں نہ پیدا ہوئی ہو، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں وہ سب کچھ پیدا ہوتا تھا جو

اعلیٰ سے اعلیٰ مذاق کے لوگوں کی ضرورت کا ہو۔ سلطنت صرف دکھنیوں ہی کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا گہوارہ تھی اس لیے کہ نیکیٹین کا بیان ہے کہ "شہر" میں (جس سے اُس کا مطلب سلطنت میں ہے) ایک جگہ شیخبالودین پیر امر ہے (شاید اُس کا مطلب گلبرگہ میں شیخ سراج الدین جنیدی کے مزار سے ہے) اور ایک بازار الادنیا ہے (غالباً یہ گلبرگہ میں علاء الدین بہمن شاہ کے مزار سے ملحق تھی) جہاں ہندوستان کے ہر حصہ سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور دس دن تک تجارت کرتے ہیں اور تقریباً ۲۰۰۰۰ گھوڑے دارالسلطنت سے وہاں لائے جاتے ہیں۔ بیدر کے علاوہ دوسرے شہر مثلاً بہمنی بندرگاہ مصطفےٰ آباد دابول بھی تجارت اور کاروبار کے مرکز تھے۔ دابول میں جو بہت بڑا شہر تھا "بہت سے گھوڑے میسور، عرب، خراسان، ترکستان اور دوسرے مقامات سے آتے ہیں" اور ہندوستان اور نیز افریقہ کی بندرگاہوں سے نفع بخش تجارت ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں نے ملک کی دولت میں اضافہ کیا ہوگا اور اگرچہ نیکیٹین کا بیان ہے کہ دیہات کے لوگ "غریب تھے مگر امرا بہت مالدار تھے" اور "اپنے چاندی کے بستروں پر (مطلب پالکیوں سے) چلتے تھے آگے آگے بیس گھوڑے سونے کے ساز سے آراستہ اور پیچھے تین سو سوار، پانچ سو پیادے، دس مشعلچی آدمیوں کا پہرہ تھا اور ان کے علاوہ سو محرر ہوتے تھے جو محل کے اندر جانے والے اور باہر آنے والے کا نام لکھتے تھے۔ نیکیٹین کا بیان ہے کہ محل میں ہر چیز منقش یا مطلا یا دوسری طرح سے مزین تھی جس کا منظر بڑا عجیب تھا۔ بظاہر قلعہ کے اندر ہی مجلس عدالت تھی جس کا نیکیٹین نے خاص طور پر ذکر کیا ہے اُس نے اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ دارالسلطنت کی آبادی کی حفاظت کا بڑا خیال کیا جاتا تھا اس لیے کہ رات کو ایک ہزار پورے طور پر مسلح سواروں کا پہرہ ہوتا تھا جن کے ہاتھوں میں لالٹین ہوتی تھی۔

ہمارے سیاح کو خود سلطان کے دیکھنے کا بھی موقعہ ملا اور وہ کہتا ہے کہ سلطان ایک پستہ قد بیس سالہ جوان تھا جسے شکار کا بڑا شوق تھا اور وہ ہر منگل اور جمعرات کو ملکہ اور مادر ملکہ کے ساتھ پورے شاہی ساز و سامان کے ساتھ شکار کو جاتا تھا۔ عید کے دن اس سیاح نے بادشاہ کو طلائی زین پر سوار دیکھا جو نیلم جڑے ہوئے زردوزی لباس میں ملبوس تھا اور اس کے نوک دار تاج (شاید ترکی کلاہ) پر ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔ اس موقعہ پر جن اسلحہ سے وہ آراستہ تھا وہ طلائی تھے جن میں نیلم جڑے تھے اور تین تلواریں سونے کے غلاف میں ساتھ تھیں۔ جلوس کے آگے آگے ایک آدمی قرنا بجاتا ہوا ساتھ تھا اور پیچھے بکثرت آدمی پیدل تھے۔ کبھی کبھی سلطان ایک سونے کی پالکی پر ہوتا تھا جس پر ریشمی چھتری ہوتی تھی اور اوپر سونے کا کلس، جس کے

گرد طلائی ساز کے چار گھوڑے ہوتے تھے جن کے پیچھے ننگی تلواریں یا تبر اور سپر، نیزے اور بڑی بڑی سیدھی کمانوں سے مسلح سپاہی ہوتے تھے۔

بہمنی سلطنت کے باعظمت وزیر محمود گاواں کے حال میں نیکیٹین نے لکھا ہے کہ اس کے دسترخوان پر روزانہ پانچ سو آدمی ہوتے تھے اور ان میں سے بیش تر "طبقہ اعلےٰ و افضل" کے لوگ نہیں ہوتے تھے اس لیے کہ اس میں عموماً صرف تین وزیر ہوتے تھے۔ اس کے اصطبل میں دو ہزار گھوڑے تھے جن میں سے نصف ہمیشہ زین کسے ہوئے دن رات تیار رہتے تھے۔ اُس کے محل پر ہر رات کو سو مسلح محافظوں کا پہرہ ہوتا تھا جن کے ساتھ دس مشعلچی ہوتے تھے[25]

مالوہ

محمد شاہ کے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے جلد ہی بعد دکھن اور اس کے شمالی ہمسایہ مالوہ میں پھر لڑائی چھڑ گئی۔ اگرچہ رجب ۸۶۷ھ (اپریل ۱۴۶۳ء) کے بعد سے شمالی علاقہ میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی لیکن دونوں سلطنتوں کے درمیان کشیدگی میں بالکل کمی نہیں ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ محمود خلجی نے مطالبہ کیا کہ ماہور اور ایلچ پور مالوہ کے حوالے کیے جائیں[26] جس کا محمود گاواں نے بجا طور پر جواب دیا کہ یہ دونوں علاقے دکھن کی سلطنت کا جزو رہے ہیں اور انھیں بہمنی افواج نے فتح کیا تھا اور یہ دونوں اضلاع مالوہ سے لیے نہیں جا سکتے تھے[27]

دراصل یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ مالوہ کا اولوالعزم حکمران دکھن پر حملہ کی پھر تیاری کر رہا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ شمالی حکمران کے وعدے "مکڑی کے جالے کی طرح" بودے ہیں[28] محمد شاہ نے مالوہ کی کارروائی کی پیش بندی کی اور مسند عالی ملک یوسف ترک مخاطب بہ نظام الملک کو برار کی فوج کا کمانڈر مقرر کر کے حکم دیا کہ اس قضیہ کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا جائے[29] اور محمود گاواں کو دوسری طرف سے حملہ کرنے والی فوج کے ساتھ خاندیش کی سرحد فتح آباد کی طرف روانہ کیا[30]۔ اس اثنا میں دکھن اور گجرات کو مالوہ کے خلاف متحد کرنے کی پالیسی پھر چلی گئی۔ ہمیں بہمنی بادشاہ کا گجرات کے محمود شاہ کے نام ایک خط ملا ہے۔ جس میں محمود شاہ کو اطلاع دی گئی تھی کہ باہمی اتحاد کے معاہدہ پر دونوں سلطنتوں کے نمایندوں کے دستخط ہو چکے ہیں جو گجرات کے سفیر خان اعظم صفدر خاں کے ذریعہ سے مرتب ہوا تھا اور گجرات کے حکمران سے استدعا کی گئی کہ وہ "فوج کا ایک دستہ" اسیر کی سرحد پر روانہ کرے تاکہ "دشمن کا جلد خاتمہ کیا جا سکے[31]"

۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) میں نظام الملک نے بڑھ کر کھیرلا کا محاصرہ کر لیا۔ مقامی ہندو رئیس یا مقدم

اتنا پریشان ہوا کہ اس نے مالوہ سے فوج کی مدد مانگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ فوج افغانوں اور راجپوتوں پر مشتمل تھی لیکن اس سے کوئی فایدہ نہ ہوا اس لیے کہ مالوہ کے کمان دار سراج الملک کے پانچ ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گئے اور سراج الملک کو نظام الملک نے قید کر لیا بشمول تئیس ہاتھیوں کے اور قلعہ پر دکھنی کمان دار کا قبضہ ہو گیا جس نے مالوہ کی فوج کو بحفاظت قلعہ سے نکل جانے دیا لیکن فریقین میں عناد اتنا شدید تھا کہ نظام الملک کو اپنی اس رحم دلی پر جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ جب دکھن کی فوجوں نے قلعہ پر پورا قبضہ کر لیا تو قلعہ کے دو راجپوت محافظ نظام الملک کے پاس آئے اور اس کے پیر چھونے کی اجازت چاہی۔ نظام الملک نے اجازت دے دی مگر ان لوگوں نے قریب پہنچ کر بجائے رحم دلی کمان دار کے پیر چھونے کے اچانک اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا جس سے وہ فوراً مر گیا[۳۳]۔ نظام الملک نے دونوں جوانوں عبداللہ نعیراش خاں اور فتح اللہ دفا خاں کو متبنی کیا تھا، یہی دو اپنے آقا کی لاش لے کر بیدر کے بادشاہ کے پاس آئے اور ان کا بڑی عزت سے استقبال کیا گیا۔ دونوں کو ہزاری منصب دار اور علی الترتیب عادل خاں اور دریا خاں کے خطابات سے نوازا گیا[۳۴]۔

محمود خلجی نے جب کھیرلا کی تسخیر میں نقصانات کا حال سنا تو وہ علالت کے باوجود بذاتِ خود میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ محمود گاواں کو جب خلجی کی نقل و حرکت کا حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً فتح آباد سے رخ موڑ دیا اور مالوہ کے بادشاہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ دکھن کی فوج کہیں پھر اس کا راستہ نہ کاٹ دے اس لیے وہ مالوہ واپس چلا گیا[۳۵]۔

اس طرح مالوہ کے خلاف جنگ ختم ہوئی اور دکھنی فوج ایک مرتبہ پھر مالوہ کی فوج پر فتحیاب ہوئی صلح کی گفت و شنید جس سے بالآخر دونوں حکومتوں کے درمیان اتحاد قائم ہوا اور جس سے اس فراخ دلی کا اظہار ہوتا ہے جو احمد شاہ ولی کے عہد سے دکھنی سیاست کا سنگ میل رہی ہے، اس کی دلچسپ تفصیلات ہمارے مورخین نے بیان کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفت و شنید مالوہ کے وزیر کے خط سے شروع ہوئی۔ جس کی باضابطہ رپورٹ محمود گاواں کو زین القضاۃ، قاضی احمد اور ملک ناصر نے کی اور جس میں مالوہ کے سفیر بیدر بھیجنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ محمود گاواں نے جواب دیا کہ جب "فریق ثانی" مصالحت پر آمادہ ہے تو دکھن بھی اس کے لیے تیار ہے اور خان اعظم صدر خاں کو شادی آباد مانڈو روانہ کیا[۳۶]۔ مالوہ کے حکمران نے اس پر ایک صلح کا وفد روانہ کیا جو شرف الملک[۳۷] اور خلف المشایخ شیخ داود مانڈوی[۳۸] پر مشتمل تھا اور ایک خط اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا بہمنی سلطان کے نام بھیجا جس میں ماہور اور ایلچ پور سے اپنا مطالبہ واپس لے لیا اور یہ

تجویز کی کہ چونکہ مالوہ کے سلطان ہوشنگ شاہ اور سلطان احمد شاہ اوّل کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ برار دکھن کے پاس رہے اور کھیرلا مالوہ کو دیا جائے اس لیے فریقین کو اس معاہدہ کا پابند ہونا چاہیے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمود گاواں کو سلطان مالوہ کی نیت پر پورا بھروسہ نہ تھا اس لیے کہ وہ کئی مرتبہ اپنے حلفیہ وعدہ کو توڑ چکا تھا اور ہندو مسلمانوں کا بے رحمی سے خون بہایا تھا اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ اگر نظام الدین احمد شاہ سوم کے زمانے میں گجرات سے مدد نہ آئی ہوتی تو اس نے بہمنی سلطنت ہی کا خاتمہ کر دیا ہوتا اس لیے بہمنی وزیر نے مالوہ کے سفیر خلف المشایخ شیخ داود کو جو خط لکھا اُس میں بڑی صفائی سے یہ بات لکھی۔ اس نے لکھا کہ مالوہ کے سفیر صلح کی خواہش لے کر پہلی ہی مرتبہ بیدر نہیں آئے ہیں۔ اور یہ محض اسی بات کا اعادہ ہے جو احمد سوم کے عہد میں ہوئی تھی جب شیخ داؤد نے "دو مسلم سلطنتوں کے درمیان اتحاد عمل" کی اپیل کی تھی۔ محمود گاواں نے مزید لکھا کہ :

"اپنی طرف سے خلجی سلطان نے محبت اور اتحاد کے بجائے دشمنی کا اظہار کیا اور بے اصولی سے وہ راہ اختیار کی جو اگلے اور پچھلے سلاطین کی راہ سے مختلف تھی اور ہمیشہ بدنام کرنے والے لوگوں کی باتوں کو خوشی سے سنتا رہا۔ بہترین حکمرانوں کا یہ خیال ہے کہ عوام کی حالت سدھارنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اندرونی اور بیرونی صفائی ملحوظ رکھی جائے۔ بیرونی صفائی کا یہ مطلب ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو ختم کیا جائے اور اندرونی صفائی یہ ہے کہ جھوٹ اور فریب سے دور رہا جائے۔"

محمود گاواں نے لکھا کہ وہ دونوں قوموں کے درمیان سے مخاصمت دور کرنے کی ہر کوشش کے لیے تیار ہے بشرطیکہ مالوہ کا سلطان غیر ذمہ دار مشیروں کی باتوں پر کان نہ دھرے اور اُس پر یہ اعتماد کیا جا سکے کہ وہ صحیح راہ عمل اختیار کرے گا[93] شیخ داؤد کے نام ایک اور خط میں محمود گاواں نے لکھا کہ خلجی کے وعدوں کی حقیقت مکڑی کے جالے کی طرح بودی ہے اور جب تک ظاہری طریق عمل کے ساتھ اندرونی نیت کی صفائی نہ ہو اُس وقت تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ مالوہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملک شاہ کی شکست پھر نہیں دوہرائی جا سکتی اور دکھن ہمیشہ لڑائی کے لیے اور آزادی اور نیک عملی کے حق میں فتح حاصل کرنے کے لیے تیار ہے۔[94]

اس کے جواب میں ایک اور مصالحت کا وفد آیا جس کے ارکین قاضی لڈن (اسی طرح ہے) ظاہر اور الحق ظاہر تھے اور انھوں نے کہا کہ جو کچھ ہوا اس پر محمود خلجی کو واقعی ندامت ہے۔ اس پر دکھن کے اہل علم و تقویٰ افراد نے بادشاہ کو آمادہ کیا کہ وہ مناسب جواب کے ساتھ اپنا سفیر روانہ کرے۔ چنانچہ افضل القضاۃ حاجی ملک احمد اور قاضی محتسب مانڈو روانہ کیے گئے اور دکھن کے حلیف بادشاہ گجرات کو اطلاع دے دی گئی[95] مانڈو کو جو سفارت گئی اس کے ہاتھ مالوہ کے حکمران کے نام بہمنی سلطان کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط بھی بھیجا

گیا جس میں بہمنی سلطان کی طرف سے مستقل اور پائیدار صلح کی خواہش ظاہر کی گئی۔[242] محمود خلجی نے بڑے تپاک اور تزک و احتشام سے اُس کا استقبال کیا اور وفد کے سربراہ قاضی احمد کی تخلیہ میں بھی پذیرائی کی۔ آخر میں ایک عہدنامہ باہمی مصالحت اور دوستی کا مرتب ہوا جس پر شیخ احمد نے دکھن کی طرف سے اور شیخ الاسلام سلام اللہؔ وحدی نے مالوہ کی طرف سے دستخط کیے اور تمام موجودہ امرا اور مشایخ نے اپنی مہریں ثبت کیں اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ اس معاہدہ کی رو سے کھیرلا مالوہ کو دے دیا گیا اور برار دکھن کے پاس رہا۔[243] سارے واقعہ کے آخر میں دونوں ہمسایہ سلطنتوں کے سابقہ تنازعات دفن کر دیے گئے اور دوستی کے تعلقات دونوں طرف سفرا کا تقرر کرکے استوار کیے گئے "تاکہ دوستی کے ضوابط باہمی تعلق کی بنیاد ہوں جو ہمیشہ ایک قصر درخشاں کی طرح جگمگاتے رہیں۔[244]" یہ منصفانہ فیصلہ اور دکھن اور مالوہ کے مابین ایک دوسرے کے احترام کے جذبات براہ راست محمود گاواں کی پالیسی کا نتیجہ تھے جو بہمنی سلطنت کے آخر تک قائم رہے اور کبھی کوئی جھگڑا نہ ہوا۔

اڑیسہ

اڑیسہ کے کپلیشور کے کارناموں کا ہم نے خواجہ جہاں کے ہاتھوں اُس کی شکست کے وقت تک ذکر کیا ہے جس کے آخری دنوں پر ۱۴۷۰ء میں بہمنی اور وجے نگر کی متحدہ فوجوں سے شکست سے ایک اور داغ لگ گیا[245] جب کہ وجے نگر کی حکومت وزیر سلواز سمہا کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی جس نے جلد ہی دیو پرکاش کو تخت سے اُتار دیا اور ایک نئے حکمران خانوادہ کا بانی ہوا۔ تھوڑے دن بعد بیدر میں اڑیسہ کے رائے کے انتقال اور اس کی سلطنت پر ایک برہمن منگت رائے کے غاصبانہ قابض ہو جانے کی خبر آئی[246] منگت رائے نے جائز وارث ہم ویر کو ملک سے نکال باہر کیا۔ چنانچہ ہم ویر نے اپنی سلطنت واپس لینے کے لیے بہمنی سلطان سے مدد کی درخواست کی[247] یہ شاید وہی ہم ویر تھا جس کو ہمایوں کے عہد میں کپلیشور نے بہمنیوں کو تلنگانہ سے نکالنے کے لیے تلنگا کی مدد کے لیے بھیجا تھا اور اب وہی شخص جس نے بہمنی فوج کو دیورکنڈہ کا محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کیا تھا مدد کی درخواست کر رہا تھا۔ دکھن کے حالات میں یہ تبدیلی جس کی پہلے ہمت افزائی اس کے وجے نگر سے اتحاد سے ہوئی تھی اور اب مزید تقویت اڑیسہ کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی درخواست سے ہوئی یقیناً محمود گاواں کی وزارت کے اعلےٰ تدبر کا نتیجہ تھی اور نیز میدان جنگ میں بہمنیوں کی فتوحات کا۔ اس کی وجہ غالباً سیاسی قوتوں کی بہتر تنظیم اور اس تنظیم سے جو اتحاد کا بہتر احساس پیدا ہوا تھا، وہ بھی تھی۔ بہر نوع ہم ویر کی درخواست موصول ہونے پر سلطان نے جنگی مجلس مشاورت منعقد کی جس میں ملک حسن بصری

نے جواب سلطان کا مقرب ہو گیا تھا[۵۸] اس مہم کی سربراہی کے لیے خود کو پیش کیا اور محمود گاواں کی خصوصی سفارش پر اُسے کمان دار مقرر کیا گیا۔ مہم کے نتیجہ میں جس نے منگت رائے کو اڑیسہ چھوڑنے اور ہمبیرکے لیے تخت خالی کر دینے پر مجبور کر دیا جو اب پرشوتم کے لقب سے اڑیسہ کا حکمران ہو گیا[۵۹] لیکن ملک حسن نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ سلطان کی ایما پر آگے بڑھ کر راجہ سندری کو اور ریڈیوں کے سابق مستقر کونڈاویڈو کے عظیم قلعہ کو بھی فتح کر لیا۔ جب وہ بیدر واپس آیا تو سلطان نے بڑی شفقت سے اُس کی پذیرائی کی اور بڑے احترام سے اُسے خلعت عطا کی اور مادر ملکہ اور محمود گاواں کی ایما پر اُسے نظام الملک کے خطاب کے ساتھ تلنگانہ کا سرلشکر بنا دیا گیا۔

مغربی مہمات

سلطنت کی شمالی اور مشرقی سرحدوں کی درستی کے بعد اب مغربی ساحلی علاقہ کو تسخیر کرنے اور قابو میں لانے کی باری تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے مغربی علاقے کونکن اور دیش برائے نام بہمنی حکومت کے ماتحت تھے اور ان پر کبھی موثر طور پر قبضہ نہیں ہوا تھا اور خلف حسن بصری اور اُس کے ساتھیوں کے قتل سے بہمنی اقتدار کی شہرت مجروح ہو گئی تھی اور اس کی وجہ سے مقامی رئیسوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ ان رئیسوں میں سے دو یعنی کھیلنا اور سنگ میشور کے رائے دوسروں سے زیادہ طاقتور تھے[۶۰] اور ان کا دستور تھا کہ مسلمانوں کے تجارتی جہاز جو بحر عرب میں چلتے تھے ان پر چھاپہ مارتے اور ان جہازوں سے لڑنے کے لیے ہر سال سیکڑوں کشتیاں بھیجتے تھے[۶۱] صرف سنگ میشور کا رائے ہر سال عازمان حج کے جہاز پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے ایک سو کشتیاں بھیجتا تھا[۶۲] اور کئی ہزار مسلمان ان لوگوں کی حرص کا شکار ہو جاتے تھے[۶۳] اس بحری ڈاکہ زنی سے ملک کی بحری تجارت یقیناً بہت گھٹ گئی ہو گی اس لیے کہ تاجر اپنا سامان لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور یہ رئیس اپنی ڈاکہ زنی سے مالدار ہو رہے تھے اگرچہ ملک بحیثیت مجموعی غریب ہو رہا تھا۔ تنازعہ کی فوری وجہ بظاہر یہ تھی کہ مقامی راجاؤں نے تین سو کشتیاں جمع کر لی تھیں اور باوجود متواتر انتباہ کے سمندری مسافروں پر ڈاکہ ڈالتے تھے[۶۴]۔

پہلا دور

پہلی مہم خود سلطان نے اپنے ذمہ لی ایک محاصرہ کے بعد کھیلنا کو تسخیر کر لیا۔ مقامی رئیسوں سے بکثرت مال غنیمت ملا اور وہ بہمنی سلطنت کو خراج دینے پر مجبور کر دیے گئے[۶۵] یہ مہم دراصل اگلے مرحلے

کے وقت بہمنی افواج کے جنوبی بازو کی حفاظت کے لیے کی گئی تھی۔

دوسرا دَور

۸۷۴ھ (۷۰-۱۴۶۹ء) کے شروع میں محمد شاہ نے خیال کیا کہ کونکن کو موثر طور پر قابو میں لایا جائے تاکہ ملک میں بے چینی اور اضطراب کی جگہ امن اور خوش حالی کا دور دورہ ہو۔[۵۵۹] اس کی خواہش تھی کہ وہ خود اس مہم کا ذمہ لے جیسا کہ اُس نے اِس سے پہلے کیا تھا لیکن محمود گاواں نے التجا کی کہ بادشاہ کو اس زحمت میں نہ پڑنا چاہیے بلکہ خود اُسے سالار بنایا جائے۔ بادشاہ کا حکم حاصل کر کے محمود گاواں کولھاپور گیا اور اُسے اپنا مستقر بنایا۔ رایوں نے جب بہمنی افواج کی آمد سنی تو انھوں نے پہاڑوں کے قدرتی راستوں کو بند کر دیا اور "قسم کھائی کہ اگر بہمنی فوج نے حملہ کیا تو وہ اپنے ملک کے سارے مسلمانوں کو قتل کر دیں گے" محمود گاواں کو جلد اندازہ ہو گیا کہ جس پہاڑی علاقہ سے اُسے گذرنا ہے اس میں رسالہ بالکل بے کار ہے بلکہ نقل و حرکت میں حارج ہوتا ہے اس لیے اُس نے رسالہ واپس کر دیا اور اسی کے ساتھ خود اپنے صوبہ بیجاپور سے کمک طلب کی۔ اس کا آزاد شدہ غلام خوش قدم جسے بعد کو کشور خاں کا خطاب ملا۔ دابول اور کرہد سے فوجیں لے کر آ گیا اور اسعد خاں کی ماتحتی میں جنیر اور چاکن کی فوجیں آ گئیں اور چاول، وائی اور مان سے بھی مدد آ گئی۔[۵۶۰] سارا علاقہ جنگل سے بھرا تھا اور خواجہ نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جنگل کاٹ کر جلا دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غنیم نے پہلے چھاپہ مار جنگ شروع کی اور محمود گاواں کی فوج سے "پچاس جھڑپیں" ہوئیں[۵۶۱] کئی ہفتہ تک یہی ہوتا رہا، اتنے میں تیز بارش شروع ہو گئی اور خواجہ کو اپنے کولھاپور کے چھتر کے مستقر پر واپس آنا پڑا۔

جب بارش ذرا ٹھہری تو خواجہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا اور رنگنا کے قلعہ پر حملہ کر دیا "جو اتنا مضبوط تھا کہ بغیر شدید خونریزی کے تسخیر نہیں ہو سکتا تھا۔"[۵۶۲] چنانچہ بظاہر بے پناہ خونریزی سے بچنے کے لیے خواجہ نے مدافعت کرنے والی فوجوں کے سرداروں کے لیے اپنی تھیلیاں کھول دیں اور "فرانسیسی کپڑا، جواہرات جڑی ہوئی پیٹیاں، پالکیاں، عرب گھوڑے اور نہایت خوبصورت وضع کے اسلحہ"[۵۶۳] پیش کر دیے اور یہ زبردست قلعہ برائے نام خونریزی کے بعد ۲ محرم ۸۷۵ھ (۱ جولائی ۱۴۷۰ء)[۵۶۴] کو بیس لاکھ نقد و جنس کے تاوان کے ساتھ تسخیر ہو گیا۔ رنگنا سے محمود گاواں نے ماچل کا رُخ کیا جو "اس جوار میں سب سے بڑا قلعہ" تھا اور جس پر بھرپور حملہ کیا گیا چنانچہ "اس فلک بوس قلعہ کی فصیلیں، دروازے اور برج" سب ڈھیر کر دیے گئے[۵۶۵] اور بچے ہوئے محافظین جنگی قیدی بنائے گئے۔ رائے اتنا عاجز ہوا کہ اُس نے خود اپنے لڑکے کو کھیلنا کے

ہمسایہ قلعہ سے کچھ "ہوش مند لوگوں" کے ساتھ روانہ کیا کہ قلعہ بہمنی افواج کو حوالے کر دیا جائے[62] اور ۲۲ رجب ۸۷۵ھ (۱۴ جنوری ۱۴۷۱ء) کو اس کی مکمل تسخیر ہو گئی۔[63]

فوج کی تیز نقل و حرکت کے باوجود طول طویل لڑائیوں اور چھاپہ مار چالوں نے خواجہ کے وسایل پر بہت اثر ڈالا ہوگا۔ سنگ میشور کا جا کھورائے ایسا آدمی نہ تھا جو بغیر جد و جہد کے ہار مان لے اور ۱۴۷۱ء کی موسم بہار کی جنگ میں اسے زیادہ آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ علاوہ بریں جیسا کہ خود خواجہ کا بیان ہے یہ جنگل کا ملک ایسے بڑے بڑے قلعوں سے بھرا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک کی بلندی اور وسعت طبرستان اور نہاوند کے جنگلوں جیسی ہے"[64]۔ سنگ میشور پر چڑھائی کرنے سے پیشتر خواجہ نے مزید کمک کے لیے بیدر کو خط لکھا کہ اگر وہ اس دشوار گذار اور خدائی لعنت کی سرزمین میں گھر گیا تو خود اس کا اور شاہی فوج کا وہی حشر ہوگا جو اس کے پیش رو خلف حسن بصری کا ہوا۔ بیدر سے خواجہ کی طویل غیر حاضری نے اس کی مخالف پارٹی کو منہ مانگا موقعہ فراہم کیا اور انھوں نے خواجہ کے اقتدار کو دو طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش شروع کر دی، اوّل تو کونکن مدد بھیجنے میں رکاوٹ ڈال کر اور دوسرے خود بادشاہ کے کان بھر کر۔

محمود گاواں کے خلاف سازشیں

ہمارے سامنے خواجہ کے تین خطوط ہیں جو اس نے عین موقعہ جنگ سے اپنے دوستوں اور وزیروں کو لکھے جس میں اُس نے اپنے مخالفین کی سازشوں سے سخت فکرمندی کا اظہار کیا ہے حالانکہ وہ باوجود شدید مزاحمتوں کے شاہی فوج کو فتح دلا رہا ہے۔ ایک خط میں، وہ "ایک دوست" کو لکھتا ہے:

"اہل فساد و حسد کی بیہودہ حرکات کا مجھے سخت صدمہ ہے اور اپنے قلیل التعداد انصار کی توجہ کا ممنون ہوں۔ اسعد خاں کی فوج کے آنے میں دیر اور ملک معظم کی طرف سے منع نامزدگی یہ سب باتیں بڑی تشویش انگیز ہیں۔ حاسد جماعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ بدنصیب جو گوا کے جزیرہ میں ہیں دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں اور اس حقیر خادم کا ستارہ اقبال قطعی تاریکی کے افق میں پہنچ جائے"[65]

ایک اور خط میں وہ ایک بہمنی وزیر کو لکھتا ہے:

"اگر کسی شخص کو اس سلطنت کے امرا، خوانین اور ملوک کی مدد پر بھروسہ ہے تو وہ تنہائی ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھے گا ...... برعکس اس کے اگر کوئی شخص خود اپنی قوت بازو سے حصول مقصد کے لیے کوشش اور خبرداری کے تیر چلاتا ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ کونکن کا ملک جنگل

اور پہاڑوں سے بھرا ہوا ہے اور جب تک درخت کاٹ کر کسی حد تک فوج کے گذرنے کے لیے راستہ نہ صاف کیا جائے اس وقت تک فوج کا گذر نہیں ہو سکتا ...... آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام بغیر آدمیوں اور ضروری سامان کے انجام نہیں پا سکتا۔"[۶۶]

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے بہمنی سلطنت کی عظمت بڑھانے کی جو کوششیں خواجہ کر رہا تھا اُن پر پانی پھیرنے کے علاوہ مخالف جماعت خواجہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھی بھر رہی تھی جس سے بالآخر اس کے المناک قتل کا راستہ صاف ہو جائے۔ جب اُسے دارالسلطنت میں اپنے خلاف کھچڑی پکنے کا علم ہوا تو اس نے "ایک وزیر" کو خط لکھ کر یہ شکایت کی:

"اِس وقت میرے دل پر عناد و حسد کی کمان سے بدنامی اور اذیت کے تیر چلائے جا رہے ہیں ..... حقیقت کی خفیف جھلک کو کذب و افترا سے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس سے تخت شاہی کو غذا پہنچائی جا رہی ہے ...... اُن کے خوفناک دلوں میں دنیا کو خاک کر دینے والی آگ بھڑک رہی ہے ...... اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ دارالسلطنت کے لوگ کب تک حقیقت سے اپنی آنکھیں اور کان بند کیے رہیں گے۔"[۶۷]

نیز قاضی القضاہ صدر جہان کو ایک خط میں وہ لکھتا ہے:

"اُن کے خزانے ناجائز طور پر حاصل کی ہوئی دولت سے بھرے ہیں جیسے ان کے دل حرص، جہالت اور حسد سے لبریز ہیں ...... اگرچہ ان کی تاریک زندگی کی بنیاد اس خاکسار خادم کے بنا کردہ نظام کے چاند کی روشنی کی رہین منت ہے لیکن ان لوگوں کے جذبات خالص بدی کے ہیں۔ وہ ایک ایک کو کھا جائیں گے اور مجھے ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیں گے جس حد تک وہ کر سکتے ہیں۔"[۶۸]

ان خطوط سے ان حالات پر افسوسناک روشنی پڑتی ہے جو دارالسلطنت میں وقوع پذیر ہو رہے تھے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنگ میشور کے جاکھو رائے اور اُس کے ساتھیوں کے خلاف جنگ کے سلسلہ میں محمود گاواں کی راہ میں کتنی مشکلات ڈالی جا رہی تھیں اور خود محمود گاواں کو کتنی فکر تھی کہ مغربی ساحل کے علاقہ میں امن قائم ہو تاکہ "مسافر خشکی اور تری کے راستہ سے بری اور بحری ڈاکوؤں کے خوف کے بغیر آزادی سے سفر کر سکیں۔"[۶۹] باوجود ان شدید خطرات کے جن سے وہ دوچار تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ دارالسلطنت میں حالات کدھر جا رہے ہیں تاہم وہ استقلال کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور جب تک اپنا مقصد پورا نہیں کر لیا پیچھے کی طرف نہیں دیکھا۔ مچال اور کھیلنا کے بعد بلوارا، مریاد اور نگر کے قلعوں کی تسخیر کی گئی۔[۷۰] لیکن اب برسات کا موسم آگیا جو اُس نے کولہا پور میں گذارا۔[۷۱] جب بارش کم ہوئی تو وہ سنگ میشور کے قلعہ

کی طرف بڑھا جو استحکام میں جنیر سے دوسرے نمبر پر تھا اور جسے ایک مرتبہ خلف حسن بصری نے فتح کر لیا تھا۔[71] اس بڑے قلعہ کی فصیل کے باہر جو فوج خیمہ زن تھی اُسے دیکھ کر رائے سخت خوف زدہ ہوگیا اور اس نے خود اپنے لڑکے کو شاہی فوج کے کمان دار سے مصالحت کے لیے بھیجا اور ۲۹ رجمادی الثانی ۸۷۶ھ (۱۳ دسمبر ۱۴۷۱ء)[72] کو سنگ میشور کا پھاٹک خواجہ کے لیے کھول دیا گیا اور دوسرے دن یعنی یکم رجب ۸۷۶ھ (۱۴ دسمبر ۱۴۷۱ء) کو رائے نے باضابطہ اطاعت قبول کر لی۔[73]

گوا کی تسخیر

اس مہم کا ایک مقصد یعنی شورہ پشت جاکھو رائے کے اقتدار کو ختم کرنا تو حاصل ہوگیا لیکن محمود گاواں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ رائے کو وجے نگر کی پشت پناہی حاصل ہے جس کی بندرگاہ گوا سنگ میشور سے صرف چودہ فرسخ کے فاصلہ پر ہے۔[74] مزید براں بندرگاہوں کے جو شہر وجے نگر کے قبضہ میں تھے وہاں مسلمانوں سے بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا اور حال ہی میں تقریباً دس ہزار آدمیوں کو محض اس بنا پر بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے عرب گھوڑے بہمنی سلطان کے ہاتھ بیچ دیے تھے۔ شاید اس زیادتی کا بدلہ لینے اور نیز اس خیال سے کہ محمود گاواں کے نزدیک یہ وجے نگر کا قلب تھا اور "تمام فسادوں کا مرکز" اور بہمنی باجگذار کی مغویانہ روش کا اصل سبب تھا اُس نے مفتوحہ علاقہ میں بہمنی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے گوا کی طرف پیش قدمی کی۔[76] گوا کا حال محمود گاواں نے یہ لکھا ہے کہ "یہ ہندوستان کے تمام جزیروں اور بندرگاہوں میں قابل رشک ہے اور اپنی بہترین آب و ہوا اور ناریل اور چھالیہ کی پیداوار کے لحاظ سے اور نیز اپنے چشموں اور نہروں اور بکثرت پان اور نیشکر کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔"[77] محمود گاواں کا یہ بھی بیان ہے کہ "گوا میں درختوں اور چشموں کی کثرت ایسی ہے جیسے جناتوں کے باغ کا نمونہ یا حوض کوثر کی نقل۔"[78] خواجہ نے سمندر کے راستہ سے ۱۲۰ کشتیاں اور خشکی کے راستہ سے فوج اور "عرب کے چیتے اور ایران کے شیر روانہ کیے۔"[79] اسعد خاں اور کشور خاں اصل فوج سے پہلے روانہ ہوئے اور خواجہ کا لڑکا علی ملک التجار دوسرے راستہ سے "وجے نگر کے قلعوں کو فتح کرنے" روانہ کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اسعد خاں اور کشور خاں گوا میں علی کا انتظار کر رہے تھے اسی وقت ان کمان داروں کے پاس ہتیار ڈالنے کے شرائط طے کرنے کے لیے وفود روانہ کیے گئے۔[80] اس طرح شہر کی مدافعت کی برائے نام کوشش بھی نہیں کی گئی اور ۲۰ رشعبان ۸۷۶ھ (یکم فروری ۱۴۷۲ء) کو اس پر قبضہ ہوگیا اور یہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔[81]

اتنی ہوشیاری اور عجلت سے مقصد حاصل کر کے خواجہ دارالسلطنت کی طرف واپس ہوا۔ خواجہ

نے سُنا تھا کہ اُس کی مخالف جماعت خود بادشاہ کو میدانِ جنگ میں لانے کا ارادہ کر رہی تھی جس سے نہ صرف بادشاہ کو زحمت ہوتی بلکہ بے سُود بھی ہوتا اس لیے کہ جو مقصد حاصل کرنا تھا وہ حاصل ہو گیا تھا۔ مزید برآں اگر بادشاہ اُدھر جاتا تو کم از کم آدھے راستہ پر اُسے استقبال کو جانا پڑتا اس لیے "ضرورت وقت یہ تھی کہ فیصلہ کے گھوڑے پر احتیاط کی زین کسی جائے" اور بادشاہ کی فوج سے مل جایا جائے تاکہ "اعلیٰ حضرت جہلا کی چالاکیوں کے نتائج اور ذلیل افراد کی باتوں کا انجام خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں"۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے: "اگرچہ بعضوں کو سازشیوں کی باتوں سے سخت صدمہ ہوا تاہم اور لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کی گھڑی ہوئی باتیں ناممکن نہیں ہیں"[۵۸۲] بہرنوع خواجہ نے یکم ذیقعدہ ۸۷۶ھ (۱۰ اپریل ۱۴۷۲ء) کو گوا کے قلعہ میں مضبوط قلعہ بند فوجیں متعین کر کے واپسی شروع کر دی اور ۱۰ ذی الحجہ ۸۷۶ھ (۱۹ مئی ۱۴۷۲ء) کو دارالسلطنت پہنچ گیا۔ وہ تقریباً تین سال تک مغربی علاقوں میں رہا اور بکثرت مالِ غنیمت لیے ہوئے واپس آیا اور شاید اُس کی توقع کے خلاف اُس کے آقا بادشاہ نے بہت خوش ہو کر اُس کی پذیرائی کی اور اس کے استقبال کے لیے دس وزیروں کو روانہ کیا۔ بادشاہ کے حکم سے سات دن تک برابر نقارے بجتے رہے اور اسی اثنا میں بادشاہ نے اس کی ضیافت قبول کر کے اس کی عزت افزائی کی اور اُسے خود اپنے توشہ خانے سے خلعت دی اور مادرِ ملکہ نے اُسے خود اپنے بھائی کی طرح مخاطب کیا اور اس کے سامنے بے پردہ آکر اُسے بے مثال اعزاز دیا۔ اُس کے خطابات جو پہلے ہی بہت تھے اب اُن میں اور اضافہ کیا گیا یعنی "رئیس مجلس فیض بخش، عظیم قاید و امیر، صاحب تیغ و قلم" اور گوا، لونڈا اور کولھاپور کے قلعے بھی اُس کے حلقۂ اختیار میں دے دیے گئے[۵۸۳]

اگرچہ خواجہ کے اعزاز و افتخار کا یہ انتہائی عروج تھا اور اب اُس کی شخصیت ملک میں سب سے بلند تھی مگر اُس کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی ذلیل تصور یا ترغیب پر مائل نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کے جانے کے بعد خواجہ تخلیہ میں چلا گیا اور وہاں اللہ تعالےٰ کے افضال کا شکر بجا لا کر خوب رویا اور فقیروں کا لباس پہن کر بیدر کے سادات میں کھانا، کپڑا، جواہرات وغیرہ تقسیم کیے۔ جب مُلّا شمس الدین محمد نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنی دولت کیوں اس طرح لٹا رہا ہے اور اتنی عزت پا کر بجائے خوش ہونے کے روتا کیوں ہے تو اُس نے جواب دیا کہ وہ یہ سب اس لیے کر رہا ہے کہ غرور، حرص اور دوسرے برائی کے جذبات جو پیدا ہو گئے ہیں اُن سے نجات حاصل کرے۔ اپنی بقیہ زندگی میں اُس نے بہت سادہ لباس پہنا اور اپنے فرصت کے اوقات مسجد میں یا اپنے بنائے ہوئے عالی شان مدرسہ میں صرف

کرنے لگا۔ جمعہ کے دن وہ بھیس بدل کر دارالسلطنت کے مختلف محلوں میں جاتا اور غریبوں محتاجوں میں خیرات تقسیم کرتا اور ان سے کہتا کہ یہ خیرات بادشاہ سلامت کی طرف سے ہے جس کی سلامتی اور اقبال مندی کے لیے اُن سب کو دُعا کرنی چاہیے۔[۹۳]

تیسرا دور

یوسف عادل خاں جو حال ہی میں دولت آباد کے مستقر کے ساتھ مہاراشٹر صوبہ کا گورنر مقرر ہوا تھا اُسے اب اپنی بہادری دکھانے کا موقعہ ملا۔ مالوہ سے جنگ کے دوران میں شمال مغربی صوبہ کا ایک حصہ بشمول ویراکھیرا اور انتور علاقوں کے نکل گیا تھا اور مرہٹہ سرداروں کے قبضہ میں چلا گیا تھا جن کا لیڈر جن سنگھ رائے ویراکھیرا پر قابض تھا۔ سلطان نے یوسف عادل کو غاصبوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ انتور پر جن لوگوں کا قبضہ تھا وہ بہمنی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور صلح کی درخواست کی لیکن ویراکھیرا کئی ماہ تک مزاحمت کرتا رہا اور آخر میں یہ خواہش کی کہ سردار اور اُس کی فوج کو بحفاظت باہر نکل جانے دیا جائے۔ اُس کی یہ درخواست قبول کر لی گئی اور ویراکھیرا کا مضبوط قلعہ مع ملحقہ علاقہ کے عادل خاں کو بطور جاگیر دے دیا گیا۔ یوسف عادل اب بکثرت مال غنیمت، جواہرات، نقد اور ہاتھی لیے ہوئے دارالسلطنت واپس آیا اور بادشاہ نے اُس کا شاہانہ پیمانہ پر استقبال کیا۔ بادشاہ نے خواجہ کو حکم دیا کہ وہ حکومت کی طرف سے یوسف عادل کی ہفتہ بھر تک ضیافت کرے اور اس کے بعد بادشاہ خود خواجہ کے ساتھ قیام کے لیے چلا گیا اور یوسف عادل کو اپنی موجودگی میں اتنا بے تکلف ہونے کی اجازت دی کہ قدیم امرا کو اور حسد ہو گیا اور پرانے آنے والوں اور نو واردوں میں نااتفاقی اور بڑھ گئی۔[۹۴]

چوتھا دور

مرہٹہ سرداروں کی سرکشی برابر قائم رہی اور باوجود حلفیہ وعدوں کے انھیں جب بھی موقعہ ملتا سر اُٹھانے سے باز نہ رہتے۔ دولت آباد میں یوسف عادل جیسی طاقتور شخصیت کی موجودگی کی وجہ سے اُدھر سے کوئی خطرہ نہ تھا لیکن گوا کا علاقہ اب بھی پریشان کر رہا تھا۔ ۱۴۷۲ء کے آخری دنوں میں یہ اطلاع آئی کہ بلگام کا سردار پرکیت اور بنکاپور کا سپہ دار[۹۵] وجے نگر کے رائے کے ورغلانے سے فساد برپا کرنے والے ہیں اور گوا کا محاصرہ بھی کر لیا ہے۔ محمود گاواں نے بادشاہ کو اطلاع دی[۹۶] اور استدعا کی کہ اُسے اس مہم پر بھیجا جائے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے وجے نگر کی کمر توڑ دے اور فساد کا خاتمہ کر دے۔ شاید قدیم امرا کے

اثر سے جو محمود گاواں کے سر مزید فتوحات کا سہرا نہیں باندھنا چاہتے تھے بادشاہ نے خود اس مہم کی سربراہی کی اور ۱۵ شوال ۸۷۶ھ (۱۵ مارچ ۱۴۷۲ء) کو دارالسلطنت سے روانہ ہوگیا۔ بلگام پہنچ کر شاہی فوج کو معلوم ہوا کہ یہ قلعہ اس جوار میں سب سے زیادہ مضبوط ہے اور ایک پہاڑی پر واقع ہے جو زمین سے اوپر تک سیدھی کاٹ دی گئی ہے اور چاروں طرف پانی سے بھری ہوئی خندق ہے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ بلگام کی فوری تسخیر ناممکن ہے قلعہ کے محاصرہ کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ قلعہ کے سامنے ایک اور مورچہ بنایا جائے۔ دوسری طرف پرکیت نے یہ دیکھ کر کہ بہمنی فوج بہت طاقتور ہے۔ سالاروں اور کمان داروں کو رشوت دینے کی چال چلی[88] نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن کمان داروں نے بادشاہ سے استدعا کی کہ پرکیت ہتھیار ڈالنے کو تیار ہے اور اُسے معافی دی جائے۔ بادشاہ اتنا نادان نہ تھا کہ اس چال کو نہ سمجھتا اور اس نے کہا کہ اس علاقہ کے حالات اُسے بہت پریشان کر چکے ہیں اور چونکہ وہ مثال قائم کرنا چاہتا ہے اِس لیے اُس نے آتشگیر دستہ کو حکم دیا کہ پندرہ دن کے اندر دھاوا کر کے قلعہ پر قبضہ کرے[89] اور محمود گاواں کو خندق پُر کرنے کا حکم دیا لیکن محمود گاواں کی کوششیں کارگر نہ ہوئیں اِس لیے کہ دن بھر میں جتنی مٹی خندق میں بھری جاتی تھی رات کے وقت پرکیت ہٹا دیتا تھا۔ متعدد کوششوں کی ناکامی کے بعد محمود گاواں نے قلعہ کی دیوار کے نیچے سرنگ لگائی اور یوسف عادل اور فتح اللہ عماد الملک نے آتش باری کی جس سے قلعہ کی دیوار میں شگاف ہوگیا[90]۔ اب بادشاہ نے خود بہ نفس نفیس دھاوا کیا اور قلعہ کی فصیل پر پہنچ گیا۔ پرکیت نے مزید مزاحمت بیکار سمجھ کر اپنے گلے میں رسّی ڈالی اور بادشاہ کے رحم و کرم کا خواہاں ہوا[91]۔ قلعہ منہدم کر دیا گیا اور محمود گاواں کی جاگیر میں دے دیا گیا اور پرکیت کو معافی دے کر سلطنت کا امیر بنا دیا گیا[92]۔ اِس طرح محمود گاواں کو اپنی بدنامی کا بدلہ مل گیا اور بادشاہ پر پوری طرح واضح ہوگیا کہ خواجہ سے زیادہ وفادار اور اطاعت شعار کوئی اور خادم نہیں ہے۔ خواجہ کی درخواست پر بادشاہ نے اب "لشکری" کا لقب اختیار کیا اور اس عظیم فتح کی یادگار میں جو خود اُسے حاصل ہوئی اسی لقب سے وہ تاریخ میں مشہور ہے[93]

مادر ملکہ کی وفات

واپسی پر ساری فوج کو خواجہ کی سرپرست اور مددگار مادر ملکہ مخدومہ جہاں کی وفات پر جو اپنے لڑکے کے ساتھ اس وقت طلب مہم پر گئی تھی سخت رنج و قلق ہوا[94]۔ بادشاہ کو قدرتاً بہت رنج ہوا اور اُس نے اپنے حلیف گجرات کے حکمران کو خط لکھ کر اپنی محرومی کی اطلاع دی[95]۔ خواجہ سے زیادہ غم کسی اور کو

نہیں ہوا اور اُس نے اپنے بھائی امیر الملک کو مکہ معظمہ میں لکھا کہ مادر ملکہ کی وفات سے اُس کا ذاتی نقصان ہوا اور اس خط میں لکھا کہ :

"ماسوا اُس شدید ضعف کے جو قدرتاً ضعیف العمری میں ہوتا ہے ملک معظم کی مادر محترمہ کی وفات کے حادثہ جانکاہ اور حکومت کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں نے میری صحت کو بگاڑ دیا ہے اور اب میرے لیے یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ گردن طاقت و استطاعت پر اتنا بوجھ سنبھال سکوں ۔۔۔۔ تاہم ۔۔۔۔ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میرے سر پر جو مدتوں کا بارِ احسان ہے اُسے اس طرح ادا کروں کہ اپنے دل کی تمام قوتوں کو ملک معظم کی اطاعت شعاری میں لگا دوں جو مجھ پر واجب ہے[۹۶]۔"

مادر ملکہ کی وفات نے ملک کی سیاست میں جو خلا پیدا کیا اُس کا پُر کرنا ناممکن تھا اِس لیے کہ "اس کی رحم دلی اور کار خیر کے رجحان کی وجہ سے چھوٹے بڑے ہندو مسلمان سب اُس سے محبت کرتے تھے۔" لیکن محمود گاواں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُس کے دشمنوں کی تعداد اُس کے منہ بولے دوستوں سے بہت زیادہ ہے کبھی پیچھے نہ ہٹا بلکہ اپنی دور رس اگرچہ مختصر المدت اصلاحات سے وہ سلطنت کو تمام خرابیوں سے پاک کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔

دارالسلطنت کو واپس ہوتے ہوئے محمد شاہ "لشکری" نے راستے میں چند دن محمود گاواں کی گورنری بیجاپور کے مستقر سے قریب کالا باغ میں قیام کیا۔ وہ پورے بارش کے موسم بھر وہاں قیام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ایسے سنگین قحط سے دوچار ہوا جسے تاریخ میں بیجاپور کا قحط کہا جاتا ہے اور وہ جلد بیدر واپس ہو گیا۔

ج ۔ محمود گاواں کا زوال و سقوط

۱ ۔ انتظامی اصلاحات

اب چونکہ بہمنی سلطنت کی حدیں مشرق میں خلیج بنگال سے لے کر مغرب میں بحیرہ عرب تک پھیل گئی تھیں اِس لیے ملک کے نظم و نسق کے جو اصول سو سال پہلے محمد اوّل کے عہد میں مدون ہوئے تھے ان میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ اُس وقت سلطنت میں بیشتر سطح مرتفع کی سرزمین مغربی گھاٹ تک، ایک چھوٹا سا حصہ تلنگانہ اور رائچور کے دوآبہ کا اور محمد اوّل کے ساختہ چار صوبوں برار، دولت آباد، احسن آباد گلبرگہ اور تلنگانہ پر مشتمل تھی۔ پچھلی صدی کے دوران میں خاص کر محمود گاواں کے عہد وزارت میں سلطنت

کی غیر معمولی وسعت ہوگئی تھی اور اب بہمنی سلطنت میں نہ صرف مغرب میں کونکن کے سارے ساحلی علاقے" جنوب مغرب میں گوا، مشرق میں اندھرا پردیش کی آخری حد تک اور جنوب میں تنگ بھدرا کے علاقے شامل تھے اور اس کی براہ راست حکومت میں برار شامل تھا اور سلطنت کی سرحد خاندیش سے مل جاتی تھی جو آگے چل کر معلوم ہوگا بہمنی سلطنت کے زیر حفاظت آگیا تھا۔ اس زبردست توسیع کے باوجود ابھی تک صوبہ جات کے حلقوں کی از سرِ نو تقسیم نہیں ہوئی تھی اور سابقہ صوبے وسیع علاقوں کے ساتھ بدستور موجود تھے۔ اس عدم تناسب کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صوبہ کا طرف دار عملاً چھوٹا سا بادشاہ ہوگیا تھا جس کا علاقہ کبھی کبھی مرکزی احکام کی مزاحمت کے لیے بھی تیار ہوجاتا تھا۔

شاید مہاراشٹر کی مہم کے بعد محمود گاواں نے صوبہ جات کی حکومتوں کو کارآمد اور سائنٹیفک اصول پر منظم کرنے کا خیال کرنا شروع کیا۔[۱۰۵] بہت زیادہ پھیلے ہوئے اطراف کے بجائے اُس نے سلطنت کو آٹھ سالاریوں یا صوبوں میں تقسیم کیا۔ دو صوبے گاویل اور ماہور پرانے "برار" سے بنائے گئے، دولت آباد اور جنیر (جس میں اننت پور کا بیشتر حصہ اور دامن، باسین، گوا اور بلگام کا سارا علاقہ شامل تھا) "دولت آباد" کا پرانا صوبہ بنا، بیجاپور (دریائے ہورا تک بشمول رائچور و مدگل) اور احسن آباد گلبرگہ (ساگر سے نلدرگ تک بشمول شولاپور) پرانا "گلبرگہ" بنا اور پرانا "تلنگانہ" جدید اضافوں کے ساتھ دو صوبوں یعنی راجہ سندری (بشمول نلگنڈہ، مچھلی پٹم اور اڑیسا علاقہ)[۱۰۶] اور ورنگل میں تقسیم کیا گیا۔ علاوہ صوبوں کے رقبہ کو تقریباً نصف کر دینے کے ہر صوبہ کے نئے گورنر کے علاقہ سے خواجہ نے کچھ حصہ الگ کرکے بطور خاصہ سلطانی کے براہ راست بادشاہ کی ماتحتی میں رکھا جس سے طرف داروں کے اپنے علاقہ کے اختیارات پر مستحکم روک ہوگئی۔

لیکن اصلاح کرنے والوں کی نظر میں یہ بھی کافی نہ تھا۔ بہمنی سلطنت کے قیام کے وقت سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ صوبہ کے فوجی معاملات میں طرف دار کے اختیارات کی کوئی حد بندی نہ تھی اور اُسے نہ صرف اپنے علاقہ کے مختلف قلعوں میں قلعہ بند فوج کے کماندار مقرر کرنے کا اختیار تھا بلکہ اُسے تقریباً پوری آزادی تھی کہ عملی فوجی کاموں کے لیے اپنی مرضی سے جتنے آدمی چاہے رکھے۔ چونکہ فوجی معاملات میں پورا پورا اسی کا اختیار تھا اس لیے مرکزی خزانہ سے اُسے جو منصب ملتا تھا اور اپنی مملوکہ جاگیر سے بہت کچھ بچا سکتا تھا اور اگر وہ چاہے تو فوج کی تعداد اتنی کم کردے جو بیرونی خطرات کا دفاع نہ کرسکے۔

محمود گاواں نے فوجی نظام میں انقلاب انگیز تبدیلی کردی۔ اُس نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ہر طرف دار کی ماتحتی میں سارے صوبہ کے اندر صرف ایک قلعہ ہو اور باقی سب قلعوں کے قلعہ دار یا کمانڈر براہ راست مرکزی حکومت سے مقرر ہوں اور مرکز ہی کو جواب دہ ہوں۔ خواجہ کی نظر چونکہ نظم و نسق کی تمام تفصیلات پر تھی اور

اسے معلوم تھا کہ اس انتظام کے ماتحت ہر کمان دار کو بلا لحاظ اس کی استعداد اور وفاداری کے منصب یا جاگیر دیے جانے سے کتنی خرابی پیدا ہوتی ہے اور اگرچہ ابتدا میں رقم کا تعین فوج کی اس تعداد کے تناسب سے ہوتا تھا جتنی ہر جاگیردار کے ماتحت ہوتی تھی لیکن وقت گذرنے پر یہ نظام ڈھیلا پڑ گیا تھا اور عطیات بلا لحاظ معینہ تعداد کی فوج رکھنے کی شرط کے ہونے لگے تھے۔ خواجہ نے سارے نظام کی نئے سرے سے اصلاح کر دی۔ اس نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ہر جاگیردار کو اس کے ماتحت ۵۰۰ مسلح سپاہیوں پر ایک لاکھ ہن سالانہ (بعد کو بڑھا کر سوا لاکھ کر دیے گئے) دیے جائیں اور اگر کوئی جاگیر نقد خراج کی بنیاد پر دی جائے تو اس میں یہ شرط ہونی چاہیے کہ ٹیکس وصول کرنے میں جو نقصان ہو اُس کی تلافی کی جائے دوسری طرف اگر کوئی جاگیردار یا منصب دار مقررہ تعداد کے سپاہیوں کی فوج نہ رکھے تو اُسے اسی تناسب سے باقی رقم خزانہ شاہی میں داخل کرنا ہوگی۔

علاوہ ان ملکی اور فوجی اصلاحات کے قرونِ وسطیٰ میں محمود گاواں پہلا وزیر تھا جس نے زمین کی باضابطہ پیمائش کرائی، شہر اور گاؤں کی حدبندی کی اور مالگذاری کی تشخیص کی پورے طور پر تحقیق کی۔ اس طرح ایک طرف تو اُس نے سلطنت کے مالیہ کے تعین میں آسانی پیدا کر دی اور راجہ ٹوڈرمل کی اصلاحات سے ایک صدی پیشتر حقوق کا کھاتہ بنوایا اور دوسری طرف اُس نے امرا کے اختیارات کی حدبندی کر دی جس سے مرکز میں بادشاہ کی حکومت کی حیثیت بہت بڑھ گئی۔

اپنے توازنِ قوت کے اصول کے ماتحت اُس نے شاہی محافظین کے دستے میں پرانے آنے والوں (حبشی اور دکھنی) اور نئے آنے والوں (ایرانی، سرکیشیائی وسط ایشیائی تارکین وطن) کو برابر کی تعداد میں بھرتی کیا اور اس طرح علاء الدین احمد دوم کی ایک رخی پالیسی کو بدل دیا۔ اسی طرح نئے گورنروں کے تقرر میں اُس نے یہ احتیاط برتی کہ کسی ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کی جانب داری نہ ہو چنانچہ اُس نے فتح اللہ عماد الملک اور ملک حسن نظام الملک کو جو دونوں دکھنی تھے ماہور اور گلبرگہ کا سرلشکر بنایا اور پرنس اعظم خاں ولد خلف سکندر خاں کو ورنگل کا سرلشکر بنایا اور دولت آباد اور جنیر علی الترتیب یوسف عادل خاں اور فتح الملک گیلانی کو سپرد کیے اور بیجاپور اپنے پاس رکھا۔ اگر ہم صوبوں کی اس تقسیم پر غور کریں تو ہمیں اس کا منصفانہ ہونا معلوم ہو جائے گا اس لیے کہ اگر چار صوبے پرانے آنے والوں کو دیے گئے اور ایک اعظم خاں کو (جو شاہی خاندان کے سرکش عنصر کا نمائندہ تھا) بطور خیر طلبی کی علامت کے تو آٹھ میں سے تین صوبے نو واردوں کو سپرد ہوئے جن میں ایک خود محمود گاواں کا بھی شامل تھا۔

کلچرل روابط

یہ بڑی حد تک محمود گاواں کی ہمہ گیری اور علمی رجحان اور نیز اُس کی علم کی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ دکھن کے بیرونی دنیا سے بہت گہرے کلچرل روابط پیدا ہو گئے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ غیر ممالک سے اہل علم کا خیر مقدم کرنے کی روایت سلطنت کے گلبرگہ کے عہد سے جاری تھی اور اس سلسلہ میں محمود گاواں کی پالیسی فیروز اور اس کے جانشینوں کی پالیسی کا براہ راست شاخسانہ تھی۔ محمود گاواں نے یہ کیا کہ سیاسی روابط کی رفتار کو ہمیشہ سے زیادہ تیز کر دیا۔ وہ خود بلند پایہ ذی علم تھا اور اپنے الفاظ کے وافر خزانہ، سوجھ بوجھ اور معلومات کی وجہ سے دور دور اپنے عہد کا ممتاز ترین فارسی انشا پرداز سمجھا جاتا تھا[۱۰]۔ اپنے زور قلم کی بدولت اُس نے دکھن کو ممالک غیر میں روشناس کرانے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اُس کے خطوط کا مجموعہ ریاض الانشا اس کے خلوص اور ذوق کا ثبوت ہے۔

جن لوگوں سے خواجہ کی برابر خط و کتابت تھی ان میں سب سے زیادہ قریبی ربط مولانا نور الدین احمد جامی سے تھا جنھیں بہمنی افواج کی فتوحات کی برابر اطلاع دی جاتی تھی اور جب خواجہ نے سنا کہ وہ حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں تو اس نے ان سے التجا کی کہ راستہ میں دکھن ضرور آئیں[۱۱]۔ اِس کے علاوہ اُس کی مشہور مورخ شرف الدین علی یزدی اور صوفی بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار، جلال الدین دوانی اور کئی دیگر مشاہیر اہل علم سے خط و کتابت تھی[۱۲]۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دکھن ترکی اور ایران کے علما کو فیاضانہ وظائف دیتا تھا۔

محمود گاواں کی اُن لوگوں سے بھی برابر خط و کتابت تھی جو اسلامی سیاست میں شہرۂ آفاق تھے اور جس ملک کو اُس نے اپنا وطن بنایا تھا اس کا وقار معاصرین میں بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہمارے پاس وہ خطوط بھی ہیں جو اُس نے اور محمد شاہ بہمنی نے محمد دوم فاتح قسطنطنیہ کو لکھے اور اس عظیم سلطان خلیفۃ الاسلام کو خراج عقیدت پیش کیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ دکھن اور ترکی کے مابین تعلقات مستحکم بنیاد پر قائم ہو جائیں[۱۳]۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ شاید یہ بات ہے کہ محمد فاتح کا ایک معتمد سفیر دکھن آیا جس کے ساتھ وہ خط تھا جو عثمانی سلطان نے اپنے ہمنام سلطان دکھن کو لکھا تھا[۱۴] اور یہی ایک خط ترکی سلطان کا ہمیں ملا ہے ـــــ سلطان ترکی کے علاوہ محمود گاواں نے سلاطین گیلان و عراق و مصر کو بھی خط لکھے ـــ اندرون ملک گجرات، جون پور اور مالوہ کے حکمرانوں کے نام بھی اُس نے خطوط لکھے تھے ـــ محمود گاواں کا ایک خط بھی ایسا نہیں ہے جس میں اُس نے اپنے آقا کی طرف سے جس کی خدمت کا اُسے فخر حاصل تھا

اپنی وطنیت اختیار کیے ہوئے ملک اور اپنے آقا کی عظمت، قوت اور علمیت کی پورے جوش و خروش سے تعریف نہ کی ہو۔ مولانا جامیؒ جو اپنے عہد کے علما کے سربرآوردہ فرد تھے۔" دکمن کی حاصل کی ہوئی حیثیت سے بہت متاثر تھے اور محمود گاواں کی شان میں ایک قصیدہ کے اندر لکھا ہے کہ اس کی موجودگی نے دکمن کو روم کے لیے بھی قابل رشک بنا دیا ہے[106]

(۲) سیاسی حالات

تلنگانہ اور اڑیسہ

بیجاپور میں دو سال تک قحط رہا جس کے دوران میں سارا دکمن بہمنی سلطنت کے اندر اور باہر انسانوں اور جانوروں کی بہبودی کے کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ کوئی اور اہم کارنامہ نہ انجام دے سکا۔ ان دو برسوں کے بعد جب حالات ذرا بہتر ہوئے (یعنی تقریباً ۸۷۹ھ = ۱۴۷۵ء میں) تو مشرقی صوبوں سے خبر آئی کہ کونڈاویڈو کے حکام رعایا پر سخت ظلم کر رہے ہیں اور لوگوں نے عاجز ہو کر بغاوت کر دی ہے اور گورنر کو قتل کر دیا ہے اور بغاوت کی سربراہی کے لیے ہمیر رائے کو بلایا ہے۔ ہمیر بہمنیوں کی قوت سے خوب واقف تھا اس لیے اس نے اڑیسہ کے پرشوتم کو پیام بھیجا کہ وہ دونوں مل کر ملک کو بہمنیوں کے ظلم سے نجات دلائیں اور چونکہ دکمن کے حالیہ قحط کی وجہ سے سلطان کی فوجوں کی قوت مدافعت کمزور ہو گئی ہے اس لیے اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں مل سکتا جس معاہدہ پر ان دونوں نے دستخط کیے وہ محض دفاع و جنگ کا معاہدہ نہ تھا بلکہ اڑیسہ اور اوڑیا (یا مشرقی تلنگانہ) کے حکمرانوں کے ایک طاقتور اتحاد کا تھا جس میں جاج نگر کے آس پاس کے تمام ملکوں کے حکمران شریک تھے اور ان کی متحدہ فوجوں نے سرحد کو پار کر کے نظام الملک کو وزیر آباد میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ فوج اشنوز کے پاس ملک پور کی طرف کوچ کرے اور محمود گاواں کے مشورہ پر سلطان نے فوراً ان فوجوں کی کمان سنبھالی جو راجہ سندری کی طرف بڑھ رہی تھیں[107] جس دریا کے کنارے یہ شہر واقع تھا وہ اتحادیوں کو عبور کرنے کے لیے بہت مشکل معلوم ہوا اور سلطان کی فوج کی آمد کی خبر سن کر ہمیر رائے قلعہ کونڈاویڈو میں چلا گیا[108]۔ چنانچہ سلطان نے محمود گاواں اور دکمن[109] ولی عہد کو راجہ سندری میں چھوڑا اور خود شاہ محب اللہ کو لے کر پرشوتم کے تعاقب میں بڑھا جو سات لاکھ پیادہ سپاہ اور پانچ سو ہاتھیوں کے ساتھ گوداوری کے کنارے خیمہ زن تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی خندق کھود کر پانی سے بھر دی تھی اور دوسری طرف ایک دیوار تعمیر کر دی تھی جس پر توپیں چڑھا دی تھیں[110]۔

بادشاہ نے دریا خاں کو دشمن کی فوج کے پشت کی طرف روانہ کیا جس پر دشمن کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور بہمنی فوج کے ایک حصّہ نے اُس کا تعاقب کیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ پرشوتم نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی استدعا کی جو قبول کر لی گئی۔

لیکن صلح زیادہ دن نہیں چلی اور ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) کے آخری دنوں میں سلطان کو پھر اڑلیہ کے قلب تک فوج کشی کرنی پڑی اور رائے کو مجبور ہو کر اپنا ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ صورت یہ ہوئی کہ سلطان کے ایک اوڑیا افسر بھیم رائے نے بغاوت کر دی اور کونڈاپلی پر قبضہ کر کے پرشوتم کو بہمنی سلطنت پر حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔ محمد چھ مہینے سے اڑلیہ میں تھا اور جب واپسی کا وقت آیا تو اس نے ولی عہد شہزادہ محمود اور محمود گاواں کو اس لیے طلب کیا کہ یہ علاقہ انھیں سپرد کر دے جسے وہ اپنی وسیع سلطنت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ یہ سن کر رائے سخت پریشان ہوا اور بادشاہ کی اطاعت شعاری قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور قیمتی تحائف اور بہت سے ہاتھی بھیج کر ہتھیار ڈال دینے کی پیشکش کی۔ بادشاہ نے رائے کی اطاعت کیشی قبول کر لی اور اُسے اپنے آبائی ملک کی حکمرانی پر مستقل کر دیا۔ واپسی میں سلطان کو ایک ایسا قلعہ ملا جس کے محافظین نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے لڑنے کو ترجیح دی اور سلطان کو اُس کا محاصرہ کرنا پڑا۔ پرشوتم نے جب یہ سنا تو اس نے سلطان سے عاجزانہ معافی طلب کی اور کہا کہ وہ قلعہ پر قبضہ کر لے اور اگر چاہے تو بطور ماتحت کے اُس کے پاس رہنے دے۔[۱۱۱]

سلطان اس کامیاب مہم کے بعد جب اپنے مستقر پر واپس آیا تو محمود گاواں نے اُس سے استدعا کی کہ وہ اپنے القاب میں "غازی" کا اضافہ کرے۔ راجہ سندری میں سلطان کا قیام تقریباً دو سال رہا[۱۱۲] اور اُس نے سرحدی قلعوں کو مستحکم کیا۔ جب سلطان دار السلطنت واپس پہنچا تو جن بہادر سپاہیوں نے اس طویل جنگ میں اُس کے ساتھ شرکت کی تھی انھیں اعزازات اور انعامات دیے۔

خاندیش

سلطان کی واپسی کے بعد خاندیش کا عادل دوم اُسے سلامی دینے آیا اور بیدر میں اس کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عادل کے ملک میں بہمنی سکّے رائج تھے اور سارے خاندیش کے اندر جمعہ کے خطبوں میں بہمنی سلطان کا نام لیا جاتا تھا اس لیے خاندیش جو پہلے دکن کا دشمن تھا اب وہ عملاً بہمنی سلطنت کا محفوظ ملک ہو گیا تھا۔ خاندیش کا حکمران جس وقت بیدر میں پہنچا تو شہر میں جشن منایا گیا اور ایک معزز مہمان کی آمد کو پُرمسرت بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا گیا۔[۱۱۳]

کونڈاوڈو اور وجے نگر

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ مشرقی صوبوں نے پھر سر اٹھایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۸۸۵ھ (۱۴۸۰ء) میں کونڈاویڈو میں جو فوج تعینات تھی اُس نے بغاوت کردی اور ملک کی آبادی سے مل گئی جس نے خود کو نرسمہا کی حفاظت میں دے دیا تھا جو کرشنا کے جنوب میں عملاً پورے مشرقی ساحل کا بلاشرکت غیرے حکمران تھا۔ چنانچہ رمضان ۸۸۵ھ (نومبر ۱۴۸۰ء) میں سلطان مشرق کی طرف روانہ ہوا اور کونڈاویڈو کے قلعہ کے دامن میں اپنا خیمہ نصب کرکے اس قلعہ کے محاصرہ کا حکم دیا۔ قلعہ بند فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ہی آبادی کے لوگوں نے سلطان کو عرضی دی کہ بغاوت کا اصل سبب یہ تھا کہ حریص حکام ان سے بہت برا سلوک کرتے تھے[۱۰۴]۔ انھوں نے کہا کہ پہلے انھوں نے حکام کی زیادتی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بالکل عاجز ہوکر ان سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔ اس عرضی کو سن کر سلطان نے باغیوں کو معاف کردیا اور قلعہ مسند عالی اُلغ خاں کے اعلےٰ خطاب، کے ساتھ نظام الملک کو سپرد کردیا اور نرسمہا کو جنوب مشرق کی طرف واپس جانا پڑا[۱۰۵]۔

اب سلطان نے نرسمہا کو سزا دینے کے لیے جنوب کا رُخ کیا۔ دارالسلطنت سے روانگی کے قبل سلطان نے محمود گاواں سے دریافت کیا کہ راجہ سندری کے نئے مفتوحہ علاقہ کا گورنر کسے مقرر کیا جائے اور محمود گاواں نے جواب: اکہ اس منصب کے لیے نظام الملک سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہے لیکن نظام الملک کی خواہش تھی کہ پورے تلنگانہ پر حکومت کرے جس پر وہ پہلے سخت نااہلیت سے حکومت کرچکا تھا۔ مزید برآں تلنگانہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاچکا تھا اور ورنگل کا چارج پرنس اعظم خلف ہمایوں عم زاد سکندر خاں کو دیا جاچکا تھا، اس لیے نظام الملک کے دل میں اُس کی بڑی کھٹک رہی۔ اُس نے بادشاہ سے استدعا کی کہ اس کے لڑکے ملک احمد کو راجہ سندری میں اُس کا نائب مقرر کردیا جائے تاکہ وہ خود اس مہم میں بادشاہ کے ساتھ رہے۔ ملک احمد نے حرم شاہی کی ایک لڑکی سے شادی کرلی تھی اس لیے وہ سلطان کا مقرب ہوگیا تھا اور نظام الملک کو اس درخواست کے قبول کرنے پر بادشاہ کو آمادہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی، اگرچہ محمود گاواں کو یہ پسند نہ تھا کہ راجہ سندری جیسے اہم مقام کا ایسا انتظام کیا جائے[۱۰۶] اور جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا یہی وہ سلسلہ تھا جس سے محمود گاواں کا قتل واقع ہوا۔

بہرنوع سلطان تقریباً چالیس فرسخ تک وجے نگر کے علاقہ میں گھس گیا اور نرسمہا کا تعاقب کرتا ہوا نیلور کے زبردست قلعہ تک پہنچ گیا[۱۰۷]۔ نرسمہا شاہی فوج کی آمد پر بھاگ کھڑا ہوا۔ سلطان نے شاہی فرمان کی شکل میں نرسمہا کو اعلان جنگ دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ فوراً ہتھیار ڈال دے ورنہ اُسے بالکل تباہ کردیا جائے گا

جس پر نرسمہا نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیے اور بیش قیمت تحفے نقد، جواہرات اور ہاتھیوں کی شکل میں بھیجے۔

نیلور میں سلطان نے سنا کہ کانچی میں دولت کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے جو دکھن کی طرف صرف پچاس فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ سلطان نے اس قلعہ پر بھی قبضہ کرنے کا تہیہ کرلیا اور نظام الملک اور خان اعظم عادل خاں کو اپنے محافظ دستہ کے ڈیڑھ سو منتخب جوانوں اور دس ہزار رسالہ فوج کے ساتھ اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیا۔ چھتیس گھنٹہ تک تیزی کے ساتھ دھاوا کرتا ہوا ۱۱ محرم ۸۸۶ھ (۱۲ مارچ ۱۴۸۱ء) کو وہ کانچی پہنچا اور قلعہ کو مسمار کر دیا اور چونکہ یہ جنوب کی طرف بہمنی افواج کی رسائی کی آخری حد تھی اس لیے اس واقعہ کو بڑی اہمیت دی گئی اور مملکت کے تمام حصوں کو غازی سلطان کے اس عظیم ترین کارنامہ کی فرامین کے ذریعے سے اطلاع دی گئی۔ واپسی میں سلطان نے کونڈاپلی میں قیام کیا اور راستہ میں مچھلی پٹم کی تسخیر کی[۱۱۸]

محمود گاواں کے خلاف سازش

جیسا کہ اوپر کہا گیا جو پارٹی خواجہ محمود گاواں کی دشمن تھی اُسے خواجہ کی نافذ کی ہوئی انتظامی اصلاحات سخت ناگوار تھیں اور اگرچہ خواجہ کو معلوم تھا کہ وہ آگ سے کھیل رہا ہے مگر اسی کے ساتھ اُسے یہ بھی احساس تھا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ ملک کی بہبودی کے لیے ہے اور اس سے سلطنت کو استحکام اور قوت حاصل ہوگی۔ مخالف پارٹی برابر خواجہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتی رہی[۱۱۹]۔ شاہی جلو میں ایک شخص یوسف عادل تھا جو خواجہ کے لیے بمنزلہ اولاد کے تھا اور وہ ہمیشہ دربار کے ناخوشگوار واقعات کی خواجہ کو اطلاع دیتا رہتا تھا لیکن وہ بادشاہ کے ساتھ جنوب کی طرف چلا گیا تھا اور خواجہ ولی عہد کے ساتھ نیلور میں ٹھہر گیا تھا۔ چنانچہ کونڈاپلی میں خواجہ کے خلاف ایک سازش کی گئی جس کے خاص محرک ظریف الملک دکھنی اور مفتاح حبشی تھے جنھیں خواجہ نے ترقی دی تھی۔ مگر اب وہ خواجہ کے کٹر دشمن[۱۲۰] تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ جو حبشی خواجہ کی مہر رکھتا ہے وہ ایسا شخص ہے جسے آسانی سے پرچایا جا سکتا ہے تو انھوں نے اُسے جواہرات اور گھوڑوں وغیرہ کے تحفوں سے لاد دیا اور ایک دن شام کو جب کہ یہ حبشی زیادہ پی جانے کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ انھوں نے اُسے ایک سادہ تہ کیا ہوا پرچہ دکھایا اور کہا کہ یہ ایک بے قصور دوست کی معافی کی درخواست ہے جس پر کئی وزیروں اور اعلیٰ حکام کے دستخط ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس پر خواجہ کی مہر بھی ثبت ہو جائے[۱۲۱]۔ جب یہ مہر لگ گئی تو ان لوگوں نے نظام الملک

کی واپسی کا انتظار کیا اور اس کے آجانے پر تینوں نے مل کر خواجہ کی طرف سے ایک خط اڑیسہ کے پرشوتم کے نام بنایا جس میں پرشوتم کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے:

"اگرچہ میری پرورش اپنے آقا بادشاہ کے نمک پر ہوئی ہے لیکن اگر تم اپنے مذہب کی مقدس ترین چیزوں کی قسم کھاؤ کہ ملک کو اپنے اور میرے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھاری ہر امکانی مدد کروں گا۔ چونکہ سارے ملکی اور مالی اختیارات پورے طور پر میرے ہاتھ میں ہیں اور نیز فوجی معاملات میں مجھے پورا اختیار ہے اس لیے کوئی چیز میرے حلقہ اختیار سے باہر نہیں ہے اور اپنے متحدہ مقصد کے حصول کے لیے میں جو کچھ چاہوں وہ کر سکتا ہوں[۱۲۲]"

انتظام یہ کیا گیا کہ یہ جعلی خط ظریف اور مفتاح بادشاہ کی واپسی پر اس کے سامنے پیش کریں جب کہ نظام الملک بھی موجود ہو۔ سلطان سخت غضب ناک ہوا اور کہا کہ جو باتیں اس کے گوش گذار کی جاتی رہی ہیں اُن کی اس خط سے تصدیق ہوتی ہے چنانچہ اس نے تہیہ کر لیا کہ خواجہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے اور اُسے فوراً بلا بھیجا لیکن خواجہ کے دوستوں کو کچھ سراغ لگ گیا تھا کہ بادشاہ کے ذہن میں کیا ہے اور انھوں نے خواجہ سے اصرار کیا کہ کم از کم اُس روز وہ پیشی میں نہ جائے اور کچھ عذر کر دے لیکن خواجہ کو بادشاہ کی طلبی کا احترام کرنے پر اصرار تھا اور اُس نے کہا کہ اس کی ڈاڑھی سلطان کے والد ماجد مرحوم ہمایوں شاہ کی خدمت میں سفید ہوئی ہے اور بہتر ہے کہ اُس کے جانشین کے ہاتھوں یہ سرخ ہو جائے۔ خواجہ کے بعض دوستوں نے یہ بھی تجویز کی کہ وہ گجرات کی سرحد کی طرف چلا جائے جہاں اُس کا استقبال کیا جائے گا لیکن خواجہ نے کہا کہ وہ مجرم نہیں ہے اور چونکہ اس کا ضمیر بالکل صاف ہے کہ اُس نے کوئی بات بادشاہ کے خلاف اپنے توطن پذیر ملک کے خلاف نہیں کی ہے اس لیے وہ کیوں کہیں بھاگ جائے[۱۲۳]

خواجہ کا خاتمہ

جب خواجہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اُس سے پوچھا کہ جو خادم اپنے آقا سے غداری کرے اُس کی کیا سزا ہے جس کا خواجہ نے فوراً جواب دیا کہ ایسے شخص کی سزا صرف قتل ہے۔ اب بادشاہ نے خواجہ کو وہ خط دکھایا جس پر اس کی مہر تھی۔ خواجہ نے بڑی انکساری سے جواب دیا کہ مُہر تو بے شک اُسی کی ہے لیکن اس خط کا اُسے کوئی علم نہیں ہے اور ساتھ ہی قرآن کی یہ آیت پڑھی: "سبحانک ھذا بہتان عظیم"[۱۲۴] بادشاہ وہاں سے چلا گیا اور اپنے غلام جوہر کو حکم دیا کہ وہ خواجہ کا کام تمام کر دے۔ خواجہ نے بادشاہ کو متنبہ کیا کہ اُس کی طرح کے بوڑھے آدمی کا قتل مشکل نہیں ہے لیکن (اس موقعہ پر اُس نے

یہ سوچا کہ سیاسی توازن کے خاتمہ کے نتائج کیا ہوں گے جب کہ اُس کے خاتمہ کے بعد ایک مخصوص پارٹی سیاہ سفید کی مالک ہو جائے گی) ملک میں بدامنی ہو جائے گی اور خود بادشاہ کا وقار ختم ہو جائے گا مگر محمد شاہ شراب کے نشہ میں ان پیش بینی کے الفاظ پر توجہ دیے بغیر چلا گیا اور جوہر تیغ آب دار لیے بوڑھے خواجہ کے سامنے آ گیا۔ ضعیف العمر خواجہ فوراً رکوع میں جھک گیا اور اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیا کہ اُسے شہادت کی نعمت عطا ہو گئی اور جب جوہر نے تلوار بلند کی تو اس نے کلمہ پڑھا اور یہ منحوس ترین کام انجام پا گیا۔[125]

یہ ۵ صفر ۸۸۶ھ (۵ اپریل ۱۴۸۱ء[126]) کا واقعہ ہے جب کہ خواجہ کی عمر ۷۳ سال کی تھی[127]۔ عجیب بات یہ ہے مرحوم نے اپنی موت سے کچھ دن پہلے اپنے آقا کی شان میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے اندر ایک طرح سے بالکل ٹھیک پیش گوئی کی تھی کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوگی اور لکھا تھا کہ کسی کو بادشاہ کی تلوار سے ڈرنا نہ چاہیے کیونکہ جب وہ کسی کی گردن کو چھوتی ہے تو آبِ حیوان کا کام کرتی ہے[128]۔ بعد کو محمود گاواں کی شہادت پر متعدد قطعات تاریخ کہے گئے جن میں سب سے زیادہ مشہور سمیعی کا یہ مصرعہ ہے کہ "بے گنہ محمود گاواں شد شہید" (بے قصور محمود گاواں شہید ہو گیا)۔[129]

(د) سلطان کی زندگی کے آخری دن (۱۴۸۱-۸۲ء)

وزیر کے قتل کے بعد سلطان کا طرزِ عمل

سلطان کو بخوبی علم تھا کہ محمود گاواں کو ملک کے ہر طبقہ میں کس قدر ہر دلعزیزی حاصل تھی اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ ایک طویل فرمان جاری کیا جائے جس میں اس فوری کارروائی کے وجوہ بیان کیے جائیں۔ اس کے بعض اقتباسات اُس سیاسی فضا کو سمجھنے میں مفید ہوں گے جس میں یہ قتل کیا گیا۔ اس فرمان میں سلطان نے کہا کہ:

"ہمیں کانچی سے واپسی پر معلوم ہوا کہ خواجہ جہاں کو وہ اعزاز پسند نہ تھے جو ہم نے اپنے بعض اہل دربار کو دیے اور ان سے اس قدر حسد تھا کہ خود ہمارے خلاف کارروائی کرنے لگا اور عین اس وقت جب کہ ہماری فوجیں دشمن سے لڑ رہی تھیں اس نے اڑیسہ کے بدکردارترین رائے کو خط لکھا جس میں اُس سے اتحاد مقصود تھا۔ دونوں فریق بظاہر یہ بھول گئے کہ خود اللہ تعالےٰ نے ہمیشہ اپنے ارضی خلیفہ کی مدد کی اور باوجود اپنی تیز ذہانت کے خواجہ نے یہ نہ سوچا کہ جس کسی نے کھوج اور نخوت کی ٹوپی پہن لی اُس کی ٹوپی اور اُس کا جلد خم ہو جائے گا ...... جب ہم تخت نشین ہوئے تو ہم نے اُسے ایسا اعزاز دیا جو سب کے بیے

قابلِ رشک ہوگیا اور تیس ہزار گاؤں اُس کی حکومت میں دے دیے۔ اس سے وہ اتنا مغرور ہوا کہ اُس کی وزارت کی نخوت خود ہماری سلطنت کے سورج کے خلاف ہوگئی جس سے اُسے روشنی حاصل ہوئی تھی اور ہمارے دشمنوں سے جو دشمن اسلام تھے اتحاد کی کوشش کی اِس لیے ہم نے مجبوراً اُسے اور اُس کے دوستوں کو جلّاد کے حوالے کر دیا۔"[۱۳۰]

خواجہ کے دوست جن کا اس میں ذکر ہے سعید خاں گیلانی اور دوسرے امرا تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خواجہ کو گجرات بھاگ جانے کی ترغیب دی تھی اور انھیں فوراً قتل کر دیا گیا۔ مزید برآں سلطان نے ہرکس وناکس کو اجازت دے دی کہ خواجہ کی ذاتی املاک لوٹ لیں۔[۱۳۱] شاید بادشاہ نے یہ خیال کر کے کہ محمود گاواں کی تجوری میں اب بھی بہت دولت ہوگی اپنے خزانچی نظام الدین احمد کو خواجہ کی زرد جواہر کی املاک جانچنے کا حکم دیا۔ خزانچی نے سرِ تسلیم خم کر کے عرض کیا کہ خواجہ کے پاس دو خزانے تھے ایک "شاہی خزانہ" اور ایک "غربا کا خزانہ"۔ اوّل الذکر میں گھوڑے، ہاتھی اور اُن کا ساز و سامان اور نیز محافظین کی ضروریات تھیں اور اس میں اس وقت ایک ہزار لاری اور تین ہزار ہن ہیں[۱۳۲] اور غربا کا خزانہ جو خواجہ کی ذاتی ملکیت تھا اس میں صرف تین سو لاری ہیں۔ خزانچی نے بادشاہ سے کہا کہ خواجہ اپنی جاگیر کی آمدنی سے اپنی ماتحت فوج کا خرچ نکال کر شاہی خزانہ میں تقسیم کرنے کے لیے بھیج دیتا تھا اور باقی غریبوں محتاجوں کو تقسیم کر دیتا تھا۔ اپنے اوپر اس میں سے کبھی ایک پائی نہیں خرچ کرتا تھا۔ تیس سال پہلے جب وہ ہندوستان آیا ہے تو اس کے پاس .... ۴۰ لاری تھیں جو اس نے تجارت میں لگا دیں اور اس سے جو آمدنی ہوتی تھی اس میں سے ۱۲ لاری روزانہ اپنے اوپر خرچ کرتا تھا (جس میں خوراک، لباس اور دوسری ضروریاتِ زندگی شامل تھیں) اور اپنی بوڑھی ماں اور دوسرے حاجت مند عزیزوں کی جو باہر تھے ان کی مالی مدد کرتا تھا۔ خزانچی نے بادشاہ سے کہا کہ اگر اس سے ایک لاری بھی زیادہ نکلے تو اس کی گردن اُڑا دی جائے۔ بادشاہ خواجہ کی دیانت داری کے اِس بین ثبوت سے بہت متاثر ہوا اور مخالف فریق کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اب انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ خواجہ کا اصل خزانہ بیدر میں ہوگا لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا کہ خواجہ کی جتنی املاک تھی وہ سب اس کے پاس تھی اور دارالسلطنت میں کوئی قیمتی چیز نہ تھی۔

خزانچی نے جو اپنے مرحوم آقا کا وفادار تھا جب اس نے حالات کا رخ بدلتے دیکھا تو سلطان سے عرض کیا کہ اس کی تحقیقات کی جائے کہ کیا خواجہ ویسا ہی غدار تھا جیسا کہا جاتا ہے اور نیز یہ کہ مذکورہ غدارانہ خط اڑلیسہ کے پرشوتم کے پاس کون لے کر گیا تھا۔ بادشاہ نے اب اپنے گرد و پیش کی تاریکی میں

روشنی کی جھلک دیکھی اور خواجہ پر الزام لگانے والوں سے کہا کہ اس آدمی کو پیش کریں جو یہ خط لے کر گیا تھا اور قدرتاً وہ اسے پیش نہ کر سکے۔ اب بادشاہ زنان خانہ میں گیا اور اپنی بڑی بہن حمیدہ سلطان سے سارا قصہ بیان کیا جو اسی کی طرح محمود گاواں کی سرپرست مرحومہ مخدومہ جہان کی لڑکی تھی۔ بادشاہ کو اپنے کیے پر سخت اذیت ہوئی اور اس نے مرحوم خواجہ کا جنازہ شاہی جلوس کے ساتھ بیدر روانہ کیا اور نوجوان ولی عہد محمود کو بھی اس کے ساتھ کیا[۱۳۳]

محمود گاواں کے بعد سلطنت کو کیوں زوال ہوا؟

اب اس کی ضرورت نہیں کہ محمود گاواں اپنے معاصرین کی نظروں میں جیسا تھا ہم اس کی تشریح کریں، اس لیے کہ ہم اُسے بحیثیت مدبر اور وزیر اور صاحب علم کے اور نیز شخصی حیثیت سے دیکھ چکے ہیں[۱۳۴] لیکن صرف ایک بات رہ جاتی ہے جس پر یہاں بحث کی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ آیا محمود گاواں نے خود زوال سلطنت کی بنیاد ڈالی؟[۱۳۵] یہ نظریہ، اگر اسے نظریہ کہا جا سکتا ہے اس پر مبنی ہے کہ خواجہ کی وزارت کے زمانہ میں بہمنی سلطنت نے بڑا عروج حاصل کیا اور اس کے انتقال کے بعد فوراً ہی مایل بہ زوال ہو گئی۔ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خواجہ کو ہمایوں کے وقت سے لے کر جس کی شان میں اس نے اڑتیس شعر کا قصیدہ لکھا محمد سوم کے عہد تک جس کی اُس نے اپنی گردن پر مہلک تلوار پڑنے سے چند ہی ہفتے قبل تعریف کی تھی سلاطین دکن کے ساتھ ہمیشہ کتنی زبردست عقیدت رہی[۱۳۶] اور وہ لحاظ جو ہمایوں کی ملکہ اور اُس کی سرپرست کو اُس کا تھا جسے وہ خود اپنا بھائی سمجھتی تھی[۱۳۷] تخت اور اپنی وطنیت اختیار کیے ہوئے ملک کے ساتھ اُس کی وفاداری کا اظہار بار بار اُس کے ملکی اور غیر ملکی دوستوں کے نام خطوط میں ہوتا رہا اور خود اُس کے اُن الفاظ سے جو اُس نے اپنے قتل سے پہلے کہے۔ ان سب سے صاف ثابت ہوتا ہے اگر کوئی اور ثبوت نہ بھی ہو کہ بہمنی سلطنت کے متعلق اُس کے حقیقی جذبات کیا تھے۔ ہندوستان میں اُس کی خدمات کے کم و بیش تیس سال کے اندر اُس کا ایک کام بھی ایسا نہیں ملتا۔ جس میں ذرہ برابر بھی اس کا ثبوت ملتا ہو کہ وہ اپنے طرز عمل میں کسی طرح بھی غدار تھا۔

اگر یہ نقطۂ خیال صحیح ہو تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بادشاہ کی وفات کے فوراً ہی بعد سلطنت کے منتشر ہو جانے کے کیا اسباب تھے اگر سلطنت کی بنیاد میں کوئی ایسا شگاف نہیں تھا جسے خواجہ نے جان بوجھ کر یا لاعلمی میں اسی طرح چھوڑ دیا ہو۔ اس کا سراغ جو کچھ اُس نے کیا اُس میں نہیں ملے گا بلکہ جو کچھ وہ نہ کر سکا اُس میں ملے گا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فیروز اور احمد اول کی پالیسی یہ تھی کہ بیرون ملک سے لوگوں کے بکثرت

دکھن میں آنے کی ہمت افزائی کی جائے اور جلد ہی کمزور احمد دوم کے عہد میں یہ ایک بڑا مسئلہ بن گیا اس لیے کہ اُس نے سلطنت کے ترازو کا پلّہ کبھی اپنے باپ کی روایت کے بموجب نوواردوں کی طرف جھکا دیا اور کبھی پرانے آنے والوں کی طرف اور نتیجہ میں جو پارٹی بادشاہ کی نظرِ کرم نہ حاصل کر سکی اُس کا قتل عام کر دیا گیا۔ اس تلون نے حکومت کے اقتدار کو جتنا نقصان پہنچایا تھا اُس کے ردِ عمل کے طور پر ہمایوں نے دونوں جماعتوں میں توازن قوت کی پالیسی جاری کی لیکن اُس کی یہ کوشش بارور ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو گئی اور اُسے اتنا برا بھلا کہا گیا جتنا اُس سے پہلے کسی بادشاہ کو نہیں کہا گیا تھا۔ اس کی دانشمند ملکہ نے محمود گاواں سے مل کر پھر اسی پالیسی کا سلسلہ شروع کیا اور اس وزیر کی ساری سیاسی زندگی اسی مقصد میں صرف ہوئی ہے[۱۳۵]

محمود گاواں کے بعد سلطنت میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو پھر اس نظام کو جاری کرتا، کچھ تو اس خوف سے کہ کہیں اس کا بھی یہی حشر نہ ہو اور کچھ محض خود غرضانہ مفاد کی بنا پر کہ اپنے یا اپنی پارٹی کے لیے بگڑ بیٹھے کرے۔ سیاسی توازن جو قائم ہوا تھا وہ درہم برہم ہو گیا اور نئی حکومت ایک پارٹی کی تابع ہو کر رہ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تک دو سیاسی گروہوں کا تعلق تھا ملک فطری حالت میں پہنچ گیا۔ اگر ایک بھی محمود گاواں ہوتا تو وہ خود غرضی، سازش اور بدامنی کے رحجان کو روک سکتا، مگر اس وفاداری اور دیانت کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا اور سلطنت ناموافق ہوا کے ایک ہی جھونکے میں ریت کے گھروندے کی طرح پاش پاش ہو گئی۔

محمد کی حکومت کے آخری دن

آنے والے طوفان کی علامتیں بہت جلد نمایاں ہو گئیں اور اس طوفان نے کئی چھوٹی حکومتیں پیدا کیں جنھوں نے منقسم دکھن کی آزادی مزید دو سو سال تک قائم رکھی۔ اپنے کیے پر پچھتاوے کی وجہ سے محمد سوم جلد سے جلد بیدر پہنچنا چاہتا تھا۔ جس دن شہزادہ محمد وزیر مرحوم کے جنازے کے ساتھ کونڈاپلی سے دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا اُس روز خبر آئی کہ فتح اللہ عماد الملک برار کی فوج کا کمان دار اور خداوند خاں حبشی ماہور کی فوج کا کمان دار دونوں شاہی کیمپ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر آ گئے ہیں اور انھوں نے بادشاہ کو پیام بھیجا جو بدخلقی کی حد تک تلخ تھا کہ جب خواجہ جیسا شخص دغا سے ختم کیا جا سکتا ہے تو انھیں اندیشہ ہے کہ خود ان کا بھی وہی حشر نہ ہو جب تک یوسف عادل جنوب سے نہ آ جائے وہ بادشاہ کی خدمت میں نہ حاضر ہوں گے۔ چنانچہ یوسف عادل کو فوراً اس نئی صورت حال

سے مطلع کیا گیا لیکن کونڈاپلی پہنچ کر اُس نے بھی اپنا خیمہ فتح اللہ اور خداوند خاں کے پاس نصب کیا۔
یہ تینوں اب بادشاہ کو اپنی مرضی پر مجبور کرنے کے لیے کافی طاقتور تھے اور بادشاہ نے انھیں کے بتائے ہوئے الفاظ میں احکام لکھے کہ بیجاپور کی طرف داری یوسف عادل کو ملو خاں، فخر الملک، دریا خاں اور دوسروں کو اس کے نائب بنا کر دی گئی اور عماد الملک اور خداوند خاں کو اپنے اپنے صوبوں میں مستقل کیا گیا۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے نظام الملک پر عنایات کی بارش جاری رکھی اور اسے وکیل اور پیشوا کے منصب کے ساتھ وزیر اعظم بنایا گیا اور اس کے دوستوں اور ساتھیوں بڑے قوام الملک اور چھوٹے قیام الملک، کو راجہ سندری اور ورنگل کی حکومتیں دی گئیں۔ جب بالآخر سلطان بیدر کو روانہ ہوا تو یوسف عادل، عماد الملک اور خداوند خاں اس کے ساتھ ہو گئے مگر بجائے شہر میں داخل ہونے کے اپنے خیمے شہر کی فصیل کے باہر نصب کیے اور چند دن ٹھہر کر اپنی اپنی حکومتوں پر روانہ ہو گئے۔[139]
بیدر واپس پہنچنے پر سلطان نے خواب دیکھا کہ خواجہ کی ماں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے التجا کر رہی ہے کہ بادشاہ کو اس کے بے قصور بیٹے کے قتل کی سزا دی جائے اور رسول اللہ نے فوراً سلطان کو سزائے موت دینے کا حکم دیا۔ سلطان خوف زدہ حالت میں بیدار ہوا اور یہ سمجھ گیا کہ اُس کی موت کے دن قریب ہیں۔[140] چھ ماہ گذر گئے اور اس کی دلی اذیت کم نہ ہوئی تو اُس نے مغربی صوبوں کے دورے کا ارادہ کیا اور عماد الملک اور خداوند خاں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ دونوں نے اس حکم کی تعمیل تو کی لیکن یہ کوشش کرتے رہے کہ شاہی جلوس سے دور دور رہیں اور بادشاہ کو سلامی اس وقت دی جب وہ مجمع عام میں ہوا۔
جب بادشاہ کی پارٹی بلگام پہنچی تو یہ خبر آئی کہ وجے نگر کا ویریکش گوا پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے فوج بھیج رہا ہے۔ بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ جس نے اتنے جنگ کے میدانوں میں اپنی قوت کا ثبوت دیا تھا اب اُس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور فیروز آباد واپس آ گیا اور یوسف عادل کو حکم دیا کہ دکھنیوں اور آفاقیوں کی مشترک فوج لے کر گوا کی حفاظت کرے۔ عماد الملک اور خداوند خاں بادشاہ کے ساتھ نہیں گئے بلکہ اپنے اپنے صوبوں کے مستقر پر واپس چلے گئے۔[141]
محمد شاہ اگرچہ ابھی جوان تھا مگر یہ دیکھ رہا تھا کہ سلطنت صحیح رخ پر نہیں جا رہی ہے برعکس اس کے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ خود اُسے جو صدمہ پہنچا ہے وہ بہت سخت ہے۔ چنانچہ اپنے بعد بدنظمی کے امکان کو روکنے کے لیے اس نے شاہی فرمان جاری کر کے اپنے لڑکے محمود کو باضابطہ ولی عہد سلطنت کر دیا۔ اور اس پر امرا اور علما کے دستخط کرا لیے۔ چونکہ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی زندگی زیادہ نہیں ہے اس لیے اس نے بے تحاشا شراب پینا اور غیر معتدل زندگی بسر کرنا شروع کر دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُس کا

انتقال ٹھیک ایک قمری سال بعد محمود گاواں کے قتل کے دن یعنی ۵ صفر ۸۸۶ھ (۲۷ مارچ ۱۴۸۲ء) کو قمری حساب سے انتیس سال کی کم عمری میں ہوا۔[۱۴۲]

محمد کے انتقال کے بعد سلطنت کی حالت

محمد کی حکومت دکھن کی تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ اُس نے خواجہ جہاں محمود گاواں کا انتہائی عروج دیکھا اور جب تک اس وزیر کا ملک کے نظم ونسق پر اختیار رہا بہمنی سلطنت کو خوشحالی کا وہ بلند درجہ حاصل ہوا جو اسے پہلے کبھی نہیں حاصل ہوا تھا لیکن مادر ملکہ کے انتقال کے بعد بادشاہ کی کمزور طبیعت اپنی تمام تاریکیوں کے ساتھ نمایاں ہوگئی اور اپنے سابق استاد کی شہادت پر اس کا انجام ہوا۔ یہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اس حکومت میں ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں میں توازن کی پالیسی کے تسلسل نے وزیر کے قتل سے مل کر غیر معمولی نتائج پیدا کیے۔ محمود گاواں کا جانشین نظام الملک ہوا اور اگرچہ اسے اختیارات کی اجارہ داری حاصل تھی مگر زندگی اور عزت جانے کا خطرہ ہر دم درپیش تھا اور اس نے اس کے بغیر چارہ نہ دیکھا کہ اپنے بعض پہلے کے مخالفین کو اپنے ساتھ ملائے۔ چنانچہ وہ عماد الملک ایک دکھنی اور خداوند خاں ایک حبشی اور یوسف عادل ایک آفاقی سے مل جاتا ہے اور ایک مخلوط فوج نوواردوں اور پرانے آنے والوں پر مشتمل وجے نگر کے خلاف جاتی ہے، صرف فخر الملک دکھنی یوسف عادل کے ساتھ بیجاپور جانے کو ترجیح دیتا ہے۔ دو بڑی سیاسی جماعتوں کا یہ اتحاد مرحوم وزیر کا ایک خواب تھا جس کی تعبیر وہ اپنی زندگی میں نہ دیکھ سکا۔

لیکن بدقسمتی سے سلطنت میں کوئی ایسی شخصیت نہیں رہ گئی تھی جو ان نئی قوتوں کو قابو میں رکھ سکے اور انھیں سلطنت کی بہتری اور استحکام کے تعمیری راستے پر لگا سکے اور جو بھی دور اندیش تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ سلطنت ایک خلیج کے دہانہ پر کھڑی ہے۔ یہ مشہور تھا کہ بادشاہ عیاشی اور شراب نوشی سے خود اپنی زندگی ختم کر رہا ہے اور اس کا ولی عہد ابھی اُسی عمر کا تھا جس عمر میں وہ خود تخت نشین ہوا تھا۔ خود اس کے بچپن میں سلطنت کی باگ ڈور تین طاقتور ترین شخصیتوں کے ہاتھوں میں تھی اور اب محمد کی زندگی کے آخری دنوں میں حالات یقیناً ابتری کی طرف جارہے تھے۔ باوجود اس احتیاط کے کہ اس نے اپنے وارث کو اپنی زندگی میں سب سے منوا لیا تھا کوئی شخص ایسا نہ تھا جو انتشار کی اُن قوتوں کو روک سکے جو کہ تی بڑی سلطنت سے اپنی کاربراری کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ وطن کی محبت اور وفاداری ناپید تھی

اور مرکز کی کمزوری اور طاقتور بے لگام متقابل قوتیں صرف ایک طرف لے جارہی تھیں، یعنی سلطنت کا چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو جانا۔

تشریحات

۱۔ پورا نام فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۷ میں۔ نیز سکوں پر جس کے لیے دیکھو اسپیٹ کا مضمون مذکور اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۰۱۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۲ میں ہے کہ احمد اور محمد جڑواں بھائی تھے۔ عبدالولی خاں کتاب مذکور صفحات ۱۳۵ و ۱۳۶ و ۱۳۹۔

۲۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۷ میں نو ہے اور برہان صفحہ ۱۰۷ میں دس۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۷ میں ہے کہ تخت نشین کے وقت بادشاہ پندرہ سال کا تھا مگر یہ صریحا غلط ہے۔

۳۔ بعد کو وہ قاضی القضاۃ ہوگیا تھا اور اسی لقب سے ریاض الانشا خط نمبر ۹۰ صفحہ ۲۷۲ میں خاطب کیا گیا ہے۔ شرف الدین کا نام خط نمبر ا صفحہ ۱۰۵ میں ہے۔

۴۔ برہان صفحہ ۱۰۸۔

۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۷۔

۶۔ برہان صفحہ ۱۰۹۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۲ میں ہے کہ بادشاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت ۱۰ سال کی تھی۔

۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۸

۸۔ اس اہم تقریر کے پورے مضمون کے لیے دیکھو برہان صفحہ ۱۱۱۔ اس تقریر کا مقابلہ اس تقریر سے کرو جو ہمایوں شاہ نے اپنی تخت نشینی کے وقت کی تھی۔ اوپر نواں باب۔

۹۔ اس تقریر کا خلاصہ بیان کرنے میں منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۲ میں اُسے خواجہ علاء الدین لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ نام کہیں اور نہیں ملتا۔ خطابات فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۸ میں۔ شاید اسی زمانہ میں خواجہ کے لڑکے علی کو ملک التجار کا خطاب دیا گیا تھا۔

۱۰۔ ریاض، نمبر ۶۹ صفحہ ۲۲۶ و نمبر ۹۸ صفحہ ۲۶۷۔

۱۱ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۱ -

۱۲ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۲ -

۱۳ - دیکھو اس کے آگے۔

۱۴ - دیکھو مسٹر ڈی - وی - اپٹے کی مدصول سنستھانچیا ایتہاس مطبوعہ پونہ جس میں اصل فرمان معہ اس کے دیوناگری ترجمہ کے نقل کیا گیا ہے۔ تاریخ ۸۷۶ھ (۲۳ر اکتوبر ۱۴۷۱ء) ہے۔

۱۵ - پرینڈا ریاست مہاراشٹر کے ضلع عثمان آباد میں۔ ۱۶ر ۱۸ شمال، ۹ر ۷۶ مشرق۔

۱۶ - یزدانی کی کتاب دی انٹیکوی ٹیز آف بیدر، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۷ء صفحات ۲۱۰ سے ۲۲۲۔ نیز دیکھو فرگوسن کی انڈین اینڈ ایسٹرن آرکیٹیکچر جلد دوم صفحہ ۲۷۰ - آرکیالوجیکل سروے آف ویسٹرن انڈیا جلد سوم صفحات ۴۲ سے ۴۶ -

۱۷ - رفیع الدین شیرازی کی کتاب تذکرۃ الملوک، کتب خانہ آصفیہ شعبہ تاریخ نمبر ۱۰۱۸، فولیو ۱۲ ب -

۱۸ - فرشتہ جلد اول - مدرسہ کے ایک بڑے حصہ کی بربادی کے متعلق دیکھو بشیر الدین کی واقعات مملکت بیجاپور۔

۱۹ - جامی (۱۲ر نومبر ۱۴۱۴ء سے ۹ر نومبر ۱۴۹۲ء) ایران کا ایک نہایت ہی نامور شاعر تھا۔ ریاض الانشا میں خواجہ کے اس کے نام سات خط ہیں۔ جامی کے لکھے ہوئے محمود گاواں کے نام کئی خط انشائے جامی مخطوطہ نمبر ۱۱۱۷ عثمانیہ لائبریری میں ہیں، جس میں جامی نے خواجہ کی بڑی تعریف کی ہے جس نے ہندوستان کو "خود روم کے لیے قابل رشک بنادیا ہے" اور اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ سفر کی دشواریوں کی وجہ سے وہ ہندوستان نہیں آسکتا۔ وہ کہتا ہے:

نیست در شہر شما از مہر منع راہبان — شہر بیدر راخیان در لبت بر رو دیم قضا

از گراں جانی بیایم سویت آمد ورنہ — رفع شوق از پیش لیئے دفع امداد از قضا

جلال الدین دوانی نے جو کئی کتابوں کا مصنف ہے بشمول اخلاق جلالی اپنی کتاب شواکل الحور کو جو شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب ہیاکل النور کی شرح ہے خواجہ کے نام معنون کی ہے۔ یہ کتاب آصفیہ لائبریری کے شعبہ عربی میں مخطوطہ نمبر ۲۶ ہے۔

صدر الدین رواسی کا انتقال ۲۵ر مارچ ۱۳۶۹ء کو جواین میں ہوا۔ حبیب السیر جلد سوم صفحہ ۱۰۷۔

نیز دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں صفحات ۱۰۳ و مابعد۔ عبدالجبار کی کتاب محبوب صفحہ ۱۰ جس میں شمس الدین شیرازی کی ایک کتاب تاریخ محمود شاہی کا بھی ذکر ہے۔

۲۰ - "یہ عالی شان مدرسہ بنیاد محمود کا خواجہ نے اہل صفا کے کعبہ کے طور پر بنا کیا
دیکھو اللہ تعالیٰ کی قبولیت کی نشانی کہ اس کی تاریخ قرآنی آیت ربنا تقبل منا سے نکلتی ہے"
(اے مالک میری جانب سے قبول کر)

فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۲ میں ہے کہ یہ اشعار سمیعی کے ہیں اور برہان صفحہ ۱۱۹ میں ہے کہ محمد بدر شیرازی کے۔

۲۱ - "اے نیکو کار تجھے سلامتی ہو، ہمیشہ کے لیے اس میں داخل ہو جا"

۲۲ - ایچ - گوئٹز کا مضمون انڈو مسلم آرکی ٹیکچر ان اِٹس اسلامک سٹینگ، جرنل آف دی یونیورسٹی آف بمبئی۔ جنوری ۱۹۴۰ء۔
جان مارشل نے حیدرآباد آرکیالوجیکل سوسائٹی بابتہ جولائی ۱۹۲۶ء میں لکھا ہے۔ "یہ مدرسہ مشرق کی عظیم ترین تعمیری تحقیقات میں ہے"

۲۳ - ٹراویلز آف اتھانی سیس نیکیٹن، جو میجر کی انڈیا ان دی ففٹینتھ سنچری، ہکلویت سوسائٹی لندن ۱۸۵۷ء صفحات ۸ سے ۳۰ میں شامل ہے۔ نیکیٹن کئی مہینہ بیدر میں رہا اور ایک ایرانی کی طرح رہتا تھا اور مسلمانوں کے تمام رسوم روزہ، نماز وغیرہ کا پابند تھا جس سے اُسے دارالسلطنت کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ تذکرہ فولیو ۱۳-الف میں ہے کہ بیدر کی لمبائی ۵ یا ۶ فرسخ تھی اور یہ مقامی روایت کے مطابق ہے کہ شہر ۹ میل شمال کے شہر خانپور تک پہنچ گیا تھا۔

۲۴ - میجر صفحہ ۱۲ - اس پیرا کے آخر میں نیکیٹن نے لکھا ہے کہ یہ جگہ ۴ کوس یا تقریباً ۵ ۶ میل شہر سے دُور تھی۔ شاید اس بیان میں "شہر" سے مطلب سلطنت ہے اور قرین قیاس یہ ہے کہ یہ اشارہ گلبرگہ کی طرف ہے۔

۲۵ - جیسا کہ اگلی فصل سے معلوم ہوگا وزیر کے پاس یہ سارا مال و لشکر سلطنت کی امانت کے طور پر رہتا تھا اور باوجود انتہائی عروج کے وہ اپنی ذاتی آمدنی پر بسر کرتا تھا اور ایک طبقہ اوسط کے آدمی کی طرح رہتا تھا۔

۲۶ - دیکھو ڈے کی کتاب مذکور صفحات ۱۴۹ و ۱۸۲ و ۱۸۳۔

۲۷ - ریاض - خط بنام شوکت الاسلام الماندوی - نمبر ۲۸ صفحہ ۵۷۔

۲۸ - ریاض - خط بنام شیخ داؤد الماندوی، نمبر ۸۵ صفحہ ۲۴۶۔

۲۹ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۸۔

۳۰ - فتح آباد، دولت آباد کا دوسرا نام - برہان صفحہ ۱۷۔

۳۱ - ریاض - خط نمبر ۱۲ صفحہ ۶۷ - یہاں اسیر کا مطلب پورا خاندیش ہے جس کا زبردست قلعہ اسیر گڑھ آج بھی برہان پور کے قریب ایک ممتاز سنگ میل ہے۔ برہان پور پہلے خاندیش کا دارالسلطنت تھا۔ محمود گاواں کے ماہرہ

کو گھیرے میں لینے کا گجرات سے اتحاد ایک جزو تھا، جیسے جونپور کے اولوالعزم حکمران حسین شرقی سے اتحاد۔ دیکھو ریاض خط نمبر ۲۲ صفحہ ۱۱۳ و نمبر ۲۴ صفحہ ۱۱۵۔ اسیر گڈھ ریاست مدھیہ پردیش کے ضلع نیماڑ تحصیل برہان پور میں۔ ۲۸، ۲۱ شمال، ۱۸، ۷۶ مشرق۔

۳۲۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۸۔ برہان کے صفحہ ۱۰۹ میں ہے کہ یہ مہم ۸۷۰ھ (۱۴۶۵-۶۶ء) میں ہوئی۔

۳۳۔ یہ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۸ میں ہے۔ برہان صفحہ ۱۰۹ میں ہے کہ جس شخص نے دکھن کے کمانڈر کو قتل کیا وہ قلعہ کا ہندو کمان دار (مقدم آں حصار) تھا اور ریاض (خط بنام عمید الملک نمبر ۱۶ صفحہ ۴۷) میں ہے کہ یہ کام ایک غیر مسلم کا تھا جس کے لڑکے قید خانہ کی طرف لیے جائے جا رہے تھے۔

۳۴۔ یہ برہان کے صفحہ ۱۰۹ میں ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ یہ یوسف عادل خاں تھا اور یہ اور اس کا ساتھی دریا خاں نظام الملک کے برادران دینی تھے، یعنی ایک ہی پیر کے مرید۔

۳۵۔ ریاض۔ خط بنام عمید الملک نمبر ۱۶ صفحہ ۸۷۔

۳۶۔ ایضاً خط محمد شاہ بہمنی بنام محمود شاہ خلجی، نمبر ۶، صفحہ ۲۴۷۔

شادی آباد مانڈو یا مانڈوگڑھ اب ریاست مدھیہ پردیش میں ہے۔ ۲۱، ۲۲ شمال، ۲۶، ۷۵ مشرق۔

۳۷۔ برہان صفحہ ۱۰۹۔ فرشتہ صفحہ ۳۴۸۔

۳۸۔ ریاض، خط بنام شیخ داؤد المانڈوی، نمبر ۱۹ صفحہ ۹۴، اور نمبر ۴۸ صفحہ ۲۵۶۔ نیز منتخب جلد سوم صفحات ۱۰۴ و ۱۰۵۔

۳۹۔ ریاض، خط بنام شیخ داؤد المانڈوی نمبر ۱۹ صفحہ ۹۴۔ نیز دیکھو منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔

۴۰۔ ایضاً، نمبر ۴۸ صفحہ ۱۳۰ اب۔

۴۱۔ ریاض، خط محمد شاہ بہمنی بنام محمود شاہ گجراتی نمبر ۱۸ صفحہ ۹۳۔

۴۲۔ فرشتہ نمبر ۵۸ صفحہ ۲۶۱۔

۴۳۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۹۔

۴۴۔ ریاض، خط محمد شاہ بہمنی بنام محمود شاہ خلجی، نمبر ۵۸ صفحہ ۲۶۱۔

۴۵۔ بنرجی، ہسٹری آف اڑلیسہ جلد اوّل صفحہ ۳۰۷۔ تیرو دتور کے کتبہ کے سند پر ۱۔ سے اینگر کی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری کے ساتھ پڑھنا چاہیے جسے بنرجی نے غیر معتبر کہا ہے مگر کوئی معقول دلیل نہیں دی ہے۔

۴۶۔ برہان صفحہ ۱۱۷۔ "مرحوم اوریا" کپلیشور ہی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اُس کے جانشین پرشوتم نے ۱۴۹۷ء تک حکومت کی۔ دیکھو بنرجی، جلد اوّل صفحہ ۳۰۵۔ بنرجی نے فرشتہ اور برہان دونوں کو نامعتبر قرار دیا ہے اس لیے

کہ وہ کہتا ہے کہ سلطان دور و دراز اڑیسہ کے معاملات میں دلچسپی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ صرف ۱۸ سال کا تھا اور بہت کم عمر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دلیل طفلانہ ہے اس لیے کہ ۱۸ سالہ جوان عموماً اتنا کم سن نہیں ہوتا کہ معاملات کو نہ سمجھ سکے اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ محمد کا پیشرو احمد ۱۸-۹ سال میں نہ صرف سیاسیات میں عملی حصہ لیتا ہے بلکہ میدان جنگ میں بھی۔ بنرجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ منگت رائے کا غاصبانہ قبضہ محض ایک افسانہ ہے، لیکن پھر ہمیں صفحہ ۳۲۱ میں ایک تختی کا حوالہ ملتا ہے جو کونڈاپلی کے پاس ایک کھیت میں پائی گئی جس میں پرشوتم کو ہم ویر کہا گیا ہے جس سے ہمارے فارسی مورخین کے بیان کیے ہوئے واقعہ کے ایک حصہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اینول رپورٹ آف دی اسسٹنٹ سوپروایزر فار ایپی گرافی، سدرن سرکل فار ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء صفحہ ۱۶ نمبر ۱۵۶ و ۱۰۵، پیرا ۴۲۔ اس کی مزید تصدیق ایک اڑیسہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کا بنرجی نے صفحہ ۳۲۰ میں حوالہ دیا ہے کہ پرشوتم کپلیشور کا سب سے بڑا لڑکا نہیں بلکہ منجھلا لڑکا تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ جانشینی کے لیے جنگ ہوئی ہو۔ تمام حالات کے پیش نظر میرا یہ خیال ہے کہ کپلیشور کے انتقال کے بعد اس کے منجھلے لڑکے ہم ویر نے بہمنی سلطان کی مدد لی اور پرشوتم کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے خیال میں برہان کی تاریخ ۸۷۹ھ صحیح ہے۔ مجھے سیویل اینڈ اینگر کی یہ دلیل قابل نہیں معلوم ہوتی کہ پرشوتم ۱۴۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس لیے کہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ۱۴۶۹ء میں جب رائے نے کانچی پر حملہ کیا تو وہ پرشوتم کی حکومت کا زمانہ تھا جو قرین قیاس نہیں ہے۔ دیکھو سیویل اینڈ اینگر صفحہ ۲۲۶ بحوالہ اے ای آر ۱۹۰۶-۱۹۰۵ء صفحہ ۵۶۷۔ مزید برآں بنرجی نے جلد اول صفحہ ۳۰۶ میں پوری کے جگناتھ مندر کے ایک کتبہ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۴۷۰ء کا حوالہ دیا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ پرشوتم کی تخت نشینی کے سال کو کندہ کیا گیا۔ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۳ء صفحات ۹۱ و ۹۲۔

نیز دیکھو فرور سورسز جلد اول صفحہ ۱۱۵ جس کے بموجب (ویرپکش) کی حکومت کا نمایاں ترین واقعہ اودے گیری سے اڑیا وں کا اخراج تھا۔ ابن بطوطہ صفحہ ۳۴۳ میں پرشوتم کو منگل رائے کہا گیا ہے اور ہم ویر اپر اس کی فتح کا حال لکھا ہے۔

۴۷۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۲۔

۴۸۔ برہان صفحہ ۱۱۷۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۱۔

۴۹۔ ہم ویر کے لیے دیکھو اوپر تشریح نمبر ۴۶۔

۵۰۔ کھیلنا موجودہ وشال گڈھ، اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۵۴ ر ۱۶ شمالی، ۲۷ ر ۷۳ مشرق۔

۵۱۔ فرشتہ نے صفحہ ۳۴۹ میں لکھا ہے کہ ہر سال ۳۰۰ کشتیاں بھیجی جاتی تھیں۔

۵۲۔ ریاض، خط بنام مولانا جامی، نمبر ۲۸ صفحہ ۱۵۲۔

۵۳۔ ایضاً۔ خط بنام کمال الدین رومی نمبر ۴۲ صفحہ ۱۷۳۔

۵۴۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۵۔

۵۵۔ برہان صفحہ ۱۱۳۔ ہبلی ریاست کرناٹک کے ضلع دھارواڑ میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۲۰ر۵۵ شمال، ۹ر۷۵ مشرق۔

۵۶۔ فرشتہ صفحہ ۳۴۹۔ شیروانی کا مقالہ خواجہ جہان محمود گاوانس کیمپین ان دی مہاراشٹر۔ فرسٹ انڈین ہسٹری کانگریس پونہ ۱۹۳۴ء۔

۵۷۔ برہان صفحہ ۱۱۴۔ کولھاپور، اب ریاست مہاراشٹر میں ایک ضلع کا مستقر۔ ۴۲ر۱۶ شمال، ۱۶ر۷۴ مشرق۔ کرہڈ، ریاست مہاراشٹر کے ضلع ستارا میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۱۷ر۱۷ شمال، ۱۱ر۷۴ مشرق۔ جنیر یا جنار، ضلع پونہ میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۱۲ر۱۹ شمال، ۵۳ر۷۳ مشرق۔ چاول، ریاست مہاراشٹر کے ضلع کولابہ میں علی باغ تعلقہ میں۔ ۳۴ر۱۸ شمال، ۵۵ر۷۲ مشرق۔ چاکن، ضلع پونہ کے کھیر تعلقہ میں۔ ۴۵ر۱۸ شمال، ۲۲ر۷۳ مشرق۔ وائی، ریاست مہاراشٹر میں ضلع ستارا کے ایک تعلقہ کا مستقر، ۵۷ر۱۷ شمال، ۵۴ر۷۳ مشرق۔ مان ضلع ستارا میں ایک تعلقہ کا نام، ۲۷ر۱۷ شمال اور ۳۹ر۱۷ شمال کے درمیان اور ۱۷ر۷۴ مشرق اور ۵۳ر۷۴ مشرق کے درمیان۔ اس تعلقہ کا نام دریائے مان کے نام پر ہے اور دہی والا کے درمیان ہے۔

۵۸۔ برہان صفحہ ۱۱۵۔

۵۹۔ ریاض، خط بنام "ایک بہمنی وزیر" نمبر ۸۴ صفحہ ۱۸۳۔ ریگنا۔ سابق ریاست سونت وادی میں ایک چھوٹا شہر، اب ریاست مہاراشٹر میں ہے۔

۶۰۔ ایضاً۔ خط بنام مولانا ابو سعید، نمبر ۳۰ صفحہ ۱۲۲۔

۶۱۔ ایضاً۔ خط بنام سلطان گیلان، نمبر ۳۹ صفحہ ۱۵۷۔

۶۲۔ مچال۔ ایک بلند پہاڑی، سابق ریاست رتناگیری میں، حال راجہ پور سب ڈویژن میں۔ اس کے درقلعہ وشال گڈھ کے درمیان ایک تنگ گھاٹی ہے۔

۶۳۔ ریاض۔ خط بنام سلطان محمد گیلانی، نمبر ۳۹ صفحہ ۱۵۷۔

۶۴۔ ایضاً۔ بنام سلطان گیلان، نمبر ۱۳ صفحہ ۷۰۔

۶۵۔ ایضاً۔ "ایک ذی علم دوست کے نام"، نمبر ۵۰ صفحہ ۲۳۸۔

۶۶۔ ایضاً۔ "ایک وزیر کے نام"، نمبر ۴۶ صفحہ ۱۸۰۔

۶۷۔ ایضاً۔ "صدر جہان کے نام" نمبر ۶۰ صفحہ ۲۶۲۔

۶۸۔ ایضاً۔ "ایک وزیر کے نام"، نمبر ۸۹ صفحہ ۲۶۷۔

۶۹ - ریاض - مولانا جامی کے نام، نمبر ۲۸ صفحہ ۱۵۴ -

۷۰ - ایضاً - خط محمد شاہ بہمنی بنام محمود شاہ گجراتی، نمبر ۵۱ صفحہ ۱۸۹ -

۷۱ - ایضاً - شمس الدین محمد لاری کے نام، نمبر ۷۷ صفحہ ۲۴۸ -

۷۲ - برہان صفحہ ۱۱۴ -

۷۳ - ریاض - خط بنام اسلام خاں، سفیر گجرات، نمبر ۴۹ صفحہ ۲۴۲ -

۷۴ - ایضاً - مولانا جامی کے نام، نمبر ۲۸ صفحہ ۱۵۲ -

۷۵ - ایضاً - "ایک وزیر کے نام"، نمبر ۴۶ صفحہ ۱۸۰ - ۱۴ فرسخ تقریباً ۴۴ میل کے برابر ہے - وجے نگر کا رائے ویر پکشس تھا - نیونز کرانیکلس جس کا ترجمہ سیویل نے ۱۷ فارگاٹن ایمپائر میں کیا ہے - اس کے صفحہ ۳۰۵ میں ہے کہ یہ رائے شراب نوشی اور عیاشی میں محو تھا - مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں دیکھو سیویل، بحوالہ بروز ڈیکاڈس، اول، ۸، سی ۱۰ - جس نے لکھا ہے کہ یہ قتل عام ۱۴۶۹ء میں ہوا -

۷۶ - ایضاً - سلطان گیلانی کے نام، نمبر ۳۹ صفحہ ۱۵۷ -

۷۷ - ایضاً - "ایک وزیر کے نام"، نمبر ۴۶ صفحہ ۱۸۰ -

۷۸ - ایضاً - مولانا جامی کے نام، نمبر ۴۰ صفحہ ۱۹۷ -

۷۹ - ایضاً - سلطان گیلانی کے نام، نمبر ۳۹ صفحہ ۱۵۷ - اس خط کا اور فرشتہ کا دونوں کا کشتیوں کی تعداد پر اتفاق ہے جو بھیجی گئیں -

۸۰ - ایضاً - "ایک وزیر کے نام"، نمبر ۴۶ صفحہ ۱۸۰ -

۸۱ - ایضاً - سلطان گیلان کے نام، نمبر ۳۹ صفحہ ۱۵۷ - سیویل اینڈ اینگر کا بیان ہے کہ گوا پر قبضہ ۱۴۷۰ء میں ہوا تھا لیکن میں نے حساب محمود گاواں کے خطوط سے لگایا ہے اس لیے کہ یہ عین میدان جنگ سے لکھے گئے تھے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم فروری ۱۴۷۲ء تک اس بندرگاہ پر قبضہ نہیں ہوا تھا - گوا - ۳۰ ر ۱۵ شمال، ۵۷ ر ۷۳ مشرق -

۸۲ - ریاض - خط بنام "ایک ذی علم دوست"، نمبر ۶۶ صفحہ ۲۲۳ -

۸۳ - نئے القاب یہ تھے: "حضرت مجلس الکریم، سید عظیم، صاحب السیف والقلم"

لونڈا - ریاست مہاراشٹر کے ضلع دھارواڑ میں، ۳۰ ر ۱۵ شمال، ۳۲ ر ۷۴ مشرق -

نیکیتین کی کتاب میں خواجہ کی آمد کی تاریخ کے لیے دیکھو میجر کی انڈیا ان دی ففٹینتھ سنچری صفحہ ۲۶ - ملکہ بے پردہ سامنے آگئیں - منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۶ -

۸۴ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۰ -

۸۵ - فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۲ - ویراکھیرا، ریاست مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد میں - ۵۸ ر ۱۵ اشمال، ۵۷ ر ۵ مشرق -

انتور، ضلع اورنگ آباد میں ایک قلعہ، ۲۷ ر ۲۰ شمال، ۵۵ ر ۵ مشرق -

۸۶ - پرکیت کا نام فرشتہ اور برہان دونوں میں ہے - مگر میں اس کا پورا نام یا خاندان نہ معلوم کر سکا - بنکاپور اب ریاست مہاراشٹر کے ضلع دھارواڑ میں ایک تعلقہ - ۵۵ ر ۴ اشمال، ۱۶ ر ۵ مشرق - سلطان کی روانگی کی تاریخ نیکیٹین کی کتاب مذکور میں - بلگام اب ریاست کرناٹک میں ایک ضلع کا مستقر، ۵۱ ر ۱۵ اشمال، ۳۱ ر ۴ مشرق -

۸۷ - فرشتہ صفحہ ۳۵۲ -

۸۸ - برہان صفحہ ۱۲۱ -

۸۹ - فرشتہ صفحہ ۳۵۲ -

۹۰ - یہ ذہن نشین کرنا چاہیے کہ دکھن میں بارود کے استعمال کا یہ پہلا موقعہ تھا -

۹۱ - اس واقعہ کی تفصیل برہان کے صفحہ ۱۲۱، اور فرشتہ کے صفحہ ۳۵۲ میں مختلف ہے - برہان کا بیان ہے کہ پرکیت فصیل پر نمودار ہوا، اور فرشتہ نے یہ قصہ بیان کیا ہے اور نیز یہ کہ ایک اور پرکیت بھیس بدلے ہوئے شاہی کیمپ میں آیا اور بادشاہ کے سامنے پہنچ کر اپنا بھیس اتار دیا اور اپنی پگڑی اپنی گردن میں باندھ لی -

۹۲ - یہ واقعہ کا غیر معمولی انجام ہے اور محمود گاواں نے جس رواداری پر کئی بار عمل کیا تھا اس کی ایک اور مثال ہے -

۹۳ - یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ علی ملک التجار اس مہم میں اپنے والد محمود گاواں کے ساتھ تھا اور فتح کے سلسلہ میں چند اشعار کہے تھے جو برہان نے صفحہ ۱۲۲ میں نقل کیے ہیں -

۹۴ - فرشتہ صفحہ ۳۵۳ -

۹۵ - ریاض - محمد شاہ بہمنی کا خط محمود شاہ گجراتی کے نام، نمبر ۴۳ صفحہ ۲۲۴ -

۹۶ - ایضاً - تذکرہ نے صفحہ ۱۲ میں ملکہ کی وفات کی تاریخ "ابد اللہ الملک وارثہا" لکھی ہے مگر کاتب نے ۸۶۶ھ تاریخ لکھنے میں غلطی کی - ٹھیک حساب لگانے پر اس فقرہ سے ۸۷۴ھ کی تاریخ نکلتی ہے جو بالکل بلگام کی مہم کی تاریخ کے مطابق ہے جس کے دوران میں ملکہ کی وفات ہوئی -

۹۷ میرا یہ قیاس کہ اصلاحات اسی زمانہ میں نافذ ہوئیں حسب ذیل چار وجوہ پر مبنی ہے :
(۱) بادشاہ اور وزیر کو بہت دنوں بعد یہی ایک موقعہ آرام لینے کا ملا تھا، (۲) تقریباً یہی زمانہ تھا جب کہ غیر مطمئن فریق نے محمود گاواں کے خلاف پروپگینڈا اور زیادہ سخت کر دیا اور (۳) خواجہ کی شہادت اصلاحات کے نفاذ کے

فوراً بعد ہوئی اور (۴) سلطنت کی سرحد کا وسیع پھیلاؤ سمندر سے سمندر تک۔

سرلشکر کے لفظ کا پہلے سے رواج تھا۔

۹۸۔ اوڑیا کا مطلب وہ درمیانی علاقہ ہے جس میں تلنگانہ کے مقامی سردار آباد تھے۔ دیکھو کلنگ دیس۔ اشاعت اندھرا ریسرچ ایسوسی ایشن سنہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۳۶۰۔ ایشورداس کا مقالہ وجے نگر کی کلنگ دیس کے خلاف لڑائیوں پر۔ اصلاحات فرشتہ کے صفحہ ۳۵۶۔ دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں پولیٹیکل تھاٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن، کرشنا سوامی اینگر بلوگاری نسخہ سنہ ۱۹۳۶ء صفحات ۱۲۶ و مابعد۔ ان اصلاحات نے تقریباً وہی راستہ اختیار کیا جو انگلستان کے ولیم فاتح کی اصلاحات نے اختیار کیا تھا۔ اِس لیے کہ ولیم اور محمود دونوں بڑے امرا کے اقتدار کو گھٹانا چاہتے تھے اور مرکزی حکومت کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے دونوں نے بڑی جاگیروں کو چھوٹی جاگیروں میں تقسیم کر دیا لیکن محمود نے ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا اور جاگیری فوج کے اخراجات کے لیے جاگیردار کو بادشاہ کے سامنے جوابدہ کر دیا۔

دامن، سابق پورتگالی ہند کا ایک حصہ تھا، ۲۵ر۲۳ شمال، ۵۳ر۷۲ مشرق۔

باسین اب ریاست مہاراشٹر کے ضلع تھانہ میں ایک تعلقہ کا مستقر ہے۔ ۲۰ر۱۹ شمال، ۴۹ر۷۲ مشرق۔

دریائے ہورا شاید ضلع رائچور کا بنا تھورا دریا ہے۔ ۲۰ر۱۷ شمال، ۰ر۷۷ مشرق۔

۹۹۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۵۴۔ شہزادہ اعظم کا بطور سرلشکر تقرر مصالحت کی اس پالیسی کی ایک اور شہادت ہے جو ہمیشہ محمود گاواں کے پیش نظر رہی۔ یہ یاد ہوگا کہ جلال خاں اور اس کی اولاد احمد دوم کے وقت سے برابر حکمران بہمنی سلاطین کی شدید دشمن رہی ہے۔

۱۰۰۔ دیکھو سخاوی کی کتاب ضوء اللامع لاہل قرن التاسع مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۳۵۵ھ، جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۵۔ عبدالرزاق کی مطلع السعدین جلد دوم، برٹش میوزیم اورینٹل شعبہ نمبر ۱۲۹۱۔

۱۰۱۔ ریاض، خط نمبر ۳۸ صفحہ ۱۵۳ و نمبر ۴۹ صفحہ ۲۲۷۔

۱۰۲۔ ریاض، خط بنام علی یزدی نمبر ۱۱ صفحہ ۶۲۔ علی تیمور کی تاریخ موسومہ ظفر نامہ کا مصنف تھا اور بہت ممتاز صاحب تصنیف تھا اُس کا انتقال سنہ ۱۴۵۴ء میں یزد کے قریب طفت میں ہوا اور اپنے بنائے ہوئے شرقیہ کالج میں دفن ہوا۔ خواجہ عبیداللہ احرار کے نام خطوط نمبر ۲ صفحہ ۲۳ و نمبر ۴۴ صفحہ ۱۱۷۔ یہ بڑے نامی نقش بندی بزرگ اور مولانا جامی کے پیر تھے فروری سنہ ۱۴۹۱ء میں طویل عمر پاکر فوت ہوئے۔

۱۰۳۔ محمد دوم کے نام خطوط: ریاض نمبر ۵ صفحہ ۳۷، نمبر ۵۶ صفحہ ۲۰۱، نمبر ۱۴۲ صفحہ ۳۴۱، نمبر ۱۵۳ صفحہ ۳۹۱۔ مکتوب اللہ محمد مراد دوم ہے جس کا مطلب محمد امین مراد دوم ہے جو اس عظیم فاتح کا پورا نام تھا۔ متن میں جس سفیر کا ذکر ہے وہ جلال الدین ہے اور شاید جو خط دے گیا تھا اُس کا پورا مضمون منشیات السلاطین مطبوعہ قسطنطنیہ سنہ ۱۲۶۴ھ میں ہے۔

نیز مجموعہ مخطوطات برٹش میوزیم اورینٹل شعبہ ۶۱ فولیو ۷ء میں۔

۱۰۴۔ انشائے جامی مذکور فولیو ۲۶۔ لطف علی بیگ، آتشکدۂ آذر مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۷ھ صفحہ ۴۲۔ دیکھو خواندمیر کی حبیب السیر جلد سوم صفحہ ۳۲۵۔ جس میں یہ لکھا ہے کہ سلطان حسین بیاق نے سید ناظم کو خواجہ کے لانے کے لیے بھیجا مگر محمد شاہ نے اس کی اجازت نہ دی۔

۱۰۵۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ آر۔ ڈی۔ بنرجی نے تاریخ اڑیسہ جلد اوّل صفحات ۳۰۸ و ۳۰۹ میں سارے واقعہ کا مطلب غلط نکالا۔ فارسی مورخین نے ہمیر رائے کو اڑیسہ کا رائے نہیں بلکہ اوڑیا کا رائے لکھا ہے یعنی اُس درمیانی علاقہ کا جس میں تلنگانہ کے مقامی سردار آباد تھے۔ دیکھو الیشور داس کا مقالہ مذکور صفحہ ۲۶۰۔ بھیم راج کے نام کا مطلق کوئی شخص نہ تھا۔ برگس نے فرشتہ جلد دوم صفحات ۴۹۴ و مابعد میں ہمیر رائے کا نام غلطی سے بھیم راج پڑھا ہے۔ وزیرآباد اندھرا پردیش کے ضلع نلگنڈہ میں دریائے کرشنا کے کنارے دریائے موسی و کرشنا کے سنگم پر۔ ۴۲ر۱۶ شمال، ۴ر۹۷ مشرق۔

۱۰۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۴۔ نیز دیکھو ہفت اقلیم صفحہ ۶۱۔

۱۰۷۔ محمود ۸۷۶ھ (۱۴۷۲ء) میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت اُس کی عمر بمشکل پانچ یا چھ برس کی ہوگی۔ دیکھو فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۰۔ احمد دوم، محمد سوم اور محمود کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی شہزادے بچپن ہی سے میدان جنگ میں بھیجے جاتے تھے تاکہ ان کے دل مضبوط ہو جائیں۔

۱۰۸۔ اس کی تفصیلات بہت خلط ملط ہیں۔ ہمارے فارسی مورخین نے کہیں پرشوتم کا نام نہیں لیا ہے لیکن ۵۰۰ ہاتھیوں کی موجودگی اور فوج کے شمال کی طرف کوچ کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ اڑیسہ کا گج پتی ہوگا۔ برہان نے صفحہ ۱۲۲ میں شاید غلطی سے اُسے نرسنگھ (نرسمہا سلودا) لکھا ہے لیکن بنرجی نے صفحہ ۳۱۲ میں لکھا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ سلودا نے پرشوتم سے اتحاد کیا ہو یا از خود کارروائی کی ہو۔ فرشتہ نے صرف ہمیر رائے کا نام لکھا ہے۔ کے۔ اینگر نے اپنی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری صفحہ ۷، میں بڑی حد تک برہان کی تقلید کی ہے۔

۱۰۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۴۔ دیکھو فرد رسورسز جلد اوّل صفحات ۱۳۴ و ۱۳۵۔

۱۱۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۴۔

۱۱۱۔ برہان صفحہ ۱۲۴۔ فرشتہ نے اس سلسلہ میں خاندیش کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے لیکن میں یہاں اکثر دیگر مواقع کی طرح برہان کو ترجیح دوں گا جس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتہ کا یہ خیال بظاہر خلاف قیاس ہے کہ محمد شاہ تلنگانہ کی مہم سے لے کر محمود گاواں کی شہادت تک کی پوری مدت میں دارالسلطنت سے باہر رہا ہو۔ عادل خاں نے تلنگانہ پر ۸۰۵ھ سے ۸۴۰ھ تک حکومت کی۔

۱۱۲۔ برہان صفحہ ۱۲۵۔ مشرقی ساحل پر سلوا پر نرسمہا کے اقتدار کے متعلق دیکھو سیویل اینڈ اینگر کی کتاب مذکورہ۔ یہ بغاوت سنہ ۸۰۹ھ (سنہ ۱۴۰۶ء) کی بغاوت کی طرح معلوم ہوتی ہے لیکن اگرچہ دونوں کا محل وقوع تقریباً وہی ہے مگر یہ دونوں مختلف ہیں۔ تاریخ کے اختلاف کے علاوہ دونوں کے عامل کردار مختلف ہیں اور اس مرتبہ سلطان نے بجائے شمال کی طرف کے جنوب کی طرف کوچ کیا۔ بہر نوع اس میں بہت کچھ خلط ملط معلوم ہوتا ہے۔

۱۱۳۔ برہان صفحہ ۱۲۶۔ مسند عالی کا خطاب محمد اوّل نے دولت آباد کے گورنر کے لیے شروع کیا تھا لیکن اب بظاہر یہ کسی گورنر کو دیا جا سکتا تھا۔ "الغ اعظم" کے معنی "بڑے بزرگ" ہیں۔

۱۱۴۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۳۵۴ و ۳۵۵۔

۱۱۵۔ برہان صفحہ ۱۲۶۔ سیویل اور اینگر دونوں نے غلطی سے "نول واڑہ" کو ریاست میسور کے نلور سے منطبق کیا ہے۔ دیکھو ونکٹ رام نیا کی کتاب محمد شاہ لشکری کی مہم کانچی کے خلاف۔ کے۔ اینگر کلکتہ سنہ ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۰۷۔

۱۱۶۔ کانچی یا کانجی ورم اندھرا پردیش کے ضلع چنگل پیٹ میں ایک تعلقہ کا مستقر۔ ۱۵ر۱۲ شمال، ۲۳ر۸۰ مشرق۔ روسی سیاح نیکیتین کا بیان ہے کہ محمد شاہ نے شہر وجے نگر پر قبضہ بھی کر لیا۔ انڈیا ان دی ففٹینتھ سنچری صفحہ ۱۲۹۔

۱۱۷۔ تذکرہ، فولیو ۱۳۔ الف

۱۱۸۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۷۔

۱۱۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۷۔ ہفت اقلیم صفحہ ۶۰۔

۱۲۰۔ خواجہ کی خود اپنی مہر۔ شاید اُسی کا نمونہ جو جعلی خط پر ثبت کی گئی تھی اُس کی زندگی کے متعلق مصنف کی کتاب کے صفحہ اوّل پر ایک فیصلہ کے اوپر دیا ہوا ہے۔ جعلی خط کے متن کی عبارت منتخب جلد دوم صفحہ ۱۰۱ میں ہے۔ فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۵۷ میں صرف اس کا خلاصہ دیا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے کہ اس میں راجہ سندری کی طرف بہمنی سرحد کی کمزوری کا بھی ذکر ہے۔

۱۲۱۔ یہ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۸ میں ہے لیکن برہان نے صفحہ ۱۲۹ میں لکھا ہے کہ ایک منجم نے پیش گوئی کی تھی کہ اگر اُس دن وہ شاہی محل میں گیا تو بہت برا انجام ہوگا۔ ہفت اقلیم کے صفحہ ۶۰ میں ہے کہ محمود کے ماتحت دس ہزار سپاہی تھے مگر اپنے فائدہ کے لیے اُس نے انھیں استعمال کرنے کا خیال بھی نہ کیا۔

۱۲۲۔ "اللہ برتر ہے۔ یقیناً یہ بڑا بہتان ہے"۔ قرآن۔ یہ واقعہ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۸ میں ہے جہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادشاہ نشہ میں تھا۔ برہان صفحہ ۱۳۰ میں ہے کہ وہ علیل تھا اور زنان خانہ میں قبض کی دوا لینے گیا تھا۔

۱۲۳ - آخری وقت کے پہلے کی تفصیلات میں برہان اور فرشتہ دونوں متفق ہیں لیکن سخاوی جو خواجہ کا ہمعصر تھا اور جنوری [illegible] سے یکم جنوری [illegible] تک اُس کے ساتھ رہا تھا اس سے مختلف حال لکھتا ہے۔ اس کے بیان کا خلاصہ (ضوء اللامع دہم صفحہ ۱۴۴) حسب ذیل ہے: "محمود گاواں بادشاہ کو اُس کے بچپن سے سمجھایا کرتا تھا کہ فضول خرچی نہ کرے اور کمینوں پر روپیہ اور اعزاز کی بارش نہ کرے۔ جب بادشاہ جوان ہوا تو اُسے یہ ناگوار ہونے لگا کہ اُس کی آزادیٔ عمل کو روکا جائے جیسا کہ خواجہ کر رہا تھا اور وہ اپنے استاد سے نجات حاصل کرنے کا موقعہ تلاش کر رہا تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ بادشاہ سترہ دن تک ترکھائی ملک میں رہا اور اس میں محمود گاواں کے دشمنوں کو موقعہ ملا کہ اس کے گرد رکو داغدار کر دیں۔ انھوں نے بادشاہ کے بعض مقرب وزیروں کو خواجہ کے پاس یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا کہ بادشاہ نے اپنی طویل غیر حاضری پر افسوس ظاہر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ چونکہ ترکھائی فوج شبخون مارنے کا ارادہ رکھتی ہے اس لیے اس کے خلاف احتیاطی تدابیر کی ضرورت ہے۔ خواجہ نے اس غلط انتباہ کو سچ جانا اور سمجھا کہ یہ خود بادشاہ کا پیام ہے (حالانکہ بادشاہ کو اس کا مطلق علم نہ تھا) تو اُس نے اپنی ماتحت فوج کو فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ اب مخالف پارٹی تیزی سے بادشاہ کے پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ محمود گاواں موقعہ ملتے ہی شاہی کیمپ پر چھاپہ مارنے کی تیاری کر رہا ہے اور بادشاہ سے استدعا کی کہ وہ کسی شخص کو بھیجے جو بچشم خود ان تیاریوں کو دیکھ آئے اگر بادشاہ کو ان کے بیان پر کچھ شک ہو۔ جاسوس نے خواجہ کی تیاریوں کی باضابطہ اطلاع دی۔ اب بادشاہ نے جب کہ وہ شراب میں بدمست تھا خواجہ کو طلب کیا۔ جب خواجہ وہاں پہنچا تو اُسے اس فریب کی مطلق خبر نہ تھی جو اُس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ایک شاہی غلام نے اُس پر تلوار کا وار کیا اور جب تک وہ مر نہیں گیا برابر وار کرتا رہا۔ یہ واقعہ ۶ صفر ۸۸۶ھ کو پیش آیا اور اسی دن اسعد خاں کو قتل کر دیا گیا۔ یہ خبر مجھے مکہ معظمہ میں ملی اور مجھے اور جتنے لوگ وہاں موجود تھے سب کو سخت رنج ہوا۔"

مکہ معظمہ میں جہاں سخاوی تھا جس شکل میں یہ خبر پہنچی ہو گی وہ یہی ہوگی اور ممکن ہے کہ اس واقعہ میں کچھ صداقت ہو مگر میں فرشتہ اور برہان کی روایت کو ترجیح دوں گا اس لیے کہ محمود گاواں جیسا دانشمند شخص فوجی حالات اور اپنے مخالفین کے ارادوں سے بے خبر نہ ہوگا۔ برہان صفحہ ۱۳۰ میں سخاوی کے اس بیان سے متفق ہے کہ خواجہ تلوار کی ایک ضرب سے نہیں مارا گیا بلکہ جب تک مر نہیں گیا تابڑ توڑ وار کیے گئے۔

۱۲۴ - فرشتہ اور برہان کا اس تاریخ پر اتفاق ہے مگر جیسا اوپر لکھا گیا سخاوی کا بیان ہے کہ قتل اس کے ایک دن بعد ہوا۔

۱۲۵ - خواجہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق ہر پہلو پر شیروانی کی کتاب محمود گاواں کے پہلے باب میں مفصل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس کی پیدائش ۸۱۳ھ (۱۴۱۱ء) میں ہوئی نہ کہ فرشتہ کی

بتائی ہوئی تاریخ ۸۸۶ھ (۱۴۸۱ء) ہیں۔

۱۲۶۔ کس قدر الہامی پیش گوئی یہ تھی اس لیے کہ درحقیقت سلطان کی تلوار نے اُسے شہادت کا درجہ دے دیا اور اس طرح وہ "آبِ حیوان" ثابت ہوئی۔

۱۲۷۔ فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۵۸ میں لکھا ہے کہ یہ قطعہ تاریخ سمیعی کا تھا مگر برہان نے اُسے فاضلی کی تصنیف بتایا ہے۔ خواجہ کو بیدر کے جنوب میں چند فرلانگ کے فاصلہ پر دفن کیا گیا۔ اس کی سادی سی قبر کے چاروں طرف کئی اور قبریں ہیں جو اُس کی براہِ راست اولاد کی ہوں گی لیکن کہا جاتا ہے کہ اُس سے ملی ہوئی قبر اُس کے دوست اور مورخ ملا عبدالکریم ہمدانی کی ہے۔ تذکرہ فولیو ۱۲۔ الف میں غلط لکھا ہے کہ خواجہ خود اپنے بنا کردہ مدرسہ میں دفن ہوا۔

۱۲۸۔ پورا فرمان برہان کے صفحات ۱۳۰ سے ۱۳۲ میں ہے۔

۱۲۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۹۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۱۳ میں ہے کہ سعید خاں اسی دن قتل کیا گیا جس دن خواجہ کا قتل ہوا۔

۱۳۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۹۔ لاری ایک چاندی کے سکّہ کا نام ہے جو ایران میں رائج تھا۔ یہاں یہ بظاہر چاندی کے ٹنکہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہُن تقریباً آج کل کے ۲½ روپیہ کے برابر تھا۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۱۳ میں ہے کہ اصل سرمایہ چالیس یا پچاس ہزار محمودی تھا۔

۱۳۱۔ یہ سب فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۶۰ میں ہے۔

۱۳۲۔ محمود گاواں کی شخصیت کے خاکہ کی تفصیل کے لیے دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں کا ساتواں باب۔

۱۳۳۔ یہ نظریہ مصنّف سے زبانی ہی بتایا گیا اور یہ معین شکل میں نہ ہوتا تو یہاں اس پر بحث بے سود ہوتی۔

۱۳۴۔ ریاض، خط نمبر ۱۴۵ صفحہ ۲۹۸۔

۱۳۵۔ برہان صفحہ ۱۲۹۔

۱۳۶۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۰۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۰۹۔

۱۳۷۔ ریاض، خط نمبر ۱۹۲ صفحہ ۹۴۔

۱۳۸۔ حدیث شریف پیغمبرِ اسلام، ریاض، خط نمبر ۱۴ صفحہ ۷۶۔

۱۳۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۶۰۔ پیشوا کا عہدہ شروع کے بہمنیوں میں نسبتہً چھوٹا عہدہ تھا مگر اب اس کا رتبہ بڑھا دیا گیا۔ قوام الملک کو سید علی گرامی نے تاریخ دکن میں فخر الملک غلط لکھا ہے۔ نیز دیکھو فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۶۲۔

۱۴۰۔ یہ واقعہ برہان صفحہ ۱۳۳ میں تفصیل سے ہے۔

۱۴۱۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۱۔

۱۴۲۔ یہ تاریخ برہان صفحہ ۱۳۴ میں ہے۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۱ میں یکم صفر ۸۸۷ھ ہے۔ برہان کا بیان ہے کہ اُس نے ۲۰ سال ۸ ماہ دو دن حکومت کی اور ہفت اقلیم میں ۱۹ سال ۴½ ماہ ہے۔ فرشتہ نے اسے بیس سال لکھا ہے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ وہ ۱۳ ذِلقعدہ ۸۶۷ھ کو تخت نشین ہوا اور ۵ صفر ۸۸۷ھ کو فوت ہوا۔ اِس طرح ہفت اقلیم قریب قریب صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سیویل نے اے فارگاٹن ایمپایر صفحہ ۱۰۲ میں محمد کی وفات کی تاریخ اکیس مارچ لکھی ہے لیکن یہ یقیناً غلط ہے اس لیے کہ یہ متفق علیہ ہے کہ وہ خواجہ کی شہادت کے پورے ایک ہجری سال کے بعد فوت ہوا۔

بارھواں باب

سلطنت کی حالتِ نزع

شہاب الدین محمود

۲۶ر مارچ ۱۴۸۲ء سے ۷ر دسمبر ۱۵۱۸ء

الف۔ سیاسی حالات

حکومت کی خصوصیات

شہاب الدین محمود بہمنیؒ کا طویل عہدِ حکومت جو چوتھائی صدی سے زیادہ رہا سلطنت کے تدریجی زوال کا عہد ہے اور جو شان دار عمارت شروع کے بہمنوں نے گلبرگہ میں اور بعد کو بیدر میں کئی قابل حکمرانوں اور وزیروں نے کھڑی کی تھی وہ بالآخر پارہ پارہ ہوگئی۔ مرحوم سلطان نے شاید مستقبل کا کچھ اندازہ کرکے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین محمود کو مقرر کرکے امرا اور اعلےٰ حکام کے دستخط لے لیے تھے مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بیدر میں خاص کر محمود گاواں کی شہادت کے بعد قیادت کے قطعی فقدان اور لوگوں میں وطنیت اور ذمہ داری کے احساس کی کمی سے سلطنت کے اندر تقسیم اقتدار کے جو رحجانات جڑ پکڑ رہے تھے اُن سے سلطنت پر زوال آگیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ دکھن میں اب بھی قابل افراد کی کمی نہ تھی مگر ان میں سے کسی کے دل میں بھی

سلطنت کے حقیقی مفاد کا جذبہ نہ تھا بلکہ اس کے برعکس وہ عمارت کی بنیادیں کھودنے میں لگ گئے۔ شروع میں انھوں نے سلطان پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ یہ بہت سے تھے اور ہر ایک دوسرے کا مدمقابل تھا اس لیے انھوں نے محمود شاہ کے لیے دارالسلطنت کے آس پاس چند ایکڑ زمین چھوڑ دی[2] اور خود اپنے لیے بڑی بڑی ریاستیں بنالیں لیکن جن روایات کی جڑیں گہری ہو گئی ہوں انھیں ختم کردینا آسان نہیں ہے اس لیے اُن میں سے کسی کی بھی حتیٰ کہ خود قاسم برید کی جسے سلطان پر پورا قابو حاصل تھا یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس دکھاوے کے حکمران کو تخت سے اُتار دے اور سلطان جہاں بھی جاتا اُس کا اعزاز و احترام کیا جاتا۔ یہی انوکھی صورت حال تھی جس کی وجہ سے ہم اس حکومت کے عہد میں بعض عجیب و غریب قسم کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں[3]۔

جانشینی

محمود کے لیے صرف بارہ سال کی عمر میں بادشاہ ہونا مقدر تھا۔ ایسی حالت میں دو جماعتوں میں سے ایک یعنی نوواردوں کی جماعت حکومت سے نکال باہر کر دی گئی تھی اور نئے نائب السلطان ملک نائب حسن نظام الملک بحری کی قیادت میں پرانے آنے والوں کی جماعت برسر اقتدار تھی۔ بادشاہ کو حسب معمول رسوم کے ساتھ تخت فیروزہ پر بٹھایا گیا، اس کے دونوں طرف شاہ حبیب اللہ اور سید حبیب تھے جنھوں نے کم سن بادشاہ کی سلامتی اور اقبال مندی کی دعا کی۔ اس کے بعد موجودہ امرا نے ملک نائب، بڑے قوام الملک اور قاسم برید ترک کی قیادت میں سلامی دی۔ قاسم برید اب برسر اقتدار پارٹی سے مل گیا تھا[4]۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے اُمرا اور حکام جیسے یوسف عادل خاں، دریا خاں، فتح اللہ عماد الملک اور ملو خاں ابن اکم بیگ صف شکن اس مبارک موقعہ پر موجود نہ تھے اور ان بڑے امرا کو جو اہمیت حاصل تھی اُس کی بنا پر ملک نائب نے احکام جاری کیے کہ ان کے بیدر آنے پر بادشاہ کی تخت نشینی کی رسم دوبارہ ادا کی جائے گی[5]۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے یوسف عادل کو وجے نگر کے ویر پکش کے خلاف روانہ کیا گیا تھا جس نے حکومت کا سارا انتظام اپنے وزیر سلووا نرسمہا کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ محمد سوم کے انتقال کی خبر سن کر یوسف عادل ملو خاں، دریا خاں، فخر الملک وغیرہ کے ساتھ ایک ہزار مغل اور ترک جوانوں کو لے کر تیزی کے ساتھ دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوا اس پر نظام الملک نے عادل خاں دکھنی کو فتح اللہ عماد الملک کے پاس جو اُس وقت ورنگل میں تھا بادشاہ کی طرف سے اس پیام کے ساتھ بھیجا کہ یوسف کی روک کے لیے وہ جلد سے جلد دربار میں آجائے۔ یوسف عادل جب شہر میں پہنچا تو اُس نے اپنی ہمراہ سپاہ کا بیشتر حصہ باہر چھوڑ دیا مگر

شاید مسلح مزاحمت کے اندیشہ سے دو سو پورے طور پر مسلح محافظ فوج کے دستہ کے ساتھ بادشاہ کو سلامی دینے حاضر ہوا[۵۸] ملک نائب بھی اس کے لیے تیار تھا اور اپنے ساتھ پانچ سو مسلح سپاہی لے کر قلعہ کے محل میں داخل ہوا۔ اس انوکھے جلوس کے آگے خود نظام الملک اور قاسم برید تھے جن کے پیچھے یوسف عادل اور اس کے آدمی تھے۔ جلوس تخت محل کے اندر پہنچا جہاں یوسف عادل کو نظام الملک پر فوقیت دی گئی[۵۹] جس کے بعد دریا خاں اور ملک احمد کو درجہ دیا گیا جنیر اور چاکن کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور باقی سب درجہ بدرجہ کھڑے ہوئے[۶۰]۔ یہ موقعہ نظام الملک اور یوسف عادل میں اپنی اپنی قوت کے اندازہ کرنے کا تھا مگر دونوں کے عملی تدبر کی وجہ سے سب کام امن کے ساتھ ہو گیا۔ جب بادشاہ نے سب کو خلعتیں عطا کر دیں تو یہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملائے محل سے برآمد ہوئے۔

بیدر میں ہنگامہ

یوسف عادل کا خیمہ شہر کے باہر تھا اور تخت نشینی کی رسوم کے دوسرے دن نظام الملک اس سے ملنے گیا اور اس سے استدعا کی کہ شہر کے اندر آ کر وہاں دوستوں کی طرح رہے اور ملک کے نظم و نسق میں اس کی مدد کرے۔ یوسف بڑے اخلاق سے ملا لیکن چونکہ اُسے خود اپنی قوت کا اندازہ تھا اس لیے اس نے جواب دیا کہ وہ فوجی آدمی ہے اور چونکہ ملکی حکومت اور سلطنت کے معاملات سے زیادہ واقفیت نہیں ہے اس لیے اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ روزمرہ کے معاملات نظم و نسق میں دخل نہ دے لیکن دونوں لیڈروں میں اَن بن رہی اور نظام الملک پہلے ہی سے یہ تدبیر کر رہا تھا کہ یوسف کو ہٹا کر اس کی جگہ عادل خاں دکنی کو بیجاپور کا گورنر بنائے[۶۱]۔ اس نے بادشاہ سے یہ حکم جاری کرایا کہ بادشاہ صوبہ جات کی فوجوں کا اُن کے اپنے صوبوں میں جانے سے پہلے معائنہ کرے گا۔ جس وقت وہ قلعہ کی فصیل پر بیٹھا تھا اس نے یوسف عادل اور عماد الملک کو اپنے پاس بُلایا اور کہا کہ وہ اُن کے ترکی ہمراہیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا اس لیے کہ وہ ہمیشہ آمادہ فساد رہتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ شہر کی ترکی آبادی کو فوراً ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ شہر کے پھاٹک اندر سے بند کر کے مقفل کر دیے گئے اور ترکوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اندازہ ہے کہ چار ہزار کے قریب بے رحمی سے قتل کر دیے گئے اور چند بزرگوں کے بیچ میں پڑنے سے یہ قصابی ختم ہوئی۔ یوسف عادل کو اب اچھی طرح محسوس ہو گیا کہ بیدر اس کے قیام کے لیے مناسب نہیں ہے اور نظام الملک کے ہاتھ میں اپنے اختیارات چھوڑ کر بیجاپور روانہ ہو گیا[۶۲]۔

اِس قتل عام کے بعد ایک سہ رُکنی مجلس قائم کر کے انتظام اُس کے سپرد کیا گیا جیسا محمود شاہ کے والد

کے وقت ہوا تھا۔ اب اس کے اراکین نظام الملک، فتح اللہ عماد الملک جو وزیر اور امیر جملہ ہو گیا تھا اور مادر ملکہ ہوئے۔ مادر ملکہ مجلس ولایت کی صدر حکومت کے معاملات میں مشیر ہو گئیں۔ اس مجلس کا پہلا کام یہ تھا کہ قاسم برید کو جس نے نظام الملک کو خود اپنے عزیز کو توال کے قتل میں مدد دی تھی، برید الممالک کا لقب دیا گیا اور عماد الملک کے لڑکے علاء الدین کو برار کی حکومت میں اس کا نائب کیا گیا اور چھوٹے قوام الملک کو خواجہ جہاں بنا دیا گیا۔[12]

یہ انتظام بالکل کامیابی کے ساتھ اور بلا کسی رکاوٹ کے چار سال تک چلتا رہا۔ لیکن ۱۴۸۶ء میں جب سلطان کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو اس نے غیر ذمہ دار قسمت آزماؤں کی باتوں پر کان دھرنا شروع کیا جن کی تعداد ان تغیر پذیر دنوں میں کافی رہی ہوگی اور اس نے وزیر اعظم کے خلاف سازباز شروع کر دیا۔ ان لوگوں میں ایک شخص دلاور خاں حبشی تھا جس نے بادشاہ کو ورغلایا کہ سہ رکنی مجلس اس کی پروا نہیں کرتی اور بادشاہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے دلاور کو حکم دیا کہ نظام الملک اور عماد الملک دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن یہ سازش ناکام رہی اور بادشاہ کو دونوں سے معذرت کرنی پڑی اور انھیں اجازت دے دی کہ دلاور کو فوراً قتل کر دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دلاور کسی طرح بچ کر نکل گیا اس لیے کہ تھوڑے ہی دن بعد ہم سنتے ہیں کہ اس نے قاسم برید کے خلاف سلطان کا ساتھ دیا لیکن اس واقعہ نے سہ رکنی مجلس کو ختم کر دیا، اس لیے کہ جب عماد الملک نے محسوس کیا کہ نظام الملک کی زیادہ قربت میں خطرہ ہے تو وہ خود اپنے صوبہ برار چلا گیا اور پھر کبھی واپس آ کر دارالسلطنت کی سیاست میں حصہ نہ لیا۔[13]

ملک حسن نظام الملک کا خاتمہ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بالکل جس طرح تلنگانہ کی مہم نے محمود گاواں کا خاتمہ کیا تھا اسی طرح تلنگانہ ہی کی مہم میں نظام الملک کے خلاف سازش کی تخم ریزی ہوئی جس کے انجام میں محمود گاواں کے کٹر دشمن نظام الملک کا خاتمہ ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۸۹۱ھ (۱۴۸۶ء) میں ورنگل کے گورنر عادل خاں دکھنی کا انتقال ہوا جس پر چھوٹے قوام الملک نے راجہ سندری سے روانہ ہو کر ورنگل پر بلکہ سارے تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔ نظام الملک نے اس پر فوج کشی کی اور اُسے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔[14] مگر اُس کے دشمنوں نے اُس کی عدم موجودگی کے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر طرح طرح کے قصے اس کے خلاف گھڑ لیے جن کی تصدیق قوام الملک نے بھی کی اور بادشاہ کو عرضی دے کر ملک نائب پر الزام لگائے۔ خود دارالسلطنت میں حبشی پارٹی اس سے الگ ہو گئی تھی اور حبشی لیڈر دستور دینار نے (جس کے متعلق مزید حالات عنقریب معلوم ہوں گے) اُس

کے پہلے کے دوست قاسم برید سے میل کرلیا اور بادشاہ سے حکم لکھوالیا کہ نظام الملک کو فوراً قتل کردیا جائے۔[514] نظام الملک کو جو بادشاہ کے کیمپ میں تھا اِس کا پتہ چل گیا اور وہ اپنے دوست دلپسند خاں پر بھروسہ کرکے جو بیدر کا ایک امیر تھا دارالسلطنت کی طرف بھاگا اور اپنے لڑکے کو جنیر فوری پیام بھیجا کہ وہ جلد سے جلد فوج کے ساتھ واپس آجائے اور خود جتنی دولت شاہی خزانہ سے نکال سکتا تھا نکال لی۔ بادشاہ نے صورت حال کی خبر پاکر قطب الملک دکھنی کو تلنگانہ کا گورنر مقرر کردیا اور خود بیدر کی طرف روانہ ہوگیا لیکن نظام الملک کو قدرت کے انتقام نے جالیا اور خود اس کے دوست دلپسند نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کو اُس کی واپسی پر پیش کردیا۔[515]

حالات کے اس موڑ سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور نظام الملک کے قتل کو باعث نجات سمجھا اور پھر شراب نوشی، عیاشی اور ناچ رنگ میں مشغول ہوگیا اور اپنی عیش پرستی پر بے پناہ روپیہ خرچ کرنے لگا بلکہ تخت فیروزہ کے جواہرات نکلوا کر اپنے شراب کے جام وسبو میں جڑوا دیے۔[516] معلوم ہوتا ہے کہ اب اُس کا رجحان بالکل آفاقی جماعت کی طرف ہوگیا اور اُس نے اپنی دو بہنوں کی شادی شاہ حبیب اللہ کے خاندان میں کردی۔[518]

پرانے آنے والوں کی سازش

ان سب باتوں کا ردعمل بیدر کی آبادی پر ہونا لازمی تھا خصوصاً دارالسلطنت کی فرقہ دارانہ سیاست کے لیڈر سلطان کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے رہتے تھے۔ ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) میں دکھینوں نے پھر حبشیوں سے میل کیا اور خود سلطان کو ختم کرنے کی سازش کی۔ کئی مہینہ تک سازش اندر ہی اندر پکتی رہی اور ۱۲ ذیقعدہ ۸۹۲ھ (۸ نومبر ۱۴۸۷ء) کو ایک ہجوم قلعہ کے اندر داخل ہوگیا اور پھاٹک اندر سے مقفل کردیا کہ باہر سے کوئی اندر نہ آسکے اور خصوصاً نوواردوں میں سے کوئی بادشاہ کو بچانے اندر نہ گھس آئے۔[519] بادشاہ عزیز خاں ترک، حسن علی خاں سبزواری، سید مرزا مشہدی[520] اور متعدد خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول تھا کہ آبادی کے ادنٰی ترین طبقہ کے ایک ہزار آدمی زبردستی گھس کر بادشاہ کے پاس پہنچ گئے۔ بادشاہ کے ملازمین جو بادشاہ اور مجمع کے بیچ میں آئے، انھیں فوراً قتل کردیا گیا۔ بادشاہ بھاگ کر شاہ برج چلا گیا۔ جہاں باغیوں اور نوواردوں میں کھل کر جنگ ہوئی۔ اس دوران میں ہنگامہ کی خبر شہر میں پہنچ گئی اور جہانگیر خاں، فرہاد خاں، قاسم برید، شیر خاں اُردستانی اور کشور خاں ۲۰۰۰ سپاہیوں کا دستہ لے کر دوڑ پڑے اور سب فصیل پر چڑھ کر رسیوں کے ذریعہ شاہ برج پہنچ گئے اور دست بدست لڑائی میں باغیوں کو نگینہ محل

کی طرف بھگا دیا۔[21] شہر کے اندر سخت خونریزی ہوتی رہی جس کا سلسلہ سورج نکلنے تک یعنی تقریباً چھ بجے صبح تک جاری رہا۔[22] صبح کو جب بادشاہ نے صورت حال پر قابو پالیا تو حکم دیا کہ دکھنیوں کو جہاں بھی ملیں قتل کر دیا جائے اور ان کی جائدادیں ضبط کرلی جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قتل عام تین دن تک جاری رہا۔ اور شاہ محب اللہ کے بیچ میں پڑنے سے۔ جو خود نوواردوں کی جماعت کے تھے اس کا خاتمہ ہوا۔[23]

سلطان کو اپنی جان حیرت انگیز طریقے سے بچ جانے پر بڑی خوشی ہوئی اور اس نے چالیس دن تک جشن منانے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ شاہ برج کے اوپر جو اتنا مبارک ثابت ہوا ایک اور محل تعمیر کیا جائے۔ محل میں جو شراب نوشی اور رنگ رلیوں کا دور چلا اس سے آبادی کے بعض حلقوں میں بھی بے محابا عیش منایا جانے لگا جس کے نتیجہ میں اخلاق اور روک ٹوک کی تمام بندشیں ختم ہوگئیں۔[24]

قاسم برید کی حیثیت

اُس وقت سلطنت کے مختلف گورنروں اور جاگیرداروں نے محسوس کیا کہ بیدر سخت بے حسی کی حالت میں پہنچ گیا ہے اور یہ خیال کرکے کہ سلطنت کا زوال بہت قریب ہے اپنا اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے پہلے جس نے سر اُٹھایا وہ قاسم برید الممالک تھا جس کے پاس قندھار اور اوسا کی جاگیر تھی۔ بادشاہ نے جب یہ سُنا تو دلاور خاں کو بہت بڑی فوج کے ساتھ اس کے خلاف روانہ کیا۔ برید میں اس طاقتور دلاور کے مقابلہ کی سکت نہ تھی اور اُسے بالکنڈہ کی طرف بھاگنا پڑا۔ دلاور نے تعاقب کیا اور برید بالکل شکست کے قریب پہنچ گیا تھا کہ ایک پاگل ہاتھی دلاور پر جھپٹا اور اُسے کچل کر مار ڈالا۔ اس طرح شکست فتح میں بدل گئی اور قاسم نے دارالسلطنت پر دھاوا کیا اور بادشاہ کو مجبور کیا کہ اُسے وزیر اعظم بنائے۔[25]

قاسم برید نے اب یہ کوشش کی کہ اپنے پیشرو مَلِک محمود گاواں اور نظام الملک کی طرح بادشاہ کے نام سے حکومت کرے لیکن زمانہ بدل چکا تھا اور شاید اس میں اتنی قابلیت اور سوجھ بوجھ بھی نہ تھی جس کی ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن امرا کے پاس ملک کے مختلف حصوں میں جاگیریں تھیں وہ اس کے خلاف متحد ہوگئے۔ اتحادیوں کی فوجیں قاسم برید کی فوج سے بیدر اور اودگیر کے درمیان دیونی کے مقام پر ملیں اور اسے کامل شکست دے دی اور وہ بھاگ کر اپنی جاگیر کی طرف چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ لڑائی کے دوران میں بادشاہ گھوڑے پر سے گر پڑا اور اسے اُمرا نے بڑے احترام کے ساتھ دارالسلطنت پہنچایا۔[26]

ملک احمد نظام الملک کی فتوحات

ان امرا میں ایک بہت طاقتور احمد نظام الملک تھا جو اپنے والد نظام الملک کے انتقال کے وقت

جنیر کا جاگیردار تھا۔ بعض قلعے جو اس کی جاگیر میں سمجھے جاتے تھے محمود گاواں کے وقت سے مرہٹوں کے قبضہ میں تھے[26] جنھوں نے پانچ سال یا اس کے اوپر سے اپنے مطالبات نہیں ادا کیے تھے حتیٰ کہ شیوناری کا قلعہ جو خود جنیر کی زد میں تھا اس کے حلقۂ اختیار سے باہر تھا۔ ملک احمد جیسا اولوالعزم آدمی خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا اور اس نے تمام مرہٹہ قلعوں کو، جو اس کے راستہ میں تھے بشمول سارے کونکن کے فتح کر لیا۔ نظام الملک کے قتل کی خبر اُس نے اُس وقت سنی جب وہ وندراج پوری کا محاصرہ کیے ہوئے تھا[27]۔ وہ اور آگے بڑھا اور ماہو، بیٹر اور شیوگاؤں کو بھی فتح کر لیا[28] اور گوداوری تک سارا ملک تسخیر ہو گیا[29] اور جلد ہی "ہندو مسلم، دکھنی خراسانی" سب نے "نظام الملک سے ڈرنے لگے۔ مہم کے خاتمہ پر نظام الملک بیدر آیا اور سلطان محمود نے اس کا پرتپاک استقبال کیا اور جتنے قلعے اس نے فتح کیے تھے وہ سب اُسے جاگیر میں دے دیے[31]

لیکن دربار میں جو پارٹی برسرِ اقتدار تھی وہ ان کامیابیوں سے خوش نہ ہوئی اور قاسم برید کی ایما پر بادشاہ نے یوسف عادل کو حکم دیا کہ وہ خواجہ جہاں دکھنی اور چاکن کے یوسف تلاش کے ساتھ جنیر پر چڑھائی کرے اور ملک احمد کا کام تمام کر دے لیکن اس قسم کی کارروائیاں بے سود تھیں اس لیے کہ یوسف عادل نے بجائے نظام الملک پر حملہ کرنے کے اُس کے پاس پیامبر بھیج کر اُس کے والد کے انتقال پر اظہارِ افسوس کیا اور اندور کا قلعہ بھی اُس کے لیے خالی کر دیا لیکن نظام الملک کا ایک سخت مخالف نادر الزمانی شیخ مودودی عرب تھا[32] جس نے بارہ ہزار رسالہ کے ساتھ جنیر پر حملہ کیا۔ خطرہ محسوس کر کے نظام السلطنت نے اپنے خاندان کو شیوناری کے قلعہ بھیج دیا جسے حال ہی میں اُس نے فتح کر کے ازسرِ نو تعمیر کیا تھا اور خود اپنے مستقر سے چند میل پیچھے ہٹ گیا اور ناصر الملک کو وکیل اور پیشوا مقرر کر دیا۔ پھر اس نے چکر کاٹ کر چاکن میں تلاش کو شکست دی جو اس کے امکانی دشمن زین الدین علی کا گڑھ تھا اور ناصر الملک نے شیخ مودودی سے لڑ کر اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیا لیکن یہ عرب لیڈر بے خبری میں نظام الملک کے ہاتھ آ گیا اور میدان جنگ میں اس کی گردن مار دی گئی[33]

اب احمد کا سامنا درباری جماعت سے تھا جو اب تک اُس کی سخت مخالف تھی اور جس نے سلطان کو اس کے خلاف عظمت الملک کو بہت بڑی فوج کے ساتھ روانہ کرنے پر آمادہ کیا۔ پچھلے موقعوں کی طرح اس مرتبہ بھی وہ اپنے دشمنوں سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور انھیں بچا کر قادر آباد کے گرد کے پہاڑی علاقہ کا چکر کاٹ کر سیدھے بیدر کا رُخ کیا جو شاہی فوج وہاں رہ گئی تھی اس کے لیے وہ بہت پریشان کن ثابت ہوتا۔ لیکن اُس نے اسی پر قناعت کی کہ پھاٹک کے محافظین سے سازباز کر کے اپنے اہل خاندان کو نکال لیا اور انھیں لے کر جنیر پہنچ گیا[34]۔ اِس کے بعد وہ تیزی سے پرنیدا پہنچا جہاں جہانگیر خاں کے ماتحت سلطان کی فوج سے مقابلہ

ہوا۔ جہانگیر خاں کے قریب آنے پر نظام الملک پٹن کی طرف چلا گیا اور وہاں سے خود اپنے مستقر جنیر پہنچ گیا یہ ۸۹۱ھ (۱۴۸۶ء) میں ہوا۔ اس طرح نظام الملک اپنے خاندان کے لوگوں کو بیدر میں اپنے دشمنوں کی گرفت سے نکال لانے میں کامیاب ہوگیا اور دارالسلطنت میں جو جماعت برسرِ اقتدار تھی اُس کی قطعی نااہلیت کا ایک اور ثبوت بہم پہنچا دیا۔ سلطان کی فوج عظمت الملک کی قیادت میں قادر آباد کی پہاڑیوں سے واپس آگئی اور بیٹھ میں اُس سے ملی جہاں عارضی التوائے جنگ کا ایک معاہدہ ہوگیا۔ دربار والی جماعت کو یہ بات پسند نہ آئی اور عظمت کی جگہ جہاں گیر خاں کو مقرر کیا گیا جس نے اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ وہ پٹکاپور میں ناصر الملک کے پاس تک پہنچا دیا گیا۔ ۳ رجب ۸۹۵ھ (۲۴ مئی ۱۴۹۰ء) کو نظام الملک دفعتہً جیور گھاٹ سے برآمد ہوا اور جہانگیر خاں پر ٹوٹ پڑا اور ایک باغ میں لڑ کر اُسے شکست دی اور قتل کر دیا۔ اُس نے کئی امرا کو جو بہمنی فوج کی قیادت کر رہے تھے گرفتار کر لیا اور انھیں گدھوں پر سوار کر کے ذلت کے ساتھ بیدر لے گیا۔ تھوڑے دن بعد نظام الملک نے اس باغ کا دیوار سے احاطہ کر دیا اور ایک خوبصورت محل تعمیر کر کے اُسے اپنا دارالسلطنت بنایا اور اپنے نام پر احمد نگر نام رکھا۔[35]

قاسم برید بہ حیثیت وزیر اعظم

دارالسلطنت میں قاسم برید محض کاہل بیٹھ کر دوسروں کو اپنی اپنی ریاست بنانے کا تماشا نہیں دیکھ رہا تھا۔ ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اُس نے خود کو سلطنت کا وکیل یا وزیر اعظم بنوالیا اور سلطان نے اسے قندھار، اوسا، اودگیر اور کلیانی جاگیریں دے دیا لیکن جو کچھ اُسے ملا اس پر وہ قانع نہیں ہوا بلکہ سلطان کے احکام کے برخلاف اس نے اپنی طبیعت سے دوسرے قلعوں کو بھی فتح کرنا شروع کیا۔ سلطان کی بےبسی کا یہ حال تھا کہ دلاور خاں حبشی نے برہان پور سے آکر قاسم کو گولکنڈہ کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا۔ دلاور کی حرص لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی اور اگر کولاس میں اُسے ایک پاگل ہاتھی نے نہ مار ڈالا ہوتا تو اُس نے اپنے لیے ایک ریاست بنالی ہوتی۔ اب قاسم فاتحانہ بیدر میں داخل ہوا اور بادشاہ سے اپنے آپ کو دوبارہ وزیر اعظم مقرر کرالیا۔[36]

اس کے حوصلوں کی اب کوئی حد نہ رہی اس لیے کہ وہ کسی کو قوت یا اعزاز میں اپنا ہم پلہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور اُس نے وہ کام کیا جو دکھن کا بدتر سے بدتر دشمن بھی نہیں کر سکتا تھا یعنی اُس نے وجے نگر کے رائے کو دعوت دی کہ وہ رائچور اور مدگل کے عزیز ترین شہروں پر قبضہ کرلے۔[37] رائے تماد یو نابالغ تھا اور زیر نرسانایک نے یوسف عادل کے خلاف ایک طاقتور فوج بھیجی اور دونوں شہروں پر قبضہ کر کے یوسف عادل

کو یہ نقصان قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ یوسف عادل نے اب قاسم برید پر چڑھائی کی جس نے گوا، کوکن، پنہالا اور کلہار جو بہادر گیلانی کے پاس تھے نظام الملک کو پیش کر کے اس کی مدد حاصل کر لی۔ لڑائی بیدر سے پانچ کروہ کے فاصلہ پر ہوئی۔ قاسم برید اور سلطان فخر الملک دکھنی اور نظام الملک کے ساتھ میمنہ اور میسرہ پر رہے اور قاسم برید کے لڑکے کو محفوظ دستہ میں رکھا اور ان کے مقابلہ میں یوسف عادل قلب میں تھا اور دریا خاں اور فخر الملک ترک اس کے داہنے اور بائیں۔ قاسم کی کمزوری پھر ظاہر ہو گئی اور دن کے آخر میں اُسے کامل شکست ہو گئی اور سلطان کو دار السلطنت کی طرف بھاگنا پڑا اور یوسف عادل بہادر گیلانی سے مصالحت کر کے بیجاپور واپس چلا گیا لیکن اس سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور جلد ہی اُس نے دریجے نگر والوں پر حملہ کر دیا جو دوآبہ میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ یکم رجب سنہ ۸۹۹ھ (۱۰ اپریل ۱۴۹۴ء) کو ایک سخت لڑائی کے بعد رائچور اور مدگل پر قبضہ کر لیا۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں شہر اُس نے بہمنی سلطان کے لیے حاصل کیے ہوں اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوسف عادل نے قیمتی تحائف بشمول زربفت کی پوشاک، چار گھوڑے، سونے کی نعل اور زرکار زین کے سلطان کو بیدر بھیجے۔

بہادر گیلانی کی بغاوت

جس وقت یہ سب ہو رہا تھا ایک بے اصول اور نڈر شخص مغربی ساحل پر اپنی ریاست بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خواجہ محمود گاواں نے گوا کو کشور خاں کے نائب کی حیثیت سے جو خواجہ کی طرف سے بیجاپور میں مامور تھا اپنے دوست نظام الدین گیلانی کے قبضہ میں دے دیا تھا۔ سنہ ۸۹۶ھ (۱۴۹۱ء) میں نظام الدین کے انتقال پر گوا کے کوتوال بہادر گیلانی نے سارے ساحلی علاقہ پر دابول تک قبضہ کر لیا تھا اور اس وقت کی ریاست مہاراشٹر کے کولہاپور، کلہار، پنہالا، بلگام، مراج اور دوسرے شہروں پر قابض تھا۔ اُس نے چال تک کے علاقہ تک تاخت شروع کر دی تھی اور اپنے ایک افسر یاقوت حبشی کو ۲۰۰ جنگی جہازوں کے ساتھ دور و دراز مہایم پر (جو شہاب الدین احمد اول کے وقت سے گجرات کے قبضہ میں تھا) بھیج دیا۔

گجرات کے محمود شاہ بیقرہ نے یہ سن کر بہادر کے خلاف ملک سارنگ خاں قوام الملک کے ماتحت ایک فوج روانہ کی۔ قوام الملک، گاسی اور باسین تک پہنچا لیکن اسے یہیں رک جانے کا حکم دیا گیا اس لیے کہ آگے بغیر دکھن کے علاقہ میں داخل ہوئے نہیں بڑھا جا سکتا تھا جس کا گجرات کا حکمران وفاداری کے ساتھ احترام کرتا تھا۔ یہ قسمت کی عجیب چال تھی کہ جس بادشاہ نے چند سال پہلے دکھن کو مالوہ کے محمود خلجی کی گرفت سے بچایا تھا اب اُس پر اُسی دکھن کا ایک امیر حملہ کرے۔ گجرات کے حکمران کی یہ اعلیٰ شرافت تھی کہ اُس نے سنہ ۸۹۹ھ

(۱۴۹۳ء) میں ہاشم تبریزی کو بطور سفیر بیدر روانہ کرکے اس شکایت پر قناعت کی کہ بہمنی سلطنت کے ایک امیر نے گجرات کے ساحل پر تاخت و تاراج کی اور مال تجارت سے لدے ہوئے ۲۴ گجراتی جہازوں کو تباہ کر دیا۔[44] سفیر نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ بہادر کے خلاف سمندر کے راستہ سے بہت بڑی فوج بھیجنا ممکن نہ تھا تاہم خشکی کے راستہ سے فوج بھیجنا اس لیے مناسب نہ سمجھا گیا کہ بیچ میں دکھن کا علاقہ پڑتا تھا۔ سفیر نے دونوں سلطنتوں کے قدیم تعلقات کا حوالہ دیا اور محمود شاہ بہمنی سے استدعا کی کہ وہ اپنے باغی امیر کا تدارک کرے۔[45]

اب بہمنی سلطان نے بہادر کے خلاف مدد کے لیے عبدالملک شوستری کو یوسف عادل کے پاس بھیجا۔ جس نے اس کی تعمیل کی اور کمال خاں دکھنی کو بہادر کے تعاقب میں روانہ کیا جو جام کھنڈی کو خالی کرکے بلگام چلا گیا تھا۔ یوسف عادل نے تین ماہ کے محاصرہ کے بعد بلگام پر بھی قبضہ کر لیا۔[46] سلطان نے بہادر کے خلاف مدد کے لیے اپنے تمام طرف داروں سے اپیل کی جس کی تعمیل میں نظام الملک اور عماد الملک دونوں نے سلطان کی مدد کے لیے بھاری فوجیں بھیجیں۔ سلطان خود بھی بیدر سے بیجاپور کے لیے روانہ ہوا اور یوسف عادل نے اُس کا شاہانہ استقبال کیا اور رنگین محل کے عالی شان قلعہ میں ٹھہرایا جسے اُس نے حال ہی میں از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ میزبان نے سلطان کو بہت سے قیمتی تحفے بھی دیے۔ جو اُس نے ایک ہاتھی کے سوا سب یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ سردست وہ انھیں اپنے ہی پاس رکھے ورنہ قاسم برید جسے دار السلطنت پر پورا قابو حاصل ہے ان پر قبضہ کر لے گا۔[47]
اسی کے ساتھ سلطان نے بہادر کو اعلان جنگ دیا کہ وہ فوراً ہتھیار ڈال دے اور کمال خاں اور صفدر خاں کو جنھیں اُس نے قید کر رکھا ہے۔ نیز گجرات کے اُن جہازوں کو جو اُس کے قبضہ میں ہیں فوراً واپس کر دے۔ جب اس اعلانِ جنگ کا جواب نہ آیا تو سلطان نے تلنگانہ کے گورنر قطب الملک دکھنی کو طلب کیا اور اُسے حکم دیا کہ بہادر کے خلاف فوجوں کے ساتھ ہو جائے۔ قطب الملک میدانِ جنگ میں مارا گیا اور سلطان نے یہ سُن کر قطب الملک کا خطاب سلطان قلی ہمدانی کو دے دیا جو پہلے خواص خاں کے خطاب سے سرفراز ہو چکا تھا اور اُسے کولکار، کوبگی اور تلنگانہ کے چند اور گاؤں جاگیر میں دیے۔[48] نئے قطب الملک کی کمان میں شاہی فوج نے بہادر گیلانی کے خلاف کئی فتوحات حاصل کیں۔ مان کھیر پر سلطان نے خود تین دن کے محاصرہ کے بعد قبضہ کر لیا۔[49]
۲ر رجب ۸۹۸ھ (مئی ۱۴۹۳ء) کو خواجہ نعمت اللہ تبریزی مبارک آباد میراج آئے جہاں سلطان خیمہ زن تھا۔ اور بہادر کی طرف سے ہتھیار ڈال دینے کی آمادگی کا پیام لائے۔[50] سلطان نے اس دن کو بہت مبارک خیال کیا اس لیے کہ اسی دن ملکہ کے بطن سے جو سلطان کے ساتھ تھی لڑکا پیدا ہوا اور بڑے جشن کے ساتھ اُس کے سر پر فوراً تاج رکھ دیا گیا۔ سلطان کو اتنی خوشی ہوئی کہ اُس نے بہادر کو پیام بھیجا کہ اگر وہ صرف دو ہاتھی لے کر حاضر ہو جائے تو جتنے قلعے اور شہر اُس نے فتح کیے ہیں وہ سب اُسے دے دیے جائیں۔ یہ بہادر کی توقعات سے بہت

زیادہ تھا اور اُس نے خیال کیا کہ اتنے فیاضانہ شرائط کا سبب محض سلطان کے کیمپ کی کوئی کمزوری ہو سکتی ہے چنانچہ اُس نے اطاعت شعاری کے سارے خیالات اپنے ذہن سے نکال دیے۔ سلطان نے میراج سے آگے بڑھ کر کلہار پر قبضہ کر لیا اور دابل میں بہادر کے منتظم کو سلامی دینے پر مجبور کر دیا۔ بہادر نے پہلے پنہالا میں پناہ لی جو اُس جوار میں سب سے زیادہ مضبوط قلعہ تھا مگر جب اُس نے سنا کہ سلطان کا رُخ کولہاپور کی طرف ہے تو باہر نکل آیا۔ کولہاپور پہنچ کر سلطان نے فخر الملک دکھنی اور عین الملک کنعانی کو حکم دیا کہ بہادر کا راستہ پنہالا کی طرف پسپائی کا کاٹ دیں۔

اب بہادر بے بس ہو گیا اور نعمت اللہ تبریزی اور خواجہ مجد الدین کو پھر سلطان کے پاس یہ پیام دے کر بھیجا کہ اگر وہ قاسم برید کے دستخط کے ساتھ یہ فرمان بھیج دے کہ اگر وہ سلامی دینے حاضر ہو تو اُس کی جان بخشی کی جائے گی۔[۵۱] سلطان نے پھر فیاضی کا اظہار کیا اور اُسے معاف کر دیا مگر یہ مطالبہ کیا کہ گجرات کی سلطنت سے جتنا مال اُس نے لوٹا ہے وہ سب واپس کرے۔ بہادر کو یہ بالکل منظور نہ تھا اور اُس نے اپنے ہتھیار ڈالنے کی یہ شرط پیش کی کہ سلطان میراج کی طرف واپس جائے اور فخر الملک پنہالا خالی کر دے۔ اب سلطان کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پھر یہ حکم دے کہ بہادر کو پنہالا نہ پہنچنے دیا جائے اور اس کام پر قطب الملک کو معین کیا۔ بہادر نے ۲۰۰۰ گیلانی، مازندرانی، عراقی اور خراسانی رسالہ اور ۱۵۰۰ پیادہ فوج لے کر قطب الملک کا مقابلہ کیا مگر لڑائی میں اُس کے ایک تیر لگا جس سے وہ مر گیا۔ یہ ۵ صفر ۹۰۰ھ (۵ نومبر ۱۴۹۴ء) کو واقعہ ہوا۔[۵۲]

اِس عظیم فتح کی خبر سُن کر سلطان نے پنہالا کا رُخ کیا اور اُس پر بلا کسی خونریزی کے قبضہ کر لیا۔ بہادر کی جاگیر سلطان نے کچھ عین الملک کنعانی کو دی اور کچھ نظام الملک کو اور باقی دوسرے امرا میں تقسیم کر دی اور فوج کو بیجاپور بھیج کر خود مصطفےٰ آباد دابول چلا گیا۔ دابول سے وہ بیجاپور گیا اور کالا باغ میں تھوڑا قیام کر کے دار السلطنت واپس آ گیا جہاں اُس کی واپسی پر بڑا جشن منایا گیا۔ اس طویل مہم کے بعد سلطان نے گجرات کے سلطان محمود کو "شان دار تحائف، سونے چاندی کی کرسیاں، منول موتی، پانچ ہاتھی اور ایک مرصع خنجر" روانہ کیے اور حکم دیا کہ بہادر کے غرق کیے ہوئے جہازوں کے بدلے میں اُس کے بحری کمان داروں کو بیس جہاز حوالے کیے جائیں۔

خود مختاری کی مزید کوششیں

حصول اقتدار کی دو اور کوششیں ہوئیں اور دونوں میں ملک احمد جو اب تک کسی قدر گمنام تھا منظر پر آ گیا۔ پہلی کوشش ایک شخص مسمی ملک اشرف کی تھی جس نے دولت آباد کے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا اور

حکم دیا کہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی مسجد میں جہاں ۰ ۱۵ سال پیشتر بہمنی سلطنت کے قائم ہونے کا اعلان ہوا تھا ہر جمعہ کے خطبہ میں سلطان محمود بیقرو کا نام لیا جائے لیکن وہ نظام الملک کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی زندہ نہ رہا جو اُس کے خلاف روانہ ہو چکا تھا اور اُس کے انتقال پر پھر دولت آباد پر بآسانی قبضہ ہو گیا۔[۵۳]

دوسرا مدعی دستور دینار حبشی اس سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ اُسے قطب الملک کے لیے تلنگانہ کی حکومت حوالہ کرنے کے عوض میں گلبرگہ، ساگر، الند اور گنگا وتی کی جاگیر دی گئی تھی اور اس موقعہ کو اس نے غنیمت سمجھا کہ دوسروں کی طرح اپنی آزادی کا بھی اعلان کر دے اور ۹۰۱ھ (۱۴۹۶ء) میں اُس نے نظام الملک سے اتحاد کیا اور کئی مقامات سے شاہی حکام کو نکال باہر کیا۔[۵۴] سلطان نے یوسف عادل کو پیام بھیجا کہ وہ اس معاملہ میں مدد کرے اور خود اُس سے ملنے کے لیے مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ دونوں فوجیں مہندری میں دوچار ہوئیں۔ سلطان کے میمنہ پر یوسف عادل اور فخر الملک اور میسرہ پر قطب الملک، قدم خاں اور جہانگیر خاں تھے۔ دستور کو شکست ہوئی اور اُس کی گردن زدنی کا حکم دیا گیا لیکن آخر میں معاف کر دیا گیا اور گلبرگہ اور الند پھر اُسے جاگیر میں دے دیے گئے۔[۵۵]

ولی عہد کی منگنی

ابھی بہت کچھ اور ہونا تھا۔ ۹۰۳ھ (۱۴۹۷ء) کے ابتدائی مہینوں میں کمسن شہزادہ احمد کی منگنی یوسف عادل کی لڑکی بی بی ستی سے گلبرگہ میں انجام پائی۔ اس رسم کو قاضی عسکر قاضی عبدالسمیع نے انجام دیا اور اگرچہ قاسم برید کو یہ رشتہ پسند نہ تھا مگر اُس نے اور فخر الملک دکھنی دونوں نے آکر سلامی دی چونکہ دولھا صرف چار سال کا تھا اور دلھن صرف تین سال کی اس لیے رخصتی چھ سال بعد کے لیے ملتوی رکھی گئی۔ اس مبارک موقعہ کی خوشی پر ایک واقعہ سے پانی پھر گیا جو سلطنت کی مستقل خانہ جنگی کی صورت کا تھا۔ اس مرتبہ اس کی شکل یہ ہوئی کہ یوسف عادل نے گلبرگہ، الند، گنگاوتی اور کلیانی پر قبضہ کا مطالبہ کیا تاکہ اُس کی سلطنت اُس کے شاہی عزیز سلطان سے متصل ہو جائے۔ بادشاہ کو قدرتاً اس معاملہ میں کچھ کہنے کی قدرت نہ تھی اور عین اُس وقت جب کہ منگنی کی رسوم ادا ہو رہی تھیں یوسف عادل اور قطب الملک ہمدانی دستور دینار سے جنگ میں مصروف تھے جس نے قاسم برید اور فخر الملک سے اتحاد کر لیا تھا۔ یوسف عادل فتحیاب ہوا اور اس فتح سے اُس کا درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ سلطان اُس کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا تھا لیکن جب یوسف کا پیچھا چھوٹا تو قاسم برید پھر مقرب ہو گیا اور ایک بار پھر وزیر اعظم کے عہدہ پر مستقل ہو گیا۔[۵۶]

لیکن یوسف عادل دستور دینار کو چین سے نہیں بیٹھنے دینا چاہتا تھا اور اگلے سال سنہ ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) کے شروع ہی میں فوج لے کر گلبرگہ پر چڑھائی کر دی اور دینار کو بھاگ کر نظام الملک کی پناہ لینا پڑی۔ اب وہ سیدھا بیدر گیا اور سلطان سے شکایت کی کہ نظام الملک باغی کی مدد کر رہا ہے جس کے جواب میں نظام الملک نے بادشاہ سے التجا کی کہ وہ دستور دینار کی راہ میں حایل نہ ہو جو مدتوں سے گلبرگہ کا جاگیردار ہے۔ بادشاہ کے اصرار پر یوسف عادل دستور دینار کے خلاف مزید کارروائی کرنے سے رُک گیا۔[۵۸]

قطب الملک

اُوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان قلی ہمدانی کو خواص خاں کے اعزاز پر ترقی ملی تھی اور خواص خاں سے ترقی کر کے وہ قطب الملک اور تلنگانہ کا جاگیردار ہو گیا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ پچھلے چند موقعوں پر اس نے جو اپنی فوجی صلاحیت کا اظہار کیا تھا اُس سے سلطان بہت متاثر ہوا تھا اور ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں اُسے تلنگانہ کے دوسرے جاگیرداروں جیسے جہاں گیر خاں، سنجر خاں، قوام الملک وغیرہ سے آگے بڑھا دیا گیا۔ سلطان نے اُسے امیر الامرا کا بھی اعزاز دیا اور شاید قاسم برید کے رشک کو تسلی دینے کے لیے اُس کی جاگیر میں بھی اوسا اور قندھار دے کر اضافہ کر دیا گیا۔[۵۹]

لیکن قاسم برید نے دار السلطنت میں کئی دشمن بنا لیے تھے۔ جو اُس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ بادشاہ کے اقتدار کے خلاف بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے۔ بادشاہ نے قطب الملک اور یوسف عادل کو اپنی مدد پر بُلایا اور ذی الحجہ ۹۰۳ھ (جولائی ۱۴۹۸ء) کے آخر میں تینوں نے مل کر قاسم کی جاگیر کے شہر اوسا کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ اگلے مہینہ تک جاری رہا جب کہ ایک واقعہ جو سلطنت میں عام ہو گیا تھا ظہور پذیر ہوا یعنی بادشاہ کی فوج کی بڑی تعداد فریقِ مخالف سے جا ملی۔ قطب الملک اور یوسف عادل اپنے اپنے صوبوں کو چلے گئے اور قاسم برید نے بادشاہ کو سلامی دی اور دونوں شاہی اہتمام کے ساتھ دار السلطنت واپس ہوئے بعد کو یوسف عادل، نظام الملک اور دستور دینار کا آپس میں طے ہوا کہ تینوں کو بادشاہ سے الگ ہو جانا چاہیے اور صرف ہر سال تخت کو سلامی دینے آ جانا چاہیے۔[۶۰]

مشرقی ساحل اور وجے نگر

محمود کی تخت نشینی کے جلد ہی بعد یعنی ۱۴۸۵ء میں وجے نگر کے طاقتور وزیر سلووا نرسمہا خود تخت نشین

ہو گیا۔ اولوالعزم ہونے کے علاوہ وہ کئی سال تک وجے نگر کا وزیر رہ چکا تھا اور ہمسایہ سلطنتوں کی کمزوری سے خوب واقف تھا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ محمد سوم نے جنوب میں کانچی کے علاقہ تک دھاوا کیا تھا اور اُس نے کانچی کے سارے سرحدی علاقہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا ہو گا۔ اب چونکہ بہمنی سلطنت زوال پذیر تھی سلووا نے خیال کیا کہ ضرب لگانے کا اچھا موقعہ ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے جنرل ایشور نایک اور اُس کے لڑکے نرسا نایک کو حکم دیا کہ کنڈکور کے بہمنی کیمپ پر حملہ کریں اور وہاں انھوں نے بہمنی فوج کو کامل شکست دے دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس فتح سے مغرور ہو کر وجے نگر کی فوجیں گج پتیوں کے علاقہ تک بڑھتی چلی گئیں مگر راستہ میں کہیں بہمنیوں کی فوجوں کی مزاحمت سے سابقہ نہ پڑا تھا۔[56]

اس حملہ کا انجام خواہ کچھ بھی ہوا ہو مگر وجے نگر کا اقتدار مشرقی ساحلی علاقہ پر مستقل نہ رہا ہو گا اِس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ "محمد کے انتقال کے چھ سال کے اندر ہی" یعنی ۱۴۸۴ء میں اڑیسہ کے پرشوتم سوم نے سارے گوداوری کرشنا دوآبہ کو روند ڈالا اور بہمنی فوجوں کو کونڈا ویڈو اور دے گیری تک پیچھے دھکیل دیا" چنانچہ" اپنی حکومت کے آخری دنوں میں پرشوتم بلا شرکت غیرے پورے دوآبہ پر بیجواڑہ تک قابض تھا" معلوم ہوتا ہے کہ وجے نگر کی فوجوں سے اکثر اُس کی جھڑپیں ہوتی رہیں اور وہ بہت سا مالِ غنیمت سمیٹ کر اپنے ملک کو لے گیا۔[57]

لیکن ۹۰۱ھ (۹۶-۱۴۹۵ء) میں قطب الملک کے تلنگانہ کے گورنر مقرر ہونے پر حالات نے پلٹا کھایا اس لیے کہ اُس نے ورنگل، راج کنڈہ، دیورکنڈہ اور کویل کنڈہ پر دوبارہ پورے طور پر قبضہ کر کے بہمنیوں کے اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ ۱۵۰۴ء میں ایک مقامی رئیس کھمامیٹ کے سیتاپت عرف شتاب خاں نے ورنگل پر قبضہ کر لیا اور اڑیسہ کے راجہ رام چندر سے اتحاد کر لیا۔ قطب الملک نے اب ورنگل پر حملہ کیا اور متحدہ فوجوں کو شکست دے دی اور اڑیسہ کے راجہ کو مجبور کیا کہ بہمنی سلطنت اور اڑیسہ کے درمیانی سرحد گوداوری کو قرار دیا جائے اور ایلور اور بیجواڑہ کم از کم کچھ دنوں تک قطب الملک کے پاس رہنے دیے جائیں۔

وجے نگر میں ایک کمزور حکومت چلتی رہی اور اگرچہ بہمنی سلطنت خود نہایت برے طریقہ کے خلفشار میں مبتلا رہی لیکن سلطنت کی جنوبی سرحد پر امن رہا بجز قاسم برید کے ایما پر ایک حملہ کے جس میں رائچور اور مدگل جنوبی حکومت کے قبضہ میں چلے گئے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رائچور پر حکومت میں کئی مرتبہ ادل بدل ہوئی، کبھی وہ بیجاپور کے قبضہ میں چلا گیا اور کبھی وجے نگر کے قبضہ میں۔ ان حالات میں قدرتاً جو خراج وجے نگر نے بہمنی حکومت کو دینا منظور کیا تھا وہ ادا نہیں ہوا۔ ۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) کے شروع میں

بظاہر بڑے جاگیرداروں کی سرگرمیوں میں کچھ سکون رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان ۵۰۰۰ رسالہ اور ۶۰۰۰ پیادہ وسپاہ لے کر رائچور اور مدگل کو پھر سے فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ ارکی میں قطب الملک اُس سے مل گیا اور انگور میں یوسف عادل ۵۰۰۰ ترکی رسالہ اور ۶۰۰۰ پیادہ اور ۵۰ ہاتھیوں کے ساتھ بھی آگیا مزید برآں عین الملک کو حکم دیا گیا کہ کلہار اور کولہاپور کے راستہ سے چکر کاٹ کر ۵۰۰۰ رسالہ اور ۵۰۰۰ پیادہ فوج اور ۸۰ ہاتھیوں کے ساتھ وجے نگر کی طرف بڑھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگی چال جنوب کی سلطنت کو خائف کرنے کے لیے کافی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وجے نگر نے بقایا خراج پیش کر دیا جسے سلطان نے قبول کر لیا اور رائچور اور مدگل یوسف عادل کو واپس کر دیے گئے۔[۶۳]

کچھ دنوں تک حالات پُرسکون رہے یہاں تک کہ ۱۵۰۹ء میں کرشن دیورائے وجے نگر میں تخت نشین ہوا اور چاروں طرف حملے شروع کر دیے اور ایک زبردست مہم میں رائچور اور مدگل یوسف عادل کے لڑکے اسماعیل عادل سے چھین لیے۔ اڑیسہ کے گج پتی نے مشرقی ساحل کے شہروں سے بہمنیوں کو نکال باہر کیا اور اب اڑیسہ کی باری تھی کہ کرشن دیورائے کے ہاتھوں شکست پائے جس نے ۱۵۱۳ء میں اودے گیری اور ۲۳ جون ۱۵۱۵ء کو کونڈاویڈو پر قبضہ کر لیا جس کے بعد وجے نگر نے دیوکنڈہ، امراوتی، راجہ سندری، کونڈاپلی حتیٰ کہ نلگنڈہ اور کھمامیٹ تک فتح کر لیا اور اس طرح بہمنیوں اور گج پتیوں کو پورے طور پر دکھن کے مشرقی ساحل سے نکال باہر کیا۔ بالآخر ۱۵۱۶ء میں اڑیسہ نے کرشن دیورائے سے مصالحت کر لی کہ جس کے پاس جو ہے وہ رہے۔[۶۴]

رائچور کے دوآبہ کو پھر سے فتح کرنے کی بہمنیوں نے ایک اور کوشش کی اور برہان مآثر میں ایک مبہم سی عبارت صفحہ ۱۴۶ پر ہے کہ صفر ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں ان کی متحدہ فوجوں نے بظاہر "بقایا" "خراج" وصول کرنے کے لیے وجے نگر پر چڑھائی کی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ متحدہ کوشش کارگر نہ ہوئی اس لیے کہ لڑائی میں خود سلطان زخمی ہو گیا اور اسے شاہ محب اللہ کے لڑکے مرزا لطف اللہ کے خیمہ میں پہنچایا گیا جس کے بعد بہمنی فوج بیدر کو واپس ہو گئی۔[۶۵]

قاسم برید کا خاتمہ

خالص تاریخی نقطۂ نظر سے قصّہ ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گیا اور اب ہم پھر ملکی معاملات سے سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) کی مہم کے دوران میں شاید دارالسلطنت کی مسلسل سازشوں کی وجہ سے قاسم برید درجہ سے اتار دیا گیا اور وزارت کی خدمت خان جہان کو سپرد کی

گئی۔ جب مہم ختم ہوئی اور بہمنی فوجوں کا بیشتر حصہ برطرف کر دیا گیا تو قاسم برید نے کسی طرح موقعہ پاکر وزیر اعظم کو قتل کر دیا اور سلطان کو مجبور کیا کہ اسے پھر حکومت کی سربراہی پر مقرر کرے۔ اس پر دوسرے بڑے جاگیردار سخت برہم ہوئے اور یوسف عادل، قطب الملک اور دستور الممالک مل کر قاسم برید کے ہاتھوں سے اقتدار نکالنے کے لیے دارالسلطنت پر بڑھے۔ قاسم برید نے بادشاہ کو محل سے نکالا کہ جو لوگ اُسے غیر قانونی گرفت سے نجات دلانے آئے تھے ان کے خلاف جنگ کرے مگر شکست کھاکر بھاگ کھڑا ہوا۔ بادشاہ تنہا رہ گیا اور فاتح افواج کے لیڈروں نے اُسے سلامی دی اور اپنے اپنے صوبوں کو واپس چلے گئے۔

سنہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) اور سنہ ۹۱۰ھ (۱۵۰۵ء) میں ایک مرتبہ پھر جو لوگ حصول اقتدار کی جدوجہد کر رہے تھے اُن میں ادل بدل ہوئی۔ سنہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں ولی عہد کی دلہن بی بی ستی دختر یوسف عادل کی گلبرگہ میں شادی کی دوبارہ تقریب ہوئی اور جس وقت سلطان تندور میں مقیم تھا قاسم برید بھی وہاں اُسے سلامی دینے حاضر ہوا اور یوسف عادل کے آدمیوں سے جھگڑ پڑا جس کے دوران میں قاسم کے آدمیوں نے عین الملک کو قتل کر دیا جس کے بعد قاسم تندور سے روانہ ہو کر بیدر پہنچا۔ جب سلطان ۵۰۰۰ رسالہ کے ساتھ برات کے ہمراہ واپس آیا۔ تو پھر ڈھونگ رچایا گیا اور قاسم برید نے پھر سلطان کو سلامی دی اور سلطان نے اُسے نائب باربک کا عہدہ دے کر شہر کی حکومت کا مختار کر دیا۔[۹۵]

سنہ ۹۱۰ھ (۱۵۰۵ء) میں قاسم برید کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا امیر برید جانشین ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا ماہر خوش نویس اور موسیقار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی سیاسی زندگی میں بہمنی سلطان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ شاید بہمنی سلطنت کا پہلا وزیر تھا جس نے اُس بنیاد کا اندازہ کیا جس پر بہمنی سلطنت کی تعمیر ہوئی تھی اور یہ کہ سلطان کا عوام و خواص کے ذہنوں پر کتنا گہرا اثر ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دور افتادہ صوبوں کے گورنر خواہ کتنے ہی طاقتور ہوں مگر جو شخص تخت کے قریب ہوگا دراصل راستہ وہی دکھائے گا اور اپنی ساری سیاسی زندگی میں اُس نے دربار پر قابو رکھنے کی امکانی کوشش کی محض اس ایک بات نے سلطان کا جو کچھ اقتدار باقی رہ گیا تھا اُسے بالکل ختم کر دیا اس لیے کہ بادشاہ کو پارٹی بندی کی سیاست میں گھسیٹ لیا گیا اور جدوجہد کسی اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض شخصیت کی بنا پر ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قاسم (امیر؟) کا انتقال ہوا تو اُس نے تاج کی حیثیت کو بالکل کمزور حالت میں چھوڑا اور سلطان کو بے یار و مددگار۔[۹۶]

تین اور امرا کا خاتمہ

سنہ ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) نے بہمنی سلطنت کے سقوط کے ڈراما کے ایک اور کردار کا خاتمہ دیکھا یعنی احمد نظام الملک جس کا جانشین اس کا لڑکا برہان ہوا۔ دو سال بعد دو اور بڑی شخصیتوں کا انتقال ہوا یعنی یوسف عادل جس کا انتقال کوول کنڈہ میں ہوا اور فتح اللہ عماد الملک جو ایلچ پور میں فوت ہوا[۶۵]۔ سلطان نے عادل خاں کا خطاب اس کے لڑکے اسماعیل کو دیا اور عماد الملک کا خطاب فتح اللہ کے لڑکے علاء الدین دریا کو اور ان دونوں کو وہ جاگیریں دے دیں جن پر ان کے والد قابض تھے[۶۶]۔ یہ ذکر موجب ہے کہ یہ دونوں امرا اگرچہ خود اپنی ریاستوں میں بالکل آزاد تھے مگر انھوں نے ہمیشہ سلطان کی شخصیت میں مرکزی اقتدار کا احترام کیا اور جب کبھی سلطان کو ان کے علاقوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے اس کا پورا اعزاز و احترام کیا۔ برہان مآثر میں جس نے ہمیشہ نظام الملک کے حوصلوں کی پاسداری کی ہے ایک دلچسپ عبارت ہے جس میں بہمنی سلطنت کے تمام حصوں سے سنہ ۹۲۲ھ (۱۵۱۶ء) میں فوجیں جمع کرنے کا ذکر ہے یعنی سلطان کے انتقال سے ٹھیک ایک سال پہلے۔ کہا جاتا ہے ان فوجوں کی سربراہی پر نظام الملک احمد نگر سے آیا، خواجہ جہان پرینڈا سے، اسماعیل عادل بیجاپور سے، قطب الملک گولکنڈہ سے اور عماد الملک برار سے اور ان سب نے بادشاہ کو سلامی دی[۶۷]۔ جس وقت یہ سب ہو رہا تھا امیر برید شاہی خزانہ سے خود اپنا خزانہ بھر رہا تھا اور اپنی مرضی سے اعزاز اور عہدے تقسیم کر رہا تھا۔ اس نے دستور دینار کے انتقال پر گلبرگہ اس کے لڑکے جہانگیر خاں کو دیا۔ اسے اسماعیل عادل کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سخت حسد تھا جس نے ساگر سے نلدرگ تک تمام قلعے فتح کر لیے تھے چنانچہ اس نے سلطان کو اس پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ دونوں فوجیں اللہ پور میں ملیں جس میں امیر برید سلطان اور ولی عہد دونوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بادشاہ جنگ میں زخمی ہو گیا تھا اور جب شاہ محب اللہ کے لڑکے مرزا لطف اللہ نے اس کی مرہم پٹی کر دی تو اسماعیل عادل نے اسے بڑے احترام سے بیجاپور پہنچایا اور جب سلطان نے دارالسلطنت جانے کی خواہش کی تو اسماعیل نے حکم دیا کہ چار یا پانچ ہزار "مغل" رسالہ اس کے ساتھ جائے۔ یہی موقعہ تھا جب کہ بی بی ستی کو اس کے بھائی نے ولی عہد کے ساتھ رخصت کیا[۶۸]۔

سلطان کی حکومت کے آخری چند سال شورہ پشت امرا کی بغاوتوں اور ان کے خلاف فوجی کارروائیوں میں صرف ہوئے چنانچہ سنہ ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں جب سلطان اسماعیل کی ایما پر گلبرگہ گیا اور دستور دینار سے اس قلعہ کا قبضہ لیا تو دینار نے امیر برید کا دامن پکڑا اور دارالسلطنت کا محاصرہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل

کر دیا۔ لیکن امیر برید اور دستور دینار میں ناچاقی ہونے کے بعد جلد ہی ایک دوسری صورت پیدا ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر برید اپنی جاگیر پر چلا گیا اور سلطان نے دستور دینار کو معافی دے کر گلبرگہ کی جاگیر پھر اُسے واپس کر دی۔ شعبان ۹۲۳ھ (ستمبر ۱۵۱۷ء) میں سلطان کو خداوند خاں کے خلاف جس نے بغاوت کر دی تھی، ماہور پر دھاوا کرنا پڑا۔ خداوند خاں کو لڑائی میں شکست ہوئی اور بغاوت کے جرم میں اُس کی گردن مار دی گئی اور اُس کی جاگیر اُس کے چھوٹے لڑکے محمود خاں کو دے دی گئی۔

سلطان کا انتقال

۴ ذی الحجہ ۹۲۴ھ (۷ دسمبر ۱۵۱۸ء) کو بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور بہمنی سلطنت کا بہ حیثیت مجموعی خاتمہ ہو گیا اس لیے کہ تقریباً سارے مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ سلطان کے انتقال پر تمام جاگیرداروں نے شاہی لقب اختیار کر لیے چنانچہ اس کا ذکر بعد کو آئے گا لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ محمود کے ساتھ بہمنی خانوادہ کی تقریباً ساری عظمت (یا جو کچھ بھی رہی سہی تھی) ختم ہو گئی۔ اس کی متواتر شکایت کہ وہ خود اپنے محل میں قیدی ہے اور دوسروں کی سخت گرفت میں ہے، یوسف عادل سے اُس کی یہ شکایت کہ اُس کی کوئی بھی املاک اُس کے اختیار میں نہیں ہے، اُس کا ہر اُس شخص کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہونا جو بیدر میں برسر اقتدار ہو، ان سب سے مرکز کا قطعی ناکارہ اور بے کار محض ہونا ظاہر ہے۔ خود اُسے اُس کی پروا نہ تھی کہ اُس کے گورنروں میں سے کسے بالادستی حاصل ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُس کی حکومت کے آخری زمانہ میں جب عماد الملک نے سلطان کو بریدیوں کی گرفت سے نجات دلانے کے لیے امیر برید کے خلاف مہم بھیجی تو اس مہم کے دوران میں وہ اس وقت بھی غسل خانہ سے باہر نہیں نکلا جب دونوں فریق اس پر قابو حاصل کرنے کے لیے دست و گریبان ہونے پر تُلے ہوئے تھے اور جب اس کے ہونے والے سرپرست نے اس مضحکہ خیز واقعہ کو سُنا تو وہ سخت برہم ہوا اور بادشاہ خاموشی سے امیر برید کے کیمپ میں چلا گیا۔

دراصل اگرچہ وہ جوان تھا لیکن عیش و عشرت کی زندگی میں اتنا محو تھا کہ سلطنت کے کاروبار کی اُسے کوئی خاص فکر نہ تھی اور اس حد تک آگے بڑھ گیا تھا کہ اپنے "جام و سبو" میں جڑنے کے لیے تخت فیروزہ میں جڑے ہوئے جواہرات نکلوا لیے اور اس معاملہ میں اُس نے اپنے سے زیادہ خوش قسمت باپ کی تقلید کی۔ اگر بیدر کے امور مملکت کی سربراہی پر کوئی قابل وزیر ہوتا تو وہ گورنروں اور جاگیرداروں کے اقتدار کو بڑھنے نہ دیتا لیکن قاسم برید یا امیر برید میں سے کوئی بھی ملک حسن نظام الملک کے معیار تک بھی نہ پہنچ سکا۔ دراصل یوسف عادل اور ملک احمد بہت زیادہ قابل تھے اور انھوں نے بیدر آ کر اپنے شرائط منوانے کی کوشش کی

تھی لیکن ان کی قابلیت اور اقتدار ایک دوسرے سے بہت متوازن تھے اور دونوں میں سے کسی میں بھی ایسا کرنے کی جسارت نہ تھی۔ باوجودیکہ سلطنت کے مرکز اور صوبہ جات کے گورنروں میں کھلی عداوت تھی لیکن ہر جاگیردار بادشاہ کی ذات کا احترام کرتا تھا اور ان خانوادوں کے ثنا خواں برہان مآثر اور فرشتہ خواہ کچھ بھی کہیں ان میں سے کسی نے بھی اپنی آزادی کے اعلان کی جرأت نہیں کی[۵۵]۔ مرکز کا یہ احترام اور رعبِ سلطنت کے خاتمہ تک قائم رہا جو محمود کے انتقال کے جلد ہی بعد ظہور میں آیا۔

ب۔ کلچرل حالات

پرتگالیوں کی آمد

شاید سب سے اہم واقعہ، خانوادوں کے عروج و زوال سے بھی زیادہ اہم اور جس سے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا بہمنی سلطنت کے مغربی ساحل پر یوروپیوں کا ظہور تھا۔ ہم پہلے ہی محمد اوّل کی فوج میں یوروپیوں کی موجودگی کا ذکر کر چکے ہیں اور شاید شروع کے زمانہ میں بہمنی اور وجے نگر کی فوجوں میں کچھ یوروپی رہے ہوں لیکن اب یوروپی ملازمت کرنے نہیں بلکہ فتح کرنے کے لیے اور حکومت کرنے اور عیسائی بنانے کے لیے آئے اور اس موقعہ پر کامیابی کا راستہ پرتگالیوں نے کھولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سے پہلے یوروپی تھے جو سمندر پار کر کے ہندوستان پہنچے اور جیسا سب کو معلوم ہے واسکوڈی گاما نے کیپ آف گوڈ ہوپ کا چکر کاٹا اور مسلم سیاح عبدالماجد کی رہنمائی میں ہندوستان کے ساحل پر پہنچا اور ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو کالی کٹ میں اترا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسمت آزما کے ذہن میں ایک خیال مسالے اور دیگر اشیا کی تجارت کا تھا جو مشرق میں ملتی تھیں اور اُس زمانہ کے یوروپیوں کے نزدیک مشرق کا مطلب بیشتر ہندوستان تھا۔ اسپین میں مسیحی حکومتوں کی مسلم اقتدار کو ختم کرنے میں کامیابی اور اس جزیرہ نما میں مذہبی عدالتوں کے قیام نے پرتگالیوں کو بہت ہمت دلائی ہوگی کہ اپنے مذہب کی ہر ذریعہ سے تبلیغ کریں، حتیٰ کہ تلوار کے زور سے بھی، اور یہ نیت نسبتاً غیر اہم تجارتی کاروبار کی نیت میں شامل ہو گئی ہوگی۔ جنوبی ہند اور دکھن میں اُس وقت سخت شورش برپا تھی اور بہمنی سلطنت انانیت اور خانہ جنگی سے پارہ پارہ ہو رہی تھی اور دلیر پرتگالیوں نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ ملک میں مذہب اور نیز تجارت کی بنیاد پر ایک سلطنت قائم کرنے کا یہ بہترین موقعہ ہے[۵۶]۔

شروع کے چند برسوں میں پرتگالیوں نے بہمنی سلطنت کے بندرگاہوں سے بچ بچ کر جہازرانی کی اور

کالی کٹ کے زموزین یا کوچین کے راجہ کے علاقوں میں کارخانے قائم کرنے پر قانع رہے لیکن کارخانے جلد ہی قلعوں میں تبدیل ہو گئے اور کھلم کھلا جنگی معاہدے ہونے لگے اور دوسری طرف قومی سرحدیں ٹوٹ گئیں اور ہندوستانی خود اپنے بھائی بندوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے انھیں ملازم رکھنے لگے۔ قسمت آزمائی کا پہلا دور ۱۵۰۹ء میں ختم ہو گیا جب کہ مشرق میں پرتگالی علاقوں کا سربراہ المیڈا مقرر ہوا لیکن جنوری ۱۵۰۸ء میں ایک رکاوٹ ہو گئی جب کہ بادشاہ مصر قناح الغوری کے امیر البحر امیر حسن اور گجراتی بیڑہ کے کماندار ملک ایاز نے بمبئی ساحل پر چاول کے مقام پر پرتگالیوں کو شکست دے دی۔ تاہم پرتگالیوں نے پھر سے قوت حاصل کر لی اور فروری ۱۵۰۹ء میں ڈیو کے ساحل پر مصری بیڑہ کو شکست دے دی[۷۷]

المیڈا کے بعد افانسو ڈی البوکرک گورنر ہوا اور نئے گورنر کا گوا پر تقریباً قبضہ تھا جو "ہندوستان کے جزیروں اور بندرگاہوں میں قابل رشک تھا" اور جو یکم فروری ۱۴۷۲ء سے جب کہ محمود گاواں نے اُسے فتح کیا تھا بہمنی سلطنت کے قبضہ میں تھا۔ ۲۸ فروری ۱۵۱۰ء کو جب کہ گوا کی فوج ابراہیم عادل کی تخت نشینی پر بیجاپور گئی ہوئی تھی[۷۸] البوکرک نے حملہ کر کے اُس پر قبضہ کر لیا۔ پہلے وہ ۲۰ مئی سے آگے اس پر قبضہ نہ رکھ سکا اور بیجاپور نے اُسے پھر فتح کر لیا لیکن ۔ ا نومبر ۱۵۱۰ء کو پرتگالیوں نے اُس کا پھر محاصرہ کیا اور جب وہ بزور قوت اُسے تسخیر نہ کر سکے تو انھوں نے اپنی تھیلیاں کھول دیں اور تھانہ دار کو رشوت دے کر ملا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ نومبر کو یہ شہر تسخیر ہو گیا اور ہزاروں مسلمان مرد عورت اور بچوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اور "قتل عام اور مظالم کی بدمستی" کے بعد "مقدس ادارہ" قائم ہوا اور عام آبادی کو مسیحیت کی رومن کیتھولک شکل میں عیسائی کیا جانے لگا[۷۹]۔ ان ابتدائی یورپیوں کی ظالمانہ روش نے قدرتاً لوگوں کے دلوں میں سخت نفرت پیدا کر دی اور جب احمد نظام الملک ضامنی لوگوں کو ایک مہم کے بعد بیدر سے جنیر جا رہا تھا تو اُس کے مخالفین نے اُس پر طنز کیا کہ وہ ایسا کام کر رہا ہے جو گمبر (آتش پرست) اور یوروپین بھی نہ کرتے[۸۰]

پرتگالیوں کے گوا کو فتح کرنے پر ملک کی سیاست میں ایک بالکل نیا عنصر داخل ہو گیا اور جیسے ہی شہر اور مضافات کی سڑکیں قتل عام کے خون سے صاف ہو گئیں انھوں نے ایک حکومت کو دوسری سے لڑانے اور اپنا مطلب حاصل کرنے کا کھیل شروع کر دیا۔ اگرچہ یوسف عادل کے وزیر اعظم کمال خاں دکنی نے البوکرک سے معاہدہ کر کے گوا کو مستقل طور پر پرتگالی مقبوضہ تسلیم کر لیا تھا[۸۲] مگر پرتگالی وائسرائے کو اس میں مطلق پس و پیش نہ ہوا کہ وجے نگر کے کرشن دیو رائے کے پاس ایک سفارت بھیج کر اُس سے ابراہیم عادل کے خلاف مدد مانگے اور بھٹکل میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرے تاکہ وہ بیجاپور کی فوج کے خلاف استعمال کرنے کے لیے "آزادی سے وجے نگر کی مملکت میں گھوڑے درآمد کر سکے[۸۳]۔"

گورنروں کی آزادی

اب ہم مرکز سے آزادی یا خود مختاری کی ان تدابیر کے مسئلہ پر پہنچ جاتے ہیں جو فرسودہ بہمنی سلطنت کے گورنروں نے اس وقت اختیار کیں۔ اگرچہ محمود گاواں کے قتل کے بعد یوسف عادل نے سب سے پہلے معاندانہ روش کا اظہار کیا تھا لیکن اپنے باپ ملک حسن نظام الدین کے خلاف سازش اور اس بوڑھے کے قتل کا سب سے زیادہ اثر ملک احمد پر ہوا۔ بیدر میں پارٹیوں کی جو نئی صف بندی ہوئی۔ اس میں پرانے آنے والوں اور نو واردوں کا امتیاز بڑی حد تک ختم ہو گیا[illegible] اس لیے کہ اب قاسم برید ترک نے یوسف عادل ترک کے خلاف محاذ بنایا اور دارالسلطنت کے دکنیوں کو ایک دوسرے دکنی ملک احمد کے خلاف ساتھ ملایا۔ اس کے بعد جیسا کہ پچھلے باب میں کہا گیا جھگڑوں کی بنیاد نسلی اصول پر نہیں رہی بلکہ خالص خود غرضانہ اصول پر اور بادشاہ کی ذات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں آ گئی۔ زیادہ سنجیدہ طرف دار اُن رنگ رلیوں سے بیزار ہو گئے جن میں دربار اور دارالسلطنت مست ہو رہے تھے اور خود اپنے صوبوں اور صوبائی مستقروں میں جو کچھ تھا اُسی پر قانع ہو گئے۔ دوسری طرف قاسم برید اور اُس کے بعد اُس کے لڑکے کی یہ خواہش تھی کہ دور و دراز صوبوں پر بھی پورا پورا قابو رکھے لیکن یہ بیجاپور، جنیر اور تلنگانہ کے قابل طرف داروں کے مدمقابل نہ تھے اس لیے ان میں برابر کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑے ہوتے رہے جن کے نتیجہ میں سلطنت ختم ہو گئی۔

دربار نے جب براہ راست ملک احمد کے حوصلوں کی مخالفت کی تو اُس کے بعد ہی ملک احمد نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ کمزور حکمران اور طاقتور اولو العزم ماتحت کے درمیان کسی قسم کا رشتہ ہونا چاہیے۔ اپنی رعایا کو وہ دارالسلطنت کے ناکارہ اور بگڑے ہوئے نظام سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب اُس نے قطعی طور پر طے کر لیا کہ اُسے سلطان کے حواریوں سے اب کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہیے۔ ہمارے بعض مورخین کا بیان ہے کہ تقریباً اسی زمانہ میں "نہ صرف اُس نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا" بلکہ سلطان احمد نظام شاہ بحری کا لقب بھی اختیار کر لیا اور نیز یوسف عادل اور فتح اللہ عماد الملک کو بھی پیام بھیجا کہ وہ بھی یہی کریں[illegible] اس میں شک نہیں کہ دارالسلطنت کے واقعات نے نظام الملک کو بہت برافروختہ کیا ہوگا اور اُس کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہو کہ وہ "کم از کم کچھ دنوں کے لیے" سلطان کا نام خطبہ سے نکال دے[illegible] لیکن اس کے متعلق بھی بعض دلچسپ تفصیلات ہیں۔ اِس لیے کہ ہمیں تاریخوں میں ملتا ہے کہ خطبہ سے بہمنی

سلطان کا نام خارج کرنا مقامی امرا کے نزدیک اُن کے آقا بہمنی سلطان کی "سخت توہین" ہے اس لیے اُسے خارج شدہ حصے کو پھر سے بحال کرنا پڑا۔[87] اسی طرح جب اُس نے سفید چتر استعمال کرنا شروع کیا (جو رکمن اور نیز مالوہ اور گجرات کا شاہی نشان تھا) تو لوگوں نے احتجاج کیا اور اُسے یہ کمزور بہانہ کرنا پڑا کہ وہ محض دھوپ سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔[88] مزید برآں جب یوسف عادل نے بیجاپور میں شیعی خطبہ رائج کرنے کی کوشش کی تو وہ تھوڑے دن کے لیے اس میں کامیاب ہوا اور پھر اُسے اپنے احکام واپس لینے پڑے مگر سلطان محمود کا نام خارج کر کے بیجاپور کی جامع مسجد میں جمعہ کے خطبہ میں یہ نام داخل کیا گیا اس لیے کہ حالات کا یہی مقتضا تھا۔[89] نظام شاہیوں کے ثنا خواں سید علی طباطبائی نے صاف لکھا ہے کہ سلطان محمود ہی نے ملک احمد کو اشرف ہمایوں نظام الملک بحری کا اور یوسف عادل کو مجلس رفیع کا اور قطب الملک کو مجلس اعلےٰ کا خطاب دیا تھا[90] اور یوسف عادل، اسماعیل عادل اور ملو عادل کے کتبوں میں شاہی القاب نہیں نظر آتے ہیں[91] اور کم از کم ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) تک بیجاپور کا چوتھا حکمران ابراہیم خود کو بہمنی خطاب عادل خاں سے ملقب کرتا ہے۔[92] یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیے کہ ہمارے پاس اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ بیجاپور کے پہلے تین حکمرانوں نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور عبداللہ الملکی نے صاف لکھا ہے کہ عماد الملک نے اپنا خطبہ سب سے پہلے ۹۳۵ھ (۱۵۲۹ء) میں پڑھوایا۔[93] مزید برآں ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ سلطان نے متعدد بار اپنے جاگیرداروں کو حکم دیا کہ شورہ پشت امرا کے مقابلہ کے لیے اُسے مدد بھیجی جائے اور اس کے احکام کی وفاداری کے ساتھ تعمیل کی گئی جیسے فتح اللہ عماد الملک اور ملک احمد نظام الملک نے بہادر گیلانی کے خلاف جنگ کے لیے مدد بھیجی۔

ان سب باتوں سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ دار السلطنت کے حالات سے بیزاری بہت بڑھ گئی تھی لیکن تاج سے وفاداری برابر قائم رہی اور نہ ہی یوسف عادل اور نہ اُس کے جنیر اور برار کے معاصرین نے آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ جہاں تک احمد نظام الملک کا تعلق ہے۔ اُس نے وہی کیا جو اُس کے دو صدی بعد اُس کے ہمنام نظام الملک آصف جاہ اوّل نے کیا تھا اِس لیے کہ دونوں دار السلطنت کے حالات سے بیزار ہو گئے تھے اور دونوں عملاً خود مختار ہو گئے مگر اپنے آقا کے پکے وفادار رہے۔

چنانچہ معلوم ہوگا کہ ہمارے سامنے جتنی بھی شہادت ہے اس سے بجا طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ ہی یوسف عادل نے اور نہ ملک احمد نظام الملک اور نہ فتح اللہ عماد الملک نے کبھی اپنی "آزادی" کا اعلان کیا اور زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرکز کی کمزوری سے پورا پورا فایدہ اٹھا کر وہ اپنی اپنی جاگیروں میں خود مختار

ہو گئے۔ اگر ہم اس عہد کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں اور بھی شہادت ملے گی جس سے یہی نتیجہ نکلے گا۔ یہی صورت بہادر گیلانی اور دستور دینار کی روش سے ظاہر ہوتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر موقع پر سلطان نہ صرف ان نام نہاد "آزاد حکمرانوں" کو مدد کے لیے طلب کرتا ہے بلکہ جاگیر تقسیم کرتا ہے اور جاگیرداروں کی جاگیروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سب اُس سے خود جاگیرداروں کی ایما پر کیا لیکن بادشاہ ہی کے توسط سے انھوں نے اپنی شکایتوں کی دادرسی حاصل کی۔ فرشتہ نے ایک عجیب واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے پھر اس بحث کی ضرورت نہیں رہتی کہ جاگیرداروں نے مرکز سے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ گنگاوتی (یا الند) کی لڑائی قطب الملک کی مدد سے یوسف عادل کی فتح پر ختم ہو جاتی ہے اور سوال یہ ہوتا ہے کہ دستور دینار کی جاگیر کے متعلق کیا کیا جائے۔ چاروں طرف میدان جنگ میں لاشوں کے ڈھیر کے درمیان قالین بچھا کر بادشاہ کو اُس پر بٹھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مقدمہ قاسم برید کے خلاف یوسف عادل اور قطب الملک زبانی پیش کرتے ہیں اور شاید بادشاہ کی ایما پر وہ حلف لیتے ہیں کہ وہ نظام الملک اور عماد الملک کی مدد سے قاسم برید اور اس کی جماعت کے اقتدار کو ختم کر دیں گے[64]۔ اس قسم کے منظر کا پیش کرنا یقیناً ناممکن ہوتا اگر یہ لوگ اعزاز میں بادشاہ کے برابر ہوتے یا ایسے باغی ہوتے جو سلطنت سے الگ ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اب تک بہر صورت تاج کے جاگیردار تھے مگر چونکہ وہ قاسم برید کے اقتدار اور مرکزی حکومت کی کمزوری سے بددل تھے جو ضرب المثل ہو گئی تھی اس لیے انھوں نے سلطنت کے دور و دراز حصّوں میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور خود مختار ہو گئے۔

فوجی اصلاحات

بدقسمتی سے ہمیں اپنے فارسی مورخین میں بجز چند فوجی کمان داروں کے نام اور بہمنی افواج کے بہادرانہ کارناموں کے بہمنیوں کے فوجی نظام کے بارے میں کوئی مواد نہیں ملتا لیکن ہمیں دوارتے تاربوسہ کے سفرنامے میں جو ۱۵۰۰ء سے ۱۵۱۶ء تک ہندوستان اور مشرق میں رہا فوج کے عہدوں اور ساز و سامان کی پوری تفصیل ملتی ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تاربوسہ کے الفاظ اُس کے انگریزی ترجمہ سے نقل کر دیے جائیں: "مور (مسلم) امرا عموماً اپنے ساتھ خیمے رکھتے ہیں جن سے اپنی قیام گاہ پر کیمپ بنا لیتے ہیں جب وہ سفر کے لیے یا کسی شہر پر حملہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ وہ زین پر سوار ہوتے ہیں جن کا اگلا حصّہ بلند ہوتا ہے اور زرہ جامے کا بہت استعمال کرتے ہیں جو اُن کی زین میں بندھا ہوتا ہے اور ہلکے لمبے نیزے رکھتے ہیں جن کا سرا ایک ہاتھ لمبا، مربع اور بہت مضبوط ہوتا ہے۔ وہ روئی سے بھرے ہوئے چھوٹے کوٹ پہنتے

ہیں اوران میں اکثر زرہ ہوتی ہے اور ان کے گھوڑے پورے سازسے مزین ہوتے ہیں جن کے آگے فولاد کی ٹوپی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ نیزے اور تبر ہوتے ہیں اور دو تلواریں اور دو یا تین ترکی کمان جو اُن کی زین سے لٹکی ہوتی ہے اور بہت لمبے تیر۔ اس طرح ہر ایک کے پاس دو آدمیوں کے اسلحہ ہوتے ہیں۔ جب وہ لڑائی پر جاتے ہیں تو اپنی بیویوں کو ساتھ لے جاتے ہیں اور بار برداری کے گھوڑے ساتھ ہوتے ہیں جن پر راستہ کے لیے سامان لادتے ہیں ...... اس دکویں (دکھن) کے لوگ عام طور پر سیاہ فام اور گٹھے جسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ پیدل لڑتے ہیں لیکن کچھ سوار بھی ہوتے ہیں ...... پیدل سپاہی کے پاس تلوار، خنجر اور تیر کمان ہوتی ہے۔ یہ بڑے اچھے تیر انداز ہیں اور ان کی کمان انگلستان کی طرح سے لمبی ہوتی ہے۔ سینہ سے اوپر وہ ننگے ہوتے ہیں مگر نیچے کپڑے پہنتے ہیں۔ ان کے سر پر چھوٹی پگڑی ہوتی ہے ......"[۹۵]

جیسا ہم نے محمود گاواں کی اصلاحات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے فوج کو کمان کرنے والے جرنلوں اور سرلشکروں کو اپنے ماتحت فوج کی داشت کے لیے بڑی بڑی جاگیریں دی جاتی تھیں اور وزیر کی اختیار کردہ پالیسی کا یہ ایک جزو تھا کہ جاگیروں کے آمد و خرچ کا حساب دینا پڑتا تھا جو اس کے زوال کا باعث ہوا۔ یہ شاید پہلی کوشش تھی کہ جاگیردار امرا کا براہ راست حکمران سے تعلق قائم کیا جائے۔

سنہ ۹۰۱ھ (سنہ ۱۴۹۶ء) کے قریب ایک دلچسپ کوشش کی گئی کہ چھوٹے امرا کو بادشاہ سے زیادہ وابستہ کیا جائے اور یہ منصب داروں کے متعلق قانون تھا۔ قاسم برید کی ایما پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ بڑے امرا کے علاوہ تمام منصب داروں کو شاہی محافظ فوج میں شامل ہونا چاہیے اور اس کے بعد سے وہ سرکردہ یا حولدار کہلائیں۔ فرشتہ نے معتبر سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جن منصب داروں کے منصب ۲۰ سے ۵۰۰ تک تھے انھیں شاہی محافظ فوج میں شامل کیا گیا اور جن کے منصب اس کے اوپر تھے انھیں امرا کا درجہ حاصل تھا۔[۹۶] یہ اصلاح تقریباً اسی نوعیت کی تھی جیسی بیس سال پہلے محمود گاواں نے کی تھی مگر اس میں نمایاں فرق یہ تھا کہ اگرچہ خواجہ میں اتنی جرأت تھی کہ اُس نے بڑے بڑے جاگیرداروں کو براہ راست حکمران سے وابستہ کر دیا تھا لیکن قاسم برید نے صرف اسی پر اکتفا کی کہ بڑے اُمرا کو ویسے ہی چھوڑ دیا اور صرف چھوٹے منصب داروں کو حکمران سے وابستہ کیا۔

شیعہ مذہب

بڑے امرا کو مرکز سے علیحدگی کا سہارا بیجاپور اور دوسرے مقامات پر شیعہ عقاید کی اشاعت سے

ملا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ دکھن میں ایران سے آنے والوں کا مدت تک برابر سلسلہ جاری رہا اور اس کا بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا دربار کی زندگی اور سلطنت کی سیاست پر کتنا اثر ہو رہا تھا۔ فیروز اور احمد اوّل کے رجحانات سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے جیساکہ مذکور ہوا۔ شاید محمود گاواں خود بھی شیعہ تھا۔ محمود گاواں کے قتل کے بعد جو ردِّعمل ہوا اُس سے دکھن میں اس مذہب کی اشاعت کو اور بھی مدد مل گئی ہوگی۔ اِس لیے کہ یوسف عادل محمود گاواں کے نام نہاد متبنیٰ نے ذی الحجہ ۹۰۸ھ (۱۵۰۳ء)[۹۷] میں جمعے کے دن بیجاپور کی جامع مسجد کے منبر پر سے اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کر دیا۔[۹۸] دراصل محمود اگرچہ اپنے باپ دادا کی روایات کے بموجب سنی مذہب پر قائم رہا مگر بظاہر اُس کا رجحان قطعی طور پر خلیفہ چہارم کے حق کی ترجیح کی طرف تھا اور کہا جاتا ہے کہ جب وہ شکست اور مایوسی سے بہت متاثر ہوتا تھا تو حضرت علی کو مدد کے لیے پکارتا تھا تاہم یہ انوکھی بات تھی کہ یوسف عادل کی حیثیت کا بڑا جاگیردار اور گورنر مجمعِ عام میں اپنے شیعہ ہونے کا اعلان کرے جس پر دوسرے امرا نے موقعہ کو غنیمت جان کر سلطان کے کان بھرے کہ یہ اعلان سخت توہین آمیز اور باغیانہ ہے چنانچہ امیر برید کی ایما پر سلطان نے قطب الملک، عماد الملک اور خداوند خاں کو دربار میں طلب کیا اور یوسف عادل کے نام فرمان جاری کر کے حکم دیا کہ وہ اس جدت کو ختم کرے۔ اس واضح اعلان کے آخر میں جو اعلان جنگ کی شکل میں تھا سلطان نے یہ معنی خیز شعر لکھا:

باسبابِ شوکت چناں غرہ شد که خورشید در چشمِ او ذرہ شد

اگرچہ عماد الملک اور خداوند خاں اس طلبی کی تعمیل میں حاضر نہیں ہوئے لیکن بادشاہ کے اختیار میں اتنی زبردست فوج تھی کہ یوسف عادل نے مناسب خیال کیا کہ برار جائے اور عماد الملک کو اپنی حمایت پر آمادہ کرے۔ شاہی افواج نے خود سلطان کی قیادت میں گاوِل تک اس کا تعاقب کیا لیکن جب بادشاہ برار کے علاقہ میں داخل ہوا تو شاہی آداب کا مقتضا تھا کہ عماد الملک زیادہ ہیر پھیر نہ کرے اور اُس نے بادشاہ کا استقبال اپنے حکمران کی حیثیت سے کیا اور یوسف عادل سے صاف کہہ دیا کہ وہ اس کے ملک سے چلا جائے۔ تاہم اُس نے نظام الملک اور قطب الملک کو پیام بھیجا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اُس سے امیر برید کو تقویت ہوتی ہے اور انھیں سمجھا کر اپنے اپنے ملک واپس کر دیا اور امیر برید بے بس سلطان کو لے کر بیدر واپس آگیا۔[۱۰۰]

سلطان کی بڑی شخصیتوں میں کشمکش کا اثر خارجی سیاسیات پر بھی پڑا۔ ہندوستان کی سرحد کے باہر دسویں صدی کے ربع آخر میں شیعہ مذہب کے لوگ اس مذہب کی اشاعت میں بہت سرگرم تھے اور شاید اس کا سب سے زبردست حامی ایران کا شاہ اسماعیل صفوی تھا۔[۱۰۱] سنہ ۹۲۶ھ (۱۵۱۹ء) میں شاہ

اسماعیل نے ایک سفیر اپنے ہمنام کے لیے بیش قیمت تحفوں کے ساتھ بیجاپور بھیجا جہاں اس کا بڑے تپاک سے استقبال کیا گیا لیکن شاید اسماعیل کی لاگ ڈانٹ میں اور اپنی سنیت کا جواز ثابت کرنے کے لیے امیر برید نے دوسرا رُخ اختیار کیا اور اس سفیر کو دو سال تک بیدر میں روک رکھا اور جب اسماعیل عادل نے امیر برید اور سلطان کو لکھا تب سفیر کو بیجاپور جانے دیا گیا اور اُس کا بڑا شان دار استقبال ہوا۔ یہ سب حال سن کر شاہ اسماعیل صفوی بیجاپور کے حکمران سے بہت خوش ہوا اور اُسے قیمتی تحائف بھیجے اور جو خود نوشت خط اُسے بھیجا اُس میں اُسے "شاہ کے لقب سے مخاطب کیا"۔ قدرتاً اسماعیل عادل کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی اور ایران سے اپنے اتحاد کی توثیق میں اُس نے حکم دیا کہ آیندہ سے اُس کے "مغل" سپاہی بارہ گوشیہ (شیعی) ٹوپی پہنیں[۱۱۱]

اسی کے ساتھ جب ہم اس زمانہ کے کتبے دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم برابر سُنی ہی رہا۔ اگرچہ اس کا رجحان شیعیت کی طرف رہا ہو۔ چنانچہ اُس کا ایک کتبہ بیجاپور قلعہ کے پھاٹک پر ہے جس کے برج کی طرف شروع میں تو پورا شیعی کلمہ ہے اور اس کی تاریخ ۹۳۵ھ (۲۹-۱۵۲۸ء) ہے اور دوسری یہ بڑی اہم بات ہے کہ خود اس کے شاندار مقبرہ پر (صدر دروازہ کے اوپر شمالی مثلث پر) ایک کتبہ ہے جس میں اللہ، محمد اور چار اول خلفا حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی کے نام اسی ترتیب سے ہیں "نیز دوسرے صحابہ رسول کے نام"۔ یہ ترتیب اور طرز صرف اسی کی اجازت سے ہو سکتا ہے جو عقیدتاً پکا سُنی ہو اور پہلے تین خلفا کو رسول کا حق دار جانشین سمجھتا ہو۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاہ ایران کے متعلق اُس کے خواہ کیسے ہی جذبات رہے ہوں ابراہیم کا انتقال سُنی عقیدہ پر ہوا اور جیسا کہ ڈاکٹر ناظم نے لکھا ہے بیجاپور کے سرکاری مذہب کے شیعہ ہونے کا اعلان اُس کے لڑکے اور جانشین علی عادل کے لیے اُٹھا رکھا گیا تھا[۱۱۲]

فنون اور تعمیرات

اس زمانہ میں ہمیں بجز بیدر کے عام الخلطا کے بہمنی فنون اور تعمیرات میں کوئی قابل لحاظ بات نہیں نظر آتی ہے اور صوبہ جاتی جاگیردار اپنے آپس کے جھگڑوں میں اتنے منہمک رہے کہ اپنے حلقہ اثر میں فنون کی ترقی میں کوئی مدد نہ کر سکے۔ یہ تو ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ قاسم (امیر؟) برید نے خوش نویسی میں کچھ امتیاز حاصل کر لیا تھا اور رنگین محل کی "خط نشیں" کی دیواروں پر خوبصورت خطاطی نقش ہے جن میں بعض سیپ کے کام کی ہے اِس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے پوتے علی برید کے زمانہ میں اس فن نے کتنی ترقی کر لی ہوگی۔ لیکن

سلطان شہاب الدین محمود نے سنہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں قلعہ بیدر کے شرزہ دروازہ پر خود اپنے قلم سے جو خوبصورت خطاطی پیش کی ہے وہ اس سے بھی اونچے درجے کی ہے مگر اسے بیدر کا فن تعمیر نہیں کہا جا سکتا اس لیے کہ اُس کا نشو و نما اس خانوادہ کی حکومت کے بعد کے زمانہ میں ہوا۔ غلام گردش جو رنگین محل کہلاتی ہے قریب کے سلاطین کے عالی شان محل کے مقابلہ میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتی ہے اور اس کی بدصورت سی لکڑی کی دیوار گیریاں جن کی پرانے چالوکین طرز سے نقل کی گئی ہے اور چھوٹے چھوٹے کمرے اور بھی بہمنی محلات اور غلام گردشوں کے مقابلہ میں حقیر معلوم ہوتے ہیں اور بعد کو بیجاپور اور احمد نگر میں جس طرز کی نشو و نما ہوئی اس کے مقابلہ میں اور زیادہ بے حقیقت۔ اس میں شک نہیں کہ "پرانے کھپروں اور سیپ کے کام کی شاندار نمائش ہے" اور "نہایت خوبصورت اور پاکیزہ پھول دار خطاطی کے نمونے ہیں لیکن سب کا مجموعی اثر نا قابل توجہ ہے اور تخیل" میں وہ گہرائی نہیں ہے جس سے نقش و نگار واقعی قابل قدر ہو جائے۔ اس کے چند فرلانگ کے فاصلہ پر مدرسہ کی وسعت اور بلندی تخیل کا جو نمونہ ہے اور نام نہاد شہ نشین یعنی بادشاہ کی نشست گاہ جو بریدیوں نے تعمیر کی ہے اس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور دونوں تصورات کے درمیان بہت بڑی خلیج حایل ہے۔

دراصل بہمنیوں نے اپنے خانوادہ کے قطعی اختتام سے بہت پہلے عوام کی زندگی پر اپنا اثر زایل کر دیا تھا۔ جو کلچر بہمنی کلچر کی جگہ لینے والا تھا وہ متعدد مرکزوں کا تھا اور احمد نگر، برار، بیدر، گولکنڈہ میں اُس نے جو شکلیں اختیار کیں ان میں ایک دوسرے سے بڑا فرق تھا لیکن کم از کم ایک خصوصیت تھی جو دکھن کے ان تمام کلچرل مرکزوں میں مشترک تھی اور وہ ہر جگہ ہندو تصوّر کی زبردست آمیزش تھی۔ چنانچہ جو کام ایک صدی پیشتر فیروز نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل ان پانچ ریاستوں میں ہوئی جو بہمنیوں کی تعمیر کردہ عظیم تعمیر کی جگہ لینے والی تھیں۔

تشریحات

۱۔ پورا نام طبقات کے صفحہ ۳۴۰ میں ہے۔ نیز بیدر میں سید السادات کے چشمہ پر ایک کتبہ میں، جس کے لیے دیکھو اپی گریفیا انڈو مسلیمیکا سنہ ۱۹۲۵-۲۶ء صفحہ ۱۰۔ سلطان کے جو سکے دستیاب ہوئے ہیں ان میں شہاب الدین کا لقب نہیں ہے۔ دیکھو عبدالولی خاں کی کتاب مذکور صفحات ۱۴۶ سے ۱۵۶۔

۲۔ فرشتہ نے جلد اوّل صفحہ ۳۴۷ میں لکھا ہے کہ جب کبھی سلطان اُس سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا تھا جتنی اُسے دی جاتی تھی تو امیر برید اُسے جواب دیتا تھا کہ سارا دکھن تو گورنروں کے زیر اقتدار ہے اور بادشاہ کے علاقہ میں جو کچھ رہ گیا ہے وہ شاہانہ شکوہ کے قائم رکھنے کے لیے ناکافی ہے۔

۳۔ سلطان محمود اور اُس کے اُس سے زیادہ نااہل جانشین کی حیثیت کچھ اس قسم کی رہ گئی تھی جیسی اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ستارا کے راجہ کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کوئی سیاسی اقتدار نہ تھا مگر وہ عظیم مرہٹہ اتحاد کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

۴۔ محمود کی پیدائش ۸۷۵ھ (۱۴۷۰ء) میں ہوئی تھی۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۵۰۔ منتخب کے مطبوعہ ایڈیشن جلد سوم صفحہ ۱۱۶ میں ہے کہ "سید خلیفہ" اُس کے بائیں بازو پر تھا مگر یہ یقیناً غلط ہے۔ شاید فاضل مورخ نے حبیب کو غلطی سے خلیفہ پڑھا۔

۵۔ یہ برہان کی روایت ہے۔ فرشتہ نے جلد دوم صفحہ ۶۱۷ میں قاسم کو سرکیشیائی کہا ہے۔ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ پارٹیوں کی صف بندی اب کسی اصول پر مبنی نہ تھی بلکہ خالص خود غرضانہ جذبات پر ہو گئی تھی، جس کے لیے دیکھو اسی باب کا حصہ الف۔

۶۔ یہ دلچسپ بات ذہن نشین رکھنے والی ہے کہ محمود گاواں کے سوانح نگار ملا عبدالکریم ہمدانی جن کی قبر بیدر میں بعد کو محمود گاواں کی قبر کے پہلو میں بنی ہے وہ اس رسم میں شریک تھے۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۶۱۔

۷ - منتخب جلد سوم صفحہ ۱۱۶ میں اس کی امکانی وجہ بیان کی گئی ہے۔ دارالسلطنت میں بغیر جاگیرداری فوج کے داخل ہونے کی اس روایت کا مقابلہ جمہوری روما کے اس رواج سے کیا جا سکتا ہے کہ امپریٹر یا کمان دار کی کمانداری شہر کی فصیل کے باہر ختم ہو جاتی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اس قدیم دستور کو ختم کیا وہ جولیس سیزر تھا جس نے اس کارروائی سے اطالیہ میں جمہوریت کی جڑ کاٹ دی۔

۸ - یہ بیان فرشتہ کا جلد اول صفحہ ۳۶۳ میں ہے۔

۹ - کہا جاتا ہے کہ ملک احمد ملک حسن نظام الملک کا مبینہ لڑکا محمد شاہ لشکری کا ایک برہمن عورت سے تھا۔ بعض نجومیوں کی ہدایت پر یہ لڑکا ملک حسن کو دے دیا گیا تھا۔ ہفت اقلیم صفحہ ۹۳۔ برہان صفحہ ۱۹۰۔ یہ روایتیں شاید اس لیے گھڑی گئیں کہ ملک احمد کی نسل کو جو احمد نگر کی حکمران ہو گئی ایک شجرہ نسب دے دیا جائے۔ نیز دیکھو فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۳۔

۱۰ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۳۔ یہ ۸۹۳ھ (۱۴۸۸ء) میں واقع ہوا۔ دیکھو قلعہ کے محمدی دروازہ کا کتبہ جس کی نقل ہیگ کے مضمون سم انسکرپشنز آن پرشین۔ ای آئی ۱۹۰۷ء صفحات ۱۰ سے ۱۴۔

۱۱ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۳ و ۳۶۴۔ برہان صفحہ ۱۲۵۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۱۷۔

۱۲ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۴۔

۱۳ - اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ پارٹی سے وفاداری ختم ہو رہی تھی اور اس کی جگہ خالص خود غرضانہ مقاصد نے لے لی تھی۔

۱۴ - یہ فرشتہ کی روایت ہے۔ طبقات صفحہ ۱۳۴ میں ہے کہ عادل خاں نے بادشاہ کو پیام بھیجا تھا کہ امرا نے دستور الممالک کی ایما پر بغاوت کی ہے۔ طبقات میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے خود مشرق کی طرف کوچ کیا اور راجہ سندری میں باغیوں کو شکست دی۔

۱۵ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۵۔ برہان صفحہ ۱۲۵۔

۱۶ - برہان صفحہ ۱۳۰۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۰۔ نظام الملک کے چند سالہ عروج پر نظر ڈالنے سے ہمیں مجبوراً اس کا مقابلہ محمود گاواں کی طویل المدت قیادت سے کرنا پڑتا ہے۔ محمود نے اس وقت بھی بھاگنے سے انکار کر دیا جب اس کی زندگی قطعی خطرے میں تھی لیکن نظام الملک نے جب دیکھا کہ دارالسلطنت میں اس کا بس نہیں چلتا تو اس نے جنیر سے اپنے لڑکے کو پوری فوج کے ساتھ بلایا۔ نظام الملک نے اپنے پانچ سالہ عروج میں نہ صرف ترکوں کو بیزار کر دیا بلکہ حبشیوں کو بھی۔ اور ان لوگوں نے بھی جنھیں وہ اپنا دوست سمجھتا تھا جب موقعہ دیکھا تو اس پر بھرپور ضرب لگائی۔

فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۵۔

۱۸۔ برہان صفحہ ۱۳۵

۱۹۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۶۵۔

۲۰۔ یہ فرشتہ کی روایت ہے۔ منتخب کا بیان ہے کہ وہ خراسانی تھا۔

۲۱۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۲۰۔ قطب شاہی خاندان کا مورثِ اعلےٰ سلطان قلی وہی تھا جس نے اُس دن سلطان کی جان بچائی۔ تاریخ قطب شاہی مخطوطہ صفحہ ۲۷۔ سطر ۱۔ ایم۔ صدیقی نے اپنی کتاب تاریخ گولکنڈہ کے صفحہ ۲۰ میں لکھا ہے کہ اس موقعہ پر اُسے قطب الملک کا خطاب دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حقیقت نہ تھی جیسا کہ خود اسی کتاب کے اگلے صفحہ ۲۱ سے ثابت ہوتا ہے۔ برہان نے صفحہ ۱۳۹ میں لکھا ہے کہ یہ خطاب جام کنڈی میں سلطان کے بہادر گیلانی کو شکست دینے کے بعد ملا۔ شاہ برج کے اوپر کا یہ محل اب تک موجود ہے۔

۲۲۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۲۲۔

۲۳۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۶۶۔

۲۴۔ برہان صفحہ ۱۴۱۔

۲۵۔ برہان صفحہ ۱۴۱۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۳۹۔

بالکنڈہ آندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد میں ہے۔ ۵۔ ۱۹ر۱۰ شمال، ۲۰ر۷۸ مشرق۔

۲۶۔ برہان کے صفحات ۱۴۳ و ۱۴۴ میں ہے کہ یہ لڑائی بادشاہ کے انتقال سے ایک سال پہلے ہوئی تھی مگر یہ بالکل قرین قیاس نہیں ہے۔ مزید برآں قاسم برید کا اس سے بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ دیونی بیدر کے شمال مشرق میں تقریباً ۳۶ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ۱۵ر۱۸ شمال، ۷۷ر۵ مشرق۔

۲۷۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۳ میں ہے کہ محمود گاواں نے ان قلعوں کو مرہٹہ سرداروں کے سپرد کر دیا تھا جنھیں وہ قابل اعتماد سمجھتا تھا"۔ شیونیری ضلع پونہ میں جنیر کے اوپر ایک پہاڑی قلعہ ہے۔ ۱۲ر۱۹ شمال، ۵۲ر۷۳ مشرق۔

۲۸۔ یہ فرشتہ کی روایت ہے۔ برہان کے صفحہ ۱۷۵ میں ہے کہ احمد کو سلطان نے کونکن کے علاقہ کو زیر کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مزید برآں برہان کے صفحہ ۱۹۰ میں ہے کہ احمد کو یہ خطاب وزیر کے انتقال کے بعد دیا گیا۔ وندراج پوری جسے اب چیرو کہتے ہیں ریاست مہاراشٹر میں ہے۔ ۱۰ر۱۸ شمال، ۷۳ مشرق۔

۲۹۔ فرشتہ جلد دوم۔ صفحہ ۹۴۔

۳۰۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۴۴۔

۳۱۔ برہان صفحہ ۱۸۸۔ ان واقعات کا سارا سلسلہ مبہم سا ہے اور فرشتہ اور برہان کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۳۲ - برہان صفحہ ۱۹۲ میں نادر الزمانی ہے - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۹ میں بہادر الزمانی ہے جس کی ترکیب غلط ہے اور شاید قرینِ قیاس بھی نہیں ہے -

۳۳ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۷۶ - برہان صفحہ ۱۹۵ -

۳۴ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۷۶ - قادر آباد ریاست مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد میں جالنہ کے قریب، ۱۹ر۱۵ شمال، ۷۵ر۵۶ مشرق -

پٹن ریاست مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد میں ایک تعلقہ کا مستقر، ۱۹ر۲۸ شمال، ۷۵ر۲۲ مشرق -

۳۵ - "باغ کی جنگ" فرشتہ جلد دوم صفحہ ۷۹ - اسی جلد کے صفحہ ۸۰ میں ہے کہ احمد نگر سنہ ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) میں آباد کیا گیا جب نظام الملک یوسف عادل کے خلاف قطب الملک اور سلطان کی مدد کرنے بیدر جا رہا تھا - دیکھو مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۹۶۶ -

احمد نگر ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں آباد کیا گیا - لیکن دیکھو ناظم کی "انسکرپشنز فرام بمبئی پریسیڈنسی - ایپیگرافیا انڈو مسلمیکا ۱۹۳۳-۳۴ء صفحہ ۴ جس میں لکھا ہے کہ احمد نگر جو قلعہ بھنگر سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اسے ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) میں محمود گاواں نے آباد کیا تھا - ٹھیک پورا احمد نگر کی زمین پر -

جیور گھاٹ ریاست اکل کوٹ میں - ۱۷ر۲۹ شمال، ۷۶ر۲۶ مشرق -

۳۶ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۸ -

۳۷ - یہ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۸ میں ہے - اسی جلد کے صفحہ ۲ میں فرشتہ نے لکھا ہے کہ دراصل قاسم برید یہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے بیجاپور کو حاصل کیا جائے - سیویل اینڈ اینگر نے صفحہ ۱۳۲ میں اس کی تاریخ ۱۴۹۲ء لکھی ہے - فرشتہ نے لکھا ہے کہ وجے نگر کی افواج کا کمان دار "تیمراج" تھا مگر یہ شاید اس کے نام کو وجے نگر کے جواں سال حکمران کے نام سے خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے -

۳۸ - یہ علاقے مذبذب حیثیت میں رہے ہوں گے اور ان کی حکومت مرکزی حکومت کی کمزوری یا فقدان کی وجہ سے برابر بدلتی رہی ہوگی - بہادر کے متعلق دیکھو بعد کی تشریح - نیز دیکھو فردر سورسز جلد اول صفحات ۱۶۶ و ۱۶۷ جس میں تماد یو کو نرسمہا کے برابر بتایا گیا ہے -

۳۹ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۵ - فرشتہ نے ایک کتاب عادل نامہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لڑائی نلدرگ میں ہوئی اور یہ کہ اس موقعہ پر نظام الملک موجود نہ تھا - نیز دیکھو فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۶۸ -

۴۰ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۷ میں ہے کہ یہ لڑائی یا بیدر میں ہوئی ہوگی، یا نلدرگ میں -

۴۱ - طبقات صفحہ ۴۲۳ -

۴۲۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۸۔ پنہالا ریاست مہاراشٹر میں ایک پہاڑی سلسلہ کے موڑ پر ایک پہاڑی قلعہ۔ ۴۸ء ۱۶ شمال، ۸۰ء ۷۴ مشرق۔

۴۳۔ کیمبرج کی تاریخ گجرات جلد اول صفحہ ۲۰۴۔

۴۴۔ بہ بیان فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۹ میں ہے۔ طبقات صفحہ ۲۳۴ میں بیس جہاز ہیں اور تاریخ ۸۷۳ھ دی ہے لیکن یہ یقیناً غلط ہے اس لیے کہ بہادر نے ہتھیار ڈالنے کی پیش کش اس کے بعد کی ہے جو بادشاہ کو ۲۰ رجب ۸۷۵ھ کو ملی۔

۴۵۔ اصل خط برہان کے صفحہ ۱۴۷ میں ہے اور خفیف تغیر کے ساتھ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۸ میں۔

۴۶۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۸۰۔ طبقات کے صفحہ ۲۳۴ میں ہے کہ کمال خاں کو خشکی کے راستہ سے بھیجا گیا اور صفدر خاں کو سمندر کے راستے سے۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۸ میں دونوں کو "بہمنی امیر البحر" کہتا ہے۔

۴۷۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۸۔

۴۸۔ لیکن برہان نے صفحہ ۱۵۰ میں لکھا ہے کہ قطب الملک کا خطاب اور جاگیر بہادر گیلانی کی شکست کے بعد دی گئی تھی۔ دیکھو اوپر تشریح نمبر ۳۱۔ برہان صفحہ ۱۵۰۔

۴۹۔ طبقات صفحہ ۱۴۱۔

۵۰۔ یہ روایت فرشتہ کی جلد اول صفحہ ۳۶۹ میں ہے۔ طبقات میں ۵ رجب ۸۷۶ھ (۱۷ دسمبر ۱۴۷۱ء) ہے۔ طبقات کے صفحہ ۲۳۴ میں سفیر کا نام دیا ہوا ہے جہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ولی عہد میرج کی فصیل کے باہر پیدا ہوا تھا۔ برہان نے صفحہ ۱۴۹ میں بونا کا نام دیا ہے۔ شکست کے بعد بونا کے ہندو رئیس کا شاہی دربار میں بڑے احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔

۵۱۔ برہان صفحہ ۱۵۲۔

۵۲۔ تاریخ برہان کے صفحہ ۱۵۳ میں ہے۔ باقی حال فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۰ سے لیا گیا ہے۔

۵۳۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۹۔

۵۴۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۸ میں ہے کہ وہ دوسروں کی طرح "سکے ضرب کرنے والا" حکمران ہونا چاہتا تھا لیکن جیسا کہ بعد کو معلوم ہوگا ان میں سے کسی بھی حکمران نے اپنا سکہ نہیں جاری کیا۔ فرشتہ کی یہ روایت بھی مشتبہ ہے کہ دستور نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

۵۵۔ برہان صفحہ ۱۵۳۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۱۔

۵۶۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۷۱ میں لکھا ہے کہ لڑائی گنگاوتی میں ہوئی تھی اور جلد دوم صفحہ ۹ میں ہے

کہ الندمیں ہوئی تھی۔ یہاں قاضی عسکر کا خطاب دلچسپ ہے اس لیے کہ وہ انگلستان کے لارڈ چانسلر کے رتبہ کا ترکی افسر تھا اور محمد دوم کے قانون نامہ کے بموجب اُس کی نشست صدر اعظم کے بائیں ہاتھ پر تھی۔ گلبرگہ میں اس عہدہ کے ذکر سے اس کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ عادل شاہیوں کا یہ دعوی تھا کہ وہ سلاطین ترکی کی اولاد سے ہیں۔ دیکھو ڈی لاجانکو کی کتاب ہسٹری ڈی لا ایمپائر آٹومان جلد دوم صفحہ ۱۱۹۔

۵۷۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۷۲۔

۵۸۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۷۶۔

۵۹۔ برہان صفحہ ۱۵۸۔

۶۰۔ کے۔ اینگر کی کتاب سورسز آف وجے نگر ہسٹری صفحات ۹ و ۸۸ و ۱۰۶۔ جس میں ورہا پورانم اور پرجاپت ہرمن کی تلنگی نظم کا حوالہ ہے۔ دیکھو فرد رسورسز جلد اوّل صفحات ۱۴۷ و ۱۴۸۔

۶۱۔ بنرجی، کتاب مذکور صفحات ۳۱۵ و ۳۱۶۔

کاول کنڈہ ریاست اندھرا پردیش کے ضلع محبوب نگر میں۔ ۵۴ر۱۶ شمال، ۴۷ر۷۷ مشرق۔

۶۲۔ ڈاکٹر سری نواس آچار کا مضمون ہسٹری آف ورنگل، حیدرآباد آرکیالوجیکل رپورٹ ۱۹۳۳-۳۴ء صفحہ ۴۳۔ فاضل ڈاکٹر کا سارنگ خاں کو "شتاب خاں" سے منطبق کرنا بظاہر بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ صفحہ ۴۴ میں بظاہر غیر معمولی نظریاتی بحث ہے کہ سیتاپتی سارنگ خاں کا "ہندو نام" ہے۔ دیکھو اے ویرا بھدرا راؤ کی سیتاپت شتاب خاں ساہتیہ اے کندورائے، حیدرآباد ۱۹۶۵ء۔ شیروانی کا مضمون "شتاب خاں آف ورنگل کی شناخت" ایچ ایس جارضو اکتوبر ۱۹۶۱ء صفحات ۲۴۹ و ۲۵۰۔ فرد رسورسز جلد اوّل صفحہ ۱۹۰۔ دیکھو سیویل کی اے فارگاٹن ایمپائر صفحہ ۱۳۳۔

۶۳۔ برہان صفحہ ۱۵۷۔ سیویل اینڈ اینگر نے اس مہم کی تاریخ ۱۴۶۲ء لکھی ہے۔

۶۴۔ بنرجی، کتاب مذکور۔ ۴ مئی ۱۵۱۶ء کو جو وجے نگر کے گورنر کی طرف سے زمین دیے جانے کے کتبہ کی تاریخ ہے اُس کے بموجب کونڈاپلی کرشن دیورائے کے قبضہ میں رہا ہوگا۔ دیکھو حیدرآباد آرکیالوجیکل رپورٹ ۱۹۳۴-۳۵ء صفحہ ۷۲۔ اینگر کی سورسز آف وجے نگر ہسٹری صفحہ ۱۴۰۔ ایک روایت یہ ہے کہ کرشن دیورائے بیدر تک بڑھ آیا اور اُس کی فصیل گرا دی لیکن اس کے ثبوت میں کوئی شہادت نہیں ہے۔ مزید برآں فصیل کے منہدم ہونے کا مطلق کوئی نشان نہیں ہے۔ کرشن دیورائے کی قلی قطب الملک سے آویزش کے واقعات بہت ہی مبہم ہیں

امرادتی ریاست تامل ناڈو کے ضلع گنٹور میں قدیم بدھسٹ آثار کی جگہ۔ ۳۴ر۱۶ شمال، ۲۳ر۸۰ مشرق۔

اڑیسہ کا پرتاپ رودر ۱۴۹۶ء سے ۱۵۲۹ء۔

٦٤ - (الف) برہان صفحہ ١٥٨ -

٦٥ - برہان صفحہ ١٥٨ و ١٥٩ - منتخب جلد سوم صفحہ ١٢٩ -

٦٦ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ١٨٦ میں ہے کہ قاسم نے اپنے نام کا خطبہ اوسا، قندھار اور اودگیر میں پڑھوایا لیکن یہ جنیر اور دیگر مقامات پر خطبہ پڑھوانے کی روایت سے بھی زیادہ خلاف قیاس ہے۔ چونکہ سلطان متواتر اس کے قابو میں رہا اس لیے محض دکھاوے کے لیے "تاج کے دوستوں" کی ہمدردی کھونے کی ضرورت نہ تھی۔

٦٧ - یہ برہان صفحہ ١٦١ اور فرشتہ جلد اول صفحہ ٣٧٣ میں ہے لیکن منتخب جلد سوم صفحہ ١٢٨ میں سنہ ٩١٣ھ و سنہ ٩١٦ھ کے درمیان یقیناً صحیح تاریخ ہے اس لیے کہ یوسف عادل کا انتقال اُس کے مادۂ تاریخ "گفتا نمانده شہنشاہ عادل" (کہو کہ عادل شہنشاہ ختم ہوگیا) سے یہی تاریخ نکلتی ہے۔ نیز دیکھو برہان صفحہ ٢٢ -

٦٨ - برہان مآثر مطبوعہ حیدر آباد کے صفحہ ١٦١ میں ہے کہ سنہ ٩٠٦ھ میں فتح اللہ کی ریاست علاء الدین کو واپس کردی گئی جو یقیناً چھاپے کی غلطی ہے۔ قدرتاً اسے سنہ ٩١٦ھ ہونا چاہیے۔

٦٩ - برہان صفحہ ١٦١ -

٧٠ - منتخب جلد سوم صفحہ ١٢٩ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ١٦ -

٧١ - برہان صفحات ١٦١ و ١٦٣ -

٧٢ - برہان کے صفحہ ١٦٦ میں ہے کہ اس کی عمر صرف ٣٧ سال دو ماہ کی تھی۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ٣٧٤ میں لکھا ہے کہ اس نے ٣٥ سال ٢٠ دن حکومت کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے اس لیے کہ محمد سوم کا انتقال ٹھیک ٥ صفر سنہ ٨٨٧ھ کو ہوا اور اُس وقت سے ٣١ ذی الحجہ سنہ ٩٢٣ھ تک حساب لگانے سے ٣٦ سال ١ ماہ اور ٢٠ دن ہوتے ہیں۔ ٣ ذی الحجہ سنہ ٩٢٣ھ (٢٧ دسمبر سنہ ١٥١٨ء) کے مطابق ہے۔ دیکھو سیویل اینڈ اینگر صفحہ ٢٤٢ - سیویل نے اپنی کتاب اے فارٹن ایمپایر کے صفحہ ٣١١ میں جو تاریخ ١٨ دسمبر سنہ ١٥١٧ء محمود کے انتقال کی لکھی ہے وہ قطعی غلط ہے۔

٧٣ - فرشتہ جلد اول صفحہ ٣٧٤ - طبقات صفحہ ٤٣٦ -

٧٤ - یہ ہفت اقلیم کے صفحہ ٦٢ میں ہے۔ فرشتہ جلد اول صفحات ٣٦٥ و ٣٦٧ میں تخت کی بربادی ہے۔

٧٥ - یہ قابل ذکر بات ہے کہ جو تاریخیں دہلی میں لکھی گئیں جیسے منتخب اللباب انھیں اسے شاہی لقب سے موسوم نہیں کیا گیا ہے۔

٧٦ - پرتگال کے ہندوستان کو فتح کرنے کی کوشش میں جو مذہبی اثرات برسرِ اقتدار تھے ان کے مختصر حال کے لیے دیکھو اے۔ ایم۔ پوپ کی کتاب انڈیا ان دی پرتگیز لٹریچر مطبوعہ گوا سنہ ١٩٣٧ء صفحات ٣٠ و مابعد۔

۷۷۔ کیمبرج کی ہسٹری آف گجرات صفحہ ۲۴۵۔

۷۸۔ البوکرک ۱۵۰۹ء سے ۱۵۱۵ء تک وائسرائے رہا۔

۷۹۔ لیکن فرشتہ جلد دوم میں ہے کہ پرتگالی یوسف عادل ہی کے زمانہ میں گوا میں آچکے تھے۔ اور انھوں نے "سارے باشندوں" کو قتل کر دیا تھا لیکن یوسف نے دوبارہ اس شہر کو فتح کر لیا۔ سیویل کا بیان ہے کہ یہ دوسری فتح یکم مارچ ۱۵۱۰ء کو ہوئی یعنی فرشتہ کی دی ہوئی تاریخ کے ایک دن بعد۔

۸۰۔ کیمبرج صفحہ ۲۴۵۔ رشوت و بداخلاقی۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۴۔

۸۱۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۵۔

۸۲۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۴۔

۸۳۔ پرتگالیوں کی آمد اور اس کے بعد کے واقعات کا مفصل حال ڈنہم کی ہسٹری آف اسپین اینڈ پرتگال میں ہے جس کا حوالہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۱۰ صفحات ۴۷۹ و مابعد میں ہے۔

۸۴۔ یقیناً کچھ نقائص تھے چنانچہ بیجاپور میں کمال خاں دکھنی کے قتل کے بعد ہی ریجنٹ پونجی خاتون نے یہ اعلان جاری کیا کہ آیندہ سے بیجاپور "مغل سلطنت کا" ہوگا۔

۸۵۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۳۱۴ میں ہے کہ یہ ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں ہوا جب کہ یوسف عادل اور فتح اللہ عماد الملک کے پاس سفیر بھیجے گئے۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۷۰۴ میں ہے کہ عماد الملک نے ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا، جس کے بعد ملک برید نے اور پھر نظام الملک نے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ "نشان آزادی" ان امرا نے سلطان محمود کے عہد میں نہیں اختیار کیا۔

۸۶۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۶۷۔

۸۷۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۷۔ جلد اول صفحہ ۳۷۳ میں فرشتہ کا بیان ہے کہ قطب الملک نے بادشاہ کا نام تو خطبہ سے خارج کر دیا مگر سلطان کو ہر مہینے ۵۰۰۰ ہن خراج برابر بھیجتا رہا۔

۸۸۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۵۔

۸۹۔ شاہی نشان کے طور پر خطبہ اور سکے کی بحث کے لیے دیکھو قریشی کی کتاب ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیت آف دہلی صفحہ ۴۷۔

۹۰۔ برہان صفحات ۱۹۰ و ۲۰۴۔

۹۱۔ ایپی گریفیا انڈو مسلیمیکا سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء صفحہ ۲۷۔ یہ ملحوظ رہے کہ یوسف عادل اور اُس کے تین جانشینوں کو ضلع گلبرگہ کے مقام گوگی میں دفن کیا گیا جو یوسف عادل کے پیر شیخ جلال الدین محمد عرف چندا حسینی

زوفات ۱۰ شعبان ۸۵۸ھ = ۵ اگست ۱۴۵۴ء) کے مزار کے قریب ہے اور ان کی قبروں پر کوئی کتبہ نہیں ہے بجز اس کے جو حال میں حکومت حیدر آباد نے نصب کردیا ہے۔ دیکھو اپی گریفیا انڈو مسلیمیکا ۱۶-۱۹۱۵ء صفحہ ۵۔

۹۲ - یادداشت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نمبر ۴۹ (کتبات بیجاپور) صفحہ ۲۵، کتبہ نمبر ۲۲۵۶ خواجہ سنبل کی مسجد میں ہے۔ اس کی تاریخ ۹۴۳ھ (۱۵۳۷ء) ہے۔ اس کے برخلاف کتبہ نمبر ۲۱۰ (صفحہ ۲۶) اور نمبر ۲۰۰۴ (صفحہ ۲۴) میں حکمران کا نام ابراہیم عادل شاہ ہے اور اس کی تاریخ ۹۴۵ھ (۱۵۳۹ء) ہے۔ چنانچہ "آزادی" کا اعلان ۹۴۳ھ (۱۵۳۸ء) میں ہوا ہوگا۔ اس کا ذکر شاید سب سے پہلے ڈاکٹر ناظم نے صفحہ ۶ پر کیا۔ اور مجھے خواجہ محمد احمد سابق مہتمم حیدر آباد میوزیم نے اس طرف توجہ دلائی۔

۹۳ - ظفر الوالیہ صفحہ ۱۰۰۔

۹۴ - فرشتہ جلد دوم صفحہ ۹۔

۹۵ - دوارتے باربوسا کی کتاب ہکلیوت سوسائٹی لندن، مقدمہ صفحہ ۶۳۔ باربوسا نے مسلمانوں کے لیے موروز کا استعمال کیا ہے اور ہندوؤں کے لیے جنٹیوز کا۔ لانگ ورتھ ڈیمز نے بلا کسی دلیل کے جنٹیوز کا ترجمہ کافر کیا ہے۔ لیکن اس کی عبارت نقل کرنے میں میں نے اصل لفظ جنٹیوز برقرار رکھا ہے۔ زوجارلیس = عربی، ہنٹر۔

۹۶ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۱۔

۹۷ - یہ تاریخ منتخب کے صفحہ ۲۶ ۱۳ میں ہے۔ ہان نے صفحہ ۹۵ میں لکھا ہے کہ یہ خانہ جنگی ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں ہوئی۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۷۲، اور جلد دوم صفحہ ۹ میں اس جدت کی تاریخ ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) دی ہے۔ لیکن صحیح تاریخ ۹۱۱ھ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ یہ یوسف عادل کے بیجاپور میں اثنا عشری خطبہ رائج کرنے کی تاریخ کے مطابق ہوتی ہے۔ یوسف عادل کے تبدیل مذہب کی تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۱۱ میں ہے۔

۹۸ - فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۲- بہمنی سلطنت میں شیعہ اثرات اور یہ امکان کہ محمود گاواں خود شیعہ تھا۔ اس کے لیے دیکھو شیروانی کی کتاب محمود گاواں صفحہ ۱۹۳، تشریح نمبر ۳۶۔ یوسف نے صرف اسی چیز کا اعلان کرنے کی کوشش کی جو پہلے ہی سے آبادی میں ایک معقول تعداد اقلیت کا عقیدہ تھا۔ یہ کشمکش اس لحاظ سے قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ یہ مذہب کے لیے جنگ ہوئی تھی۔ بعد کو یورپ میں یہ عام بات ہوگئی لیکن میرے مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے غرض مند مورخوں نے مذہب کو چاہے جتنا اچھالا ہو مگر ساری لڑائیاں ذاتی نفع کی خاطر ہوئیں۔

یہاں یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ یوسف کی شیعیت بہت معتدل اور رواداراسہ قسم کی تھی اور فرشتہ نے جلد دوم صفحہ ۱۱ میں صاف لکھا ہے کہ وہ کبھی کسی خلیفہ کو برا کہنے کا روادار نہ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیجاپور

میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان اچھا خاصا میل جول تھا۔"

۹۹۔ "وہ غرور و نخوت سے اتنا بھر گیا تھا کہ روشن سورج بھی اُسے ایک دھبہ نظر آتا تھا"۔ جس شعر میں حضرت علی کی مدد مانگی گئی تھی وہ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۴ کے بموجب حسب ذیل ہے۔

در بحر غم فتادم و امواج بے عدد تا چند دست و پا بزنم یا علی مدد

(میں بحر غم میں ڈوبا ہوا ہوں اور بے شمار موجیں میرے اوپر گذر رہی ہیں۔ کب تک ہاتھ پیر ماروں۔ اے علی مدد کر) بہمنی فیروز کے وقت سے یقیناً سنی تھے لیکن تفضیلیت کی طرف مایل تھے، یعنی یہ کہ پہلے خلیفہ خواہ کتنے ہی جایز طور پر منتخب ہوئے ہوں مگر حضرت علی کئی پہلو سے اُن سے برتر تھے۔

۱۰۰۔ فرشتہ جلد اوّل صفحات ۲۷۳ و ۲۷۷۔ یہ واقعہ برہان کے صفحہ ۱۹۰ میں کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے مگر بنیادی باتوں میں دونوں متفق ہیں۔

۱۰۱۔ شاہ اسماعیل صفوی شہنشاہ ایران سنہ ۱۵۰۱ء سے سنہ ۱۵۲۳ء۔ ایران شیعہ مذہب کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان سنہ ۱۵۰۱ء میں ہوا۔ بہادر شاہ بادشاہ گجرات سنہ ۱۵۲۶ء سے سنہ ۱۵۳۷ء۔

۱۰۲۔ فرشتہ جلد دوم صفحات ۱۵ و ۱۶۔ اس جگہ اور نیز دوسرے مقامات پر "مغل" کا مطلب ایرانی ہے۔

۱۰۳۔ کتبات یادداشت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نمبر ۴۹ صفحات ۴۷ و ۴۸۔ ڈاکٹر ناظم کا حوالہ صفحہ ۶ پر۔ اسماعیل عادل سنہ ۱۵۱۰ء سے سنہ ۱۵۳۴ء۔ ملو عادل سنہ ۱۵۳۴ء سے سنہ ۱۵۳۵ء۔ ابراہیم عادل سنہ ۱۵۳۵ء سے سنہ ۱۵۵۷ء۔

۱۰۴۔ یزدانی کی کتاب اینٹی کوی ٹیز آف بیدر صفحہ ۱۴۳۔

تیرہواں باب

آخری منزل

۷ دسمبر ۱۵۱۸ء سے ۱۵۲۸ء

ظاہری اسباب

ہم نے بعد کے بہمنیوں کی سیاسی تاریخ پر شہاب الدین محمود کے انتقال کے وقت تک نظر ڈالی ہے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا یہ تاریخ بیشتر بیدر کے شہر اور چند میل گرد و پیش تک محدود ہے۔ اگرچہ نظری حیثیت سے سارا وسیع خطہ جس میں بیجاپور، احمد نگر، برار، اوسا اور قندھار اور خاص تلنگانہ شامل ہیں بہمنی سلطنت کا حصہ تھے لیکن خود سلطان کی حکمرانی اُس کی ذاتی جائداد تک محدود تھی جو گھٹتے گھٹتے بالکل صفر رہ گئی تھی۔ ہم نے باہر کی ریاستوں کے حالات کی تفصیل بیان کرنے سے قصداً احتراز کیا اس لیے کہ ان حالات کا تعلق دراصل بہمنی سلطنت کے شمالی، مغربی اور مشرقی علاقوں میں اُبھرنے والی سلطنتوں کی اپنی تاریخ سے ہے مگر خود سلطنت کے خاتمہ کا مزید حال بیان کرنے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ ذرا ٹھہر کر سرسری طور پر ان حالات کا ذکر کر دیا جائے جو دارالسلطنت کے قرب و جوار میں رونما ہو رہے تھے تاکہ اس عظیم خانوادہ کے آخری افراد کے ماحول کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ہم نے گوا کی فتح، شکست اور دوبارہ فتح کے وقت تک اور بالآخر اسے بیجاپور کے اسماعیل عادل کے پرتگالیوں کے حوالے کر دینے تک کے حالات کا ذکر کر دیا ہے۔ قریبی جنوب میں کرشن دیو رائے کی شخصیت میں

جو شاید وجے نگر کا عظیم ترین حکمران تھا اور وسط ۱۵۰۹ء میں اپنے بھائی ویر نرسمہا کا جانشین ہوا تھا اور بیس سال تک حکومت[1] کی ایک بڑی طاقت اُبھر آئی تھی جس وقت بہمنی سلطنت تیزی کے ساتھ روبہ انحطاط تھی اور جو نئی سلطنتیں اس سے بنی تھیں وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ وجے نگر کرشن دیو رائے کی ماتحتی میں درجہ بدرجہ اپنی قوت بڑھا رہا تھا۔ تقریباً وجے نگر کے بڑے ہال میں اس کی تخت نشینی کے فوراً ہی بعد سنہ ۱۵۱۰ء میں پرتگالی وائسرائے البوکرک نے ایک خاص سفارت فادر لوئی کی قیادت میں روانہ کی اور رائے سے استدعا کی کہ وہ بیجاپور اور مسلمانوں کے حامی کالی کٹ کے زمورین کے خلاف متحدہ محاذ میں شریک ہو جائے۔ یہ سفارت جس مقصد کے لیے آئی تھی اُس میں ناکام رہی اور فادر لوئی قتل کر دیا گیا۔[2]

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کرشن دیو رائے نے بہمنیوں کو دبا کر رائچور اور مدگل حوالے کرنے پر اور گج پتیوں کو ساحل کا علاقہ خالی کر دینے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وجے نگر کے طاقتور حکمران کے دبانے سے دو حکمران نہ دب سکے یعنی بیجاپور کا یوسف عادل اور قطب الملک گورنر تلنگانہ۔ ہمیں یوسف عادل اور کرشن دیو رائے کے درمیان متعدد لڑائیوں کا حال ملتا ہے جس میں کرشن دیو رائے کو ہمیشہ کامیابی نہیں ہوئی اور معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں قطب الملک نے اُس پر غلبہ حاصل کر لیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۵۲۳ء میں اُس نے کونڈاپلی اور بیجواڑہ کے درمیان چند گاؤں خیراتی کاموں کے لیے وقف کیے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اس سال سے پہلے ان مقامات کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔[3]

مغرب، جنوب اور مشرق کے حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات، بالکل واضح ہو جاتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بہمنی سلطان کا اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں شہاب الدین محمود جب تک زندہ رہا سلطنت کو مرکز سمجھا جاتا رہا اور جاگیرداروں کی مسلسل باہمی آویزش میں اس کے نام کی اخلاقی مدد لی جاتی تھی لیکن اپنی حکومت کے آخری زمانہ میں خود سلطان کا کوئی اقتدار باقی نہ رہا تھا اور بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے حکمران اپنے آپ فتوحات کی مہم جاری کیے ہوئے تھے۔ محمود کے عہد میں سلطان کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہی تھی اور جیسے جیسے وقت گذرتا گیا بیدر کے باہر کے لوگ اُسے دھیان میں بھی نہ لاتے تھے۔ محمود کے انتقال کے بعد بہمنی سلطان محض نام کا رہ گیا جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔

احمد چہارم

۷ر دسمبر ۱۵۱۸ء سے ۱۵ر دسمبر ۱۵۲۰ء

امیر برید حکومت میں اتنا طاقتور تھا کہ اگر وہ چاہتا تو حکومت پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا اور اس طرح اپنی اولاد سے پہلے حکمراں بن گیا ہوتا مگر وہ بڑے جاگیرداروں سے ٹکر نہ لے سکتا تھا جو بیجاپور، احمد نگر اور دوسرے مقامات پر جاگزیں تھے۔ زیادہ تر اسی وجہ سے اُس نے محمود کے لڑکے احمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن احمد شاہ امیر برید کی سخت گرفت میں تھا جس نے اتنی احتیاط کی کہ وہ نہ صرف محل سے باہر نکلنے پائے بلکہ اُس کی زندگی اور اخلاق کو بھی برباد کرنے کی کوشش کی۔ اِس لیے اُس نے حکم دے دیا کہ کوئی عام آدمی بجز ناچنے اور گانے والے کے سلطان کے پاس نہ جانے پائے[۳۵]

محمود شاہ کے انتقال تک قطب الملک کثیر رقم سلطان کو بطور خراج بھیجا کرتا تھا مگر جب اُس نے دیکھا کہ سلطان اتنا کمزور ہے کہ سیاست کے کھیل میں مہرہ بھی نہیں بنایا جا سکتا تو اُس نے اپنی پیشکش بند کر دی۔ اور سلطان نے مجبور ہو کر بہمنیوں کے قدیم تخت کو جس کی قیمت ۱۰ لاکھ روپیہ تھی توڑ ڈالا اور اُس کے جواہرات بیچ کر اپنے عیش و عشرت میں صرف کیا امیر برید نے جب یہ سُنا تو وہ سخت برہم ہوا اور جن لوگوں کے ذریعہ سے جواہرات فروخت ہوئے تھے اُن میں سے کئی آدمیوں کو قتل کر دیا، خاص کر جب اُس نے یہ سُنا کہ شاہی جواہرات باہر برآمد کر دیے گئے اُس وقت کٹھ پتلی کے بادشاہ نے اپنے برادر نسبتی اسماعیل عادل خاں کو پیام بھیج کر اپنے وزیر کی سخت گیری کی شکایت کی جس کے جواب میں اسماعیل نے اُسے قیمتی تحائف بھیجے لیکن ان تحائف کے دارالسلطنت پہنچنے سے پہلے ہی سلطان چل بسا۔ یہ حادثہ ۴ر محرم ۹۲۶ھ ۱۵ر دسمبر ۱۵۲۰ء کو پیش آیا[۳۶]

علاء الدین شاہ

۱۵ر دسمبر ۱۵۲۰ء سے ۵ر مارچ ۱۵۲۳ء

احمد کے انتقال پر امیر برید کی بادشاہ بننے کی خواہش پھر اُبھر آئی اور کہا جاتا ہے کہ اُس کے بعض

دوستوں نے استدعا بھی کی کہ وہ شاہی تاج پہن لے مگر اُس کی ہمت نے پھر جواب دے دیا اور پندرہ دن سوچنے کے بعد اُس نے ۷ ارمحرم ۹۲۷ھ (۸ ۲ر دسمبر ۱۵۲۰ء) کو احمد کے لڑکے علاء الدین کے سر پر تاج رکھ دیا۔[۵۹] نیا سلطان اپنے باپ اور دادا سے مختلف تھا اس لیے کہ وہ "عاقل اور جری" تھا اور شراب اور عیش و عشرت سے پرہیز کرتا تھا اور پورے طور پر سمجھ لیا تھا کہ اُس کے باپ اور دادا دونوں شراب نوشی میں تباہ ہوئے۔ اُس نے امیر برید کو طلب کیا اور کہا کہ اُس کا والد بُری طرح مخرب اخلاق عیاشی میں پڑ گیا تھا مگر خود اُس نے شراب سے پرہیز اور سلطنت کے کاموں میں حصہ لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اُس نے امیر برید سے کہا کہ یا تو اسے جاسوسوں کے پنجے سے نجات دی جائے جس سے اس کا دم گھٹا جاتا ہے ورنہ اُسے مکہ معظمہ جا کر اپنی زندگی کے آخری دن وہاں گذارنے کی اجازت دی جائے۔ امیر بریدنے اُسے جاسوسوں سے نجات دے دی۔

علاء الدین یا تو ضرورت سے زیادہ ہوشیار تھا اور یا ضرورت سے زیادہ بیوقوف، اس لیے کہ اُس نے امیر برید کو بلکہ سارے بریدی قبیلہ کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی۔ اُسے خبر نہ تھی کہ امیر برید کو سلطنت کے معاملات میں کتنا قابو حاصل ہے اور زیادہ دن نہیں گذرے کہ سازش کا پردہ فاش ہو گیا اور سلطان کے مددگاروں کو اذیت کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ خود سلطان کو دو قمری سال اور تین ماہ برائے نام حکمران رہنے کے بعد، ۷ ارمحرم ۹۲۹ھ (۵ رمارچ ۱۵۲۳ء) کو تخت سے اتار دیا گیا۔[۶۰]

ولی اللہ

۵ رمارچ ۱۵۲۳ء سے ۱۵۲۶ء

امیر بریدنے اب سلطان محمود کے چھوٹے لڑکے ولی اللہ کو متزلزل تخت پر بٹھایا۔ ولی اللہ نے اُس گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی جو اُس کے چاروں طرف تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زنان خانے میں قید کر دیا گیا اور اپنے آقا محل کے منتظم کے دیے ہوئے "روٹی کپڑے" پر گذر کرنے لگا۔[۶۱] شاید شاہی خاندان سے رشتہ قائم کرنے کے خیال سے امیر بریدنے احمد کی خوبصورت بیوہ بی بی ستی سے شادی کر لی جس کی عمر صرف ۲۲ یا ۲۳ سال کی تھی۔[۶۲] اب امیر برید شاہی خاندان کا رکن ہو گیا اور آزادی سے محل کے زنان خانے میں آنے جانے لگا۔ اور خود ملکہ جب اس کے سامنے ہوئی تو اُس کی صورت پر فریفتہ ہو گیا اور اُس سے اظہار عشق کرنے لگا۔[۶۳] اس پر یقیناً بیچارے سلطان نے احتجاج کیا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع ۹۳۲ھ

(۱۵۲۶ء) میں، تین سال کی حکومت کے بعد سلطان کو زہر دے کر مار دیا گیا۔[۱۴]

یہ سب تو بیدر میں ہو رہا تھا لیکن دکن کے دوسرے حصوں میں بہمنی روایات جاری و ساری تھیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) اور سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں ایک مسجد کی یادگار کے ایک کتبہ میں اور ساگر کے عاشور خانہ میں نصب ایک تختی میں ابراہیم اب بھی خود کو ”بادشاہ ولی اللہ کا وزیر“ کہتا ہے[۱۵]

کلیم اللہ

۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۸ء

بہمن شاہ کے خانوادہ کا آخری بادشاہ ولی اللہ کا بھائی کلیم اللہ تھا[۱۶] جسے امیر برید نے تخت نشین کیا مگر اُسے پورے طور پر حفاظت میں رکھا۔ اب ہندوستان کے مطلع پر ایک نئی قوت ظہیر الدین محمد بابر شاہ کی شخصیت میں نمودار ہوئی جس نے ۸ رجب سنہ ۹۳۲ھ (۲۲ اپریل ۱۵۲۶ء) کو پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست دے دی اور دکن کے تمام حکمرانوں یعنی بیجاپور، احمد نگر، برار اور برہان پور کے حکمرانوں نے مغل فاتح کو مبارک باد دینے کے لیے اپنے اپنے سفیر دہلی بھیجے۔[۱۷] کلیم اللہ نے بھی بابر کو لکھا کہ اگر وہ بریدی جوئے سے اُس کی گلو خلاصی کرا دے تو برار اور دولت آباد (جو اس کے قبضہ میں نہ تھے) اُسے نذر کر دیے جائیں۔[۱۸] لیکن یہ خبر افشا ہو گئی اور سلطان اپنی زندگی خطرے میں دیکھ کر سنہ ۹۳۴ھ (۱۵۲۷-۲۸ء) میں بیجاپور چلا گیا۔ مگر یہ محسوس کر کے اسماعیل کے دارالسلطنت میں بھی اُس کا قرار واقعی خیر مقدم نہیں کیا گیا اُس نے احمد نگر چلا جانا مناسب سمجھا۔ پہلے تو برہان نظام الملک نے اس امید میں کہ وہ بیدر کے بالآخر فتح کرنے میں اُسے استعمال کرے گا سلطان کا اتنا ادب کیا کہ اُسے تخت پر بٹھایا اور خود ہاتھ باندھ کر اُس کے سامنے کھڑا ہوا لیکن اُسے مشورہ دیا گیا کہ اگر اُس نے دوبارہ اتنا ادب کیا تو خود اُس کا رعب و داب ختم ہو جائے گا اور ملک کے نظم و ضبط میں کمزوری آ جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد برہان نے پھر کبھی کلیم اللہ کو کھلے دربار میں نہیں بلایا۔

اب صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ احمد نگر میں قدرتی موت سے یا زہر خورانی سے جلد ہی کلیم اللہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا جنازہ محمد آباد بیدر بھیج دیا گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی قبر میں اپنے نامور اجداد کے مزارات کی صف میں دفن ہے۔[۱۹] لیکن اس خانوادہ کے قطعی ختم ہونے کی تاریخ کا پتہ چلانا باعث دلچسپی

ہوگا اور یہ کہ آخر تک ہر چھوٹے بڑے کے ذہن پر بہمن کے نام کا کتنا اثر رہا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مورخ کو واقعات کے تسلسل کو معین کرنے کی کاوش میں دشواری ہوتی ہے لیکن سکوں کے ذریعے سے اس کی مشکل حل ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے سنہ ۹۳۴ھ (سنہ ۱۵۲۸ء) میں کلیم اللہ نے بیدر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا، مگر ہمیں اس کے نام کے سکے سنہ ۹۵۱ھ اور سنہ ۹۵۲ھ (سنہ ۱۵۴۴ء) اور (سنہ ۱۵۴۵ء) تک ملتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سلطان احمد نگر میں کئی سال تک مقیم رہا ہوگا۔[20] اس میں شک نہیں کہ ہمیں دوسرے مقامات پر ایسے سکے ملتے ہیں جو بادشاہ کے نام کے ہیں اور اُس کے انتقال کے بعد کئی برس چالو رہتے ہیں[21] لیکن اگر بیجاپور کے بعض قابل ذکر کتبوں کی شہادت نہ ہوتی تو یہ قیاس مشتبہ سمجھا جاتا۔ پہلا کتبہ قلعہ کی دیوار کے باہر نصب ہے جس میں مجلس رفیع عادل خاں کے مدگل پر قابض ہونے کا ذکر ہے۔[22] اس کتبہ پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ سنہ ۱۵۲۹ء کے بعد شاید سنہ ۱۵۳۰ء میں اسمٰعیل عادل نے وجے نگر کے کرشن دیورائے کے جانشین اچیوتا رائے سے دوآبہ فتح کیا تھا جس میں مدگل بھی شامل ہے۔ دوسری تختی خواجہ سنبل کی مسجد کے پاس ایک شکستہ دیوار میں نصب ہے جس کی تاریخ سنہ ۹۳۵ھ (سنہ ۱۵۲۹ء) ہے (یعنی اوپر ذکر کیے ہوئے سکوں کی تاریخ) اور جس میں بیجاپور کے چوتھے حکمران کو صرف مجلس رفیع عادل خاں کہا گیا ہے۔[23] یہ بڑی قابل لحاظ بات ہے کہ بیجاپور کا حکمران ان سکوں کی تاریخ تک جو کلیم اللہ کا آخری سکہ ہے اپنے کو مجلس رفیع کہتا ہے (جو کلیم اللہ کے باپ محمود شاہ کا دیا ہوا خطاب ہے)۔ کلیم اللہ کے سکہ کی آخری تاریخ تک یہی صورت ہے۔

اِس سے ہماری رہنمائی بیجاپور کے دو اور کتبوں کی طرف ہوتی ہے۔ ایک تو خواجہ سنبل کی مسجد کے شکستہ مشرقی دروازہ کے اندر ہے، جس کی تاریخ سنہ ۹۴۳ھ (سنہ ۱۵۳۷ء) ہے۔ جس میں حکمران کا نام و لقب "مجلس رفیع ابراہیم عادل خاں" ہے[24] اور دوسرا عیدگاہ میں، جس میں آخری مرتبہ بہمنی سلطان کا خطاب حذف کر دیا گیا ہے اور حکمران کو "ابراہیم عادل شاہ" کہا گیا ہے۔[25] اِن دو کتبوں سے قریب قریب بالکل یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جس شخصیت کو ابراہیم اپنا ولی نعمت سمجھتا تھا وہ سنہ ۹۴۳ھ (سنہ ۱۵۳۷ء) میں زندہ تھا اور سنہ ۹۴۵ھ کے پہلے یا تقریباً سنہ ۹۴۴ھ (سنہ ۱۵۳۸ء) میں اس کا انتقال ہوا ہوگا۔[26] اس کا بھی امکان ہے کہ کلیم اللہ احمد نگر کی فضا اپنے لیے موافق نہ پا کر پھر بیجاپور چلا گیا ہو، اور وہیں انتقال کیا ہو۔[27]

کلیم اللہ کے بعد اُس کے لڑکے انعام اللہ نے محسوس کیا کہ بیدر اُس کے رہنے کی جگہ نہیں ہے اس لیے وہ بھیس بدل کر مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں سے پھر کبھی واپس نہ آیا۔[28] اس طرح بہمنی خاندان

دکن پر ایک سو نوے شمسی سال حکومت کرنے کے بعد ختم ہوگیا اور اُس کی جگہ اُس کی جانشین کئی حکومتیں قائم ہوگئیں جو ڈیڑھ سو برس تک چار و ناچار زندہ رہیں اور بالآخر مغل سلطنت میں مدغم ہوگئیں۔

تشریحات

۱۔ کرشن دیورائے ۱۵۰۹ء میں اپنے بھائی ویر نرسمہا کا جانشین ہوا اور ۱۵۲۹ء تک حکومت کی۔ اس کا جانشین اس کا بھائی اچیوتارائے ہوا (۱۵۲۹ء سے ۱۵۴۲ء)۔

۲۔ مسلمانوں اور زمورین کے تعلقات کے بارے میں دیکھو کرشنا آیر کی کتاب دی زمورینس آف کالی کٹ مطبوعہ کالی کٹ ۱۹۳۸ء۔ نیز کرشنا آیر کا مضمون اسلام ان ملیبار (روئیداد انڈین ہسٹری کانگریس ۱۹۴۱ء منعقدہ حیدرآباد صفحہ ۲۷۱)۔

۳۔ سیویل اینڈ اینگر کتاب مذکور۔

۴۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۳۲۔

۵۔ چار لاکھ ہُن۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۴۔

۶۔ بقول فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۷۴ احمد نے دو سال ایک ماہ حکومت کی اور بقول تذکرۃ الملوک فولیو ۲۰۔۱ الف ایک سال آٹھ ماہ۔ برہان محمود کے جانشینوں کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔

۷۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۳۳۔

۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۸۔

۹۔ ایضاً

۱۰۔ وہ نہ علاء الدین کا بھائی تھا جیسا کہ فرشتہ میں ہے اور نہ چچیرا بھائی جیسا کہ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۳۶ میں ہے۔ اس کے سکوں سے اس کی ولدیت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ دیکھو اسپیٹ مضمون مذکورہ اسلامک کلچر ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۰۴۔ عبدالولی خان کتاب مذکور صفحہ ۱۶۲۔

اوپر کا حصہ : المؤید بنصر اللہ   نیچے کا حصہ : السلطان ولی اللہ بن محمود البہمنی

نیز دیکھو ساگر کے عاشور خانہ کا کتبہ، ایپی گرفیا انڈو مسلیمکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحہ ۲۰- جس میں اس کی ولدیت دی ہوئی ہے۔

۱۱- فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۷۸-

۱۲- اُس کی منگنی ۹۰۳ھ (۱۴۹۷ء) میں احمد کے ساتھ چار سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ دیکھو اس کے پہلے کا باب۔ دیکھو منتخب جلد سوم صفحات ۱۳۳ و ۱۳۴-

۱۳- یہ فرشتہ کا بیان ہے۔ منتخب نے لکھا ہے کہ اُس نے سلطانہ سے شادی بھی کر لی اور سلطان کو جان سے مار دیا۔ لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں ہے اس لیے کہ ملکہ سے شادی بغیر اُس کے شوہر کے طلاق دیے نہیں ہو سکتی تھی۔ طبقات اکبر شاہی کے صفحہ ۱۳۴ میں ہے کہ اُس نے ولی اللہ کے انتقال کے بعد ملکہ سے شادی کر لی۔

۱۴- فرشتہ میں اُس کی مدّت حکومت یہی ہے۔ سر وولزلی ہیگ نے اپنی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے صفحہ ۴۰۲ میں آخری چار سلاطین بہمنی کے عہدِ حکومت کی حسبِ ذیل تاریخیں دی ہیں: احمد ۹۲۳ھ سے ۹۲۷ھ۔ علاء الدین ۹۲۷ھ سے ۹۲۸ھ، ولی اللہ ۹۲۸ھ سے ۹۳۱ھ، کلیم اللہ ۹۳۱ھ سے ۹۳۲ھ۔ اِس ساری جلد میں کہیں کوئی ذیلی تشریح نہیں ہے اور ایسے حالات میں طالب علم کو قطعاً اپنے فطری رجحانات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہوگا میں نے محض اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے نتائج کو ان اسناد پر مبنی کیا ہے جو ہمیں مل سکی ہیں۔ ولی اللہ کی حکومت کے خاتمہ کے بارے میں ڈاکٹر یزدانی کا بیان ہے (ایپی گرفیا انڈو مسلیمکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحہ ۲۰، فٹ نوٹ ۲) کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیم اللہ کے ۹۳۲ھ کے سکّے اُس کی زندگی ہی میں مسکوک ہوئے اور بطور تہدید کے اس لیے کہ سلطان مضطرب تھا لیکن اس کے دوسرے ہی صفحہ میں انھوں نے دور و دراز ساگر کے عاشور خانہ کا کتبہ حل کیا ہے جو ۹۳۲ھ کا ہے اور جس میں ولی اللہ کو ابراہیم عادل نے بادشاہ کہا ہے اور خود کو وزیر سلطنت۔ ہمیں فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی اللہ تین سال حکومت کرنے کے بعد معزول کیا گیا اور اس سے ہم ۹۳۲ھ کے شروع میں پہنچ جاتے ہیں لہٰذا اس لیے کسی تہدید یا غلطی کا مطلق سوال نہیں ہے۔ نیز دیکھو عبدالولی خاں کتاب مذکور، صفحات ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۸-

۱۵- ایپی گرفیا انڈو مسلیمکا ۳۲-۱۹۳۱ء صفحات ۱۹ و ۲۰-

۱۶- منتخب جلد سوم صفحہ ۱۳۷ میں اُسے احمد کا لڑکا بتایا گیا ہے اور فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۷۹ میں اُسے یوسف عادل کا بھتیجا لکھا ہے جو منتخب کے مطابق ہے مگر اُس کی ولدیت اُس کے سکون سے واضح ہے کہ وہ شہاب الدین محمود کا لڑکا تھا۔ دیکھو اسپیٹ مضمون مذکور پلیٹ نمبر ۱۹ مقابل صفحہ ۲۰۰ جس میں سکّوں کی حسبِ ذیل عبارت دی ہے:

اوپر کی طرف: المؤید بنصر اللہ نیچے کی طرف: کلیم اللہ السلطان بن محمود البہمنی

نیز دیکھو عبدالولی خاں کتاب مذکور صفحہ ۱۶۳-

۱۸۔ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۲۷۶۔ شاید سلطان نے برار جانے کی جرأت نہیں کی اس لیے کہ عماد الملک نے قطعی طور پر اس کے چند سال پہلے ۹۳۰ھ (۱۵۲۳ء) میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور اس طرح وہ شاید سب سے پہلا آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔ ظفر الولیہ صفحہ ۱۷۰۔

۱۹۔ یہ قبر ولی اللہ کی قبر کی طرح چھوٹی اور بغیر آرائش کے ہے جس پر روایاتی گنبد کے بجائے فیروزی طرز کی مخروطی شکل ہے۔ چبوترے کی پیمائش ۲۷ مربع فٹ ہے اور اس کے اجداد کے قبروں سے بالکل مختلف ہے۔

۲۰۔ دیکھو اسپیٹ مضمون مذکور صفحہ ۲۷۵ نوٹ و صفحہ ۳۰۶۔ پلیٹ نمبر ۱۹ کے چربہ نمبر ۲۹ و ۳۰ میں ۹۲۲ھ اور ۹۲۳ھ کی تاریخیں بالکل صاف ہیں۔ دیکھو عبد الولی خاں کتاب مذکور صفحہ ۱۵۸۔
۹۵۱ھ و ۹۵۲ھ کے سکوں کے متعلق دیکھو یزدانی :۔ یدر اینڈرسن، نرنش صفحہ ۱۲۔

۲۱۔ میریا تھرلیسیا کا ڈالر ابھی کچھ دن پہلے تک حبش میں رائج تھا اور وہاں ڈھالا بھی جاتا تھا حالانکہ آسٹریا کی ملکہ بہت پہلے یعنی ۱۸۰۰ء میں فوت ہو چکی تھی۔ اسی طرح مغلیہ سکے شاہ عالم کے نام کے ساتھ ۱۸۳۵ء تک مسکوک ہوتے رہے اگرچہ آخری مغل بادشاہ بھی جلا وطن کیا جا چکا تھا اور شاہ عالم کو مرے ہوئے ۲۷ برس گذر چکے تھے۔ یہ نام انگریز ریزیڈنٹ کی ایما سے بدلا گیا۔ دیکھو فریزر کی کتاب اور اور رضیہ فل الائی دی نظام مطبوعہ لنڈن ۱۸۶۵ء صفحہ ۳۰۴۔

۲۲۔ دیکھو بارہواں باب تشریح نمبر ۹۸۔ مدگل کی تسخیر کے بارے میں دیکھو سیویل کی اے فارگاٹن ایمپایر صفحہ ۱۶۰ جس میں بروز کی ڈیکیڈا چہارم، یکم، ۷، باب ۱ کا حوالہ ہے۔ نیز سیویل اینڈ اینگر کی کتاب مذکور صفحہ ۵۴۔

۲۳۔ یادداشت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نمبر ۳۲۵ صفحہ ۲۶، کتبہ نمبر ۳۲۵۱۔

۲۴۔ ایضاً صفحہ ۷۴، کتبہ نمبر ۹۳۴۔

۲۵۔ ایضاً صفحہ ۲۶، کتبہ نمبر ۳۱۰۔

۲۶۔ تاریخ میں اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں جب کہ ایک بے بس حکمران سے اظہار عقیدت کیا گیا۔ ایک بہت دلچسپ مثال دور و دراز ملک ٹراونکور کی ہے جس کی رانی نے ۱۸۱۳ء میں گورنر جنرل کو عرضی دی کہ اس کے نوجوان لڑکے نئے راجہ کے لیے خلعت شاہی زیب تن کرنے کی اجازت مغل شہنشاہ دہلی سے حاصل کی جائے۔ دیکھو تھارنٹن کی گزیٹیر آف ٹراونکور انڈر ایسٹ انڈیا کمپنی مطبوعہ لنڈن ۱۸۵۱ء۔

۲۷۔ بہمنی سلاطین کا جو غیر معمولی اثر لوگوں کے ذہنوں پر تھا اس کی بہت نمایاں شہادت سلطان قلی کی قبر کے کتبہ سے ملتی ہے جسے گولکنڈہ کا پہلا نام نہاد قطب شاہی بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ کتبہ کی تاریخ بہت بعد کی ہے یعنی ۲ جمادی الثانی ۹۴۰ھ (۲ ستمبر ۱۵۳۳ء) لیکن اس پر اسے محض "قطب الملک" کہا گیا ہے۔ دیکھو ایپی گرفیا انڈو مسلیمکا ۱۹۱۵-۱۶ء صفحہ ۲۷۔ ڈاکٹر یزدانی نے اسی شمارہ کے صفحہ ۱۹ میں لکھا ہے کہ سلطان قلی نے اپنی "آزادی کا اعلان" محمود شاہ کے انتقال کے

بعد ہی کر دیا تھا اور قبر کے کتبہ کے الفاظ "الغازی بوجہ اللّٰہ المجاہد فی سبیل اللّٰہ" کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس سے اس کی شاہی حیثیت ظاہر ہوتی ہے مگر انھوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ جو لقب استعمال ہوا ہے وہ قطب الملک ہے نہ کہ قطب شاہ۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سلطان قلی کو اس کی عمر بھر بڑا مالک کہا جاتا رہا اور اُس زمانہ میں "مالک" محض ایک امارت کا لقب تھا۔ البتہ فرشتہ نے سلطان قلی کو اس سے بہت پہلے آزاد قرار دے دیا ہے یعنی ۹۱۸ھ (۱۵۱۲ء) میں۔

۲۸۔ منتخب جلد سوم صفحہ ۱۲۹۔ ڈاکٹر ناظم نے اپنی ہسٹری آف بیجاپور میں جو میموایرس نمبر ۴۹ کا مقدمہ ہے یہ لکھا ہے کہ ابراہیم عادل نے الہام اللّٰہ کے "غائب ہو جانے" کے بعد شاہی لقب اختیار کیا لیکن جب ہم کلیم اللّٰہ کے انتقال کی اغلب تاریخ سے واقف ہیں تو کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو تشریح نمبر ۲ مذکورہ بالا۔

چودھواں باب

لسانیاتی رجحانات

دکھن میں بہمنیوں کے عروج ہی کے زمانہ میں ہند میں آرین زبانوں کا اختلاط ہوا۔ ایک طرف فارسی، مراٹھی اور دکھنی یا پروٹو اُردو اور دوسری طرف "دراوڑی" زبانیں کنڑی اور تلنگی۔ لسانیاتی فضا کا پہلا جھونکا ۱۲۹۴ء میں علاءالدین کی فوجوں کی دکھن پر یلغار سے آیا جس کی تکمیل ۱۳۱۱ء میں ملک کافور کی دکھنی مہمات سے ہوئی جو ہندوستان کے آخری سرے رامیشورم تک پہنچ گئیں۔ ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے جو ہندوستان کی سلطنت کا مستقر دیوگیری یا دیوگیر کو بنا کر اس کا نام دولت آباد رکھا وہ دکھن میں خلجی تغلق فتوحات کے استحکام کی علامت تھا لیکن تغلق سلطنت کی دور تک پھیلی ہوئی وسعت زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی تھی اور بالآخر انتشار رونما ہوا۔ ۱۳۳۵ء میں مختصر مدت کی معبر ریاست قائم ہوئی جس کا مستقر مدورائے تھا اور ایک سال بعد وجے نگر کی راسئے سلطنت وجود میں آئی اور ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت دولت آباد مستقر سے قائم ہوئی جو بعد کو گلبرگہ میں اور پھر آخر میں بیدر میں منتقل ہو گئی۔

چنانچہ یہ واضح ہے کہ بہمنی سلطنت کا علمی رابطہ سب سے پہلے فارسی سے ہوا جو بنیادی تغلق سلطنت کی زبان تھی۔ اس کی بنیاد تو مراٹھی علاقہ میں جو بعد کو کنڑی علاقہ میں منتقل ہو گئی اور بعد کو اندھرا علاقہ کا بہت سا حصہ گھیر لیا۔ شمالی حملہ آوروں اور دکھن کے لوگوں کے ابتدائی ربط سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جو پہلے دکھنی کہلائی اور پھر ترقی کر کے کل ہند زبان اُردو بن گئی۔ اب ہم ان زبانوں کا سلسلہ وار حال بیان کریں گے:

۱- فارسی

خلجی فوج کی تیز رفتار فتح اور پسپائی نے اپنے پیچھے بہت کم نشان چھوڑے اور اگرچہ جنوب کو ان لوگوں سے ربط ہوا جن کی مادری زبان اور سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اس نے مقامی آبادی پر زیادہ اثر نہیں چھوڑا۔ البتہ تغلق سلطنت کا دوسرا مستقر دولت آباد میں قائم ہونے اور بہمنی سلطنت کے وجود میں آنے سے فارسی کا اثر اس علاقہ میں ہوا۔ علاء الدین حسن بہمنی شاہ کے مورخ اور مداح عصامی نے فتوح السلاطین گلبرگہ میں لکھی اور منہاج السراج کی طبقات ناصری کی ملحقات یا ضمیمہ عین الدین بیجاپوری نے لکھا۔ فارسی کے کئی ممتاز اہل علم جیسے مفتی احمد بروی، نصیر الدین تبریزی، میر محمد بدخشی اور ان سے بھی زیادہ نامور سیف الدین غوری اور میر فضل اللہ انجو اور کئی اور نے دکھن ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ امن پسند محمد دوم (۱۳۷۸ء سے ۱۳۹۷ء) اور متعدد زبانوں کے ماہر تاج الدین فیروز (۱۳۹۷ء سے ۱۴۲۲ء) جیسے فرمانرواؤں نے بھی فارسی زبان کو مالا مال کیا۔

محمد دوم نے ابتدائی تعلیم فارسی کے عالم اور فلسفی فضل اللہ انجو سے حاصل کی تھی اور وہ خود بھی ممتاز شاعر تھا مگر بدقسمتی سے اُس کے چند ہی اشعار ہمیں مل سکے ہیں جیسا کہ اوپر کہا گیا اُسے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی مہارت تھی اور اس نے اپنی سلطنت کے اہم مقامات پر مدرسے بھی قائم کیے۔ محمد اپنی دارالسلطنت گلبرگہ کو فارسی کے علما کا گہوارہ بنانا چاہتا تھا حتیٰ کہ شیراز کے نامور شاعر حافظ کو بھی دکھن آنے کی دعوت دی تھی لیکن بدقسمتی سے جس کشتی پر وہ دکھن آنے والا تھا اس پر قدم رکھتے ہی سمندر میں طوفان آگیا اور حافظ نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

تاج الدین فیروز (۱۳۹۷ء سے ۱۴۲۲ء) علمی قابلیت کا انسان تھا اور کئی زبانوں کا ماہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عروجی اور فیروزی کے تخلص کے ساتھ فارسی شاعری کرتا تھا۔ ایران اور ملحقہ ممالک سے بکثرت فارسی کے علما دکھن آئے جن میں سے دو محمد گزرونی اور حسن گیلانی علم نجوم کے مشہور ماہر تھے۔

اس کے بعد فارسی علوم کا عصا شہاب الدین احمد اوّل (۱۴۲۲ء سے ۱۴۳۶ء) نے سنبھال لیا جس نے جدید بہمنی مستقر محمد آباد بیدر کی آرایش فارسی تہذیب کی متعدد علامتوں سے کی مثلاً مختلف رنگ کے چینی کام کے کھپرے، ایرانی نقاشی کی وسیع شہ نشینیں، نوک دار محرابیں، شاہی تخت کا بلند کمرہ جس کی بیرونی دو محرابوں کے اُوپر کی طرف شیر اور سورج کا ایرانی قومی نشان۔ سلطان نے شیخ آزری اسفرائنی کو ولی عہد کا معلم مقرر کیا۔ آزری بہمن نامہ کا مصنف تھا جو شاہنامہ فردوسی کے وزن پر بہمنی خانوادہ کی منظوم تاریخ

ہے۔ احمد نے شاہ نعمت اللہ کرمانی سے بھی استدعا کی کہ وہ دکھن میں آکر قیام کریں لیکن شاہ صاحب وطن ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے اور اپنے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ کو روانہ کر دیا جن کے پیچھے شاہ صاحب کے خاندان کے اور افراد بھی آگئے اور اس طرح دار السلطنت میں ایرانی عنصر کو مزید تقویت حاصل ہوگئی۔

دکھن کی علمی تاریخ میں باعظمت اور مشہور نام خواجہ محمود گیلانی کا ہے جن کا عرف اُن کے پیدائشی شہر قادان کے نام پر محمود گاواں تھا۔ قادان بحیرہ خزر کے ساحل پر واقع ہے۔ خواجہ ۱۴۵۵ء میں ایران سے دکھن آئے اور ۱۴۸۱ء میں جب انھیں ایک درباری سازش سے قتل کر دیا گیا اس وقت تک وہیں رہے۔ محمود گاواں نے فوجی قیادت اور انتظام مملکت کے ساتھ علمی حیثیت میں بڑا نام پیدا کیا کہ قرون وسطیٰ کے دکھن میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ اُن کے خطوط کا مجموعہ "ریاض الانشا" اور فارسی طرز تحریر پر اُن کی تصنیف "مناظر الانشا" فارسی نظم و نثر میں اُن کی اعلیٰ قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں بکثرت نامور مصنفین کے مقولے اور درمیان میں خود ان کے مصنفہ قطعات اور قصاید ہیں اور ریاض الانشا میں بعض نادر خطوط بلند پایہ اور نامور فارسی مصنفین اور علمائے فلسفہ کے نام ہیں۔ ان کا شمار اُن لوگوں میں ہے جن کے کارنامہ ہائے زندگی عرب عالم سخاوی (۱۴۲۸ء سے ۱۴۹۷ء) نے اپنی کتاب "ضوء الامع" میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور جس میں خواجہ کو نویں صدی ہجری کے ممتاز ترین افراد میں شامل کیا گیا ہے۔ خواجہ کی خط و کتابت دیگر مشاہیر عالم کے ساتھ سلطان محمد دوم فاتح قسطنطنیہ سے بھی تھی اور ان کے خطوط کا مجموعہ نہ صرف ہندوستان کے بلکہ استامبول اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ بہمنی سلطنت میں فارسی روابط اور فارسی علوم کو انتہائی عروج پندرھویں صدی کے وسط میں حاصل ہوا۔

۲۔ مراٹھی

جس زبان کو سب سے پہلے فارسی زبان سے رابطہ کا اتفاق ہوا ہوگا وہ مراٹھی زبان ہوگی اس لیے کہ دولت آباد کے قرب و جوار میں جو پہلے دیوگیر کے نام یادو خانوادہ کا دار السلطنت تھا عام طور پر لوگوں کی یہی زبان تھی۔ مراٹھی زبان نے خلجی تغلق حملوں سے پہلے ہی اپنا ایک مقام پیدا کر لیا جیسا کہ یادو حکمراں رام چندر (۱۲۷۱ء سے ۱۳۱۱ء) کے ہاتھیوں کے دستہ کے کمان دار ہیمادری کے مقدمہ ورات کھنڈ سے ظاہر ہوتا ہے نیز مکند راجہ کی تصنیف ویکا سندھو سے جو ۱۲۸۸ء میں لکھی گئی تھی۔

تقریباً پہلے خلجی حملہ ہی کے زمانہ میں درویش شاعر جنن دیو نے بھاگوت گیتا کی ایک عظیم ترین

تفسیر "جنیسوری" کے نام سے لکھی۔ جنن دیوہی نے بھاگوت عقیدہ کی بنیاد رکھی جس میں بھگتی کے اصول یعنی خدا سے لو لگانے پر زور دیا گیا ہے اور یہ عقیدہ جس کا مرکز پنڈھار پور میں تھا مراٹھی بولنے والے علاقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ دراصل جنیسوری واقعتاً مراٹھی زبان کی اولین اہم تصنیف ہے[5]۔ بھاگوت عقیدہ کی سربراہی پنڈھار پور کے نام دیو نے کی۔ نام دیو کا اثر بظاہر دور دور تک پھیل گیا اور اس کے بھجن سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں شامل ہو گئے جنھیں سکھ بڑے ذوق سے روزانہ پڑھتے ہیں[6]۔

جنن دیو کے بھاگوت عقیدہ کے ساتھ ہی ساتھ مہانو بھو کا عقیدہ تھا جسے چکر دھر نے جاری کیا اور جس کا انتقال ۱۲۷۳ء میں پہلے خلجی حملہ سے ذرا پہلے ہوا۔ چکر دھر ایک طرح کا سیاح فلسفی تھا جس نے اپنے خیالات سپرد قلم کرنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے مقولے اس کے انتقال کے بعد لیلا چرترا کے نام سے جمع کیے گئے اور یہ کتاب اس لحاظ سے خاص امتیاز کی ہے کہ مراٹھی زبان میں سب سے پہلی مکمل سوانح حیات ہے۔ اس عقیدہ کے ماننے والے بہت پھیل گئے حتیٰ کہ شاہی دربار تک اس کی رسائی ہو گئی اور راجہ رام چندر اور اس کے حرم کی چند خواتین اس کی پُرجوش مقلد ہو گئیں۔

بہمنی سلطنت کے قیام اور وسیع پیمانے پر قحط کی وجہ سے مراٹھی بولنے والی آبادی میں شدید انتشار ہو گیا اور باعظمت بزرگ ایکناتھ (۱۵۳۳ء سے ۱۵۹۹ء) کی آمد ہی پر ادبی ترقی کی رفتار کا رشتہ پھر سے پکڑا جا سکا۔ ایکناتھ پیٹھن ضلع اورنگ آباد کے رہنے والے تھے لیکن یہ سلطنت بہمنی کے زوال اور اس کی جانشین ریاستوں کے وجود میں آنے کے وقت کی بات ہے جب کہ مقامی زبانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ بیجاپور کے عادل شاہیوں کے زمانہ میں اور شیواجی کی سربراہی میں مراٹھی نے پورا عروج حاصل کیا اور اسے ایک نیم غیر مذہبی حیثیت حاصل ہوئی جو پہلے اس میں نہ تھی۔

۲۔ دکھنی

اُردو جس نے آگے چل کر عظیم کل ہند عروج حاصل کیا اس کی ابتدائی شکل بہمنیوں کے عہد میں دکھنی یا پروٹو اُردو تھی۔ دکھن میں اس نے اپنا سر دہلی کے سلاطین کی فوجوں کے حملہ کے وقت تیرہویں صدی عیسوی میں نکالا جب کہ اس کے بعد ہی یہ زبان دہلی بھی دکھن پہنچی۔ زبان کی اسی ابتدائی شکل کو امیر خسرو (۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء) نے اپنی شاعری کا ایک وسیلہ بنایا۔ دکھن میں ۱۴۰۰ء تک جب کہ حضرت خواجہ بندہ نواز اسی سال کی عمر میں گلبرگہ آئے اور یہیں ۱۴۲۲ء میں انتقال کیا یہ زبان کم و بیش محض بول چال کی زبان رہی۔ پروٹو اُردو زبان کی کئی تصنیفات ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب انھیں کی

تصانیف ہیں۔ لیکن ان کی کتاب "معراج العاشقین"[۵۷] تصوف کے مباحث سے مملو ہے اور "شکار نامہ"[۵۸] میں تمثیلی طور پر تصوف کے ضروری اصول عام فہم زبان میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان بزرگ نے الفاظ کے استعمال میں نہ صرف فارسی زبان سے استفادہ کیا ہے بلکہ سنسکرت زبان اور روزمرہ کی بول چال کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ یہ کوئی وقت طلب مسئلہ بھی نہ تھا اس لیے کہ فارسی، مراٹھی اور دکھنی تینوں زبانوں کا بنیادی ماخذ ہند آریائی زبان ہے اور اس لیے اسما اور دیگر اجزائے کلام ایک زبان کے بآسانی دوسری زبان میں گھل مل سکتے ہیں[۵۹]۔ دکھنی میں سنسکرت کی بہتات کا رجحان بڑی حد تک نظامی بدری کی تصنیف "مثنوی کدم راؤ و پدم راؤ" میں نظر آتا ہے جو پندرہویں صدی کے آخر میں لکھی گئی۔ یہ ضخیم تالیف ہے جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں اور "تت سم" اور "تت بھو" دونوں قسم کے بکثرت الفاظ ہیں[۶۰]۔ سخاوت مرزا کا خیال ہے کہ ۱۴۳۳ء اور ۱۴۳۷ء کے درمیان تقریباً علاء الدین احمد دوم کے عہد حکومت میں یہ تصنیف کی گئی۔

بہمنیوں کے عہد میں جو آخری کتاب دکھنی زبان میں لکھی گئی وہ شاید اشرف کی "نوسرہار" ہے لیکن یہ کوئی اونچے درجہ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس زبان کو اعلیٰ عروج بیجاپور کے عادل شاہیوں اور گولکنڈہ کے قطب شاہیوں کے زمانہ میں حاصل ہوا جب کہ مغلوں کے تقریباً پورے ہندوستان پر تسلط ہو جانے پر اسے کل ہند حیثیت حاصل ہو گئی۔

۴۔ کنڑی

اپنے پورے عروج پر بہمنی سلطنت تقریباً اُس پورے علاقے پر حاوی تھی جہاں کنڑی زبان بولی جاتی تھی۔ مراٹھی کی طرح اس زبان نے بھی اپنی ایک انفرادی حیثیت بہت جلد حاصل کر لی تھی اور بیسویں صدی عیسوی میں یہ مذہبی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بن چکی تھی[۶۱]۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ابتدائی دور میں جو سنسکرت اور تامل زبان کا اس پر غلبہ تھا اُس سے اس نے پیچھا چھڑا لیا۔ اس زبان نے دو راستے اختیار کیے یعنی ویر سیوا اور لنگایت اور یہ دونوں رجحانات پندرہویں صدی عیسوی میں تقریباً بہمنی سلطنت کے قیام کے وقت پوری طرح پھل پھول رہے تھے۔ بہمنیوں کے عہد میں جو سب سے پہلی ویر سیوا زبان میں کتاب لکھی گئی چام رس کی "پربھو لنگا لیلے" ہے جس میں الیلا پربھو کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں جو ایک افسانوی ہیرو تھا اور کہا جاتا ہے کہ شیو کا اوتار تھا۔ ایک اور مشہور ویر سیوا زبان کا مصنف نیجا گنا سیو یوگی ہے جس کے "بھجن" کیول ونار شیو کی تعریف میں سہل کنڑی زبان میں ہیں جو اب تک کنڑی بولنے والے علاقوں میں مقبول ہیں اس لیے اپنی تصنیف میں شیو تک پہنچنے کے راستے کی وضاحت کا رجحان ظاہر کیا ہے اور ویر سیوا درویشوں کے حالات زندگی بیان

بے ہیں۔ اس کی تصنیفات سے مختلف موضوعات سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور اس کی تصنیف "دویکا چنتامنی" میں تقریباً تمام مروجہ مسایل پر معلومات ہیں اور اس کے تحقیقی ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔ اس یوگی کے کئی پیرو تھے جیسے ویرپکش پنڈت، جس کی کتاب "چما بوا وران" ہمیں ۱۵۸۵ء تک پہنچا دیتی ہے۔ اس زبان کے بعد کی تاریخ میں بہمنی سلطنت کے سقوط کے بعد مذہبی اور فلسفیانہ مباحث میں مزید ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔

ویرسیوا زبان کا تنہا مصنف جس نے خالص مذہبی مضامین سے الگ ہٹ کر لکھا شاید تنجاگندا جس کی کتاب "کمار رمنا کتھا" سولہویں صدی میں کسی وقت لکھی گئی اور جس میں شمالی حملہ آوروں کے مقابلہ میں مقامی آبادی کی بہادری کا ذکر ہے۔

کنڑی بولنے والے علاقہ میں زبان کا دوسرا دھارا جو بہمنیوں کے عہد میں جاری ہوا وہ جینیوں کا تھا۔ ویرسیوا کے معتقدین قدرتی طور پر جینی مذہب کے شدید دشمن تھے۔ شروع کے جین مصنفین کا خاص موضوع "تیر تھنکروں" کی عظمت و برتری کا بیان ہے جو اُن سے پہلے گذرے تھے جیسے افسانوی دھرم ناتھ۔ اس کا ایک مداح مدھر تھا جس نے ۱۴۱۲ء میں کتاب لکھی اور جسے وجے نگر کے دیوراج اول کے ایک وزیر کی سرپرستی حاصل تھی۔ تصنیف و تالیف کا شوق اس علاقہ کے بعض چھوٹے درباروں تک بھی پہنچا جیسے کالاہی کے حکمران نے "تیر تھنکروں" کے حالات زندگی پر ایک ملخص لکھا جو خالص مذہبی موضوع تھا مگر بیچ بیچ میں دنیاوی مسایل بھی آگئے ہیں جیسے دیہاتی مناظر کا حسن۔ لوگوں کے عادات و اطوار، شہروں کے حالات وغیرہ۔ اسی طرح ایک اور جینی مصنف بھاسکر ہے جس کی تصنیف "جیون دھر چرتر" میں شہزادہ جیون دھر کا قصہ ہے جس سے جین عقیدہ کو ترک کیے بغیر بھکتی عقیدہ کے اثر کا اظہار ہوتا ہے۔ بعد کی صدیوں میں اس عقیدہ کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس کا سب سے بڑا مبلغ رتن کورنی ہمارے موضوع بحث سے باہر ہے۔

۵۔ تلنگی

زمانہ زیر بحث میں تلنگی زبان نے بھی کسی حد تک عروج حاصل کیا اس لیے کہ اسے دربار وجے نگر، دربار کاکاتیا اور ریڈی ریاستوں کی اور بہمنی سلطنت کے سقوط کے بعد گولکنڈہ حیدر آباد کے قطب شاہیوں کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ بہمنیوں کے عروج کا زمانہ وجے نگر کے عروج اور کاکاتیا حکومت کے زوال کا معاصر ہے۔ کاکاتیا کا وزیر ٹکنا سومیاجی جو تلنگی کے ممتاز ترین مصنفین میں تھا اُس کا تقریباً ۱۲۹۰ء میں انتقال ہوگیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کا مدمقابل پال کوریکی سومناتھ پیدا ہوگیا جسے بعض مورخین ٹکنا کا ہم عصر اور بعض تلنگی

ادب میں اس کا جانشین بنتے ہیں۔ اس دوران میں سیوی عقیدہ نے کنڑی تلنگی علاقہ کی سرحدیں پار کر لی تھیں اور سوم ناتھ نے سیوی عقیدہ قبول کر لیا تھا۔ وہ ذات پات کے نظام کو نہیں مانتا تھا اور ویدوں کے تقدس کا منکر تھا اور ہندو معاشرہ اور تلنگی زبان کے مروجہ اسلوب سے بغاوت کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ تلنگی زبان کا پہلا مصنف ہے جس نے سیوی بزرگوں کے حالات زندگی کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا۔[12]

دوسری طرف کرشنام چاری جیسے مصنفین جو ویشنوی عقیدہ کے تھے اور بھگتی کی تلنگی نثر کے موجد تھے جس میں شاعرانہ رجحان تھا اور جو ساز پر گائی جا سکتی تھی اور جس کے اسلوب کی شاید کنڑی سے نقل کی گئی تھی۔ اس کے بعد دوسری باعظمت شخصیت تلنگی ادب میں پراپگاتا کی ہے جو کونڈا ویڈو کے پہلے تاریخی حکمران پرولایا ویما (۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۳ء) کا درباری تھا۔ پراپگاتا نے کنڑی زبان کی مہابھارت "ہری ونس" کی تکمیل کر لی۔ جو نانیا اور ٹکانا سومایاجی نے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ وہ "نرسمہا پروا" کا بھی مصنف تھا جو ناص کر ویشنویوں کے بڑے مرکز اہوبالم کے حالات میں ہے۔

نچپا سوم ناتھ کی یاد اس لیے بھی تازہ ہے کہ اس نے تلنگی کے عظیم شاعر سری ناتھ کو متاثر کیا۔ سری ناتھ کونڈا ویڈو (۱۳۶۵ء سے ۱۴۴۰ء) کے پیڈا کوماٹی ودما کا ودیا دھیکاری تھا اور سیوی عقیدہ کا تھا۔ اس نے سری ہرش کی سنسکرت ہری ویلاس اور اس کی نل ودمینتی کی کہانی لے کر اسے تلنگی کا جامہ پہنایا۔ اس کے ماسوا سری ناتھ نے دو نظمیں "بھیمیشور پورانم" اور "کاشی کھنڈمو" اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن سے اس کے سیوی رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ اول الذکر نظم میں اس نے شمال مشرقی اندھرا کے مناظر، زمین کی پیداوار اور اس کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔[13]

پندرہویں صدی عیسوی میں کئی شاعروں کو عروج ہوا جن میں خاص کر بمیرا پٹارا جو قابل ذکر ہے جو شاید ورنگل کا رہنے والا تھا یا جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے کڈپہ ضلع کا۔ وہ "بھوگنی وندا کامو" کا مصنف تھا جس میں ایک چھوٹی سی کتاب راج کنڈہ کے حکمران سنگھ سوم کی درباری زندگی کے حالات میں۔ اسے آسائش کی زندگی کی رغبت نہیں تھی کہ بادشاہوں کی تعریف میں نظمیں لکھ کر ان کی قربت حاصل کرتا بلکہ وہ زندگی کی کشمکش میں گذر کرنے پر قانع رہا۔ روایات کی بنا پر وہ سیوی تھا لیکن اپنی تصنیفات میں ویشنوی رنگ دینے سے قاصر نہیں رہا۔

اگرچہ وجے نگر کی سرپرستی میں اور بعد کو قطب شاہیوں کی سرپرستی میں تلنگی کو انتہائی عروج حاصل ہوا لیکن اس زبان میں صرف نباتی کرشنا متیا کی "راج نیتی سرامو" ہے جس میں بہمنیوں کا کچھ ہے اس لیے کہ نباتی بہمنی دربار سے متوسل تھا۔ دراصل بہمنیوں نے اپنی تاریخ کے آخری زمانہ میں اندھرا کے علاقہ کے

ایک حصّہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور پھر بھی اودے گیری کے قرب و جوار کا علاقہ وجے نگر کے راجاؤں اور اڑیسہ کے گج پتیوں کے درمیان مابہ النزاع تھا۔

تلنگی علوم کا مرکز تو وجے نگر ہو گیا تھا اپنے ابتدائی دور ہی سے اگرچہ اسے انتہائی عروج کرشن دیو رائے (۱۵۰۹ء سے ۱۵۲۹ء) کے زمانہ میں ہوا جس کا دَور حکومت ہمارے دائرہ بحث سے باہر ہے۔ اگرچہ سنسکرت تصنیفات کے ترجمہ اور تلبیق کے اعلےٰ ترین عروج کا دور دیکھا۔ ہمیں پلالماری ویربھدر شاعر کا ذکر ملتا ہے جس کی تصنیف "سری رنگرا سکنتلم" کالی داس کے مشہور ڈرامہ کا چربہ ہے۔ ویربھدر "جے منی بھارتامو" کا بھی مصنّف ہے جس میں خاص کر پانڈوؤں کی اشوامیدھ قربانی کا حال بیان کیا گیا ہے۔[۱۳]

وجے نگر کا حکمران سلوا نرسمہا (۱۴۸۵ء سے ۱۴۹۳ء) نیلاپکا نام چاری کا سرپرست تھا جو وشنوی تھا اور جس نے وشنو کی تعریف میں سمر کیرتن کے نام سے بھجن تصنیف کیے۔ نیلاپکا کے اسلوب کی تقلید نہ صرف اس کے لڑکے ترومل چاریہ نے بلکہ بعد کے آنے والے بہت سے موسیقار شاعروں نے بھی کی۔[۱۴]

تشریحات

۱- پروٹو اُردو (ابتدائی اُردو) - پروٹو یونانی زبان کا سابقہ ہے - ویبسٹر کی لغت میں کئی صفحات اس سابقہ کے بیان میں صرف کیے گئے ہیں جس میں پروٹو عربی، پروٹو کال پروٹو فاشرم، پروٹو لیٹنک، پروٹو پلازم وغیرہ الفاظ شامل ہیں۔

۲- دولت آباد۔ تغلق سلطنت کا دوسرا مستقر۔ دیکھو اوپر۔ دوسرا باب۔

۳- محمود گاواں کی ابتدائی زندگی کا حال شیروانی کی کتاب " محمود گاواں - عظیم بہمنی وزیر " کا پہلا باب۔ ریاض الانشاء مرتبہ چاند بن حسین، حیدر آباد ۱۹۴۸ء نیز دیکھو شیروانی کا مقالہ " ریاض الانشاء، دکھن کی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے " انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن اجلاس منعقدہ بڑودہ ۱۹۴۰ء۔ استامبول میں ریاض الانشاء کے مخطوطہ کے متعلق دیکھو غلام محمد نظام الدین کا مضمون اس موضوع پر۔ معارف اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۴۷ء صفحات ۲۹۰ سے ۳۱۱۔

۴- یزدانی: " ارلی ہسٹری آف دی دکھن " جلد دوم صفحہ ۵۷۲۔

۵- میکالیف۔ " دی سکھ ریلیجن " باب ششم۔ یہ امر معرض بحث ہے کہ آیا نیپدھار پور کے نام دیو اور پنجاب کے نام دیو دونوں ایک ہی ہیں۔

۶- مقامی زبانوں کی رفتار ترقی کا ابتدائی عہد لازمی طور پر مذہب ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ برخلاف فارسی زبان کے جو شروع ہی سے غیر مذہبی اصول پر چلی، دکھن سے اس کے اولین رابطہ ہی کے وقت سے۔ شیواجی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے مراٹھی زبان کو غیر مذہبی اور دنیاداری کی زبان بنایا۔

۷- معراج العاشقین سب سے پہلے ۱۳۲۳ف میں بمقام حیدر آباد چھپی۔

۸- شکار نامہ جس کے مخطوطے متعدد لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔ اب چھپ گیا ہے (۱) شمیمہ شوکت کی ادارت میں ۱۹۶۳ء میں اور پروفیسر مبارز الدین احمد کی ادارت میں بھی اسی ۱۹۶۲ء میں۔

۹- مراٹھی زبان پر فارسی کے اثر کے متعلق دیکھو شیروانی کی کتاب کلچرل ٹرینڈس ان مڈیول انڈیا، پہلا باب۔

۱۰- اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ میں فہرست کے صفحہ ۳۶۱ پر ہے۔ نیز سخاوت مرزا کا مضمون "اردو ادب" علی گڑھ جلد دوم ۱۹۳۱ء۔

۱۱- کنڑی ادب کی عام تاریخ کا حال دیکھو آر۔ ایس موگلی کی کتاب "کنڈا سہتیہ چرتر"

۱۲- تمیا- "پال کریکی سومناتھ کوی" کی "کاکاتیا سنچیکا" مطبوعہ راجہ مندری ۱۹۳۵ء صفحات ۲۰۷ و مابعد۔

۱۳- پیاپا شاستری کی "سرینا تھ کویتا سمکشا" ۱۹۶۱ء۔

۱۴- "انا چاریہ چرتر" شائع کردہ تیر دیتی دیوا استھانم، تیر دیتی۔

پندرہواں باب

اسناد

تاریخ فیروز شاہی

اس تاریخ کا مصنف ضیاء الدین برنی فیروز تغلق کے چھٹے سنہ جلوس (۱۳۵۷ء) تک کی مدت تک کے لیے ہمارا مورخ کہا جا سکتا ہے اور دکھن کی آزادی کے سلسلہ میں جو کشمکش اور ہنگامہ آرائی ہوئی اُس کے لیے ہماری سب سے بڑی سند ہے جیسا کہ اس کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے وہ برنی حال بلند شہر کا رہنے والا تھا اور ۱۲۸۶ء سے لے کر ۱۳۵۷ء تک زندہ رہا جب کہ اُس نے اپنی کتاب کی تکمیل کی جسے اُس نے ۱۳۳۳ء میں شروع کیا تھا۔ اِس لیے جو واقعات اُس نے قلمبند کیے ہیں اُن کا وہ عینی شاہد تھا اگرچہ اُس نے جو تصویر کھینچی ہے وہ یک رُخی ہے خصوصاً محمد بن تغلق یا فیروز تغلق کے متعلق۔ اُس کی یادداشت بڑی حیرت انگیز تھی اور اُس کے بیان کیے ہوئے واقعات اور تاریخیں بے شمار ہیں۔ وہ اپنی تاریخ کی تکمیل کے بعد جلد ہی غربت کی حالت میں فوت ہو گیا۔ شاید فیروز تغلق جس کی اُس نے بے پناہ تعریف کی تھی اُس سے ناراض ہو گیا۔ دکھن کے حالات کے متعلق وہ ہماری اہم ترین سند ہے خصوصاً جب ہم اُس کی تاریخ کو عصامی کی فتوح السلاطین سے ملا کر پڑھیں تو ہمیں تاریخ کا صحیح اندازہ ہو جائے گا اِس لیے اگر عصامی بہمن شاہ کا حامی ہے تو برنی تغلق سلطان کا مداح ہے۔

فتوح السلاطین

یہ دکھن کے معاصر حالات کی منظوم تاریخ ہے جسے مولانا عبدالملک عصامی نے تصنیف کیا جو ۱۳۲۷ء میں ۱۶ سال کی عمر میں دہلی سے دکھن آیا جب کہ دولت آباد تغلق سلطنت کا دوسرا مستقر قرار پایا۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے یہ ۱۲۰۰۰ اشعار کی تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۳۴۹ء کو شروع کی اور پانچ ماہ کی غیر معمولی طور پر قلیل مدت میں ۱۴ مئی ۱۳۵۰ء کو مکمل کرلی۔ یہ دکھن کی جدوجہد آزادی کی پوری مدت پر حاوی ہے۔ پہلے بہمنی حکمران کی سرپرستی میں رہنے کی وجہ سے وہ اس حکمران کا بڑا مداح ہے اور کبھی کبھی اس کا مبالغہ آمیز الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔ اپنے معاصر برنی کی طرح اس نے جو واقعات قلمبند کیے ہیں ان کا وہ عینی شاہد ہے اور اس کا بیشتر حصّہ صحیح کہا جاسکتا ہے۔ انقلابی افواج کے لیڈروں اور تغلق کی فوجوں کی مہمات کی اور نیز ان کے متعلقہ واقعات کی اس نے نہایت دلچسپ تفصیلات بیان کی ہیں۔ برنی کے مقابلہ میں اس نے تاریخیں کم دی ہیں۔ لیکن ہر واقعہ کا ٹھیک ٹھیک موقع بیان کیا ہے اس لیے تاریخ کا بآسانی حساب لگایا جاسکتا ہے اس کے باوجود اس کے تاریخی تسلسل میں بہت کم غلطی ہے۔

ریاض الانشا

ریاض الانشا بہمنی وزیر خواجہ محمود گاواں کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اس نے خود اپنی طرف سے یا اپنے آقا بہمنی سلطان کی طرف سے لکھے۔ یہ مجموعہ اب ایس۔ بی حسین کی فاضلانہ ترتیب کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔ جس مخطوطہ کو میں نے استعمال کیا وہ حبیب گنج ضلع علی گڈھ کی بیش بہا لائبریری کا ہے۔ جسے مجھے مرحوم نواب صدر یار جنگ نے مستعار دیا تھا۔ یہ نسخہ بہت دلچسپ ہے اس لیے کہ یہ پہلے نواب محسن الملک کے پاس تھا جو حیدرآباد کے ناظم مال و آمدنی تھے اور بعد کو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ کے سیکرٹری ہوگئے تھے جو اب ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی ہوگیا ہے۔ یہ نسخہ بہت خوشخط لکھا ہوا ہے اور اس کے جتنے نسخے میں نے دیکھے ان سب میں بہترین ہے۔ بدقسمتی سے اس کے آخری دو یا تین صفحے جس میں شاید خاتمہ کتاب کی تفصیل ہوگی غائب ہیں اس لیے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ کب نقل ہوا۔ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ اس میں دکھن کی تاریخ کے متعلق کثیر معلومات ہیں مجھ سے پہلے اسے کسی نے تاریخی سند کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ خواجہ کی زندگی کے متعلق جو دو کتابچے شائع ہوئے ہیں ان میں سے ایک میں عزیز مرزا صاحب نے ریاض الانشا کا حوالہ لکھا ہے مگر انھوں نے بھی پندرہویں صدی کے وسط میں جو مرصع فارسی کا اسلوب رائج تھا اس کے

نمونہ کے طور پر اسے پیش کیا ہے۔

اس مجموعہ میں کل ۱۴۰ خطوط ہیں جن میں سے ۴۰ براہ راست اُس تاریخی ماحول سے متعلق نہیں جس میں وہ لکھے گئے، اور باہر کے حکمرانوں اور وزیروں کے نام جو خط ہیں وہ بھی بڑی تاریخی اہمیت کے ہیں۔ اس مجموعہ میں جو مواد ہے اس سے محمود گاواں کی خانگی زندگی، بہمنیوں کے سفارتی تعلقات، فوجی مہموں، فرقہ وارانہ سیاسیات اور پارٹیوں کے مناقشات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ نہایت مرصع الفاظ میں ہیں جو تشبیہ و استعارات سے مملو ہیں اور جابجا اشعار، قطعات اور غزل، نیز قرآن و حدیث کے بکثرت عربی اور فارسی مصنفین کے اقتباسات ہیں چنانچہ اس کا نام جس کا ترجمہ "طرز تحریر کا باغ" ہے بہت ہی موزوں ہے۔

ان ۱۴۰ خطوط میں ۱۳ وزرائے دکن کے نام ہیں جو میدان جنگ سے لکھے گئے ہیں، ۱۴ ممالک غیر کے وزرا کے نام اور ۱۱ ہندوستانی سلطنتوں کے حکمرانوں کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی خطوط ہیں جو خواجہ نے خود اپنے عزیزوں اور اہل علم کے نام لکھے ہیں جن میں سے بعض میں دکن کے حالات کا طویل اور تفصیلی ذکر ہے۔ مجموعہ کے خطوط کا بیشتر حصہ اُن خطوط پر مشتمل ہے جو نظام الدین احمد دوم اور محمد سوم کے عہد میں لکھے گئے جن میں خاص ملکی حالات کے علاوہ مالوہ اور مہاراشٹر کی مہموں کے دلچسپ حالات ہیں جن سے ہمیں ان مہموں کی رفتار اور واقعات کا تاریخ بتاریخ اور دن بدن کا حال معلوم ہوتا ہے۔

یہاں قدرتاً ریاض الانشا کے مستند ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ پہلی بات جو اس سلسلہ میں ذہن نشین رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ان خطوط کے مستند ہونے پر کبھی کسی یورپی یا مشرقی مورخ نے شبہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ مزید برآں علاوہ خارجی شہادت کے جو پورے طور پر ملتی ہے اندرونی ناقابل تردید شہادت اُن کے مستند ہونے کی ہے۔ اس مجموعہ کے چار خطوط جو محمد دوم فاتح قسطنطنیہ کے نام ہیں اُن میں سے ایک میں یعنی نمبر ۱۴۴ میں فاتح کے بہادرانہ کارناموں کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ خط خفیف تغیرات کے ساتھ تقریباً لفظاً بہ لفظاً "نقل خطوط محمد دوم و بایزید دوم بنام شاہ ایران و دیگر حکمرانان و عمایدین کے نام مع ان کے جوابات کے ۸۳۶ھ سے ۸۵۱ھ" میں موجود ہے جو برٹش میوزیم کے شعبہ اورینٹل کے ایک مخطوطہ نمبر ۶۱ میں محفوظ ہے۔ مذکورہ خط فولیو ۴۵ سے ۴۷ میں اور اس کا جواب فاتح سلطان کی طرف سے فولیو ۴۷ سے ۴۹ میں ہے۔ اس مخطوطہ کے مقدمہ میں ایک نوٹ ترکی زبان میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسے قصہ دار یا خزانچی محمد المقدسی نے فروخت ہوتے ہوئے دیکھا اور رئیس الکتب یا افسر دار الانشاء کو آمادہ کیا کہ وہ اسے خرید کر شاہی ذخیرہ مخطوطات میں محفوظ کر دے۔ اس نوٹ کی تاریخ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) ہے۔

برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست کے فاضل مدون ریو کا بیان ہے کہ "یہ خطوط دراصل

منشات السلاطین مرتبہ نشان جی فریدوں کی مرتب کی ہوئی ضخیم فہرست کا ایک حصہ ہیں" منشات السلاطین جس میں باریک چھپے ہوئے ۱۲۲۶ صفحات ہیں ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ یہ خط جلد اوّل کے صفحہ ۲۵۸ میں ہے۔ اگرچہ یقیناً اس کا اصل مضمون مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں میں یکساں ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ مطبوعہ نسخہ میں جو خط ہے وہ اُس مجموعہ کے مطابق نہیں ہے جو محمد القدسی نے سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں نیلام گھر میں حاصل کیا تھا لیکن جیساکہ دوسری جلد کے آخر میں واضح طور پر کہا گیا ہے اس کا مضمون اُس مکمل مخطوطہ سے نقل کیا گیا ہے جو ایک صاحب محمد لبیب کے پاس ہے۔ دونوں میں جو خفیف اختلافات ہیں ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کی اصل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ برٹش میوزیم کے مخطوطہ میں خط کا عنوان ترکی زبان میں ہے کہ" یہ خط سلطان محمد غازی کو خواجہ جہان نے ہندوستانی بادشاہ محمد شاہ بہمنی کی طرف سے بھیجا تھا" لیکن اس کے مقابل منشات کے خط کا عنوان یہ ہے: "یہ خط اعلےٰ حضرت فتوحات جنگ کے امیر سلطان محمد غازی کو جو رئیس قصر جنت ہیں خواجہ جہان نے بہمن شاہ کی طرف سے بھیجا تھا"۔ اگرچہ خطوں کے مضمون دونوں مجموعوں میں تقریباً یکساں ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مجموعہ اگر دوسرے کی محض نقل ہوتا تو عنوان اور الفاظ دونوں کے ایک ہی ہوتے۔ اس طرح داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں مجموعے مختلف ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ریاض الانشا کا خط نمبر ۱۴۴ دو مختلف مجموعوں میں بڑی حد تک تقریباً یکساں ہے یعنی برٹش میوزیم کے مجموعہ میں فولیو نمبر ۴۵ میں اور منشات کی پہلی جلد کے صفحہ ۲۵۸ میں حالانکہ اس وقت ترکی میں ریاض الانشا کا کسی کو مطلق علم نہ تھا اس لیے یہ ناقابل تردید نتیجہ نکلتا ہے کہ خط جعلی نہیں ہے اور جس مجموعہ میں یہ خط ہے وہ خود خواجہ کے لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ مزید برآں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان ۱۴۸ خطوط میں سے ہر ایک لکھنے والے کے جذبات کا مظہر ہے جو خط میں مندرج واقعات میں خود اصل کردار یا مظلوم رہا ہو۔ جس میں اس کا پورا جوش و خروش، بعض اشتعالات سے اُس کی بیزاری اور وہ تمام تفصیلات جو اُسے بے حد عزیز تھیں موجود ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض معاملات مختلف لوگوں سے دوہرائے گئے ہیں اور ان میں مقامات کی جو تفصیل دی ہے وہ ٹھیک ہے۔ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خطوط محض انشا پردازی کی مشاقی نہیں ہیں بلکہ سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کے متعلق خطوط ہیں۔ مورخ کے لیے ان کی اہمیت محض اس لیے نہیں کہ ان سے بہمنی سلطنت کی اندرونی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں واقعات کی تاریخ اور ماہ و سال کی نشاندہی ہے جن کا مقابلہ اگر ان تاریخوں سے

کیا جائے جو دوسرے مآخذ میں ملتی ہیں تو حالات کے تسلسل کا ٹھیک حال معلوم ہو جائے گا۔

ضوء الامع

اس کتاب کا مصنف محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی ۸۳۰ھ(۱۴۲۸ء) میں پیدا ہوا اور ۹۰۲ھ(۱۴۹۷ء) تک زندہ رہا اور اس طرح اُس کی زندگی تقریباً بالکل محمود گاواں کی زندگی کی معاصر ہے۔ اُس کی تصنیف ضوء الامع لاہل قرن التاسع یعنی نویں صدی کے ممتاز لوگوں کے حالات پر دس جلدوں کی ضخیم کتاب ہے جس میں محمود گاواں پر طویل تبصرہ ہے اور دکھن کے ممتاز لوگوں کے متعلق جو اُس کے ہمعصر تھے بہت ہی مفید معلومات ہیں۔ چنانچہ جو واقعات سخاوی نے لکھے ہیں وہ بعد کے مورخین کے مقابلہ میں زیادہ معتبر ہیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ محمود گاواں کے قتل کے حالات جو اس نے لکھے ہیں وہ دوسرے مورخین کے بیان سے مختلف ہیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جس وقت محمود گاواں کا قتل ہوا ہے اُس وقت وہ مکہ مکرمہ میں تھا اور وہاں پہنچتے پہنچتے واقعات کی صورت بدل گئی ہوگی۔

ظفر الولیہ

یہ ہندوستان کے متعلق ان معدودے چند کتابوں میں ہے جو عربی زبان میں لکھی گئیں۔ مصنف عبداللہ المکی عرف حاجی الدبیر سلطنت گجرات کے مستقر احمد آباد میں ۹۶۳ھ(۱۵۵۵ء) میں ۱۵ سال کی عمر میں آیا اور امیر الغ خاں حبشی کے خانگی ملازمین میں چار سال بعد داخل ہو گیا۔ وہ اکبر اعظم کے گجرات کو فتح کرنے کے وقت تک زندہ رہا۔ اکبر اعظم نے اُسے منتظم اوقاف کے عہدہ پر مقرر کر دیا جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی نفع رسانی کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس عہدہ پر وہ ۹۸۵ھ(۱۵۷۷ء) تک قائم رہا۔ چنانچہ اس کی تاریخ خصوصاً گجرات کے متعلق ہے لیکن اُس نے ۱۰۱۴ھ(۱۶۰۵ء) تک کے ہندوستان پر بھی طایرانہ نظر ڈالی ہے اور دکھن کی تاریخ کے متعلق بھی بعض دلچسپ تفصیلات دی ہیں۔ اگرچہ ان کا ذکر اُس نے ثانوی حیثیت سے کیا ہے۔ جس وقت ہم مختلف بیانات کے اختلافات کا اس سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

برہان مآثر

یہ کتاب سید علی طباطبائی نے ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں برہان نظام شاہ کے حکم سے فرشتہ کی تصنیف سے چند سال قبل تصنیف کی۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تک یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں تھی اور اس کے

کچھ حصّوں کا انگریزی ترجمہ کنگ نے دی ہسٹری آف دی بہمنی ڈائی نسٹی کے نام سے کیا تھا اسے پرشین ٹیکسٹ بک سوسائٹی حیدرآباد نے شائع کردیا ہے

برہان کے مبحث کا دائرہ بمقابلہ فرشتہ کے محدود ہے اس لیے کہ برہان میں صرف دکھن کی تاریخ اور خاص کر احمدنگر کی تاریخ اور اس کے متعلقات ہیں۔ جہاں تک بہمنیوں کا تعلق ہے بظاہر مصنّف نے تقریباً وہی مواد استعمال کیا ہے جو فرشتہ نے استعمال کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ واقعات کی تفصیل اور تبصرہ میں اپنے ہمعصر سے زیادہ متوازن اور محتاط ہے۔ چنانچہ اس کا سلاطین بہمنی کا سلسلۂ نسب فرشتہ کے مقابلہ میں سکوں کی براہ راست شہادت کے زیادہ مطابق ہے اور اُس کے نام اور القاب بھی زیادہ صحیح ہیں۔ ایک پہلو برہان کا ایسا ہے جو فرشتہ کے جنگ میں قتل کیے گئے کفار کے مرصع بیان کے مقابلہ میں بہمنی سلطنت کے مقاصد اور طریق عمل کے بارے میں بہت زیادہ پُرازمعلومات ہے۔ اس کا اظہار بہمنی حکمرانوں کی تخت نشینی کے وقت یا وزرا کے تقرر کے وقت کی تقریروں سے ہوتا ہے جن کا اس کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے اور جن میں ایک طرح سے وہ لایحۂ عمل کیا گیا ہے جو حکومت کے پیش نظر تھا۔

ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برہان کا سادہ طرز بیان فرشتہ کے مرصع اور دلچسپ انداز بیان سے جو کبھی کبھی غلط اور مبالغہ آمیز ہوتا ہے بہت زیادہ قابل اعتبار قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے جیسا برہان کے فارسی ایڈیشن کے فاضل مدول نے لکھا ہے کہ "کبھی کبھی وہ انشا پردازی کی خوش نمائی کے جوش میں واقعات کی تاریخی صحت کو نظرانداز کردیتا ہو" لیکن اگر برہان کے مصنّف سے بعض غلطیوں کا قصور ہوا ہے تو یہ کہنا بہرنوع ناانصافی ہے کہ وہ تاریخی تحقیق میں "فرشتہ سے کمزور درجہ" کا ہے اس لیے کہ دونوں کا بغور مطالعہ کرنے پر ہم اس سے بالکل مختلف نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

تذکرۃ الملوک

مشہور تاریخ تذکرۃ الملوک کا مصنّف رفیع الدین ہے۔ وہ ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا تھا اور اپنی ۶۰ سال کی عمر میں تذکرۃ الملوک لکھی۔ وہ شیراز سے بطور تاجر ہندوستان آیا تھا اور بعد کو سلطان بیجاپور کا ملازم ہوگیا۔ بیجاپور میں رفیع الدین نے بہت بلند رتبہ تک ترقی کی اور دارالضرب کا مہتمم ہوگیا، نیز اہم سفارتی مشن پر احمدنگر بھی گیا۔ بیجاپور کی وطنیت اختیار کرنے پر اُس نے قدرتاً دربار کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اپنی تاریخ میں بہمنیوں کے بھی بعض دلچسپ حالات لکھے ہیں۔ اس میں تفصیلات کی بھرمار ہے اور کہیں کہیں مافوق الفطرت حالات کی بھی جھلک ہے۔ خصوصاً بہمن شاہ کے پیر سراج الدین جنیدی اور اُن کے

جانشینوں کی زندگی کے متعلق جو کہیں اور نہیں ملتے ہیں۔ بعض اور بھی دلچسپ اور قریبی حالات اس قسم کی باتوں کے جیسے مجاہد کے لقب بلونت کے متعلق اور لوگوں کے لباس اور عادات و اطوار کے متعلق اس تاریخ میں ملتے ہیں۔ سلطان تاج الدین فیروز کے متعلق ایک بہت ہی معنی خیز تبصرہ ہے جو اس حکمران کی خانگی زندگی کے متعلق فرشتہ کے لکھے ہوئے تبصرہ سے مختلف ہے اور تذکرۃ الملوک کا یہ بیان ہے کہ مجاہد کی صرف ایک بیوی تھی۔ بحیثیت مجموعی اس کتاب میں مندرج بعض تفصیلات قابل توجہ ہیں اور دوسری تاریخوں کی خلا کو پُر کرتی ہیں۔

طبقات اکبر شاہی

ہندوستان کی پہلی عام تاریخ طبقات اکبر شاہی کا مصنف نظام الدین احمد ہے جس پر بعد کی بہت سی تاریخی تصنیفات کی بنیاد ہے۔ وہ مقیم الہروی کا لڑکا تھا جو فاتح بابر کے امور خانگی کے شعبہ میں اہم عہدہ پر مامور تھا اور بعد کو گجرات کے گورنر کے وزیر کے رتبہ پر ترقی کر گیا تھا۔ نظام الدین ۱۵۲۹ء میں پیدا ہوا اور اکبر اعظم کے ماتحت کئی فوجی عہدوں پر فائز رہا اور بعد کو شہنشاہ نے اُسے بخشی الممالک کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ طبقات اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے اور اکبر کے ۳۷ ویں سنہ جلوس (۱۵۹۳ء) یعنی اپنے انتقال کے وقت تک جو ۱۵۹۴ء میں واقع ہوا ہندوستان کی تاریخ پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک بہت ہی مفید تتمہ ہے جس میں اسی عہد کی اہم شخصیتوں کے حالات ہیں۔ دکن کے متعلق جو حصے ہیں وہ ذرا مختصر ہیں لیکن اپنے اختصار اور صحت کے لحاظ سے بجائے خود قابل قدر ہیں اور اکثر سکوں اور دوسری شہادتوں کے مطابق ہیں۔

ہفت اقلیم

اس سوانح کی لغت کے مصنف احمد رازی کے متعلق جو رے کا باشندہ تھا (جس پر اس کا لقب ہے)، بہت کم معلوم ہے لیکن اس کا خاندان بہت مشہور تھا جس میں کئی نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں جیسے خود مصنف کا والد خواجہ مرزا احمد جو اپنی دولت اور فیاضی کے لیے مشہور تھا اور اُس کا چچا خواجہ محمد شریف یزد، خراسان اور اصفہان کا وزیر تھا۔ یہ محمد شریف تاریخ ہند کے طالب علم کے لیے باعث دلچسپی ہے اس لیے کہ یہ مرزا غیاث ملقب بہ اعتماد الدولہ کا والد تھا جس کا مقبرہ آگرہ کی مغل عمارات کا ایک نگینہ ہے اور جس کی لڑکی مہر النساء ملکہ نورجہاں کے نام سے مشہور ہے اور شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ تھی۔ امین احمد کی تصنیف

ہفت اقلیم یعنی سات سرزمینیں سیرتوں کا مجموعہ ہے جن کی ہر صاحب سیرت کے وطن کے حساب سے ترتیب دی گئی ہے اور ہر ملک کے لوگوں کا تذکرہ مندرجہ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) متعلقہ ملک کا مختصر جغرافیائی اور تاریخی تعارف اور (۲) اس ملک کے ممتاز لوگوں کے تاریخی ترتیب کے مطابق حالات زندگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دکھن کا ذکر دوسری اقلیم میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بنگال اور اڑیسہ کے ساتھ کیا گیا ہے اور شمالی ہند کو تیسری اقلیم میں عراق، شام اور مصر سے جوڑا گیا ہے۔ ہفت اقلیم کی تکمیل اُسی سال ہوئی جو طبقات اکبرشاہی کی تکمیل کی تاریخ ہے یعنی ۱۵۹۵ء اور اس میں دکھن کے خانوادہ سلاطین کا ذکر ۱۵۹۱ء تک ہے۔ مسالک الابصار کا مواد خاص طور پر اسی سے لیا گیا ہے۔

گلشن ابراہیمی

محمد قاسم ہندو شاہ عرف فرشتہ ۱۵۵۲ء میں ایران کے اشک آباد ساحل بحر خزر میں پیدا ہوا تھا اور ۱۶۲۳ء میں بیجاپور میں فوت ہوا۔ وہ بچپن ہی میں احمد نگر آیا تھا مگر ۳۸ سال کے سن میں بیجاپور چلا گیا اور جنوری ۱۵۹۱ء میں ابراہیم عادل شاہ کا ملازم ہو گیا۔

اُس کی ضخیم یادگار تصنیف گلشن ابراہیمی جو عموماً تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے یقیناً قرون وسطیٰ کے متعلق ایک نہایت اہم تاریخ ہے اور ایک طرح سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد جتنی تاریخیں لکھی گئیں وہ اسی کے مبحث کا تقریباً تتمہ ہیں۔ اُس نے جن کتابوں سے مدد لی ہے اُن کی طویل فہرست دی ہے۔ جن کی تعداد ۳۲ ہے جن میں سے چار یعنی ازری کا بہمن نامہ، ملا محمد لاری کی سراج التواریخ، ملا داود بیدری کی تحفۃ السلاطین اور ملا عبدالکریم ہمدانی کی سوانح محمود گاواں بہمنی دکھن کی تاریخ سے متعلق ہیں، لیکن بدقسمتی سے یہ سب کتابیں نایاب ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف میں اُسے ۱۶۰۶ء سے ۱۶۱۱ء تک پانچ سال لگے۔ تاہم جتنا مواد اس میں جمع کیا گیا ہے اُس کے لحاظ سے یہ مدت بہت مختصر ہے۔

لیکن گلشن ابراہیمی زیادہ سے زیادہ اُن اسناد کا خلاصہ ہے جن کا مصنف کو علم تھا اور چونکہ وہ سب کتابیں جو دکھن سے متعلق تھیں نایاب ہو گئی ہیں اس لیے فرشتہ کے بیانات کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کم از کم جہاں تک دکھن کا تعلق ہے صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی نظر ناقدانہ نہیں ہے اس لیے جتنا معتبر اُسے سمجھا جاتا ہے اس سے کمتر ہے اور اکثر وہ غلط بیانیاں اور لیپ پوت کر جاتا ہے جو پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ ہونے کے باوجود اس تصنیف کی تاریخی وقعت کو مجروح کر دیتی ہیں۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں لیکن یہاں ان میں سے چند پیش کی جاتی ہیں جو یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ

متنازعہ معاملات میں فرشتہ کے بیانات کی وقعت کا اندازہ کرنے میں کس قدر احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

فرشتہ کی ایک بہت نمایاں غلطی وہ ہے جو اُس نے ابتدائی بہمنیوں کے سکوں کی عبارت، اُن کے خالص ہونے اور بعد کو اُن کے گلائے جانے اور ان کی جگہ وجے نگر کے سین اور پرتاب رائج ہونے کے متعلق بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں فرشتہ کا ہر لفظ سکوں کی شہادت کی بنا پر غلط ہے۔ بہمنیوں کے جو سکے ہمیں ملتے ہیں اُن سے بہمنی سلاطین کے سلسلہ نسب کے متعلق بھی اُس کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔ پھر ہمایوں کے کردار کے متعلق اُس کی رائے سے جیسا کہ ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے اس سلطان کا کردار خاک میں مل جاتا ہے۔ جو واقعات وہ بیان کرتا ہے اُن میں اُسے مبالغہ کی عادت ہے۔ چنانچہ بہمنی جب کبھی میدانِ جنگ میں گئے ان کے دشمنوں کے نقصانات میں بہت اضافہ کر دیا ہے اور جس ملک پر حملہ کیا گیا اس کی آبادی اور مقابل افواج کی تعداد کا مطلق لحاظ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ اُس نے بڑی جسارت سے یہ لکھ دیا ہے کہ محمد اوّل کی تلنگانہ کی مہم کے بعد ملک کے حکمران کی رعایا کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ ایک اور عجیب واقعہ جو فاضل مصنف نے بیان کیا ہے جو قدرتاً ناممکن ہے وہ یہ کہ فیروز نے ایک رات میں ۸۰۰ عورتوں سے صحبت کی۔ ایک غیر معمولی غلطی اُس نے اس واقعہ کے بیان میں کی ہے کہ دیورکنڈہ کی شکست کے بعد نظام الملک کی گردن ماردی گئی حالانکہ تھوڑے دن بعد ہم اسے مالوہ کی مہم میں موجود پاتے ہیں۔

اس سب کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فرشتہ نے بہمنی خانوادہ کے متعلق اپنی کتاب ۱۶۱۲ء میں لکھی۔ یعنی جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن کے سو سال سے زیادہ گذرنے کے بعد اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ ذرا ادبی اور مصنوعی چاشنی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ان واضح کمزوریوں کے باوجود گلشن ابراہیمی میں اِتنے کثرت سے واقعات اور شمار و اعداد ہیں جو قرون وسطیٰ کی موجودہ تاریخوں میں نہیں ہیں۔

ضمیمہ الف

مصدقہ تاریخیں

علاء الدین حسن کی پیدائش	سنہ ۱۲۹۲ء
دکن پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ	سنہ ۱۲۹۴ء
ملک ہزبر الدین ظفر خاں علائی کی وفات	سنہ ۱۲۹۸ء
شیخ زین الدین داؤد کی پیدائش	سنہ ۱۳۰۲ء
حضرت گیسو دراز کی دہلی میں پیدائش	۱۳ جولائی سنہ ۱۳۲۰ء
اسپین کے بازار میں آتشگیر اسلحہ کا استعمال	سنہ ۱۳۲۵ء
سلطان محمد بن تغلق کی حکومت	جولائی سنہ ۱۳۲۵ء سے ۲۰ مارچ سنہ ۱۳۵۱ء
دولت آباد تغلق سلطنت کا دوسرا مستقر بنایا گیا	سنہ ۱۳۲۷ء
حضرت گیسو دراز کی دکن میں پہلی دفعہ آمد	سنہ ۱۳۲۷ء
ہری ہر بلاری اور کرشنا دوآبہ کے کچھ حصہ کا گورنر ہوا	سنہ ۱۳۲۷ء
مدورا کے گورنر سید احسن کی بغاوت	سنہ ۱۳۳۵ء
ہوشنگ شاہ کی بغاوت کے بعد سلطان تغلق کی دہلی کو واپسی	جولائی سنہ ۱۳۳۶ء
شہاب سلطانی دکن کا بادشاہ بنایا گیا	سنہ ۱۳۳۶ء
سلطان تغلق کی دولت آباد کو روانگی	۳۱ اکتوبر سنہ ۱۳۴۰ء
علی شاہ کی بغاوت اور اس کا دکن کی شاہی کا اعلان	سنہ ۱۳۴۰ء
وجے نگر کے حکمران ہری ہر کا انتقال	سنہ ۱۳۴۳ء

کمبا وجے نگر کا حکمران	۱۳۴۳ء سے ۱۳۵۵ء
بدر چاچ کی دکھن کی طرف روانگی	۸ دسمبر ۱۳۴۴ء
سلطان تغلق کا دکھن کی طرف کوچ	۳۰ یا ۳۱ جنوری ۱۳۴۵ء
عزیز خمار مالوہ کا گورنر مقرر ہوا	۱۳۴۵ء
ملک مقبل گجرات کا گورنر مقرر ہوا	۱۳۴۵ء
ناصرالدین اسماعیل دکھن کا پہلا خود مختار حکمران	ستمبر ۱۳۴۶ء سے ۱۲ ستمبر ۱۳۴۷ء

۱۔ گلبرگہ کے بہمنی سلاطین

سلطان علاءالدین حسن بہمن شاہ	۳ اگست ۱۳۴۷ء سے ۱۱ فروری ۱۳۵۸ء
ساگر میں بغاوت	۱۳۵۲ء
شہزادہ محمد کی شادی	۲۰ جون ۱۳۵۲ء
جشن	۲۰ فروری ۱۳۵۱ء سے ۸ جولائی ۱۳۵۲ء
سجان سنگھ کو جاگیر دی گئی	۴ نومبر ۱۳۵۲ء
معتقد عباسی خلیفہ مصر	۱۳۵۲ء سے ۱۳۶۲ء
سلطان کے حکم سے مکہ مکرمہ میں رباط کی تعمیر	۱۳۵۳ء
سنگما وجے نگر کا رائے	۱۳۵۹ء سے ۱۳۶۲ء
عصامی نے فتوح السلاطین کی تکمیل کی	۱۴ مئی ۱۳۵۹ء
سلطان محمد اول	۱۱ فروری ۱۳۵۸ء سے ۲۱ اپریل ۱۳۷۵ء
نئے سلطان کی تخت نشینی	۱۳ فروری ۱۳۵۸ء
مادر ملکہ کی حج کو روانگی	۲۴ اگست ۱۳۶۰ء
مادر ملکہ جدہ پہنچیں	۲۸ ستمبر ۱۳۶۰ء
مادر ملکہ کی وفات	۱۳۶۲ء
تلنگانہ سے جنگ شروع	۱۳۶۲ء
تخت فیروزہ سلطان کو نذر کیا گیا	۲۱ مارچ ۱۳۶۳ء
تلنگانہ کی فیروز تغلق سے گفت وشنید کی اطلاع	۱۳۶۳ء

بتاکی وجے نگر پر حکومت (تخت نشینی کی تاریخ ۱۳۴۳ء قرار دیتا ہے) ۱۳۶۳-۶۴ء سے	۱۳۶۲-۶۳ء
کوتلم کی جنگ	۲۰ر جولائی ۱۳۶۶ء
اودنی کا محاصرہ اور آتشگیر اسلحہ کا استعمال	۱۳۶۶ء
تعمیر جامع مسجد گلبرگہ	۱۳۶۷ء
شیخ زین الدین داؤد کی وفات	۲۷ر اکتوبر ۱۳۶۹ء
۳ — سلطان علاء الدین مجاہد	۲۱ر اپریل ۱۳۷۵ء سے ۱۶ر اپریل ۱۳۷۸ء
۴ — سلطان داؤد اوّل	۱۶ر اپریل ۱۳۷۸ء سے ۲۱ر مئی ۱۳۷۸ء
۵ — سلطان محمد دوم	۲۱ر مئی ۱۳۷۸ء سے ۲۰ر اپریل ۱۳۹۷ء
اودنی میں بہمنی فوج کی شکست	۱۳۸۰ء
کوہاکنڈہ میں بہمنی فوج کی شکست	۱۳۸۲ء
شیخ عین الدین بیجاپوری کی وفات	۱۳۹۳ء
رینگنی خالی کر دیا گیا	۱۳۹۵ء
۶ — سلطان غیاث الدین تہمتن	۲۰ر اپریل ۱۳۹۷ء سے ۱۴ر جون ۱۳۹۷ء
ملک سیف الدین غوری کا انتقال	۲۱ر اپریل ۱۳۹۷ء
۷ — سلطان شمس الدین داؤد دوم	۱۴ر جون ۱۳۹۷ء سے ۱۶ر نومبر ۱۳۹۷ء
۸ — سلطان تاج الدین فیروز	۱۶ر نومبر ۱۳۹۷ء سے ۲۲ر ستمبر ۱۴۲۲ء
تیمور کی ہندوستان میں آمد	۱۳۹۸ء
ساگر کے زمینداروں کی بغاوت کا انسداد	۱۵ر جنوری ۱۳۹۸ء
بھیروں سنگھ کو مدگل کی جاگیر دی گئی	۱۵ر جنوری ۱۳۹۸ء
وجے نگر کی پہلی مہم	۱۳۹۹ء
حضرت گیسو دراز کی گلبرگہ واپسی	۱۴۰۱ء
مانڈو میں دلاور خاں غوری کا اعلان آزادی	۱۴۰۱ء
ماہان نے بنگال میں آتشگیر اسلحہ کے استعمال کا حال بیان کیا	۱۴۰۶ء
وجے نگر سے دوسری جنگ	۱۴۰۷ء
بالاگھاٹ میں رصد خانہ کی تعمیر	۱۴۰۸ء

سلطان کی وجے نگر کی شہزادی سے شادی ۱۴۰۶ء

حسن خاں کی پرتھل سے شادی ۱۴۰۸ء

محمود گاواں کی پیدائش ۱۴۱۱ء

حسن خاں ولی عہد مقرر کیا گیا ۱۴۱۶ء

سلطان کا راجہ سندری اور اڑیسہ کی طرف کوچ ۱۴۱۷ء

پنگل کا محاصرہ ۱۴۱۸ء

تخت کے لیے جنگ کا خاتمہ ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء

۲- بیدر کے بہمنی سلاطین

۹ - سلطان شہاب الدین احمد اول ۲۲ ستمبر ۱۴۲۲ء سے ۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء

فیروز کا انتقال ۲۸ ستمبر ۱۴۲۲ء

حضرت گیسو دراز کا وصال یکم نومبر ۱۴۲۲ء

المخدومی نے گلبرگہ میں اپنی عربی صرف و نحو کی تصنیف مکمل کی ۲۴ اپریل ۱۴۲۳ء

المخدومی کا گلبرگہ میں انتقال ۱۴۲۴ء

بیدر میں سولہ کھمبہ مسجد کی تعمیر ۱۴۲۳ء

دار السلطنت گلبرگہ سے بیدر منتقل ہوا ۱۴۲۴ء

ماہور کی مہم ۱۴۲۶ء

کونکن میں خلف حسن بصری کی آمد ۱۴۲۷ء

مالوہ سے پہلی جنگ ۱۴۲۹ء

شاہ نعمت اللہ کرمانی کا وصال ۱۴۳۱ء

مالوہ سے دوسری جنگ ۱۴۳۳ء

راجہ سندری میں دودیا الا کی حکومت ۱۴۳۴ء

۱۰- سلطان علاء الدین احمد دوم ۱۷ اپریل ۱۴۳۶ء سے ۷ مئی ۱۴۵۸ء

سلطان کی تخت نشینی ۱۹ اپریل ۱۴۳۶ء

وجے نگر سے جنگ ۱۴۳۶ء

دلاور خاں جنوبی مرہٹہ دیس میں ۱۴۳۶ء

خاندیش سے جنگ	۱۴۳۸ء
وجے نگر سے دوسری جنگ	۱۴۴۳ء
وجے نگر میں فوجی اصلاحات	۱۴۴۳ء
نکولو کونٹی کی ہندوستان میں آمد	۱۴۴۴ء
وجے نگر کے دیورائے دوم کا انتقال	۲۴ مئی ۱۴۴۶ء
چاکن کا قضیہ	۱۴۴۷ء
محمود گاواں کی بیدر میں آمد	۱۴۵۳ء
شیخ جلال الدین چندہ حسینی کا وصال	۵ اگست ۱۴۵۴ء
۱۱۔ سلطان علاء الدین ہمایوں شاہ	۷ مئی ۱۴۵۸ء سے ۴ ستمبر ۱۴۶۱ء
حسن خاں کا غاصبانہ قبضہ	۷ مئی ۱۴۵۸ء
تلنگانہ کے رئیسوں کے خلاف مہم	۱۴۶۰ء
کپلیشور کا تلنگانہ پر قبضہ	۲۲ فروری ۱۴۶۰ء
حسن خاں کی بغاوت	مارچ۔جون ۱۴۶۰ء
۱۲۔ سلطان نظام الدین احمد سوم	۴ ستمبر ۱۴۶۱ء سے ۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء
مجلس ولایت	یکم ستمبر ۱۴۶۱ء سے ۱۴۶۶ء
مالوہ سے تیسری جنگ	۱۴۶۲ء
۱۳۔ سلطان شمس الدین محمد سوم	۳۰ جولائی ۱۴۶۳ء سے ۲۶ مارچ ۱۴۸۲ء
خواجہ جہاں کا قتل اور مجلس ولایت کا خاتمہ	۱۴۶۶ء
سلطان کی شادی	۱۴۶۶ء
محمود گاواں وزیر اعظم	۱۴۶۶ء سے ۱۴۸۱ء
مالوہ سے چوتھی جنگ	۱۴۶۹ء
مغربی مہم ۔ پہلا دور	۱۴۶۹ء
نیکیتین ہندوستان میں	۱۴۶۹ء سے ۱۴۷۴ء
اڑیسہ کے معاملات میں بہمنیوں کی مداخلت	۱۴۷۰ء
راجہ سندری اور کونڈاویڈو کی تسخیر	۱۴۷۰ء

بہمنیوں کی مدد سے اڑیسہ میں پرشوتم کی تخت نشینی	سنہ ۱۴۷۰ء
مغربی مہم ۔ دوسرا دور	سنہ ۱۴۷۰ء
مدھول کے کرن سنگھ کی بہمنیوں کو مدد	سنہ ۱۴۷۰ء
رنگینا کی تسخیر	۱۹ر جولائی سنہ ۱۴۷۱ء
کھیلنا کی تسخیر	۱۴ر جنوری سنہ ۱۴۷۱ء
مدھول کے بھیم سنگھ کو راجہ گھوڑپڑے بہادر کا خطاب	۲۲ر اکتوبر سنہ ۱۴۷۱ء
ولی عہد محمود کی ولادت	سنہ ۱۴۷۱ء
سنگ میشور کی تسخیر	۱۳ر دسمبر سنہ ۱۴۷۱ء
گوا پر قبضہ	یکم فروری سنہ ۱۴۷۲ء
مہم کا خاتمہ	۱۰ر اپریل سنہ ۱۴۷۲ء
مغربی مہم ۔ تیسرا دور	سنہ ۱۴۷۳ء
سلطان کی بیدر سے روانگی	۱۵ر مارچ سنہ ۱۴۷۳ء
مادر ملکہ کا انتقال	سنہ ۱۴۷۵ء
محمود گاواں کی انتظامی اصلاحات	سنہ ۱۴۷۳ء
تلنگانہ میں شورش	سنہ ۱۴۷۵ء
اڑیسہ سے جنگ	سنہ ۱۴۷۸ء
خاندیش کا عادل خاں بیدر میں	سنہ ۱۴۷۹ء
تلنگانہ میں دوسری شورش اور وجے نگر سے جنگ	سنہ ۱۴۸۰ء
سلطان کانچی میں	۱۲ر مارچ سنہ ۱۴۸۱ء
محمود گاواں کا قتل	۵ر اپریل سنہ ۱۴۸۱ء
سلطان کا انتقال	۲۶ر مارچ سنہ ۱۴۸۲ء
۱۴۔ سلطان شہاب الدین محمود	۲۶ر مارچ سنہ ۱۴۸۲ء سے ۷ر دسمبر سنہ ۱۵۱۸ء
سہ رکنی مجلس کی حکومت	۲۶ر مارچ سنہ ۱۴۸۲ء تا ۶ر مارچ سنہ ۱۴۸۶ء
سلووا نرسمہا کا وجے نگر کی سلطنت پر غاصبانہ قبضہ	سنہ ۱۴۸۵ء
عادل خاں دکھنی گورنر تلنگانہ کا انتقال	سنہ ۱۴۸۶ء

نظام الملک کا قتل	۱۴۸۶ء
ملک احمد نے مرہٹہ دیس کا دوبارہ فتح کیا	۱۴۸۶ء
بیدر میں پرانے آنے والوں کی شورش	۸ر نومبر ۱۴۸۶ء
اڑیسہ کے پرشوتم نے گوداوری دوآبہ کو تاراج کیا	۱۴۸۷ء
جیور گھاٹ کی جنگ	۲۳ر مئی ۱۴۹۰ء
گورنروں کی مزعومہ آزادی	۱۴۹۰ء
احمد نگر آباد کیا گیا	۱۴۹۰ء
بہادر گیلانی کا گوا اور عقبی علاقہ ساحل پر قبضہ	۱۴۹۱ء
قاسم برید وزیر اعظم	۱۴۹۲ء
یوسف عادل نے رائچور اور مدگل وجے نگر سے پھر چھین لیا	۲۹ر اپریل ۱۴۹۲ء
ہاشم تبریزی گجرات کا سفیر بیدر کے دربار میں	۱۴۹۳ء
بہادر کی ہتھیار ڈالنے کی پیشکش	۷ر مئی ۱۴۹۳ء
بہادر کا خاتمہ	۴ر نومبر ۱۴۹۴ء
دستور دینار کا گلبرگہ پر قبضہ	۱۴۹۶ء
مہندری کی جنگ	۱۴۹۶ء
ولی عہد احمد کی منگنی	۱۴۹۷ء
قطب الملک ہمدانی امیر الامرا اور تلنگانہ کا گورنر بنایا گیا	۱۴۹۸ء
یوسف عادل نے دستور دینار کو شکست دی	۱۴۹۸ء
واسکوڈی گاما کیپ آف گڈ ہوپ کا چکر کاٹ کر کالی کٹ پہنچا	۱۴ر مئی ۱۴۹۸ء
اوسا کا محاصرہ	۱۰ر اگست ۱۴۹۸ء
سلطان نے وجے نگر سے دوآبہ کو پھر فتح کر لیا	۱۵۰۳ء
یوسف عادل نے شیعہ مذہب قبول کرنے کا اعلان کیا	جون ۱۵۰۲ء
ولی عہد کی شادی	۱۵۰۴ء
ڈی المیڈا ہندوستان کے پرتگالی مقبوضات کا گورنر مقرر کیا گیا	۱۵۰۹ء
علی (امیر؟) برید اپنے والد قاسم برید کی جگہ وزیر اعظم مقرر کیا گیا	۱۵۰۵ء

چال کی جنگ میں پرتگالیوں کی شکست	جنوری ۱۵۰۸ء
ملک احمد نظام الملک کا انتقال	۱۵۰۸ء
ڈیو کی جنگ میں پرتگالیوں کی شکست	فروری ۱۵۰۹ء
کرشن دیو رائے وجے نگر کا حکمران	۱۵۰۹ء
گوا پر پرتگالیوں کا قبضہ	۲۸ فروری ۱۵۱۰ء
اسماعیل عادل نے گوا کو پھر فتح کر لیا	۲۰ مئی ۱۵۱۰ء
گوا پر آخری مرتبہ پرتگالیوں کا قبضہ	۲۵ نومبر ۱۵۱۰ء
علاء الدین عماد الملک اپنے والد فتح اللہ کا جانشین ہوا	۱۵۱۰ء
اسماعیل صفوی شہنشاہ ایران	۱۵۱۱ء سے ۱۵۲۳ء
قطب الملک کی مزعومہ آزادی	۱۵۱۲ء
کرشن دیو رائے نے مشرقی ساحل کے شہروں کو فتح کیا	۱۵۱۴ء سے ۱۵۱۷ء
سلطان نے دستور دینار سے گلبرگہ پھر فتح کر لیا	۲۲ جون ۱۵۱۵ء
وجے نگر سے بہمنیوں کو شکست	۱۵۱۷ء
خداوند خاں کی بغاوت اور موت	ستمبر ۱۵۱۷ء
سلطنت کی افواج نے سلطان کو سلامی دی	۱۵۱۷ء
۱۵۔ سلطان احمد چہارم	۷ دسمبر ۱۵۱۸ء سے ۱۵ دسمبر ۱۵۲۰ء
۱۶۔ سلطان علاء الدین شاہ	۲۸ دسمبر ۱۵۲۰ء سے ۵ مارچ ۱۵۲۳ء
۱۷۔ سلطان ولی اللہ	۵ مارچ ۱۵۲۳ء سے ۱۵۲۶ء
ابراہیم عادل خود کو بادشاہ ولی اللہ کا وزیر کہتا ہے	۱۵۲۵ء و ۱۵۲۶ء
۱۸۔ سلطان کلیم اللہ	۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۸ء
بہادر شاہ سلطان گجرات	۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۷ء
پہلی جنگ پانی پت	۲۲ اپریل ۱۵۲۶ء
سلطان کی بیجا پور کو روانگی	۱۵۲۸ء
سلطان کا مزعومہ انتقال	۱۵۲۸ء
عماد الملک نے پہلی مرتبہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا	۱۵۲۹ء

مدگل کے ایک کتبہ میں ابراہیم عادل خود کو ابراہیم خاں کہتا ہے — سنہ ۱۵۳۰ء
ابراہیم عادل ساگر کے ایک کتبہ میں خود کو بہمنی وزیر کہتا ہے — سنہ ۱۵۳۷ء
کلیم اللہ کے سکّوں کی آخری تاریخ — سنہ ۱۵۳۰ء
بیجاپور میں سلطان کا غالباً انتقال — سنہ ۱۵۳۸ء
ابراہیم عادل سلطان کا لقب اختیار کرتا ہے — سنہ ۱۵۳۸ء

ضمیمہ ب

خانوادہ بہمنی کا شجرۂ نسب

سندات اور سکوں کی شہادت کی بنیاد پر مرتب کیا ہوا

نوٹ: نمبر ایک سے ۸ تک نے گلبرگہ میں حکومت کی اور نمبر ۹ سے ۱۸ تک نے بیدر میں

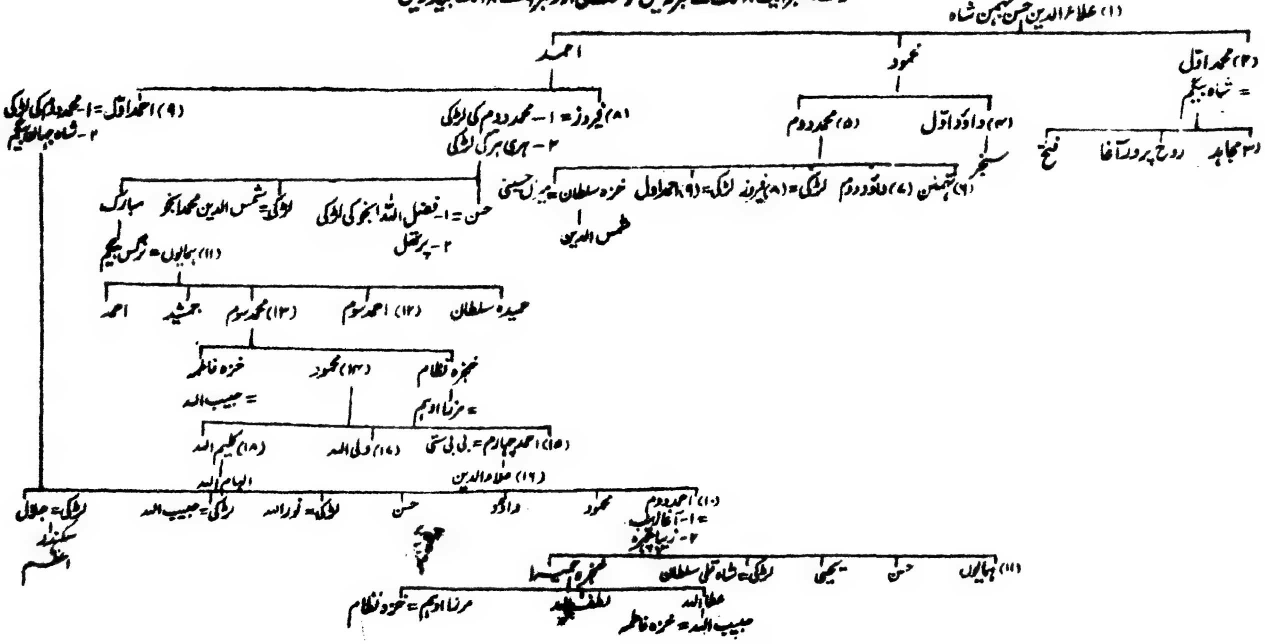

ہماری مطبوعات

جدید سیاسی فکر	سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	14/25
جدید ہندوستان کے معمار	آئی۔ سی۔ ایچ۔ آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد	14/-
جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی	19/-
جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	47/-
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	28/-
بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	14/-
برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	36/-
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	10/-
تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	10/50
اسلامی تہذیب و تمدن	عمادالحسن آزاد فاروقی	14/-
اسلامی سماج	ریوبن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق	60/-
اکبر سے اورنگ زیب تک	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	21/50
البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	11/-
تاریخ فلسفہ سیاسیات	پروفیسر محمد مجیب	18/-
تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این داس گپتا	12/50
تحریک آزادی ہند	ظہور محمد خاں	2/25
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	65/-
قدیم ہندوستان میں شودر	ڈاکٹر رام سرن شرما / جمال الدین محمد صدیقی	14/50
مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا / علی جواد زیدی	60/-
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	37/-
مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست (دوسری طباعت)	ڈاکٹر ستیش چندر / ڈاکٹر قاسم صدیقی	22/-

فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/-
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/-
فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۶) جولائی تا دسمبر 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون 1997	قومی اردو کونسل	30/-
فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر 1997	قومی اردو کونسل	30/-
آہنگ و عروض	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	18/-
املا نامہ	مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	9/-
اردو تصویری لغت	شیاملا کماری / ڈاکٹر علی وقار قیمی	30/-
اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خاں	16/-
اردو افعال	سونیا چرنیکوا	24/-
اردو املا (دوسری طباعت)	رشید حسن خاں	زیر طبع
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ اوّل)	پروفیسر فضل الرحمٰن	300/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ دوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصہ سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اسکول لائبریری	سید حسین رضا رضوی	20/-

ایلس آئینہ گھر میں	لیو لیس کیرل / ڈاکٹر عبدالحئی	12/-
بابر نامہ	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	12/-
باتیں کرنے والا غار	دولت ڈونگاجی / رائے کے لونگیا	3/50
باپو اور بچے	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن / تاجور سامری	2/25
بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	3/75
بچوں کے ڈرامے	اظہر افسر	10/50
بچوں کی مسکان	سیدہ فرحت	3/75
بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	5/-
بچوں کے نہرو	ایم چیلاپتی راؤ / پریم نارائن	7/50
بکری دو گاؤں کھا گئی	م۔ ندیم	9/-
بگلا اور کیکڑا	الکا شنکر	7/-
بوڑھیا اور کوا	شنکر	7/50
بے زبان ساتھی	وکیل نجیب	10/-
بیربل کی شوخیاں	ثریا جبیں	8/-
بے زبانوں کی دنیا	حیدر بیابانی	18/-
بینک کی کہانی	غلام حیدر	4/50
چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	1/50
چڑیا اور راجہ	مدھو ٹنڈن / اتل ویاس	7/-
چڑیاں	سلطان آصف	3/-
چلو چاند پر چلیں	جے پرکاش بھارتی / ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	5/-
چندا ماما کے گاؤں میں	قاضی مشتاق احمد	5/-

وفادار نیولا	شنکر	7/-
ہری اور دوسرے ہاتھی	شنکر / پریم نارائن	6/-
ہمارا سنیما	پریمپال اشک	10/-
ہمارا قومی گیت	سید محمد ابراہیم فکری	10/-
ہماری لوک کہانیاں	پریمپال اشک	18/-
ہمارے ٹیگور	صفدر حسین	8/50
ہمارے جانباز	پریمپال اشک	13/-
ہمالیہ کے بنجارے	شیام سنگھ ششی	6/50
ہندوستان کی آبادی	محمد ابوذر	8/75
ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اوّل)	صفدر حسین	15/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ اوّل)	کلیم الدین احمد	400/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ سوم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ چہارم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ پنجم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ ششم)	کلیم الدین احمد	600/-
توضیحی لسانیات	ایچ. ایل. گلیسن / عتیق احمد صدیقی	23/-
چندر دیو	ایم نثار کشور سلطان	3/-
حاتم طائی کا قصہ	مرتب: ڈاکٹر نورالحسن نقوی	13/-
حالی	صالحہ عابد حسین	4/-
حرف حرف نظم	وقار خلیل	5/-